

بہنوں کا آئینہ سناہنامہ

ستمبر 2014

شعاع



WWW.PAKSOCIETY.COM

نیووی لائبریری اینڈ فرنیچر پوائنٹ
ساؤتھ سسٹم اور جلد سازی کی سہولت موجود ہے
مفتہ اور پائے ڈائجسٹوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے
دوکان نمبر 13 صدی بازار ہری پور



مستقل سلسلے

269	خالہ جیلانی	271	رضیہ جمیل	خط آپ کے
288	خالہ جیلانی	263	صباح سحر	مُسکراہٹیں
290	ادارہ	284	واصفہ سہیل	ایٹینہ خانے میں
		266	شگفتہ جاہ	بالوں سے خوشبو لے
		280	امت الصبور	یارخ کے جھروکے

ستمبر 2014

جلد 29 نمبر 1
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل فلمیں حسن پریشنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲۰، پی ایچ ڈی، سی ایچ ایچ، سولائی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

ناولٹ

اور اگر... شاہد طلعت 84
وفا کے وعدے... صدق رحمان گیلانی 206

افسانے

اور عورت کا دل... نگہت سیما 58
ادھوری تصویر... سمیرا عثمان گل 70
گر مسکاتیں... صباحت یاسین 76
میں آنکھ کا پانی ہوں... منضیل علی 135
دوسرا رخ... قراۃ العین دلت 254
لا علاج... قانتہ والبعہ 258

نظمیں غزلیں

غزل... شعیب مظہر 262
غزل... سعید احمد اختر 262
نظم... شکیب جلالی 261
غزل... صابر ظفر 261

قرآن سالانہ بک کی طرح کی گنتی

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 6000 روپے

اعتبار: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی اعزاز سے نوازا نہیں کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی ٹیلی ویژن اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔

پہلی شعاع، رضیہ جمیل 10
حمد، لاریب، ماہ زیب 11
نعت، سید مظہر علی بخاری 11
بچی کی باتیں، ادارہ 12

انشوویو

ارتج فاطمہ سے ملاقات، شاہین رشید 20
دشمن، شاہین رشید 25
شعاع کے ساتھ، ادارہ 29

ناول

ایک تھی مشال، رخسانہ نگار عدنان 36
قصہ جمل، نبیلہ عزیز 238

مکمل ناول

روپ نگر کی راکھ بانی، نعیمہ تار 104
یارم، سمیرا حمید 148



شعاع کا ستمبر کا شمار آپ کے ہفتوں میں ہے۔
چشمہ شمارہ سالگرہ نمبر تھا۔ قارئین نے اسے بے حد پسند کیا۔ ہمیں خط لکھ کر ہماری محنتوں کو سراہا۔ بہت سی بہنوں نے فون کر کے اپنی رائے سے نوازا۔ سالگرہ نمبر میں جو کئی یاغی انہیں محسوس ہوئی اس کا اظہار کیا تھا جس کی اس حوصلہ افزائی سے ہمیں نئی انگ اور تعزیت ملی ہے۔
شعاع کو خوب سے خوب تر بنانے کی انگ، آپ کی پسندیدگی، ہمارے لیے کس قدر قیمتی ہے، الفاظ میں اس کا اظہار ممکن نہیں۔ ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہم وہ تمام خط شامل نہیں کر سکے جو ہمیں موصول ہوئے۔ ہم تہ دل سے ان قارئین کے ممنون ہیں جنہوں نے اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ ہماری زندگی میں ڈال دیا۔ اودان تمام قارئین کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو شعاع پڑھتی ہیں، اس پر تنقید و تبصرہ کرتی ہیں، ہماری دعا ہے کہ قارئین کی یہ محبتیں اسی طرح ہمارے ساتھ رہیں۔ آمین۔

عید سروے

اکتوبر کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ اس میں عید کے حوالے سے دیگر سلسلیں کے علاوہ حسب روایت قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوال یہ ہیں۔

1۔ ذی الحجہ کا چاند نظر آتے ہی کئی کچول میں رونق نظر آنے لگتی ہے۔ جاقروں کی خریداری، ان کی آمد کا شوق، ان کے پیچھے جاکے بچنے، ان ہی ہنگاموں میں عید الاضحیٰ کا دن طلوع ہوتا ہے تو قصائی کی آمد کے انتظار سے لے کر گوشت بھنے، اسے تقسیم کرنے اور اسے بیکانے تک معروفیت کا وہ عالم ہوتا ہے کہ سر اٹھانے کی ہمت نہیں ملتی۔ آپ ان مراحل سے کیسے گزر رہے ہیں؟ گھر میں قربانی کے جانور دل کی آمد سے لے کر قربانی ہونے تک کا احوال لکھیں۔

2۔ گوشت سے ہی آپ کی پسندیدہ دُش کون سی ہے؟ آپ خود بناتی ہیں یا فرمائش کر کے بنواتی ہیں؟

3۔ ہر صوبہ، ہر قوم، ہر خاندان کی ایک روایتی دُش ہوتی ہے جو خاص موقعوں پر ضرور بنائی جاتی ہے۔ آپ کے گھر کی روایتی دُش کون سی ہے؟

4۔ گوشت کی تقسیم کس طرح کرتی ہیں، گوشت تقسیم کسے ہوئے آپ کون سی باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟
ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ 15 ستمبر تک ہمیں موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- ، نعیم ناز کا مکمل ناول - روپ نگر کی لام کہانی،
- ، سمیرا احمد کا مکمل ناول - یارم،
- ، صدف ریحان کی مکمل ناول - وفلکے وعدے بھاریے مائیں،
- ، شاہدہ طلعت کا ناول،
- ، رضوانہ نگار مدنان اور نعیم عزیز کے ناول
- ، نگہت سیما، مصباح علی، سمیرا عثمان گل، صباست یاسین، نورا العین رائے اور قاترہ رابعہ کے افسانے،
- ، فی دی فنکارہ ارتج فاطمہ سے ملاقات،
- ، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ - دستک،
- ، ہمارے نئی کی پیاری باتیں - احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ، خط آپ کے، آئینہ خانے میں، تاریخ کے جہر کوں سے اور دیگر مکتعل سلسلے شامل ہیں۔
- شعاع، برقعہ کر اپنی رائے سے ضرور نوازے گا۔ ہم منتظر ہیں۔

عید کی آمد ستمبر کی پہلی شکر فرمیں گے پوچھیں
سناؤ کہ ستمبر اور اکتوبر میں کیا کچھ ہو رہا ہے
نور علی شاہ کی نئی نثریں پڑھیں
13 صبر و ہمت اور ہرگز ہار نہ دینا



مہک میں سارے حروف دھو کر
قلم کو عنبر میں ڈبو کر
ثناء رب جلیل لکھوں
رحیم لکھوں، کریم لکھوں
اُسی کو اس کی دلیل لکھوں
کہاں نہیں تھا کہاں نہیں ہے
مجھے بتاؤ وہ جہاں نہیں ہے
ازل سے ہے، تا ابد رہے گا
وہ آپ اپنی سند رہے گا
وہی تو ہے لا شریک و یکتا
وہ سب کا خالق وہ سب کا آقا
وہ سب کے اندر وہ سب کے باہر
وہ سب سے اعلیٰ وہ سب سے برتر
رحیم و رحمان صفات اس کی
بڑی مکرم ہے ذات اس کی

لاریب، ماہ ذیہب



روزِ ازل سے منبع انوار آپ ہیں
تاریکیوں میں نور کا مینار آپ ہیں
میری مجال، بیعتِ اغیار میں کروں
سردار آپ ہیں، مرے سردار آپ ہیں
کون و مکاں بنائے گئے آپ کے لیے
کون و مکاں کے وارث و حق دار آپ ہیں
ہے آپ کے جمال کا پھولوں میں رنگ و جن
گلزارِ کائنات کی مہکار آپ ہیں
کوئین میں نہیں کوئی آئینہ آپ سا
خلاقِ شش جہات کا شہکار آپ ہیں
ہیں اس جہاں میں جتنے بھی انسان لے نوا
ہر بے نوا کے مونس و عم خوار آپ ہیں
کس واسطے ظفر نہ لکھے نعت آپ کی
سرکار صرف اس کے تو حق دار آپ ہیں
سید ظفر علی شاہ بخاری

ایک نئی کہانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ہم ایک دعوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دستی کا گوشت بڑھایا گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ گوشت پسند تھا۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے نوح نوح کر کھانے لگے اور فرمایا۔

”میں قیامت والے دن تمام لوگوں کا سردار ہوں گا۔ کیا تم جانتے ہو اس سرداری کی وجہ کیا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ایک ہی میدان میں (اگلے پچھلے تمام) لوگوں کو جمع فرمائے گا۔ ایک دیکھنے والا ان سب کو دیکھے گا اور ایک بیکارنے والا ان سب کو اپنی آواز سنائے گا۔ سورج ان کے قریب ہو گا۔ لوگوں کو غم اور بے چینی اس حد تک پہنچے گی کہ ان کی طاقت اور برداشت سے باہر ہوگی تو گھر کیس گئے۔“

”کیا تم دیکھتے نہیں کہ تم جس تکلیف سے دوچار ہوؤ کس حد تک پہنچ چکی ہے۔ کیا تم ایسا شخص نہیں دیکھتے جو تمہارے لیے تمہارے رب سے سفارش کرے؟“

تو لوگ ایک دوسرے کو کہیں گے کہ تمہارے باپ آدم علیہ السلام ہیں۔

چنانچہ لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور کہیں گے۔

”اے آدم علیہ السلام! آپ تمام انسانوں کے باپ ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے بنایا اور آپ کے اندر اپنی روح پھونکی اور اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا، تو انہوں نے آپ کو سجدہ کیا اور آپ کو جنت میں آباد کیا۔“

کیا۔ کیا آپ اپنے رب سے ہماری سفارش نہیں کرتے؟ کیا آپ ہماری وہ تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں اور جس حالت کو ہم پہنچے ہوئے ہیں؟“

حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے۔ ”میرا رب آج اتنا سخت غصے میں ہے کہ اس جیسا غضب ناک وہ

اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی اس جیسا غضب ناک ہو گا اور اس نے مجھے (جنت میں) ایک درخت کے پاس جانے سے منع کیا تھا۔ لیکن مجھ سے نافرمانی کا صدور ہو گیا تھا۔ مجھے تو اپنی فکر ہے اپنی فکر ہے اپنی فکر ہے۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ، تم نوح کے پاس جاؤ۔“

چنانچہ لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے عرض کریں گے۔

”اے نوح! آپ اہل زمین کی طرف سے سب سے پہلے رسول ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام شکر گزار بندہ رکھا ہے۔ کیا آپ وہ تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں؟ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ ہماری بے چینی کس حد تک پہنچ چکی ہوئی ہے؟ کیا آپ اپنے رب سے ہماری سفارش نہیں کرتے؟“

نوح علیہ السلام فرمائیں گے۔ ”میرا رب آج اتنا سخت غصے میں ہے کہ اس جیسا غضب ناک وہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آئندہ ہو گا اور مجھے ایک دعا کرنے کا حق حاصل تھا جو میں نے اپنی قوم کے خلاف کر لی تھی۔ مجھے تو اپنی فکر ہے اپنی فکر ہے اپنی فکر ہے۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ، تم

ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ چنانچہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے۔

”اے ابراہیم! آپ اللہ کے نبی اور اہل زمین میں سے اس کے خلیل ہیں۔ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کرو دیجئے کیا آپ وہ تکلیف دیکھ نہیں رہے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں؟“

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے فرمائیں گے۔ ”میرا رب آج اتنا غضب ناک ہے کہ اتنا غضب ناک اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہو گا اور میں نے تو زمین باتیں ایسی کی تھیں جو بظاہر واقعے کے خلاف تھیں۔ مجھے تو اپنی فکر ہے اپنی فکر ہے اپنی فکر ہے۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ، تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔“

چنانچہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے عرض کریں گے۔

”اے موسیٰ! آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی رسالت اور ہم کلامی سے نواز کر تمام لوگوں پر فضیلت عطا کی۔ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کرو دیجئے کیا آپ وہ تکلیف دیکھ نہیں رہے ہیں جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں؟“

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے۔ ”میرا رب آج اتنا سخت غضب ناک ہے کہ اس جیسا غضب ناک وہ پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہو گا اور مجھ سے ایک جان کا قتل ہو گیا تھا جس کے قتل کرنے کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا۔ مجھے تو اپنی فکر ہے اپنی فکر ہے اپنی فکر ہے۔ تم میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ، تم عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ۔“

تو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے۔

”اے عیسیٰ! آپ اللہ کے رسول اور اس کا وہ کلمہ ہیں جو اس نے حضرت مریم کی طرف القا فرمایا اور اس کی روح میں اور آپ نے انوارے میں لوگوں سے

گفتگو فرمائی۔ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش کرو دیجئے کیا آپ وہ تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ہم مبتلا ہیں؟“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے۔ ”میرا رب آج اتنا سخت غصے میں ہے کہ اس جیسا غضب ناک وہ پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہو گا۔“ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے کسی قصور کا ذکر نہیں فرمائیں گے (اور فرمائیں گے) ”مجھے تو اپنی فکر ہے اپنی فکر ہے اپنی فکر ہے۔ تم میرے سوا کسی اور کے پاس جاؤ، تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ۔“

ایک اور روایت میں ہے۔ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔) ”لوگ میرے پاس آئیں گے اور کہیں گے۔“

”اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اللہ کے رسول

اور خاتم الانبیاء ہیں۔ اللہ نے آپ کے اگلے پچھلے (تمام) گناہ بھی معاف فرما دیے ہیں۔ آپ اپنے رب سے ہماری سفارش فرما دیجئے کیا آپ وہ تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں جس میں ہم گھرے ہوئے ہیں؟“ چنانچہ میں چل کر عرش کے نیچے آؤں گا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤں گا پھر اللہ تعالیٰ اپنی حمد اور حسن ثناء پر مشتمل ایسے کلمات مجھ پر القا فرمائے گا کہ مجھ سے پہلے وہ کسی پر القا نہیں کیے گئے ہوں گے پھر کہا جائے گا۔

”اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اپنا سر اٹھائے، مانگیے، آپ کو دیا جائے گا۔ سفارش کیجئے سفارش قبول کی جائے گی۔“

چنانچہ میں اپنا سر (سجدے سے) اٹھاؤں گا اور کہوں گا۔

”اے میرے رب! میری امت اے میرے رب! میری امت (اے بخش دے)۔“

پس کہا جائے گا۔ ”اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی امت کے ان لوگوں کو جو جن پر حساب نہیں ہے، جنت کے دروازوں میں سے دائیں طرف کے دروازے سے

جنت میں لے جائیں اور وہ اس کے علاوہ دوسرے دروازوں میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ شریک ہیں۔ (دوسرے دروازوں سے بھی وہ جاسکتے ہیں۔) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جنت کے کواٹوں میں سے دو کواٹوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا مکہ اور بصرہ کے درمیان یا مکہ اور بصرہ کے درمیان ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ تاجرین میں ایک شہر ہے اور بصرہ دمشق کے جنوب میں واقع حوران کی ایک بستی ہے۔ یعنی جنت کا ایک دروازہ اتنا چوڑا ہوگا کہ دونوں کواٹوں کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ ہوگا۔

2۔ اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

فضیلت کا بیان ہے کہ قیامت والے دن جبکہ جلیل القدر پیغمبروں کو بھی بارگاہ الہی میں سفارش کرنے کی ہمت نہیں ہوگی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکم سے سفارش فرمائیں گے۔ ایک سفارش تو یہ فرمائیں گے کہ لوگوں کا حساب کتاب شروع کیا جائے تاکہ میدان محشر کی ہولناکیوں سے لوگوں کو نجات ملے۔ روایت کا یہ حصہ اس حدیث میں نہیں ہے، دوسری روایات میں ہے۔

دوسری سفارش اپنی امت کے حق میں فرمائیں گے۔ یہ مختلف مرحلوں میں ہوگی۔ اس میں پہلے مرحلے کا ذکر ہے۔ جس میں آپ کی سفارش پر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جنت میں لے جانے کی اجازت مرحمت فرمائے گا جن پر حساب نہیں ہوگا۔ دوسری مرتبہ آپ کی سفارش اس وقت ہوگی جب گناہ گار اہل ایمان جہنم میں اپنے گناہوں کی کافی سزا بھگت چکے ہوں گے تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سفارش سے انہیں جہنم سے نکال کر جنت میں داخل فرمایا جائے گا۔

3۔ اس میں انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اپنی بعض لغزشوں کے حوالے سے سفارش کرنے سے معذرت کریں گے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ انبیاء ایمان و تقویٰ کے جس بلند ترین درجے پر فائز ہوتے ہیں وہاں معمولی سی لغزش بھی جو گناہ کے دائرے میں نہیں آتی، انہیں بڑی غلطی محسوس ہوتی ہے جیسے کہا جاتا ہے۔ ”سفید اجلے کپڑے پر معمولی سا دھبہ بھی بڑا نمایاں محسوس ہوتا ہے۔“ یہی حال انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اسی اعتبار سے انہوں نے معمولی معمولی لغزشوں کی وجہ سے بارگاہ الہی میں پیش ہونے سے معذرت کی۔

4۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تین واقعے جنہیں کذبات کہا گیا ہے حالانکہ وہ جھوٹ نہیں ہیں بلکہ معارف میں ہیں جو ظاہراً ”جھوٹ معلوم ہوتے ہیں“ لیکن حقیقتاً ”جھوٹ نہیں ہوتے۔“

ان میں سے ایک ان کا یہ کہنا کہ میں بیمار ہوں۔ دوسرا بتوں کی بابت کہنا کہ بڑے بت نے یہ کام کیا ہے اس سے پوچھو۔

تیسرا بیوی کو اپنی بہن کہنا۔ پہلی بات کو کسی طرح جھوٹ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ آپ نے اپنے آپ کو بیمار کہا تو یقیناً آپ بیمار ہوں گے یا ان کی گہستی کے لوگ جس جشن میں شرکت کی دعوت دے رہے تھے اس کے لیے آپ بیمار تھے۔ بت توڑنے کے بعد کہنا کہ بڑے بت سے پوچھو اس سے مقصود بتوں کے پجاریوں کے سامنے بتوں کی اصل حقیقت واضح کرنا اور ان کو توحید کی حقیقت سے آشنا کرنا تھا۔ اسی طرح بادشاہ کے سامنے حالت کی مجبوری کی وجہ سے بیوی کو بہن کہنا بھی جھوٹ نہیں ہے کیونکہ ہر مسلمان مرد دوسرے مسلمان مرد کا بھائی اور مسلمان عورت ہر مسلمان کی بہن ہے۔ لیکن ظاہری شکل کے اعتبار سے کیونکہ یہ واقعات کے خلاف ہیں اس لیے انہیں جھوٹ کہہ دیا گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت کے لحاظ سے وہ جھوٹ

نہیں ہیں، تو یہی کی قسم سے ہیں جو بوقت ضرورت جائز ہے۔

حضرت ہاجرہ کا توکل

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ اور ان کے بیٹے اسماعیل کو جبکہ وہ ان کو دودھ پلاتی تھیں لائے حتیٰ کہ انہیں بیت اللہ کے نزدیک مسجد حرام کے بالائی حصے میں زمزم کے اوپر واقع ایک درخت کے پاس ٹھہرایا۔

اس زمانے میں مکہ میں کوئی انسان آباد نہیں تھا۔ نہ وہاں پانی ہی تھا۔ ان ماں، بیٹے کو وہاں بٹھایا اور ان کے پاس ایک تھیلی رکھ دی۔ جس میں کچھ کھجوریں تھیں اور پانی کا ایک مشکیزہ تھا۔ پھر ابراہیم علیہ السلام پیٹھ پھیر کر جانے لگے تو حضرت اسماعیل کی والدہ ان کے پیچھے گئیں اور کہا۔

”اے ابراہیم! ہمیں اس وادی میں (تنہا) چھوڑ کر جہاں کوئی غم خوار سا بھی ہے نہ ضرورت کی کوئی چیز کہاں جا رہے ہیں؟“

انہوں نے یہ بات ان سے متعدد مرتبہ کہی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کی طرف توجہ ہی نہ فرماتے۔ بالآخر حضرت ہاجرہ علیہ السلام نے کہا۔ ”کیا اللہ نے آپ کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟“ حضرت ابراہیم نے کہا۔ ”ہاں۔“

تو انہوں نے کہا۔ ”تب وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔“

پھر وہ واپس چلی گئیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی راہ پر چلے یہاں تک کہ جب ثنیہ مقام پر پہنچے جہاں سے ان کے اہل و عیال انہیں نہیں دیکھ رہے تھے۔ اپنا رخ بیت اللہ کی طرف کیا، پھر ان کلمات کے ساتھ دعا میں گئیں۔ اے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا۔

”اے میرے رب! میں نے اپنی اولاد کو ایک بے آب و گیاہ وادی میں آباد کیا ہے۔ تاکہ وہ شکر کریں۔“

(ادھر) اسماعیل کی والدہ اسماعیل کو دودھ پلاتی اور اس مشکیزے کے پانی سے پانی پیتی رہیں یہاں تک کہ جب مشکیزے کا پانی ختم ہو گیا تو خود بیاہی رہنے لگیں اور بیٹا بھی پیاس سے بلبلانے لگا اور وہ اسے زمین پر لٹاتے ہوئے دیکھنے لگیں۔

یہ منظر ان کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔ چنانچہ وہ پانی کی تلاش میں چلیں تو صفا پہاڑ کو انہوں نے زمین میں سب سے قریب پایا۔ وہ اس پر کھڑی ہو گئیں اور وادی کی طرف منہ کر کے دیکھنے لگیں کہ کوئی انسان نظر آتا ہے۔ لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ صفا پہاڑ سے نیچے اتریں یہاں تک کہ جب وادی (میدان) میں پہنچیں تو اپنی گھیس کا کنارہ اوپر اٹھایا، پھر اس طرح دوڑیں جیسے کوئی سخت مصیبت زدہ انسان دوڑتا ہے۔ حتیٰ کہ ساری وادی پار کر گئیں، پھر مردہ پہاڑی پر چڑھ کر کھڑی ہو گئیں اور نظر دوڑائی کہ کیا کوئی انسان دکھائی دیتا ہے؟ لیکن کوئی نظر نہ آیا۔

انہوں نے ایسا سات مرتبہ کیا۔ (سات چکر لگائے) حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اسی وجہ سے (حضرت ہاجرہ کی متابعت میں) لوگ صفا اور مردہ کے درمیان سہی کرتے ہیں۔“

چنانچہ جب (آخر میں) مردہ پر چڑھیں تو ایک آواز سنی۔ تو اپنے آپ کو خطاب کر کے کہا۔ ”خاموش رہ۔“ (کیونکہ آواز ان کے لیے ناقابل یقین چیز تھی۔) پھر کان لگائے تو پھر آواز سنی۔ تو حضرت ہاجرہ نے کہا۔

”تیری آواز پہنچ گئی ہے۔ اگر تیرے پاس کچھ مدد کا سامان ہے تو۔“ (فورا) ”مدد کے لیے پہنچ۔“

پس ناگہاں دیکھا کہ زمزم کی جگہ کے پاس فرشتہ ہے۔ اس نے اپنی ایڑی یا اپنے پر کے ساتھ زمین کو کھدایا، یہاں تک کہ پانی نکل آیا تو حضرت ہاجرہ اس کے لیے حوض بنانے لگیں اور اپنے ہاتھ سے باڑھ بناتی تھیں اور چلو سے پانی لے کر مشکیزے میں

ڈالنے لگیں۔ وہ جتنا پانی چلو میں لیتیں، وہ پانی اتنا ہی ابلتا اور ایک روایت میں ہے کہ چلو کی مقدار کے برابر پانی ابلتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل کی والدہ پر رحم فرمائے۔ اگر وہ زمزم کو یوں ہی چھوڑ دیتیں۔“ یا فرمایا۔ ”چلو سے پانی اکٹھا نہ کریں تو زمزم روئے زمین کو سیراب کرنے والا برا چشمہ ہوتا۔“

راوی نے بیان کیا۔ ”حضرت ہاجرہ نے خود بھی پانی پیا اور اپنے بچے کو بھی پلایا۔ پس فرشتے نے حضرت ہاجرہ سے کہا۔

”تم اپنی جان کا خوف مت کرو۔ (کہ وہ ضائع ہو جائے گی) اس لیے کہ اس مقام پر اللہ کا گھر ہے جسے لڑکا اور اس کا باپ تعمیر کریں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے لوگوں کو ضائع نہیں کرتا۔“

اور (اس وقت) بیت اللہ (کی جگہ) نیلے کی طرح زمین سے بلند تھی۔ وہاں سیلاب آتے تو اس کے دائیں اور بائیں سے گزر جاتے۔ ایک عرصے تک یہی کیفیت رہی یہاں تک کہ جرہم کا قافلہ یا جرہم قبیلے کا کوئی گھرانہ مکہ کے راستے سے آتے ہوئے ان کے پاس سے گزرا۔ انہوں نے مکہ کے زیریں حصے میں پڑاؤ کیا تو ایک منڈلا تا ہوا پرندہ دکھاؤ کہنے لگے۔

”یہ پرندہ یقیناً پانی پر گھوم رہا ہے۔ ہمیں تو اس وادی سے آتے جاتے ایک زمانہ ہو گیا ہے اس میں تو پانی نہیں ہے۔“

چنانچہ (معلومات کے لیے) انہوں نے ایک یا دو قاصد بھیجے تو انہوں نے وہاں پانی پایا۔ انہوں نے اگر ان کو خبر دی تو وہ لوگ وہاں گئے۔ حضرت اسماعیل کی والدہ پانی کے پاس تھیں۔ انہوں نے کہا۔

”آپ ہمیں اجازت دیتی ہیں کہ ہم آپ کے پاس آکر پڑاؤ ڈال لیں؟“

انہوں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، لیکن پانی کی ملکیت میں تمہارا حق نہیں ہوگا۔“

انہوں نے کہا ٹھیک ہے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”یہ بات حضرت اسماعیل کی والدہ کی خواہش کے مطابق ہوئی، وہ بھی انس و محبت کو پسند کرتی تھیں۔“

پس انہوں نے وہاں پڑاؤ ڈال لیا اور اپنے گھر والوں کو پیغام بھیجا۔ وہ بھی وہاں آکر مقیم ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہاں رہنے والے کئی گھر ہو گئے اور اسماعیل بھی جوان ہو گئے اور ان لوگوں سے انہوں نے عربی زبان بھی سیکھ لی اور جب وہ بڑے ہو گئے تو وہ ان میں سب سے زیادہ نفیس اور سب سے زیادہ دل پسند تھے۔ لہذا جب وہ بالغ ہو گئے تو انہوں نے اپنی ایک عورت سے ان کی شادی کر دی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ فوت ہو گئیں۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام آئے، تاکہ اپنی چھوڑی ہوئی چیزوں (بیوی، بچے) کو ملاحظہ کریں۔ انہوں نے

اسماعیل علیہ السلام کو نہ پایا تو ان کی بابت ان کی بیوی سے پوچھا۔ اس نے بتلایا کہ ”وہ ہمارے لیے رزق کی تلاش میں اور ایک روایت میں ہے۔ ہمارے لیے شکار کرنے باہر گئے ہیں۔“

پھر انہوں نے ان کی بیوی سے ان کی گزران اور عام حالت کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

”ہم بہت برے حال میں ہیں بڑی تنگی اور سختی میں ہیں۔“ اور ان کی طرف شکایت کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ”جب تمہارے خاوند آئیں تو انہیں میرا سلام کہنا اور ان سے کہنا۔ اپنے دروازے کی دہلیز بدل دیں۔“

چنانچہ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو گویا انہوں نے کسی چیز کو محسوس کیا۔ (کسی کی آمد کا احساس ہوا) اور پوچھا۔

”کیا تمہارے پاس کوئی آیا تھا؟“

بیوی نے کہا۔ ”ہاں۔ ایسے ایسے حلیے کے ایک

بزرگ آئے تھے انہوں نے آپ کی بابت پوچھا، تو میں نے ان کو بتلایا۔ پھر انہوں نے پوچھا۔ ہماری گزر اوقات کیسی ہے؟ تو میں نے ان کو بتلایا۔ ہم بڑی تکلیف اور سختی میں ہیں۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا۔ ”کیا انہوں نے تجھے کسی بات کی تلقین کی تھی؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں۔ مجھے انہوں نے حکم دیا تھا کہ میں آپ کو ان کا سلام کہوں اور آپ کے لیے یہ پیغام دے گئے تھے کہ اپنے دروازے کی دہلیز بدل دیں۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا۔ ”وہ میرے والد بزرگوار تھے اور انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تجھ سے علیحدگی اختیار کر لوں، پس تو اپنے گھر والوں (والدین) کے پاس چلی جا۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس کو طلاق دے دی اور اس قبیلے کی کسی اور عورت سے شادی کر لی۔

پس حضرت ابراہیم علیہ السلام جب تک اللہ نے چاہا، کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد دوبارہ ان کے پاس تشریف لائے تو پھر اسماعیل علیہ السلام کو گھر میں موجود

نہ پایا۔ ان کی بیوی کے پاس آئے اور ان سے ان کی بابت پوچھا۔ تو اس نے بتلایا کہ وہ ہمارے لیے رزق کی تلاش میں باہر گئے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا۔ ”تمہارا کیا حال ہے؟“ اور اس سے ان کی گزران اور عام حالت کے بارے میں پوچھا۔ تو بیوی نے کہا۔

”ہم خیریت سے ہیں اور فراخی میں ہیں اور اس نے اللہ کی حمد و ثنا کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا۔

”تمہاری خوراک کیا ہے؟“ اس نے کہا۔ ”گوشت۔“

انہوں نے پوچھا۔ ”پتے کیا ہو؟“ اس نے کہا۔ ”پانی؟“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اے اللہ! ان کے لیے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما۔“

ان کے لیے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما۔“ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اس وقت ان کے لیے کوئی غلہ نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام اس کی بابت بھی ان کے لیے (برکت کی) دعا فرما دیتے۔“

حضرت ابن عباس نے فرمایا۔ ”مکہ کے سوا کسی اور جگہ کوئی شخص صرف ان دو چیزوں (گوشت اور پانی) پر گزارہ کرے تو اسے موافق نہیں آئیں گے۔“

ایک اور روایت میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام (دوسری مرتبہ) آئے تو پوچھا۔

”اسماعیل کہاں ہیں؟“ تو ان کی بیوی نے کہا۔ ”شکار کرنے گئے ہیں۔“ پھر ان کی بیوی نے کہا۔

”کیا آپ تشریف نہیں رکھتے کہ (کچھ) کھائیں پیئیں؟“

انہوں نے پوچھا۔ ”تمہارا کھانا پینا کیا ہے؟“ اس نے جواب دیا۔ ”ہمیں کھانے کو گوشت اور پینے کو پانی میسر ہے۔“ انہوں نے فرمایا۔ ”اے اللہ! ان کے کھانے اور پینے میں برکت عطا فرما۔“

حضرت ابن عباس نے بیان کیا کہ ابو القاسم نے فرمایا۔ (مکہ میں ان چیزوں کی فراوانی) حضرت ابراہیم کی دعا کا نتیجہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ”جب تمہارا خاوند آئے تو انہیں سلام کہنا اور یہ پیغام دینا کہ اپنے دروازے کی دہلیز کو برقرار رکھیں۔“ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام آئے تو پوچھا۔

”کیا تمہارے پاس کوئی آیا تھا؟“ اس نے کہا۔ ”ہاں۔ ایک خوب شکل بزرگ آئے تھے۔“

بیوی نے حضرت ابراہیم کی تعریف کی۔ ”انہوں نے مجھ سے آپ کی بابت پوچھا تو میں نے انہیں بتلایا۔“ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”ہماری گزر اوقات کیسی ہے؟“ تو میں نے بتلایا۔ ”ہم بہت

اچھی حالت میں ہیں۔“
حضرت اسماعیل علیہ السلام نے پوچھا۔ ”انہوں نے کسی بات کی تلقین بھی کی؟“
ہوئی نے کہا۔ ”ہاں۔ وہ آپ کو سلام کہتے تھے اور آپ کو حکم دیتے تھے کہ اپنے دروازے کی دہلیز کو برقرار رکھیں۔“

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا۔ ”وہ میرے والد تھے اور دہلیز سے مراد تو ہے انہوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں مجھے اپنے پاس ہی رکھوں۔ (اپنے سے علیحدہ نہ کروں)“

پھر جب تک اللہ نے چاہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ عرصہ ٹھہرنے کے بعد پھر تشریف لائے۔ اسماعیل علیہ السلام زمزم کے قریب ایک درخت کے نیچے تیر درست کر رہے تھے۔

جب اسماعیل علیہ السلام نے ان کو دیکھا تو کھڑے ہو کر ان کی طرف بڑھے، پھر وہی احترام و محبت کا معاملہ کیا۔ جس طرح باپ، اولاد کے ساتھ اور اولاد باپ کے ساتھ کرتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔
”اے اسماعیل علیہ السلام! اللہ نے مجھے ایک بات کا حکم دیا ہے۔“

اسماعیل علیہ السلام نے کہا۔ ”آپ کے رب نے آپ کو جس بات کا حکم دیا ہے وہ کریں۔“
انہوں نے پوچھا۔ ”تو میری مدد کرے گا؟“
انہوں نے کہا۔ ”میں آپ کی مدد کروں گا۔“

حضرات ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں یہاں ایک گھر تعمیر کروں۔“
اور ایک ٹیلے کی طرف اشارہ فرمایا جو ارد گرد کے حصوں سے بلند تھا۔ چنانچہ اسی وقت اس خاص گھر کی دیواریں اٹھائیں۔ اسماعیل علیہ السلام پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے اور ابراہیم علیہ السلام اس سے تعمیر کرتے یہاں تک کہ جب دیواریں اونچی ہو گئیں تو (مقام ابراہیم والا) پتھر لائے اور وہاں رکھا۔ پس ابراہیم علیہ السلام

اس پر کھڑے ہو کر تعمیر کرتے اور اسماعیل علیہ السلام ان کو پتھر پکڑاتے جاتے اور دونوں کی زبانوں پر یہ دعا تھی۔

”اے ہمارے رب! ہمارا یہ عمل قبول فرما یقیناً تو بہت سننے والا اور جاننے والا ہے۔“

ایک اور روایت میں (واقعی کا ابتدائی حصہ اس طرح) ہے کہ حضرت ابراہیم، اسماعیل اور ان کی والدہ کو لے کر نکلے۔ ان کے ساتھ ایک مشکیزہ تھا۔ جس میں پانی تھا۔ پس اسماعیل کی والدہ مشکیزے سے پانی پئیں تو بچے کے لیے ان کی چھاتی میں دودھ خوب اترتا یہاں تک کہ وہ مکہ آگئے۔

یہاں حضرت ابراہیم نے ان کو ایک بڑے درخت کے نیچے بٹھایا۔ پھر ابراہیم اپنے گھر والوں کی طرف لوٹے تو اسماعیل علیہ السلام کی والدہ بھی ان کے پیچھے چلتی رہیں یہاں تک کہ جب وہ کدرا جگہ پر پہنچے تو حضرت ہاجرہ نے ان کو پیچھے سے آواز دی۔

”اے ابراہیم! ہمیں گس کے سپرد کر کے چھوڑ چلے ہو؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”اللہ کے۔“
والدہ اسماعیل علیہ السلام نے کہا۔ ”میں اللہ کے سپرد کیے جانے پر راضی ہوں۔“

اور واپس چلی گئیں اور مشکیزے سے پانی پیتی رہیں اور بچے کے لیے ان کی چھاتی میں دودھ اترتا رہا۔ یہاں تک کہ جب پانی ختم ہو گیا تو (دل میں) کہا۔ ”میں (ادھر ادھر) جاؤں اور دیکھوں تو شاید کوئی آدمی نظر آجائے۔“

راوی نے بیان کیا۔ چنانچہ وہ گئیں اور صفا پہاڑی پر چڑھ گئیں اور خوب نظر دوڑائی کہ کیا کوئی نظر آتا ہے۔ لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ (پھر نیچے اتریں) جب اتر گئیں تو دوڑیں اور مردہ پہاڑی پر چڑھ گئیں۔

اس طرح کئی چکر لگائے۔ (دونوں پہاڑوں کے درمیان) پھر (دل میں) کہا۔ میں جا کر بچے کو تو دیکھوں۔ اس نے کیا کیا۔ (اس کا کیا حال ہے؟) پس گئیں اور

دیکھا تو وہ اسی حال میں تھا۔ گویا کہ وہ زندگی کی آخری سانس لے رہا ہے۔ چنانچہ ان کے نفس نے قرار نہیں پکڑا۔ (اور وہ زیادہ بے چین ہو گئیں) اور سوچا۔ میں (پھر) جاؤں اور دیکھوں۔ شاید کسی کو پاؤں۔ وہ پھر گئیں اور صفا پہاڑی پر چڑھ گئیں اور خوب دیکھا۔ لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ سات چکر پورے کر لیے پھر سوچا کہ جاؤں اور بچے کو دیکھوں کہ اس کا کیا حال ہے۔ وہاں آئیں تو اچانک ایک آواز کلن میں پڑی۔ تو انہوں نے کہا۔ ”اگر تیرے پاس کوئی بھلائی ہے تو مدد کر۔“ وہاں جبریل علیہ السلام موجود تھے۔ انہوں نے اپنی ایزدی زمین پر ماری۔ چنانچہ زمین سے پانی پھوٹ پڑا۔ جسے دیکھ کر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حیرت زدہ ہو گئیں اور اپنی ہتھیلیوں سے پانی سمیٹ کر مشکیزے میں ڈالنے لگیں اور راوی نے حدیث پوری تفصیل سے بیان کی۔

یہ ساری روایات امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کی ہیں۔
فوائد و مسائل

1۔ اس میں ایک تو صفا مردہ کے درمیان سعی کرنے کے تاریخی پس منظر کی وضاحت ہے کہ حج و عمرہ کا یہ رکن حضرت ہاجرہ کے اس واقعے کی یادگار کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے جو اس حدیث میں بیان ہوا ہے۔ کیونکہ انہوں نے محض اللہ کی رضا کے لیے اللہ کے حکم پر اپنے شیر خوار بچے سمیت ایسی بے آب و گیاہ سرزمین پر رہنا قبول کر لیا تھا۔ جہاں کسی انسان کا نام و نشان تھا نہ کھانے پینے کا کوئی بندوبست۔ اللہ نے اس کا حسن صلیہ عطا فرمایا کہ ایک تو ان کے لیے زمزم کا چشمہ جاری فرمایا جو وقتی طور پر ان کے لیے چشمہ آب حیات ثابت ہوا اور اس کا فیض عام اب تک جاری ہے۔ دوسرے صفا اور مردہ کے درمیان ان کی بے تابانہ دوڑ کو حج اور عمرے کا رکن بنادیا، تاکہ ہر حاجی اور عمرہ کرنے والے اس کو دہرائے اور قیامت تک یہ سلسلہ جاری رہے۔

2۔ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ہاتھوں سے ہوئی۔
3۔ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا پسندیدہ اور اس کے برعکس طرز عمل نا پسندیدہ ہے۔
4۔ رضائے الہی سے بے اعتنائی پر اگر باپ اپنے بیٹے کو بیوی کی بابت کہے کہ اسے طلاق دے دے تو بیٹے کو باپ کی اطاعت کرتے ہوئے ناشکری بیوی کو اپنے سے جدا کرونا چاہیے۔

بیارے بچوں کے لئے

قصص الانبیاء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

قیمت - 300 روپے

میں کسی اہم جگہ پر جاتی ہوں اور وہاں پر کمرشلز چل رہے ہوتے ہیں تو جب میں اپنے آپ کو دیکھتی ہوں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ ایک عجیب خوشی سی محسوس ہوتی ہے۔

”اور لوگ آپ کو سہ مڑ مڑ دیکھتے ہوں گے کیا کہتے ہیں جب ملتے ہیں تو؟“

”بہت عزت بہت پیار سے ملتے ہیں اور بے ساختہ کہتے ہیں ارے آپ تو اسکرین پر بڑی نظر آتی ہیں جبکہ آپ تو بہت چھوٹی ہیں۔ تو میں کہتی ہوں کہ میں اصل میں بھی چھوٹی ہی ہوں۔ اور یہ تو واقعی حقیقت ہے کہ اسکرین آپ کو اپنی عمر سے دو چار سال بڑا ہی دکھاتی ہے۔“

”آپ بتا رہی ہیں کہ آپ عمر میں بھی چھوٹی ہیں تو کچھ بتائیں اپنے بارے میں؟“

”جی میری پیدائش 2 نومبر 1989ء کی ہے تو



باسلا حیات فنکار

ایک فاطمہ سے ملقات

شاہین رشید

آپ خود سوچ لیں۔ یہ بھی بتاؤں کہ مجھے سب پیار سے ”ارتج“ اور ”بیا“ بولتے ہیں جبکہ میرا اصلی نام ”فاطمہ“ ہے۔ اور یہ ”فاطمہ جعفری“ ہے۔ اور یہ بھی بتاؤں کہ میں ”یو ایس اے“ میں پیدا ہوئی۔ اور دو بھائیوں کی اہلکوی بہن ہوں۔ اس لیے لاڈلی بھی ہوں۔

”ہوں۔ گڈ۔ دونوں بھائی بڑے ہیں کیا۔؟ اور ”یو ایس اے“ میں پیدا ہونے والی لڑکی پاکستان میں کیوں رہ رہی ہے؟“

(خوبصورت ہنسی کے ساتھ) ”پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک بھائی مجھ سے بڑے ہیں ایک چھوٹا۔ اور میں اپنے دونوں بھائیوں اور والدین کی لاڈلی ہوں۔“

نازک مومل اور اچھے قد کاٹھ کی فنکار ”ارتج فاطمہ“ کو اس فیلڈ میں آئے ہوئے تقریباً ”ڈیڑھ دو سال“ ہی ہوئے ہیں مگر اس فنکار نے بہترین پرفارمنس سے اور اپنے اخلاق و کردار سے جگہ بنالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ارتج فاطمہ آپ کو ہر وقت اسکرین پر نظر آتی ہے۔ کبھی کمرشلز میں تو کبھی ڈراموں میں۔

”ہر وقت اسکرین پر رہنا کیسا لگتا ہے؟“ ہم نے دعا و سلام کے بعد پہلا سوال کیا۔

”بہت اچھا لگتا ہے۔ اور جی بتاؤں مجھے تو اپنے آپ کو زیادہ دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ لیکن جب



انجوائے کر رہی ہوں۔ جب کام اپنی مرضی کا ہو تو مزا کیوں نہیں آئے گا۔ اس فیلڈ میں اپنے چاچو کی وجہ سے آئی اور مجھے نہیں پتا تھا کہ اس فیلڈ میں کامیابیاں میری منتظر ہیں۔“

”واقعی۔ کس نے پہچان دی اور کس طرح آگے بڑھیں آپ؟“

”سب اوپر والے کی مہانیاں۔ پہلا کمرشل کیا تھا اور یوں شووز میں آنے کی ابتدا ہوئی تھی۔ ایک نیلی کام کمپنی کا کمرشل تھا اور صرف ایک لائن ہی بولنی تھی۔ اس کے بعد ڈرامہ سیریل ”ہزار داستان“ میں کام کرنے کی آفر آئی۔ تین بہنوں یا یوں کہہ لیں کہ تین بیٹیوں کی کہانی تھی اور زیادہ مختار نے ہماری ماں کا کردار کیا تھا۔ ایک سیریل ”سبز قدم“ میں چھوٹا سا رول ملا تھا جس میں میں نے نیگیٹو رول کیا تھا۔ اور پہچان مجھے ڈرامہ سیریل بلکہ سوپ ”مرحائیں ہم تو کیا“ نے دی۔ اور ”ایک پاگل سی لڑکی“ نے دی۔“

”امریکہ سے آئی ہوئی لڑکی کو اردو بولنی کیسے آئی۔ کیسی یا گھر کا ماحول ایسا تھا کہ اردو بولی جاتی تھی؟“

”بس دیکھ لیں۔ اصل میں گھر میں تو ہم انگریزی

دوسری بات یہ کہ میں پاکستان میں کیا کر رہی ہوں تو الحمد للہ پاکستان میں میرے دادا دادی ہیں اور میرے کزن وغیرہ بھی ہیں تو مجھے بہت مزا آرہا ہے یہاں رہ کر اور یہاں کام کر کے۔“

”آپ نے بتایا تھا کہ آپ ایک ”ہین جی او“ چلانے کی نیت سے پاکستان آئی تھیں۔ تو کیا اب وہ کام پس پشت چلے گئے؟“

”ارے نہیں۔ ایسا کچھ نہیں۔ ”ہین جی او“ چلانا میرا مشن ہے اور میں اس پر کام کر رہی ہوں۔ مجھے ایک ”میم خانہ“ کھولنا ہے اور بچوں کے لیے کام کرنا ہے۔ کیونکہ میں نے چائلڈ سائیکولوجی میں بیچلر کیا ہے اس کام میں دیر اس لیے ہو رہی ہے کہ میں پہلے اسٹیبلیش ہونا چاہتی ہوں مالی طور پر تھوڑی اسٹراٹج ہونا چاہتی ہوں پھر ان شاء اللہ بھرپور طریقے سے کام کروں گی۔ ایسا کچھ نہیں کہ میں پیچھے ہٹ گئی ہوں۔“

”والدین خوش ہیں آپ سے؟ اور والدین کیا کرتے ہیں؟“

”والدین بہت خوش ہیں میری شہرت سے۔ میری پرفارمنس سے میرے کام سے اور سچ بات تو یہ ہے کہ اگر والدین اور بھائیوں کا تعاون نہ ہوتا تو بھلا میں کیا کر سکتی تھی۔ اور والدین کے بارے میں بتاؤں کہ میری امی کا حلق ”ایران“ سے ہے اور والد کا تعلق پاکستان سے ہے۔ دونوں ”یو ایس اے“ میں رہتے ہیں والد جاب کرتے ہیں جبکہ امی گھر کی ذمہ داریاں سنبھالتی ہیں۔ دونوں بھائی بھی یو ایس اے میں ہی ہوتے ہیں۔ ہمارا آنا جانا گارنٹا ہے۔“

”شادی کب کرنی ہے؟“

”وہ بھی ہو جائے گی۔ ممکن تو ہو چکی ہے۔ والدین کی پسند سے ان شاء اللہ شادی بھی جلدی ہو جائے گی۔ میرے منگیتر میرے کزن بھی ہیں۔“

”شووز میں انجوائے کر رہی ہو۔ اور آمد کیسے ہوئی؟“

”بالکل جی۔ بہت مزے آرہے ہیں بہت



کچھ بتا نہیں ہوتا اس لیے انسان کے پاس اپنی سیونگ ضرور ہونی چاہیے۔

”لوگ تعریف کرتے ہیں یا ایمانداری کے ساتھ تھوڑی تنقید بھی کرتے ہیں؟“

”سچ بتاؤں۔ مجھے تو تعریف ہی سننے کو ملتی ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ڈرامہ سیریل ”میری بیٹی“ ختم ہوا ہے اس میں میرے کردار کو بہت پسند کیا گیا۔ اور یہ کردار تھا بھی بہت اچھا۔ مجھے کرنے میں مزا آیا۔ تنقید اب نہیں ہوتی، شروع شروع میں ہوتی تھی۔ اور مجھے لگتا تھا کہ واقعی یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ کیونکہ مجھے اداکاری کب آتی تھی۔ اب تو شکر ہے کہ اللہ نے اپنا کرم کر دیا ہے۔“

”آپ نے بتایا کہ شروع شروع میں اردو نہیں آتی تھی تو ڈائریکٹر ز اور سینئر کارویہ کیسا ہوتا تھا؟“

”سینئر نے تو کچھ زیادہ حوصلہ افزائی نہیں کی۔ کچھ توصیف کہہ دیتے تھے کہ یہ ایک مشکل فیلڈ ہے آپ کو کچھ کرنا نہیں آتا آپ کو وقت لگے گا مگر ڈائریکٹر مجھ سے خوش تھے اور ایک ڈائریکٹر نے تو کہا کہ آپ دیکھئے گا کہ ایک دو سال میں آپ ایک بہترین اداکارہ کہلا جائیں گی۔“

”اور ایسا ہی ہوا۔۔۔ ہے نا۔۔۔“

”جی بالکل۔۔۔ میں تو اپنی تعریف نہیں کروں گی۔ لیکن مجھے اچھا لگتا ہے جب لوگ میری تعریف کرتے ہیں۔“

”اس فیلڈ میں جگہ بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟“

”صرف اور صرف محنت اور اپنے کام سے کام۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اس فیلڈ میں اپنے آپ کو منوانا پڑتا ہے مگر بہت محنت کے ساتھ۔“

”آنے والے سیریلز میں کیا کیا ہے؟“

”آنے والے سیریلز میں ”ایک پل زندگی ہے تو“

اور مزید دو اور ڈرامے بھی ہیں مگر ابھی ان کے ناموں کا انتخاب نہیں ہوا۔“

”تو پھر چھوڑی عادت؟“

کرنا اور چوڑی دار پاجامہ پہنتی ہیں وجہ؟ یہ کردار کا حصہ ہوتا ہے کیا۔“

”سچ بتاؤں جو ڈراموں میں پہننے کو ملتے ہیں وہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں آتے اس لیے زیادہ تر ڈراموں میں اپنے ہی پہنتی ہوں۔ اور مجھے چونکہ چوڑی دار پاجامہ زیادہ پسند ہے اس لیے پھر میں وہی زیادہ پہنتی ہوں۔“

”آج کل سیرسل وغیرہ کا تو رواج رہا نہیں۔ تو پھر آپ کیا کرتی ہیں۔ سیٹ پر جا کر تھوڑی سیرسل کرتی ہیں یا بس کر لیا جو ذہن میں آیا؟“

”نہیں ایسا نہیں ہے کہ جو ذہن میں آیا کر لیا۔ تو باقاعدہ سیرسل کرتی ہوں۔ سیٹ پہ بھی اور اپنے گھر میں شیشے کے سامنے بھی۔ جب سے میں نے کام شروع کیا ہے مجھے اس کام میں اتنا مزہ آ رہا ہے کہ اداکاری میرا جنون بنتی جا رہی ہے۔ اور جب تک میں خود مطمئن نہیں ہو جاتی بریکسٹ نہیں چھوڑتی۔“

”اس فیلڈ میں آکر کیا محسوس کیا اچھی یا بری۔ لوگ کیسے ہیں؟“

”دیکھیں فیلڈ کوئی بھی ہو۔ اس میں اچھائی اور برائی تو ہوتی ہی ہے۔ اس لیے صرف شو بیز کو الزام نہیں دے سکتے۔“

”گویا اداکاری مشکل کام ہے۔ تو ماڈلنگ؟“

”محنت دونوں میں ہے اور میں محنت سے نہیں گھبراتی۔ مگر پھر بھی ماڈلنگ میں میں شروع ہی سے اپنے آپ کو ایزی محسوس نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ دیکھا جائے تو ماڈلنگ میں پیسہ بہت ہے مگر پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔ اپنی پسند اور ناپسند بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ لیکن خیر اب تو عادت ہو گئی ہے۔“

”پیسہ جمع کرتی ہیں یا اڑا دیتی ہیں؟“

”ہرگز نہیں اڑا دیتی۔ پیسہ کمانا آسان نہیں ہے پیسہ اڑانا آسان ہے۔ مگر میں یہ آسان کام نہیں کرتی۔ میرے والدین کی تربیت ایسی ہے کہ ہمیں فضول خرچی کی عادت نہیں ہے۔ کیونکہ وقت اور حالات کا

ہی بولتے تھے ”اردو تو مجھے بس ٹوٹی پھوٹی ہی آتی تھی۔ اور جب یہاں آئی تو مجھے بہت مشکل ہوئی، مگر پھر آہستہ آہستہ آئی گئی۔ شروع شروع میں ڈانٹا لگ بولنے میں مشکل ہوتی تھی۔ بہت مشکل سے بولتی تھی۔ مگر زبان ہمیشہ سیکھنے سے نہیں بولنے سے پریشانی کرنے سے آتی ہے۔ سو مجھے بھی آگئی۔ اور اب تو آپ دیکھ ہی رہی ہیں کہ میں کتنی اچھی اردو بول رہی ہوں۔“

”ابتدا میں ہی آپ نے ایک سیریل میں نچھٹو اور ایک سیریل میں ”ینگ ٹو اولڈ“ کیا۔ ڈر نہیں لگا کہ کہیں مخصوص نہ ہو جاؤں۔“

”نہیں بالکل بھی ڈر نہیں لگا۔ کیونکہ سب میرے بارے میں جانتے ہیں۔ یگ ٹو اولڈ تو کردار کا ایک حصہ تھا۔ ہاں اگر میں ابتدا میں ہی اولڈ کردار کرتی تو شاید مشکل ہوتی۔ ”میرے ہم نشین“ میں میں نے یہ رول کیا تھا اور فائزہ حسن نے بھی تو یگ ٹو اولڈ کیا تھا۔ ہاں نچھٹو رول میں ڈر لگتا ہے کہ اگر لوگ پسند کرنے لگیں تو کہیں ایسے ہی رول نہ ملنے لگ جائیں۔ اس لیے ذرا احتیاط کرتی ہوں۔ سبز قدم میں نچھٹو رول ابتدا میں تھا بعد میں وہ پوزیشن ہو جاتا ہے۔“

”نچھٹو رول میں۔۔۔ مقبولیت کے زیادہ چانس ہوتا ہے۔ اور یہ بتاؤ کہ اپنا برہنہ دیکھ کر کیسا لگا؟“

”تقہ۔۔۔ اپنا برہنہ؟۔۔۔ اچھا لگا۔ اچھی لگوں گی برہنہ میں۔ کافی بروڈر اور گرینس فل۔ اور جہاں تک نچھٹو رول کی بات ہے تو ایسا نہیں کہ میں نچھٹو رول بالکل نہیں کروں گی ضرور کروں گی مگر ہمیشہ نہیں کبھی کبھی۔ اور ہاں آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ میری خواہش کہ مجھے ”ساس“ کا رول کرنے کو ملے۔“

”اچھا۔۔۔ ساس کا۔۔۔ کیسی ساس لڑا کا یا مظلوم؟“

”مٹے ہوئے۔ کوئی سا بھی۔ بس ساس کا رول ہو۔“

”میں نے دیکھا ہے کہ آپ زیادہ تر سنسوار قیص یا

مناہین رشتید



”اس سے تو آپ کے نزدیک ڈرامے کے معیار پر بھی برا اثر پڑا ہو گا۔“

”آپ سڑکیں سنسان کروینے والے ڈرامے نہیں بن رہے ہیں۔ لیکن اتنے بڑے بھی نہیں بن رہے۔ لوگ اچھا کام کر رہے ہیں۔ ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ایک جیسا ماحول نہیں رہتا۔ لیکن چونکہ ہم ٹھیٹر کے لوگ ہیں اور ذرا پرانے دور کے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے۔“

”آپ نے کہا کہ سڑکیں سنسان کروینے والے ڈرامے نہیں بن رہے۔ مگر میں اس بات کو نہیں مانتی کیونکہ پہلے نہ صرف ایک ہی چینل تھا بلکہ لوگ بھی

غزالہ بیٹ

”کیسی ہیں آپ۔؟“

”اللہ کا شکر ہے“

”کیا مصروفیات ہیں؟“

”بس آپ کو تو پتا ہی ہے ہم فنکاروں کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں بس وہ ہی مصروفیات میری بھی ہیں۔“

”لوگ آپ کو پسند کرتے ہیں۔ پھر کم کم کیوں آتی ہیں؟“

”میں ایک وقت میں ایک ہی پروجیکٹ کرتی ہوں اس لیے کم کم نظر آتی ہوں۔ اور ایک وقت میں ایک کام اس لیے کرتی ہوں، تاکہ بہت توجہ کے ساتھ کام کر سکوں۔ اور لوگ پسند کرتے ہیں یہ ان کی مہربانی ہے۔“

”جیو بند ہوا کئی پروجیکٹ بند ہو گئے۔“

”جی بالکل۔ بہت برا ہوا جیو کے ساتھ۔ ہمارا سوپ سٹارہ جہاں کی بیٹیاں۔“ بھی اس کی نذر ہو گیا۔ دیکھیں کہ کب یہ آن ایئر ہوتا ہے۔“

”جب جیو کی سزا ختم ہوگی۔ اب کام کرنے کا انداز اور ماحول بہت بدل گیا ہے۔ آپ کو عرصہ آتا ہے یا سب چلتا ہے؟“

”جی۔ واقعی ماحول اور انداز بہت بدل گیا ہے اور یہ بات میں ہی کیا، جتنے بھی سینئر لوگ ہیں سب محسوس کرتے ہیں۔ پہلے وقت میں لوگ محنت بہت کرتے تھے اب ذرا محنت کا فقدان نظر آتا ہے۔ اب سب کو ہر کام کی جلدی ہوتی ہے۔“

”نہیں ہے“
”کہاں جانے کے لیے کبھی سستی نہیں
دکھاتیں؟“

”بازار شاپنگ کے لیے بہت انجوائے کرتی ہوں اور صرف ونڈو شاپنگ نہیں کرتی سچ مچ خریدتی ہوں۔“

”گھر آتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟“
”کہہ میک اپ اتاروں اور فریش ہو کر اپنے بستر پہ چلی جاؤں۔“

”بہت بُرا ————— جب کوئی گہری نیند سے اٹھنا کیسا لگتا ہے؟“

”غصے میں کیا رو عمل ہوتا ہے؟“
 ”کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں۔ رونا دھونا شروع کر دیتی ہوں۔“

”جی۔ بہت شوق سے مناتی ہوں۔ امریکہ میں

پاکستان آئی ہوں، ہر تہوار مناتی ہوں۔ بلکہ جمعہ کا دن بھی خاص اہتمام سے مناتی ہوں اور اس دن خاص طور پر نماز پڑھنے کا بہت مزہ آتا ہے۔“

”اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔“

سہ ورق کی شخصیت

ماڈل ----- علیہ
 میک اپ ----- روز بیونی پارل
 فوٹو گرافر ----- موسیٰ رضا



”ہرگز نہیں۔ میں کیوں اپنی عادت خراب کروں۔ میں تو اپنے حساب سے ہی چلتی ہوں۔ تو اب یہ ہے کہ جب کام اشارت ہونے لگتا ہے اس سے کچھ دیر پہلے مجھے ملانا جاتا ہے۔“

”فیوچر پلاننگ کیا ہے؟ ڈائریکشن یا پروڈکشن؟“
 ”آپ کو پتا ہی ہے میری فیوچر پلاننگ کیا ہے
 انشاء اللہ اس جی او ہی چلائی ہے۔ نہ ڈائریکشن کی

طرف خیال ہے اور نہ ہی پروڈکشن کی طرف۔
 ”جب اواکاری سے زیادہ واقفیت نہیں تھی اس
 وقت کے ڈرامے اس دیکھتی ہو تو کیسا لگتا ہے؟“

”ہی آئی ہے لگتا ہے کہ میں نے بہت برا کام کیا ہے مگر پھر دل کو تسلی ہو جاتی ہے کہ اگر میں نئی تھی تو کیا ہوا۔ ڈائریکٹر تو مجھے ہوئے تھے انہوں نے جیسا کہا

”تم نے کہا کہ تھوڑی سی موٹی ہو جاؤ۔“

اور اب تو پہلے سے کافی بستر ہو گئی ہوں۔ ہر چیز کھاتی ہوں مگر ہڈی کچھ ایسی ہے کہ اس پہ گوشت چڑھتا ہی



رکھا۔ ریڈیو کی وی یا تھیٹر؟
”میں نے پہلا قدم ریڈیو پر رکھا اور اس سیڑھی کو کامیابی کے ساتھ عبور کرنے کے بعد میں نے لی وی کا رخ کیا بلکہ میں نے رخ نہیں کیا مجھے لی وی میں کام کرنے کی آفر دی گئی۔ اور اس کے بعد تھیٹر سے آفر آئی۔ بس پھر ان کا سفر شروع ہو گیا۔ اور آج تک جاری ہے۔“

”آج کل صرف کام ہو رہا ہے یا گھریلو ذمہ داریاں بھی نبھائی جا رہی ہیں؟“
”گھریلو ذمہ داریوں سے بھلا کیسے دور ہو سکتی ہوں۔ عورت کے لیے یہ ذمہ داریاں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ پہلے میں ہی کھانا پکاتی تھی مگر اب بھونے کا کام تک یہ ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ میرے میاں صاحب کو میرے ہاتھ کا پکا بہت پسند ہے۔ اس لیے ان کے لیے اکثر کوکنگ میں ہی کرتی ہوں۔“

مدر شنگ FM-104

”بیلو کیسے ہیں آپ؟“
”جی اللہ کا شکر ہے۔ جو وقت اچھا گزر جائے۔“
”اب ابو ناراض تو نہیں ہوتے کہ کیوں ریڈیو پر پروگرام کرتے ہو؟“
”نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب کچھ نہیں کہتے کیونکہ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرے ابو میرے سب سے بڑے فین تھے تو جب انہیں پتا چلا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ اور کہنے لگے تم کب سے کر رہے ہو پروگرام؟ میں نے بتایا تو کہنے لگے مگر وہ تو کوئی ”رمان“ توڑ کا ہے تو میں نے کہا کہ جی میں ہی ارمان ہوں۔ نام بدل کر اس لیے پروگرام کیا کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔ خیر پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔“
”آپ کا پروگرام تو لایو ہوتا ہے۔ اپنی آواز کیسے سنتے ہوں گے آپ؟“

”میں نے آج تک اپنی آواز نہیں سنی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی آواز سن نہیں سکتا بلکہ سچ

تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اور مجھے کردار میں دراٹی چاہیے ہوتی ہے۔“
”اب تو آپ سچ سچ نالی داوی ہوں گی۔ یہ کردار کیسا نبھائی ہیں۔“
”جی اب تو میں سچ سچ نالی داوی ہوں۔ اور یہ حقیقی رول کس طرح نبھائی ہیں تو یہ آپ کو ———
میرے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ہی بتا سکتے ہیں۔ لیکن وہ ابھی چھوٹے ہیں۔ البتہ میرے بچے آپ کو بتا سکتے ہیں کہ میں کیسی نالی داوی ہوں۔“
”ماشاء اللہ سے کہتے بچے ہیں۔ اور کیا آپ سب مل کر رہتے ہیں۔“

”جی میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ اور تینوں کی شادی ہو گئی ہے بیٹے کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے اور جبکہ ایک بیٹی کے دو بیٹے ہیں اور دو سری بیٹی کی شادی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اور بیٹیاں تو ظاہر ہے کہ اپنے سسرال میں ہوتی ہیں اور ہم اپنے بیٹے کے ساتھ تو یوں سمجھ لیں کہ ہم مل جل کر جوائنٹ فیملی میں رہتے ہیں۔ اور میرے بچے اس فیلڈ میں نہیں ہیں۔“
”اچھا! بچے نہیں ہیں اس فیلڈ میں؟ جبکہ عموماً اگر خاندان کا کوئی ایک فرد اس فیلڈ میں آجائے تو سب کے راستے کھل جاتے ہیں؟“

”ہاں جی ہوتا تو ایسا ہی ہے مگر میرے بچوں کو اس فیلڈ میں آنے کا شوق کبھی ہوا ہی نہیں۔ بیٹیاں ویسے ہی بیباکی گئیں اور بیٹے کو دلچسپی ہی نہیں ہوئی۔ اور پتا نہیں کیوں میرا خود بھی دل نہیں چاہا کہ بچے اس فیلڈ میں آئیں۔ ورنہ میں فورس کرتی تو وہ کیوں نہ آتے۔“
”آپ کا دل کیوں نہیں تھا؟“

”ایک تو میں ان کا رجحان نہیں دیکھتی تھی پھر اس فیلڈ میں محنت اور خواری بہت ہے۔ مجھے تو میرا جنون لے آیا اس فیلڈ میں۔ اگر بیٹے کا رجحان نہیں ہے تو میں کیوں زبردستی کرتی۔ ٹھیک ہے وہ اپنی چھوٹی سی فیملی اور دنیا میں بہت خوش ہے۔“
”سب سے پہلے آپ نے کس سیڑھی پہ قدم

فارغ ہوتے تھے۔“
”کیا مطلب لوگ فارغ ہوتے تھے۔ کیا ہمیں کوئی کام نہیں ہوتا تھا؟“
”ارے نہیں یہ مطلب نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ نہ موبائل فون نہ انٹرنیٹ نہ فیس بک اور نہ ہی Whats کچھ بھی تو نہیں تھا۔ واحد تفریح ڈرامہ ہی ہوتا تھا۔“
”ہاں یہ بات تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس لحاظ سے تو واقعی ہم لوگ فارغ ہی ہوتے تھے مگر پھر بھی ہر دور میں کوئی نہ کوئی مصروفیات نکل ہی آتی ہے۔“
”کتنے سال ہو گئے ہیں آپ کو اس دشت کی سیاحی میں؟“

”یہ اچھا جملہ استعمال کیا آپ نے۔ جناب 1995ء سے اس فیلڈ میں ہوں اور نہ صرف اداکاری کی بلکہ تھیٹر بھی کیا اور ریڈیو بھی کیا۔ ریڈیو کے ڈراموں میں صداکاری بھی کی۔“
”بے شمار کردار کئے کوئی ایسا جس کو کرنے کی لگن ہو؟“

”جوانی سے اداکاری کا آغاز کیا اب بڑھاپے میں قدم رکھ لیا ہے تو ماشاء اللہ سے کردار تو میں نے سب ہی کر لیے ہیں۔ مگر وہ کہتے ہیں ناکہ فنکار کبھی اپنی اداکاری سے مطمئن نہیں ہوتا۔ تو یہی حال میرا ہے۔ مجھے ہمیشہ ہر کردار نیا ہی لگتا ہے۔ اور میں اسی طرح محنت کرتی ہوں جس طرح کوئی ایک نیا فنکار کرتا ہے۔“

”ہوں۔ گڈ۔ جوانی میں بھی اولڈ رول کیسے کیوں؟“

”کیوں کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ شاید مجھ میں جوانی سے ہی بوڑھی روح تھی۔ ایسا نہیں کہ مجھے جوانی والے رول ملتے نہیں تھے بلکہ مجھے خود ہی تنگ رول کرنا پسند نہیں تھا۔ مجھے اچھا لگتا تھا ماں کے اور نانی داوی والے کردار کرتا۔ کیونکہ ان کرداروں میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے کرنے کے لیے جبکہ تنگ کردار

بتاؤں مجھے اپنی آواز بہت بری لگتی ہے اس لیے اپنے پروگرام نہیں سنتا۔“

”لوگوں کو آپ کی آواز پسند ہے۔“
”جی جی۔ بالکل۔ اس لیے تو آج تک پروگرام کر رہا ہوں۔ ورنہ کب کا چھوڑ چکا ہوتا۔ اور یہ میرا خود سے وعدہ ہے کہ جس دن میں نے اپنی آواز سن لی۔ میں پروگرام کرنا چھوڑ دوں گا۔“

”ارے۔ اتنی بری لگتی ہے اپنی آواز؟“
”جی اتنی ہی بری لگتی ہے مجھے اپنی آواز۔“
”اور اپنی کون کون سی عادت بری لگتی ہے؟“

”مجھ میں غصہ بہت تیز ہے اور یہ ایک بری بات ہے۔ ویسے عام طور پر غصہ آتا نہیں ہے مگر آتا ہے تو خالص پٹھانوں والا آتا ہے۔ مگر یہ ایک اچھی عادت ہے کہ جب غصہ آتا ہے تو وہ جگہ چھوڑ دیتا ہوں۔ بالی ایسی کوئی بری عادت نہیں ہے۔“

”کھانے پینے میں خرابی دیکھتے ہیں؟“
”ارے بالکل بھی نہیں۔ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی کبھی ناشکری نہیں کرتا۔ سب کچھ مزے سے کھا لیتا ہوں۔“

”ریڈیو کے علاوہ فوج میں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“

شعاع کے ساتھ ادارہ

جانب سے واپس آکر میں اور ماما دوسرے کھانا کھاتے ہیں، کیونکہ میں اکلوتی بیٹی ہوں پھر نماز ظہر ادا کر کے ماما تھوڑا آرام کرتی ہیں تو میں رسالہ لے کر لیٹ جاتی ہوں اور دوسرے سے سہ پہر تک میں اور میرا رسالہ ہوتے ہیں (جناب جانب لٹنے کے بعد میں اپنی پاکٹ سے رسالہ خریدتی ہوں) پھر رات کے کھانے کی تیاری، ساتھ ساتھ عصر، مغرب بھی ادا کی جاتی ہے آٹھ بجے تک ہم لوگ کھانا کھا لیتے ہیں، مجھے پکانے کا شوق ہے اور میں نئی نئی ڈشز بھی ترائی کرتی ہوں۔ جسے میرے بابا بہت سراہتے ہیں۔ اس دوران ہی سارے گھر والے گپ شپ بھی کرتے ہیں۔

3۔ جی ہاں بہت سی کہانیاں ایسی ہیں جن میں مجھے لگتا کہ یہ میرے کردار کی جھلک ہے جیسے متوسط طبقے کی ساری کہانیاں مجھے لگتی ہیں میرے متعلق ہیں۔ زیادہ تر میں خاموش رہتی ہوں مگر قریبی لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق بھی کرتی ہوں۔ رات کو چھت پر لیٹتی ہوں تو رب کا سنت کے بارے میں سوچتی ہوں۔

تقریباً ساری ہی تحریریں میری پسندیدہ ہیں۔ ہر تحریر میں کوئی نہ کوئی سبق ہوتا ہے پیغام ہوتا ہے ہر تحریر سوچ کے نئے دروا کرتی ہے۔ پیر کامل۔ متاع جاں جنت کے تپتے سدرہ المنتہی، آمنہ ریاض، سائرہ رضا، فرحت اشتیاق، نکتہ سیما، بہت ہی زبردست ہیں البتہ مجھے رخسانہ نگار عدنان بہت بہت پسند ہیں کیا کبھی ان کا انٹرویو شامل ہو سکتا ہے؟

4۔ خامیاں بھی ہیں، خوبیاں بھی ہیں۔ خوبیاں زیادہ خامیاں کم ہیں۔ ابو کہتے ہیں تم کسی کی بات برداشت نہیں کرتیں۔ میرا چھوٹا بھائی کہتا ہے تم اگر ایک دفعہ کسی کو اچھا کہہ دو تو سب کچھ اس پر لٹا دیتی ہو چاہے وہ

سفیل ملک لاہور

1۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ان رسالوں کی دنیا میں قدم رکھے۔ اس کی وجہ ادب کی دنیا سے ناپسندیدگی ہرگز نہیں بلکہ منگانی ہے کیونکہ ہمارے ہاں کبھی کسی فرد کا مکمل سوٹ ایک مرتبہ میں نہیں آیا تو رسالے کہاں سے خریدے جاتے، 60 روپے گز کا کاٹن اور 60 رسالہ (60 کا رسالہ 10 روپے کمیشن لانے والے کے ستر اب تو دینے پڑیں گے) آتا ہے میں جب کے سلسلے میں ایک آفس میں گئی تو وہاں ریک پر رکھے رسالے نظر آئے ان میں شعاع اور خواتین بھی تھے رسالوں کا ناؤلوں کا۔ اخبار پڑھنے کا نشہ تو شروع سے تھا مگر فری میں مل جائے تو کیا بات انتظار کے دوران میں نے رسالہ بھی ختم کر لیا پھر تو جہاں بھی یہ ڈائجسٹ مجھے نظر آتے میں پڑھ لیتی۔ خیر اس میں ایسی بھی شرمندگی کی کوئی بات نہیں کیونکہ میں نے کتابیں بھی ادھار ہی لے کر پڑھا ہے لی اے تک چند کتابیں لے آتی پھر ان کے نوٹس بناتی پھر وہ دے کر اگلی لے آتی ہوں۔ وقت گزر گیا۔ ماما بابا مجھے آپ پر فخر ہے کہ آپ نے ہم چاروں بہن بھائیوں کو اتنی تنگی کے باوجود بڑھایا، لکھایا۔ اللہ پاک آپ کو عمر خضر عطا کرے صحت و تندرستی اور سکون دے آمین۔

2۔ میں صبح سویرے اٹھ جاتی ہوں فجر پڑھنے کے بعد قرآن مجید کی تلاوت پھر آٹا گوند ہتی ہوں۔ اس کے بعد ماما کے ساتھ باہر کھیتوں میں واک کرنے جاتی ہوں۔ ایک گھنٹے کے بعد واپس آتے ہیں تو میں جب پر جانے کی تیاری کرتی ہوں اور ماما پر اٹھ بٹاتی ہیں۔ میں ناشتہ کر کے بھائی اور بابا کے ساتھ ہی نکل جاتی ہوں

ہے اور میں اس میں بہت آگے تک جانا چاہتی ہوں۔
”ہوں۔ گنڈے کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ میں۔ اور شہرت حاصل کرنا بھی جنون میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایسا ہے؟“

”میں 2005ء میں اس فیلڈ میں آئی۔ تھوڑا عرصہ کام کیا اور پھر اسکرین سے عائب ہو گئی۔ کیوں کہ مجھے اپنی میڈیسن کی پڑھائی مکمل کرنی تھی۔ پڑھائی مکمل ہوئی تو پھر واپس اس فیلڈ میں آئی۔ اور شہرت حاصل کرنا جنون نہیں تھا، کیونکہ اگر اچھی پرفارمنس دوں گی تو شہرت تو خود بخود ہی مل جائے گی۔“
”ڈاکٹر بننا خواہشات میں شامل تھا۔ یا بس اچھے نمبر آگئے تو یہ لائن لے لی؟“

”اصل میں میری والدہ ڈاکٹر تھیں اور میرے والد انجینئر۔ ان کی خواہش تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک پروفیشن میں بھی اختیار کروں۔ چنانچہ میڈیسن میں میرے بھراچھے آگئے تو میں نے اس کو دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور ویسے بھی میڈیسن مجھے پسند تھی۔“
”آپنی مصروفیات میں گھریلو ذمہ داریاں بخوبی نبھالیتی ہیں۔“

”حمد اللہ۔ اللہ نے بہت باہمت بنایا ہے۔ گھر کی کوکنگ، سجاوٹ دیکھ بھال، اپنے میاں کا خیال رکھنا سب کچھ کرتی ہوں اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور میں ہی کیا میرے میاں صاحب جو کہ ڈاکٹر ہیں وہ بہت اچھے لگ بھی ہیں، کبھی کبھی بچن کو ٹائم دیتے ہیں تو مزہ آ جاتا ہے۔“
”پیسہ خرچ کرتی ہیں یا بچتے۔“

”جمع؟۔۔۔ جمع کرنا تو میں نے سیکھا ہی نہیں ہے۔ بہت کھلے دل کی ہوں بہت فراخ دلی سے خرچ کرتی ہوں۔ کیونکہ انسان کما کس لیے ہے۔“
”اور فرصت میں کیا کرتی ہیں؟“
”فرصت ملتی ہی کب ہے۔“

☆

”ہماری فیملی میں بزنس کا بہت رجحان ہے۔ تو اس لیے انشاء اللہ فیوچر میں میرا بھی ارادہ بزنس کرنے کا ہے۔ اور اس کے لیے میں انشاء اللہ ایم بی اے ان مارکیٹنگ کروں گا۔“

ڈاکٹر عائشہ گل

”کیسی ہیں ڈاکٹر صاحبہ!“
”جی الحمد للہ۔“

”ڈاکٹر کھلوانا اچھا لگتا ہے یا فنکار کھلوانا؟“
”دونوں۔ کیونکہ میں جنرل فزیشن ہوں یہ اور بات ہے کہ اس فیلڈ میں آکر میں اپنے پروفیشن سے دور ہو گئی ہوں۔ لیکن انشاء اللہ بہت جلد اس فیلڈ میں آکر

پریکٹس کروں گی۔ اور فنکار کھلوانا تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے کیونکہ لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔“
”آج کل کیا مصروفیات ہیں؟“

”میں وہی آپ کو بتاتی ہے۔ بہت زیادہ کام نہیں کر رہی کچھ گھریلو مصروفیات کی وجہ سے۔ لیکن کچھ ہیں پروجیکٹ اینڈ رپورڈ کشن جو انشاء اللہ جلد ہی آن ایر ہوں گے۔“

”ڈاکٹری پڑھتے پڑھتے شوز میں آنے کا خیال کیسے آگیا؟“

”شاید اداکاری کے لیے ہی میرے رب نے مجھے پیدا کیا تھا اس لیے مجھے اتنی کامیابی ملی۔ آکر میں اس فیلڈ میں کامیاب نہ ہوتی تو یقیناً واپس اپنی فیلڈ میں آجاتی۔ مگر ناظرین نے مجھے بہت محبت دی۔“
”صرف اداکاری تک محدود رہیں آپ یا کچھ اور بھی کیا؟“

”میں نے اداکاری کی فیلڈ میں سب کام کئے، سوائے پروڈکشن اور ڈائریکشن کے۔ میں نے فلم میں بھی کام کیا۔ کمرشل ماڈلنگ اور میگزین ماڈلنگ بھی کی اور ریمپ پہ بھی اور کیٹ واک بھی کی۔ اور ڈراموں میں اداکاری چل رہی ہے بلکہ سوائے کیٹ واک کے باقی تمام کام چل رہے ہیں۔ یہ فیلڈ میرا جنون

دین

ستمبر 2014 کا شمارہ شائع ہو گیا

❖ "قصید ہاری خان" سے شمعین رشید کی ملاقات

❖ "ہر وہ لائق" کہتی ہیں "میری ہنس سنہ"

❖ اس ماہ "صدف منظر" کے "مقابلہ آئینہ"

❖ "آواز کی دنیا سے" اس ماہ "صارم خان" سے ملاقات

❖ "نیر سید کا سطلے وارنل" "اک ساک ہے زندگی"

❖ "شام آرزو" فرمان نازک کا سطلے وارنل

❖ "دل اک شعر مال" چیدک کا سطلے وارنل

❖ "نیری جسنو میں" فوزیہ یاسین کا سطلے وارنل

❖ "ملن کی ساعتیں" مصباح نوشین کا دلچسپ ناولٹ

❖ "میں دل میں مسافر" رفاقت جاوید کا ناولٹ

اختتامی مراسلے میں

❖ عطیہ مظہر، سید عثمان، فرح طاہر اور مہا جاوید کے افسانے

اور مستقل سطلے

اس شمارہ کے ساتھ کرن کتاب

مجموعہ نثر و نثری نثری کرن کتاب

"رسم و رواج اور تہوار"

کرن کے ہر ماہ کے ساتھ ملو، یہ وقت حاصل کریں

بارش کی بنیاد میں جانے کس کے اتنے آنسو ہیں
صدیوں پہلے شاید کوئی صدیوں بیٹھ کے رویا ہے
5۔ پسندیدہ اقتباس کافی ہیں مگر یہ بہت پسند ہے۔

"دنیا کی مثال اندھیرے کی طرح ہے اور دین کی
مثال روشنی جیسی ہے اور ہمیں آگے اندھیرا اس لیے
نظر آتا ہے کیونکہ ہم دنیا کو آگے رکھنے کے عادی ہیں
اور جب دنیا ہمیں روکتی ہے تب دین یاد آتا ہے تو
بات یہ ہوتی ہے ہم دنیا کے اندھیرے سے تھک کر اپنے
اللہ کے پاس آتے ہیں اور پھر کچھ عرصے بعد دوبارہ دنیا
میں کھو جاتے ہیں استقامت نہیں ملتی ہمیں۔ کیونکہ
ہمارے اعمال میں اخلاص نہیں ہے۔"

ایسا کچھ خاص تو اپنا کردار نہیں محسوس ہوا کبھی کسی
میں ہاں۔ ہر وہ لڑکی جو حساس ہو، محنتی ہو اور ہم

لڑکیوں کے خیر تو گندھتے ہی محبت سے ہیں۔ بس
سارے کردار اپنے اپنے سے لگتے ہیں۔ پسندیدہ ناول
بہت ہیں۔ مجھے مطالعے کا شوق ہے اس لیے کتابیں
بہت بڑھی ہیں۔

دل کی دنیا بدلنے والا پیر کامل ہو یا پروین شاکر کی ہجر
میں ڈوبی شاعری سب بہت پڑھا ہے۔ پسندیدہ شعر بھی
بہت ہیں۔ بس ایک لکھ رہی ہوں میرا انتخاب کیسا
لگا۔ ضرور بتائیے گا۔

سلجھا ہوا سا فرد سمجھتے ہیں مجھ کو لوگ
الجھا ہوا سا مجھ میں کوئی دوسرا بھی ہے

نور سحر... چونیاں

(1) : شعاع سے وابستہ ہوئے قریباً ایک دہائی کا
عرصہ گزر چکا ہے اور یہ صرف وابستگی نہیں رہی
دلہستگی بن چکی ہے اور اس حوالے سے دلچسپ
واقعات تو بہت ہوا کرتے تھے جب زندگی دلچسپ ہوا
کرتی تھی اب تو۔

انہیوں کا دور ہے اور ہم ہیں دوستو
بائبل کے آگن میں جب ہوا کرتے تھے تو شعاع
پڑھنے کی منگوانے کی اتنی جلدی ہوتی تھی کہ کئی بار

نماز اور اس کے بعد تلاوت! میں تدریس کے شعبے
سے وابستہ ہوں تو نماز وغیرہ سے فارغ ہو کے بس اپنے
لیکچر دیکھ لیے اور مہتمس کی اسائنمنٹس وغیرہ (مجھے
کوئی عمر سیدہ خاتون مت سمجھا جائے میں بیس سال
کی ہوں) پورا دن ویسے ہی گزرتا ہے جسے کوئی طالب
علم یا لیچر گزار سکتا ہے بڑھائی، لیچر ز اور بکس مشام میں
یوشنیز، اپنی مصروفیات کی وجہ سے میں گھر کا کام نہیں
کراتی۔

(بقول بہنوں کے مہمان جو ٹھہری) ہاں رات بس
میری اپنی ہوتی ہے ایگزیزیز سے پہلے تو بڑھائی کی ٹینشن
ہوتی تھی اب راوی چین ہی چین لگھتا ہے۔ بس
جواب اور دیگر مصروفیات اور دن رات کی اسی کشمکش
میں وقت بہت تیزی سے پر لگائے اڑ رہا ہے۔

رسالوں کے لیے ٹائم میں نکال لیتی ہوں رات کو
جب بہت دیر تک جاگوں یا پھر کالج میں بھی۔ بشرطیکہ
بڑھنے کا موڈ ہو۔

3۔ خامیوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہے میری ذات
زیب کتنی ہے تم دل کی بہت اچھی ہو! ہاں بد لحاظ
ہو جاتی ہو۔ (اب جب سامنے بندہ ہی ایسا ہو تو؟؟)
ہاں میری اپنی نظر میں میں جذباتی ہوں کچھ ٹھہراؤ
نہیں ہے میرے اندر اور میں اپنی ذات کے بارے
میں لا پرواہ بہت ہوں خوبیاں یہ کہ محنتی ہوں اور بھی
ہوں گی ڈھیر ساری!

تعریفی جملے بہت سارے ہیں جو میرے لیے سرمایہ
ہیں اسپیشلی مہتمس کے حوالے سے میری
ٹیچنگ کے حوالے سے۔

ابو کہا کرتے تھے "شعاع بہت اچھی بیٹی ہے۔"
بارش مجھے نہیں پسند ہاں جب ضرورت ہو تب
دل کرتا ہے بارش ہو ویسے نہیں۔ عجیب سیلن سی
ہو جاتی ہے ہاں یاد گار واقعہ جب میں اور زہنبہ برستی
بارش میں اکیڈمی سے گھر آئے تھے وہ سارے لمحے
بچپن کے جو تیلی بن کے اڑ گئے ہاں ان کے رنگ آج
بھی تھیلیوں پر ہیں۔

تمہیں نقصان ہی پہنچائے۔ البتہ بھی کبھی میں غلط نہ
بھی ہوں تو خاموشی سے غلطی کو اپنے کھاتے میں ڈال
لیتی ہوں۔ جلدی معاف کر دیتی ہوں کیونکہ میں لڑائی
جھگڑے بھول جاتی ہوں ہمیشہ منانے میں پہل کرتی
ہوں۔ کام آنے والی ہوں بغیر کسی غرض کے میری ماما
میری بہترین دوست ہیں ہر چھوٹی بڑی بات ان سے
کہہ کر مطمئن ہو جاتی ہوں۔

5۔ بارش ہمیشہ سے ہی اچھی لگتی ہے اور بارش کو
انجوائے بھی کرتی ہوں اگر جاب بر نہ ہوں تو پکوڑے یا
سموسے ضروری بناتی ہوں۔ بارش میں بھیگنا ہوا کے
ساتھ رقص کرنا اچھا لگتا ہے۔ جب ٹھنڈی ہوا گالوں

کو چھو کر گزرتی ہے تو اک سکون سا محسوس ہوتا ہے۔
6۔ بہت سارے شعر یاد ہیں یہ شعر میٹرک میں
میری ٹیچر نے میری ڈائری پر لکھا تھا۔

رنگتے ہیں جو اوروں کے لیے پیار کا جذبہ
وہ لوگ بھی نوٹ کر بکھرا نہیں کرتے

شبنم شمشاد۔ یزمان

بہادر کے پیار سے شہر یزمان سے تعلق ہے تو
اس حوالے سے شہر یزمان بہت خوش قسمت ٹھہرا
(بھئی! میں جو ہوتی ہوں وہاں)

جہاں تک شعاع سے وابستگی کا تعلق ہے تو وہ تو
شاید بچپن سے ہی ہو گئی تھی تب جب لفظ بڑھنے تو
آتے تھے لیکن ان میں چھپی تلخ حقیقتوں کا ادراک
نہیں تھا۔ کچھ اپنی طبیعت کی وجہ سے میں باقاعدگی
سے نہیں پڑھتی لیکن "کوئی لمحہ گلاب ہو" سے لے کر
"صحف" تک باخبر ضرور رہتی ہوں۔ سردیوں کی خشک
راتوں میں اور گرمیوں کی گرم دھوپوں میں یہی تو ہے
مشغلہ اپنا!

صبح کا آغاز تو ابوجی کی آواز سے ہوتا تھا لیکن 4 مئی
کو ایک خوفناک حادثہ انہیں ہم سے بہت دور لے گیا۔
اللہ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)
اب یہ سیٹ ای نے سنبھال لی ہے وہ روایتی سی صبح

ایسا ہوا کہ اگلی قسط جاننے کی بے چینی میں نیا مہینہ شروع ہونے کے پہلے ہی دن کسی کام والی یا کسی بچے کو نیا شعل لے لے بھجنا تو نیا شمارہ نہ آیا ہونے کی صورت میں دکاندار نے پیسے بڑھ کر پچھلے مہینے کا شمارہ ہی تھما دیا کرنا تو شعل کے کئی شمارے ایک ہی مہینے کے ڈبل ڈبل آجایا کرتے تھے اب تو تقریباً "یہ حال ہے کہ اپریل کا شمارہ جولائی میں اور جولائی کا شمارہ میں پڑھ رہے ہوتے ہیں بلکہ تازہ ترین واردات تو یہ ہے کہ شعل پڑھنے پر پابندی کتاب پکڑنا جرم شاعری لکھنا پڑھنا کسی پرانے عاشق کو یاد کرنے کی کوشش ٹھہرتی ہے سو یہ بھی دلچسپ واقعہ ہی ہوا ناں؟

(2) : صبح کا آغاز حق بندگی ادا کرنے کی کوشش سے ہوتا ہے۔ اس میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں یہ علم نہیں لیکن کوشش کرنا ہی ہمارے بس میں ہے اور اس کی ہمیں ترغیب دی گئی ہے جیسا کہ سورۃ بنی میں فرمان باری ہے۔

"اور جو شخص آخرت کی بھلائی چاہتا ہو اور اسی کے لیے جیسے کوشش کرنا چاہے دے دے کوشش کرے اور ایماندار ہو تو ایسے لوگوں کی کوشش خدا کی بارگاہ میں قبول ہوگی۔"

نماز تلاوت ذکر ازکار کے بعد کچھ دیر باہر کی ٹھنڈی فضا میں چل قدمی کرتی ہوں۔ اس کے بعد حقیقی خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجازی خدا کے احکامات کی تعمیل میں جو دوڑیں لگتی ہیں تو تب تک پہلا پیرو گزر کر دوپہر ہونے کو ہوتی ہے۔ صاحب بہادر کی رخصتی عمل میں آنے کے بعد سے ان کی واپسی تک کے چند گھنٹے کسی حد تک میرے اپنے ہوتے ہیں آزادی کا لٹکا سا احساس رہتا ہے شام تک کام بھی وہ سارے نمٹاتی ہوں جو شادی شدہ زندگی کا حصہ ہوتے ہیں۔ شعل کے لیے وقت تب نکلتا ہے جب اپنی گمشدہ جنت اپنے باپل کے دیس اپنی اماں کے آگے میں قدم رکھتی ہوں تب میرا سارا وقت میرا اپنا ہوتا ہے۔ گزشتہ مہینوں کے شعل و خاتین پڑھتی ہوں

کتابوں کا مطالعہ کرتی ہوں ڈائری لکھتی ہوں مہینوں کے ساتھ باتیں کہانیوں پر تبصرے کرتی ہوں بہت زیادہ اور اونچی آواز میں ہنسی ہوں اور ماں کی گود میں سر رکھ کر روتی ہوں۔

میرے مخلص اور سچے دوستوں میں میرا خدا میری ماں اور میرا شعل خدا تو ہے ہی صبور اور رہنما۔ ماں آنسو پونچھ کر پیار کرتی ہیں دعا دیتی ہیں تو شعل جیسے کی نئی راہیں دکھاتا ہے نئے حوصلے بخشتا ہے اپنے اور اقی پر بکھری مثالیں پیش کرتا ہے تو اس کے کردار اپنی زندگی کا حصہ محسوس ہوتے ہیں۔

(3) : نگہت سیمامیری پسندیدہ مصنفہ ہیں ان کی تقریباً "ہر تحریر یاد رہتی ہے محبت کی دھیمی دھیمی آواز اچھی لگتی ہے ان کی تحریروں میں خوب صورت آنکھوں گندی رنگت اور لابی انگلیوں والے آرٹسٹک ہاتھوں والی ہیروئن سب سے جدا ہے۔ یہ ہی نہایت حسینہ جلیلہ اور نہ ہی بہت بد صورت ہوتی ہے۔ خدیجہ علیزہ اور ارباب فاطمہ کی طرح اور سب سے بڑھ کر جذبہ حب الوطنی اپیل کرتا ہے اس حوالے سے ان کی تحریر "جس دھج سے کوئی مقل میں گیا" بہت خوب اور یادگار تحریر تھی۔

سعدی حمید چودھری کی تحریروں میں آتش عشق میں سلگتی لڑکی سے بہت اپنا پن محسوس ہوتا ہے میں جتنا زیادہ سعدی کو پڑھنا چاہتی ہوں وہ اتنا ہی کم لکھتی ہیں "سب مایا ہے ہمیشہ یاد رہے گی یہ کہانی۔" مجھے جلا کر بھسم کر دینے والا عشق اٹریکٹ کرتا ہے۔ سب مایا ہے اور عشق آتش (کنیز نبوی) میں بیان کیے گئے عشق کی طرح کا۔

کیوں کہ میرے خیال بھی اس شعر کے شاعر کے جیسے ہیں۔

اگر دل ہار ہی بیٹھے میرے ہم دم محبت میں جزا کیسی سزا کیسی فنا کیسی بھا کیسی

سعدیہ عزیز آفریدی بہت منفرد لکھتی ہیں ان کی زیادہ تر تحریروں حقیقی رشتوں کی محبت کی چاشنی میں

گندھی ہوئی ہیں جیسا کہ اماں کا شفو بہت زبردست تحریر تھی گو کہ اماں کا شفو۔ جیسے کردار حقیقی زندگی میں کم پایا ہیں مگر نایاب نہیں کہ یہ معاشرہ ان ہی جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی قائم ہے۔

سعدیہ عزیز اور سعدی حمید دونوں فلسفہ بہت زبردست لکھتی ہیں۔

مکمل طور پر اپنی جھلک کہیں بھی نہیں دکھی مگر کسی نہ کسی کردار میں کوئی نہ کوئی بات یا علامت اپنی ضرورت دکھ جاتی ہے کیوں کہ یہ کہانیاں بھی ہم ہی لوگوں کی ہوتی ہیں کہ۔

انسانوں کی دنیا میں سب جھوٹ نہیں ہوتا۔

(4) : یہ سوال خاصا مشکل ہے جس کا آسان ترین جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ ہلہاکی جاناں میں کون؟ (اپنی خوبیاں خامیاں خود جتنا آسان تو نہیں ناں!) بہر حال کچھ نہ کچھ جواب دینے کی کوشش کرتی ہوں۔

لوگوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے وقوف بن جاتی ہوں اکثر آنسو میری کمزوری ہیں۔ کسی سے لڑائی ہو جائے تو دل میں غصہ رکھ کر اسے بلا نہیں سکتی دل میں زہر بھر جاتا ہے اس کے خلاف پھر بولنا تو دور کی بات اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی کہ میرے لیے۔

منافقت کا نصاب پڑھ کر محبتوں کی کتاب لکھنا بہت کمٹن ہے خزاں کے ماتھے پر داستان بہار لکھنا

پراچھی چیز یہ ہے کہ نفرت میرے دل میں زیادہ ٹھہر نہیں پاتی۔ غصہ ختم ہو جائے تو صلح کرنے میں پہل کرتی ہوں اکثر معاف کر دیتی ہوں غلطی میری ہو تو احساس ہو جانے پر معافی مانگ بھی لیتی ہوں پھر انا کا مسئلہ نہیں بناتی! بچوں سے کتابوں پھولوں خوشبوؤں شاعری سے فطرت کی رنگینیوں سے پیار ہے۔

انسانوں سے نہیں انسانیت سے پیار ہے۔

(انسانوں میں اگر انسانیت نہ ہو تو ان سے پیار کیا بھی نہیں جاسکتا)

میرا اللہ یہ ہے کہ لوگ مجھ سے خوش نہیں رہتے یا یوں کہنا بہتر ہو گا کہ میں لوگوں کو خوش نہیں رکھ پاتی

میرے رشتہ دار اور دوست احباب (جو کہ نہ ہونے کے برابر ہیں) بھی مجھ سے ٹاللا ہیں جس کی وجہ میرے خیال میں تو یہ ہے کہ میں کہہ دیتی ہوں (کننے نہ کننے والی ہر بات) اور آج کے دور میں کہہ دینا ناقابل معافی جرم ہے کہ تو نے سچ بولنے کی جرأت کی یہ بھی تو ہیں بے عدالت کی قتل صرف جان سے مارنا ہی تو نہیں ہو گا۔ قتل لفظوں کے تیروں سے لہجوں کی تلواروں سے رویوں کی برجھیوں سے بھی تو ہوتا ہے سوز و جیت ہیں روز مرتے ہیں۔

یہ پتھروں کا دور ہے رت ہے صلیب کی جن کو ہوسر عزیز وہ ہٹ جائیں راہ سے تعریفی جملہ؟

بہن کی منہ کے میرے بارے میں یہ الفاظ (جو انہوں نے میری متوقع سسرال کے بارے میں سن کر میری ہنسا کے تھے)

"سچے موتی جیسی تمہاری بہن اور تمہارے ابو اسے کہاں پھنسا رہے ہیں وہ لوگ (موجودہ سسرال) تو اسے دیول دیں گے۔"

یہ تعریف سن کر اچھا بھی لگا تھا اور دکھ بھی ہوا تھا (کہ ان کا تجزیہ درست ثابت ہوا) پر مجھے کسی سے شکوہ نہیں کہ یہ فیصلے تو کہیں اور ہوتے ہیں۔

کوئی تو فیصلہ کرتا ہے پتھر کے مقدر کا کے ٹھوکر پہ رکھنا ہے کے بھگوان ہوتا ہے

(5) : ساون اور ررم جھم برسات کا موسم مجھے بہت پسند ہے۔ برسات میں جب سیاہ گھاؤں کے ایک دم سے آکر نیلے آسمان کو ڈھک لینے کے نتیجے میں جو خوفناک سا اندھیرا چھا جاتا ہے ہر طرف اس سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے وہ پراسرار تاریکی میرے دل میں خوف اور بے چینی بھر دیتی ہے میں تب تک بہت مضطرب رہتی ہوں جب تک بارش رُک نہ جائے یا مطلع صاف نہ ہو جائے۔

تیز ہواؤں اور شوریدہ سر آندھیوں والی طوفانی مارش اچھی نہیں لگتی۔ دھیمی اور خاموش بارش اچھی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، ہائر مل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہر اک گھر پہ مسلط ہے ویرانی دل کی
سارے شہر پہ سایہ میرے مکان کا ہے
اب بیاخیز شعر ان لوگوں کے نام، میں جن کی
توقعات پر پورا نہیں اتر پاتی اور انہیں مجھ سے بہت
شکوتے ہیں۔

جو ہو سکے تو بھلا دینا رنجشیں دل کی
کہ محبتوں کا تقاضا ہے درگزر کرنا
تیرے طرز تعارف سے کیا لگے ہم کو
ہمیں آتا ہی نہیں دلوں میں گھر کرنا

پسندیدہ کتابیں بہت سی ہیں مگر سب سے زیادہ
قرآن مجید ہے جو کہ سب سے بڑھ کر بھی ہے۔ وہ نسخہ
کیسا جو نشان منزل ہی نہیں بلکہ مکمل ضابطہ حیات
بھی ہے جس کو جتنا سمجھ کر اور گہرائی سے پڑھا جائے
اس فانی دنیا سے دل اتنا ہی اچاٹ ہوتا جاتا ہے اور اس
پر ہی عمل کر کے دنیا و آخرت میں سرخرو ہوا جاسکتا
ہے۔ اقتباسات بھی اسی کتاب ہدایت میں سے۔

”مال اور بیٹے دنیاوی زندگی کی آرائش ہیں اور
تیرے پرووگار کے نزدیک باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں
تو اب میں اور بہتر ہیں آرزو رکھنے میں۔“ (سورۃ کف)

”اور اگر اللہ بندوں کو ان کی نافرمانیوں پر جھٹ پکڑ
لیا کرے تو زمین پر ایک جاندار باقی نہ چھوڑے مگر وہ ان
کو ایک مقررہ وعدے تک مہلت دیتا ہے جب ان کا
وقت آن پہنچتا ہے تو ایک لمحہ آگے یا پیچھے نہیں ہو
سکتے۔“ (سورۃ نحل)

”اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اللہ کی رحمت
سے ناامید وہی ہوتے ہیں جو منکر ہیں۔“ (سورۃ
یوسف)

”جو کوئی اللہ سے ڈرے اور صبر کرے تو اللہ نیک
لوگوں کا حق برباد نہیں کرتا۔“ (سورۃ یوسف)

☆

لگتی ہے جس میں بوندوں کے ٹپ ٹپ کے سوا کوئی
آواز نہ ہو (گویا محبوب کے ہجر میں کوئی آنکھ برس رہی
ہے) سادوں رت کے حوالے سے چند سال پہلے کی
ایک خوب صورت یاد دل پر نقش ہے۔ وہ میرا جنم دن
تھا جب اس بات پر کہ ”آج کسی کو میری سالگرہ یاد
نہیں“ یا ہر برسات اور اندر میری آنکھیں برس رہی
تھیں دل اداسی سے بھر رہا تھا کہ چپکے سے میرے پیچھے
آکر میری ہنوں نے ایک دم شور مچا دیا ”بھئی برتھ
ڈے ڈیز سسٹر“ اور ساتھ ہی دونوں نے اپنا اپنا تحفہ
مجھے پکڑ لیا۔ جب میں نے ان گفتگوں کو گھولا تو وہ
خوب صورت ناول ”بار و فدا اور میرے دل میرے مسافر“
ہاتھوں میں تھے۔ بہت سر پرانگ تھا یہ سب
میرے لیے بہت اچھا لگا تھا ہنوں کا سالگرہ یاد رکھنا اور
اتنی بہترین کتابیں تحفے میں دینا۔ جبکہ اس کے کچھ دیر
بعد بارش میں نہانا اور اک دو بجے کے پیچھے بھاگنا بھی یاد
آ رہا ہے۔ بے انت خوشی کے انمول لمحے تھے جو بیت
گئے کبھی نہ لوٹنے کے لیے وقت گزر جاتا ہے وقت
گزر رہا ہے پر ذہن و دل پر وہ نقش یادیں سنبھال رکھی
ہیں کسی قیمتی سرمائے کی طرح۔ نہ وہ عمر لوٹ سکتی ہے
نہ ہی گزرے ہوئے سادوں کے وہ دن پر تصویر کی
صورت وہ یاد محفوظ ہے ذہن کے البم میں۔ جب جی
چاہا نکال کر دیکھ لی۔

بھلے چھین لو مجھ سے میری جوانی، مگر مجھ کو لوٹا دو
بچپن کا سادوں وہ کانڈ کی کشتی وہ بارش کا پانی
(6) : پسند کے شعر تو بہت سارے ہیں لیکن ابھی
لکھے تو نہیں جاسکتے سو یہ چند ایک حاضر خدمت ہیں۔
جو پسندیدہ ترین کی لسٹ میں سے ہیں۔

ہمارا تذکرہ چھوڑو ہم ایسے لوگ ہیں جن کو
نفرتیں کچھ نہیں کہتیں وفائیں مار دیتی ہیں

کیا ضرر کیا فائدہ کچھ رکھا نہیں حساب کبھی
عمر بھر اس دل کو لا حاصلی اچھی لگی

ماؤں کے لئے اور بچوں کی بہولت موجود ہے
مٹے اور پرانے دنوں کی یادیں اور خوشی کی جاتی ہے
دکان گریو کے لئے اور بچوں کی بہولت موجود ہے



رخسانہ نگار عدنان

گیتھی

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشری ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشری کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشری اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلیٰ بیٹا بہو سے لگاوت رکھتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشری کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ بیانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشری کی مند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشری دو لہا نظیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل نظیر کا بشری کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشری اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشری اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشری کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ذکیہ کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔

عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔ اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی



رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشری سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لائے کو کتا ہے۔ حمیدہ خالہ عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زہیر کا کیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زہیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے۔ مسودہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور وہیں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر سوا اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشری کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارش ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آ جاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زہیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفروز ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم عاصمہ کو ایک مکان دلایا ہے۔

بشری اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشری کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشری سے جھگڑتا ہے۔ بشری بھی بہت دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشری کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشری بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پراچا کوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چٹخیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی

جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔ انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بھگا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل مثال کو لے جائے تاکہ وہ بشری کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

انسپکٹر طارق ذکیہ بیگم سے بشری کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں مگر بشری کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ ایک پراسرار سی عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے وار رہنے لگتی ہے۔ وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جاوٹوئے والی عورت لگتی ہے۔ عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال پاتی ہے۔

بشری کا سابقہ منکبتر احسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔ وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشری سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آ جاتا ہے اور دوبارہ بشری سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشری تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشری اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشری قطعی نہیں مانتی پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ سیفی کے ابتدائی پندرہ دنوں میں مثال بشری کے پاس رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ مگر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔ بشری کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زمین تنگ بشری

اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تارخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک نشی ٹنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آ کر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً پوش امیریا میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کونجنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا ہے۔ اسے مثال بہت اچھی لگتی ہے۔ مثال واثق کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔

عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اریشہ اور اربہ کو اپنے بیٹوں وقار و قاسم کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور واثق بہت خوش ہوتے ہیں۔ مثال کو نیند میں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اسے گھسیٹ رہا ہے۔

انیسویں قسط

وہ بہت خاموشی سے گھر کے کاٹھ کباڑ سے اٹے اسٹور بنے کمرے کی صفائی میں جتی ہوئی تھی۔ اس نے سارا بھاری ہانکا کاٹھ کباڑ کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔

اسے یاد تھا۔ مرنے سے کچھ ماہ پہلے عفت نے نسیم کو اس چھوٹے سے ایک کھڑکی والے تنگ کمرے میں شفٹ کروا دیا تھا۔

”پی! آپ کا کمرہ ہمارے بیڈ روم سے کافی فاصلے پر ہے جبکہ یہ کمرہ ہمارے بیڈ روم کے پیچھے ہے لیکن قریب ہے۔ رات میں آپ آوازیں دیتی رہتی ہیں اور مجھے پتا نہیں چلتا۔ اس کمرے سے مجھے آپ کی آواز صاف سنائی دیا کرے گی۔ میں نہ سنی عدیل تو سن ہی لیا کریں گے۔“ عفت نے بہت چالاکی اور صفائی سے نسیم کا کشادہ کمرہ پر کی کو دیتے ہوئے عمر رسیدہ ساس کو یوں طریقے سے بہلایا تھا۔

یہ الگ بات کہ نسیم کی آوازیں تو کیا دن میں بھی گھر کے افراد کم ہی سن پاتے تھے۔ سن بھی لیتے تھے تو ان سنی کر دیتے تھے۔

مثال جن دنوں یہاں ہوتی وہ نسیم کی فل ٹائم اینڈنٹ ہوتی تھی۔ نسیم کی دیکھ بھال کی وجہ سے اکثر عفت اس سے بہت سے کام نہیں کہہ پاتی تھی۔ نسیم کو پرانی باتیں دہرانے اور دہراتے چلے جانے کی عادت تھی۔ جن میں مثال کی ماں کی باغی طبیعت اور فساد فطرت جیسے بھولے بسرے سارے فسادے ہوتے تھے جنہیں مثال کے لیے سننا مشکل ہوتا۔ مگر وہ کان لپیٹے کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی رہتی۔

اسے آج رات بھر سوچ سوچ کر اپنے باپ کے گھر میں رہنے کے قابل ہی کرا لگا تھا۔

جب وہ پندرہ دنوں کے لیے آتی تھی تو عفت اسے کبھی برآمدے میں سلا دیتی، کبھی اوپر والے اسٹور میں۔ کبھی عدیل کے سامنے دکھاوا کرتا ہوتا تو پری کی منت کر کے اسے پری کے کمرے میں میٹرس لگا کر سونے کی اجازت مل جاتی۔

اور انیال تو مثال سے عداوت کے معاملے میں بہن سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ وہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں سب گھر والوں سے الگ مزاج کا تھا۔

انتہائی غصیلہ خود غرض، ضدی اور جھگڑالو، بس سے پنگا لینے کی ہمت عفت میں بھی نہیں ہوتی تھی۔
عدیل کے سامنے وہ کچھ دبا رہتا۔ کم گوارا لائق۔

اس کے کمرے میں جانے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ وہ پری اور ماں کو بھی اس جرات پر رگید کر رکھ دیتا تھا
چوہہ پندرہ سال کا لڑکا اس پورے گھر میں دہشت کی علامت تھا۔ صرف یہی ایک کمرہ تھا جو نچلے پورشن کے بالکل
اختتام پر تھا اور گھر میں فالتو تھا۔

”کنا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔ کیوں آتے ہی گھر میں اٹھاؤنگا دی ہے تم نے۔ کیا ان کے گھر سے کوئی ڈراؤنا
خواب دیکھ کر آئی ہو۔“ اور تن دی سے دیواریں جھاڑتے مثال کے ہاتھ وہیں ٹھک کر رک گئے۔
عفت نے کتنا درست اندازہ لگایا تھا۔

ڈراؤنا خواب ہی تو تھا وہ سب جسے وہ بھلا دینا چاہتی تھی۔ لیکن کیا ایسا ممکن تھا۔ شاید کبھی نہیں۔
”ٹھیک کہا آپ نے بہت ڈراؤنا خواب دیکھا ہے میں نے۔“ وہ پھر سے اطمینان کے ساتھ دیواریں جھاڑنے
لگی۔

”کیا مطلب؟“ عفت اس کے لہجے پر ٹھٹکی۔
”داؤ آئی تھیں میرے خواب میں۔“ وہ اب دروازہ اور کمرے کی اکلوتی کھڑکی کو پوری طاقت کے ساتھ جھاڑ
رہی تھی۔

ایک تو اس کے ساتھ بڑے بڑے تین سیاہ بیگ دیکھ کر ہی وہ خوف زدہ ہو گئی تھی، اوپر سے اس لڑکی کے انداز!۔
”کہہ رہی تھیں۔ تم لوگوں نے میرے کمرے کو کباڑ خانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں اس کمرے میں تھوڑی بہت
جتنی بھی ہو سکتی تھی اللہ کی عبادت کیا کرتی تھی۔ اس کباڑ کی وجہ سے وہ بھی مجھ تک نہیں پہنچ پا رہی۔“ مثال
پوری سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔

عفت کی آنکھوں میں ابھرنے لگی۔
”کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔“ وہ جھلا کر اس کے دروازے کے پاس پڑے ہوئے خوب پھولے بیگوں کو پاؤں کی
ٹھوکر سے چپک کرتے ہوئے کوفت سے بولی۔

”داؤ کی عبادت اس کمرے میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا۔ داؤ نے خواب میں
آکر میری منت کی ہے کہ جب تک یہ کمرہ خوب صاف نہیں ہو جاتا، اس میں کوئی بیسرا۔ آئی مین۔ کوئی رہنے
نہیں لگ جاتا۔ ان کی عبادت یہیں پھنسی رہے گی اور اس کا ثواب بھی انہیں نہیں مل سکے گا اور وہ ہماری اس
سستی کی وجہ سے ہو سکتا ہے عذاب میں ہوں۔“

عفت کا جی چاہا اسے دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالے۔
”کمینی نے کیسی کہانی گھڑی ہے عدیل تو اس کو اس پر فوراً ہی ایمان لے آئے گا۔“

ابھی تک وہ ماں کو یوں یاد کرتا تھا جسے وہ ابھی بھی موجود ہوں۔
”یہ تھیلے بھر بھر کر سامان کیوں لے کر آئی ہو؟ کیا ماں نے دھکے دے کر نکال دیا ہے ہمیشہ کے لیے۔“ عفت
بہت دیر تک اپنے تجسس کو چھپانہ سکی۔

”ایسا ہی ہوا ہے اس بار۔“ مثال نے گہرا سانس لے کر تنقیدی نظروں سے صاف دیواروں، دروازے اور
کھڑکی کو دیکھا۔ فرش پر اب صرف دھلائی کا کام رہ گیا تھا۔ پھر یہ کمرہ مکمل طور پر اس کو اپنانے کے لیے تیار تھا۔
”آپ اتنی اچھی ہیں اتنی مہربان اور خیال رکھنے والی۔ میں جہاں بھی جاتی ہوں۔ آپ کی نیک طبیعت کا

چرچا کرنے سے خود کو روک نہیں پاتی۔“ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔
عفت کو اس پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ مگر ابھی وہ برداشت کرنا چاہتی تھی۔
”تم یہ سب کیوں لے کر آئی ہو؟“ وہ دانت پیس کر بولی۔

”ممانے مجھے اپنے شوہر کے گھر سے نکال دیا ہے۔“ وہ چہرے پر زمانے بھر کی مظلومیت سجا کر بولی۔
”کیونکہ میں نے ان کے منہ پر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ آپ سے اچھی تو میری عفت ممانے جو میرا بہت
خیال رکھتی ہیں اور وہ مجھے اپنی پری سے بڑھ کر چاہتی ہیں اور اہمیت دیتی ہیں تو میری سکی ماں کو جیسے آگ لگ گئی۔

میرا سامان اٹھا کر گھر سے باہر پھینکا اور صاف کہہ دیا کہ جاؤ اپنی عفت ممانے کے ساتھ ہی رہو ہمیشہ کے لیے۔ سو میں
آئی فی الحال تو یہ سب لے کر۔“ وہ دونوں بازو جھٹکتے ہوئے خود کو مطمئن ظاہر کرتے ہوئے بولی۔
عفت تو یوں ششدر سی کھڑی رہ گئی جیسے اس نے کسی بہت قریبی عزیز کے مرنے کی خبر سن لی ہو۔

”تو۔۔۔ اب واپس۔۔۔ پندرہ دن بعد بھی۔ واپس نہیں جاؤ گی۔“ وہ اڑی رنگت کے ساتھ بمشکل بولی۔
مثال نفی میں سر ہلا کر شب میں موجود پانی اور سرف فرش پر بہا کر بڑی تندہی سے جھاڑو لگانے لگی۔
وہ عفت کے سر پر ہم پھوڑ چکی تھی۔ عفت کی حالت اب کیا ہوگی۔ اسے اس میں دلچسپی نہیں تھی۔
اسے صرف پیپا کا رد عمل جاننا تھا۔ وہ جانے اس بات کو کیسے لیں گے۔

”تم۔۔۔ یہاں۔۔۔ آپ۔۔۔“ عدیل اتنے برسوں بعد بشری کو اپنے سامنے دیکھ کر لمحہ بھر کو تو کچھ بول ہی نہیں سکا
تھا۔

اور پھر بولا تو یہ تین بے ربطا سے الفاظ۔
بشری کچھ کہے بغیر خاموشی سے اس کے سامنے بڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔
اس کے چہرے پر اتنی گہری چپ اور ایسی وحشت تھی جیسے وہ کچھ بولے گی تو شاید رو ہی پڑے گی۔

اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ بال بال چہرے کے ارد گرد اڑ رہے تھے جیسے انہیں کئی دنوں سے سلجھایا
نہ گیا ہو۔ کہیں براؤن، کہیں سیاہ اور کہیں جھلکتی سفیدی۔ خشک۔ بے رونق بال بشری کی بے توجہی کا اعلان
کر رہے تھے۔

عدیل نے بشری کو کبھی خود سے یوں لا پروا نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنا بہت خیال رکھا کرتی تھی۔
اس نے دونوں ہاتھ آپس میں جکڑ رکھے تھے۔ بڑھتی عمر کا اعلان کرتی ہاتھوں میں نیلی سبز رگیں ابھری ہوئی
تھیں۔

اس کی گردن کی ہڈی بہت نمایاں تھی اور جڑے رخساروں میں یوں نمایاں تھے جیسے کئی دنوں سے اس نے کھانا
پینا چھوڑ رکھا ہے۔ وہ عدیل کو بہت کمزور، مڑھائی ہوئی اپنی عمر سے کہیں بڑی نظر آنے والی عورت لگ رہی تھی۔
اس کے چہرے پر تھکن تھی۔ جیسے وہ اپنے گھر سے عدیل کے آفس تک پیدل چل کر آئی ہو۔

”تم۔۔۔ تم ٹھیک ہو نا۔“ اس کی اتنی لمبی چپ نے عدیل کو ڈرا دیا۔
وہ کوشش کے باوجود خود کو اسے تم کہنے سے نہ روک سکا۔
”ایک گلاس پانی۔۔۔ مل جائے گا۔“ وہ اسی طرح دونوں ہاتھ آپس میں جوڑے، چہرہ جھکائے کھر دری آواز میں
بولی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ علامہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔
”یقیناً کوئی بہت بڑی بات ہوئی ہے۔“ وہ اسے دیکھ کر سوچنے لگا۔
”کہیں احسن کمال نے اسے چھوڑ تو نہیں دیا۔“ برسوں پہلے کی دہلی دہلی سی خواہش کسی خدشے کی طرح سراٹھا کر اس کے دل میں آئی۔
”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اب نہیں۔۔۔ اس کے ساتھ کچھ ایسا برا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس باریہ ٹوٹی تو پھر شاید کبھی جڑ نہیں سکے گی۔“ اس نے کانپتے دل کے ساتھ اس کے آگے پانی کا گلاس رکھ کر سوچا۔
بشری ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گئی اور اس سارے درانیے میں اس نے پہلی بار عدیل کی آنکھوں میں دیکھا۔
جن میں اسے اپنے لیے وہی فکر اور پریشانی نظر آئی جو کبھی بشری کو موسم بدلنے پر نزلہ زکام بخار ہونے پر عدیل کی آنکھوں میں ہوتی تھی۔
دونوں چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھ کر نظری جڑا گئے۔ دونوں کی صدائیں تھیں یا بہت سی آوازیں جو دونوں کے ویران دلوں میں گونجی تھیں۔
”مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ بشری بے بسی سے بڑبڑا کر رہ گئی۔
”سب ٹھیک تو ہے نا بشری۔ تم۔ تمہارا شوہر۔ مثال!“ عدیل اس کے پھر خاموشی میں ڈوب جانے پر کچھ بے چین ہو کر بولا۔
وہ ساکت سی بیٹھی تھی۔
”میں آج آپ سے ایک درخواست کرنے آئی ہوں عدیل!“ بہت رک رک کر بہت سوچ کر جیسے پوری ہمت جمع کر کے وہ بولی۔
”کیسی درخواست۔ میرے پاس کیا ہے اب تمہیں دینے کے لیے۔“ وہ پھیکے سے لہجے میں بولا۔ جس میں بہت کچھ کھودینے کا چچکتا تھا۔ بشری نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔
عدیل نظروں چرا کر بلا سنڈز سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کی شکایتی نظروں کی تلافی اب ممکن نہیں تھی۔
”میں احسن کمال۔ بچوں۔ اس کے دونوں بچوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے آسٹریلیا شفٹ ہو رہی ہوں۔“
ایک لمبی چپ کے بعد وہ پھر سے ہارے لہجے میں بولی اور عدیل کو یوں لگا جیسے اس کے آس پاس کوئی ہم پھوٹا ہو۔
”اس کے دونوں بچوں۔“ وہ زرب لب بڑبڑایا۔
”حسن کمال کے بیٹے سیفی اور آئینہ۔“ بشری نے اس کی استعجاب بھری سرگوشی سن کر شرمندہ سے لہجے میں وضاحت کی۔
”اور مثال۔“ وہ ایسا کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن جانے کیسے اس کے منہ سے پھسل گیا۔
بشری کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔
مثال کے نام پر اسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے لیا ہو۔ وہ جتنی ہمت سے اتنا بڑا فیصلہ دل میں کر کے آئی تھی۔ اسے لگا وہ یہ فیصلہ جو عدیل کو سناٹے کی تو اس کے بعد شاید وہ خود بھی زندہ نہیں رہ پائے گی۔
”وہ۔ میرے ساتھ۔ ہمارے ساتھ۔ نہیں جائے گی۔ وہ جانا نہیں چاہتی۔ اس نے ہمارے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔“ لمحہ بھر میں اس نے جملوں میں رد و بدل کیا اور دفاعی پوزیشن پر آگئی۔
”میں نے اس سے بہت کہا، سمجھایا۔ کہ میں چاہتی ہوں وہ ہمارے ساتھ چلے۔ اسے چلنا چاہیے۔ وہاں اس

کے لیے ایک برائٹ سیکور فوج ہو گا۔ بٹ۔ وہ تم سے۔ اپنے باپ سے اتنی دور نہیں جانا چاہتی۔
وہ بے ربطگی سے جلدی جلدی بولتی چلی گئی۔

حالانکہ وہ گھر سے یہی سوچ کر نکلی تھی کہ وہ عدیل کو سارا ماجر اسپی کی ذلیل حرکت کا قصہ اور اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور اپنی بے بسی۔ سب کچھ سچ بتا دے گی۔
لیکن جانے کیوں اتنے سالوں بعد اگرچہ دل مکمل طور پر عدیل پر بھروسہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن ایک دم سے اپنے بھرم کی خاطر اس نے خود کو یہ سب کہنے سے روک دیا۔

”اب تم کیا چاہتی ہو کہ میں مثال کو سمجھاؤں کہ وہ تمہارے ساتھ چلنے کے لیے راضی ہو جائے؟“ عدیل نے سکون بھرے لہجے میں جواب دیتے ہوئے جیسے بشری کی بساط ہی الٹ دی۔ وہ پریشان سی اسے دیکھنے لگی اور بے ساختہ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
عدیل نے اسے الجھ کر دیکھا۔

”تم۔ تم میرے پاس اور کون سی درخواست لے کر آئی ہو۔“ اسے بشری کے آنے کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا۔
”اتنے برس گزر گئے۔ یوں سمجھیں میں نے اپنی آدھی سے زیادہ عمر بتادی اور مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ عورت واقعی بہت کمزور بہت بے بس ہے۔ وہ لاکھ خود مختار ہونے کا دعوا کرے۔“ وہ گہرا سانس لے کر بے بسی سے اپنی بے چارگی کا اظہار کر گئی۔

”میں ابھی بھی نہیں سمجھا بشری! عدیل واقعی سمجھ نہیں پایا تھا وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔
بشری پھر خاموش ہو گئی۔
جسے وہ بولنے کے لیے مناسب الفاظ کا انتخاب کر رہی ہو۔

”میں یہ جان چکی ہوں عدیل! کہ میں لاکھ مثال سے محبت اور ممتا کے دعوے کروں میں اس کی حفاظت نہیں کر سکتی۔“
کچھ دیر پہلے جو اس نے کچھ نہ بتانے کا دل میں عہد کیا تھا۔ اس چھوٹے سے جملے میں کہہ گئی۔

عدیل کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔
”کیا مطلب؟“ وہ بہت دیر بعد پوچھ سکا تھا۔ ”کیا ہوا ہے مثال کو۔ بتاؤ مجھے۔ کسی نے اس کے ساتھ کچھ غلط کیا ہے؟“ وہ ایک دم سے وحشت زدہ سا ہو گیا تھا۔
بشری آنکھوں میں پانی لیے زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

”اسے کچھ نہیں ہوا۔ لیکن میری خواہش۔ اور یہ ضروری ہے عدیل! کہ مثال اپنے باپ کی محفوظ چھت تلے رہے۔ میں جارہی ہوں۔ میں اس کا وہ خیال نہیں رکھ سکوں گی جو شاید ایک سگابا پ رکھ سکتا ہے۔ میں اس سے رابطے میں رہوں گی۔ اس کی ضرورت کا خیال رکھنے کی کوشش کروں گی۔ لیکن میری درخواست ہے پلیز! اسے اپنے پاس رکھ لیں اور اس کا بہت خیال رکھیں۔ وہ میرے بغیر تو رہ سکتی ہے مگر وہ تمہاری جدائی نہیں سہہ سکے گی۔ میں اسے اپنی خوشی اور رضا سے تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔“ کہتے کہتے وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

عدیل شاکہ سا ساکت بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔
”میں اس کی جدائی نہ لوں گی۔ جیسے بھی ہو گا اس کے بغیر جی لوں گی۔ مجھے یہ اطمینان ہو گا کہ وہ تمہارے پاس۔ اپنے باپ کے پاس بحفاظت ہے۔ تم اس کا خیال مجھ سے بہت بہتر رکھ سکتے ہو رکھ لو گے۔“
کہہ کر خود کو کھینچتے ہوئے وہ مردہ قدموں سے عدیل کا جواب سنے بغیر دروازہ کھول کر جیسے آئی تھی اسی طرح چلی

گئی۔

عدیل ٹوٹ گئی تھی۔ نہ جانے سچ میں کیا ہوا ہے۔ کیا احسن کمال۔ نے مثال کے ساتھ کچھ برا کیا؟
کسی سانپ کی طرح اس خدشے نے سراٹھایا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر آفس کے باہر تک بشری کے پیچھے گیا۔ مگر اس کی گاڑی دھول اڑاتی دور جا رہی تھی۔
شاید وہ ٹھیک کہہ گئی ہے۔ جو ان بیٹی کی جیسی حفاظت ایک باپ کر سکتا ہے کہ ایک لاجپاں نہیں کر سکتی مگر مثال کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ وہ ستون کے ساتھ ٹکا مضطرب سا ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا۔

سارا گھر ایک دم سے خالی ہو گیا تھا۔
اسے تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ بیٹیوں نے گھر کو کس طرح سے بھر رکھا ہے۔ گھر کی ساری آبادی جیسے ان کے دم سے تھی۔

سب طرف ایک گہیر خاموشی گہری چپ سی تھی۔
وردہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ بہت سارے دنوں کی تھکن جمع ہو گئی تھی۔ آرام کے لیے تو وہ بھی لیٹ تھی۔ ذرا سی دیر کو اس کی آنکھ لگی مگر پھر وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔
واثق جاب کی تلاش میں نکلا تھا۔ پچھلے دنوں اسے جو عارضی نوکری چھ ماہ کے کنٹریکٹ پر ملی تھی وہ پچھلے ہفتے ختم ہو چکی تھی۔

عاصمہ کی اکیڈمی میں بچے اب بہت کم رہ گئے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا تھا۔ کوئی ڈھنگ کی ٹیچر چند ہفتوں سے زیادہ نکلتی ہی نہیں تھی۔ حالانکہ عاصمہ نے اپنی جیب سے ان کی تنخواہیں بھی بہت بر بھائی تھیں مگر انہیں کسی اور اکیڈمی سے اچھا کچھ مل جاتا تو وہ چپکے سے بغیر بتائے ہی چلی جاتیں۔

بار بار نیچر زبڈ لے سے اسٹوڈنٹس اور ان کے والدین بہت ڈسٹرب ہوتے۔ یوں بھی اس کا اپنا دھیان بھی اکیڈمی کی طرف سے خاصا کم ہو گیا تھا۔ واثق کو جاب مل جاتی تو وہ اکیڈمی بند کرنے کا ہی سوچ رہی تھی مگر ابھی تو آمدنی کا یہی ایک ذریعہ تھا۔

”مما! آپ سوئی نہیں؟“ وردہ جمائیاں لیتی اٹھ کر باہر آ گئی۔
عاصمہ اسے دیکھ کر ذرا سا چونکتے ہوئے مسکرائی۔

اسے یہ کی طرح وہ بھی قد کاٹھ میں دن بدن بڑھتی جا رہی تھی یا شاید وردہ ان دونوں کی موجودگی میں عاصمہ کو نظر ہی نہیں آتی تھی اور اب ایک دم اسے لگا۔ وردہ فرسٹ ایر پاس کرتے ہی ایک دم سے بہت بڑی ہو گئی ہے۔
عاصمہ نے کوئی جواب دے بغیر اس کی طرف بائیں پھیلائی۔ وہ فوراً ماں کی بانہوں میں سا گئی۔
”مما! آپوں کے جانے کے بعد کتنی خاموشی ہو گئی ہے گھر میں۔ وہ دونوں اتنا شور مچاتی تھیں کیا؟“ وہ ماں کے سینے میں منہ ڈھیر کر شریر لہجے میں بولی۔

عاصمہ نے ہنستے ہوئے اس کے سر پر ہلکی سی چپٹ لگائی۔ دونوں پھر خاموش ہو گئیں۔
”مگر ممما! ماموں تو کہہ رہے تھے وہ پاکستان آجائیں گے کچھ مہینوں میں سب کو لے کر۔“ وردہ کو کچھ دیر بعد خیال آیا تو سراٹھا کر پوچھنے لگی۔

”مشکل ہے وردہ! تمہارے ماموں تو کئی سالوں سے یہی کہہ رہے ہیں۔ اب تو دونوں بیٹیوں کی جاب بھی وہیں

ہے گھر بھی لے چکے ہیں اور اور سوئیں تو مل ہی گئیں۔ آخر میں وہ خود ہی مسکرائے گی۔

”تو وہ اب کبھی نہیں آئیں گے یہاں؟“ ورنہ کچھ پریشان ہو کر بولی۔

”اللہ نہ کرے۔ آتا تو ہے انہیں جلد یا بدیر، بلکہ ابھی تو میں سوچ رہی ہوں واثق کی جاب لگ جائے تو تمہارے فرض سے ایک دو سالوں میں سکدوش ہو کر جے کے لیے جاؤں گی۔“

”خبردار ماما! آپ نے ابھی میرے متعلق ایسی ویسی کوئی بات سوچی بھی تو مجھے بڑھنا ہے ابھی اور بہت بڑھنا ہے شادی۔ بالکل بھی نہیں۔ کم از کم پانچ چھ سال تو سوچے بھی نہیں۔“ وہ خطرناک تیروں کے ساتھ ماں کو دھمکانے والے انداز میں بولی تو عاصمہ یوں ہی مسکرا کر سر ہلانے لگی۔

اسی وقت دروازہ کھول کر واثق آگیا۔

اس کے چہرے پر تھکن کے بجائے مسکراہٹ اور چمک سی تھی۔

”اللہ تیرا شکر ہے۔“ عاصمہ زیر لب کہتے ہوئے سر اٹھا کر بولی تو دونوں ماں کو دیکھنے لگے۔

واثق سلام کر کے ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

”مجھے لگتا ہے کوئی اچھی خبر ہے۔“ عاصمہ یقین بھرے لہجے میں بولی۔

”اچھی سی چائے پلوا میں پسکے پھر پتا آتا ہوں۔“ واثق جوتے اتارتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

”اس کا مطلب ہے وہ خبر میرے سامنے نہیں سنائی جانے والی جو مجھے چائے بنانے کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔“

ورنہ برا سا منہ بنا کر بولی۔

”بہت تیز ہو گئی ہے ماما۔“ واثق ہنس کر بولا۔

”بھائی! بتائیں نا کیا بنا آپ کی جاب کا؟“ وہ بے صبرے پن سے بولی۔

”بہنہ جی! تمہیں مل بھی گئی ہے اور نہیں بھی۔“ وہ ٹانگیں سامنے پھیلا کر پرسکون انداز میں بولا۔

عاصمہ اور ورنہ نے ابھ کر اسے دیکھا۔

”یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ ملی ہے یا نہیں، ٹھیک بتائیں نا۔“ ورنہ کچھ منہ بنا کر بولی۔

”ماما! میرا ایک کالج فیلو تھا۔ کالج کے دور میں تو اتنی دوستی نہیں تھی ہمارے درمیان، لیکن آج ملا تو بہت اچھا

لگا۔ بہت ناگس ہے وہ میرے بارے میں پوچھنے لگا کہ کیا کر رہا ہوں آج کل، میرے بتانے پر کچھ دیر تو خاموش رہا،

پھر اس نے مجھے جاب کی آفر کر دی۔“

”جاب کی آفر۔ آفس ہے اس کا یا کوئی کمپنی۔ امیر دوست ہے کیا آپ کا؟“ ورنہ اسی بے صبری سے پھر بولی۔

”ہاں ہے تو۔“ فیکٹری ہے اس کی کافی بڑی۔ اسے سی ایٹل میری ضرورت ہے۔ کل جاؤں گا دیکھوں گا کہ

جاب کیا ہے، پھر فیصلہ کروں گا کہ کرنی ہے یا نہیں۔ اب چائے مل سکتی ہے یا نہیں۔“

وہ اٹھ کر جاتے ہوئے ورنہ کے سر پر چپٹ لگا کر کہہ گیا۔

”یہ کیا پھسپھی جاب ہوئی بھلا۔ ملنے پہ بھی ففٹی ففٹی۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

عاصمہ خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔

☆ ☆ ☆

”کیا مطلب ماما۔ یہ مثال آپ۔ اب کیا مستقل ہمارے سر پر بڑی رہیں گی۔ اب کبھی بھی اپنی ماں کے گھر

نہیں جائیں گی۔ کیا مصیبت ہے یا ر! پری بہت جھنجھلائی ہوئی تھی۔ خواہ مخواہ کمرے کی چیزیں اٹھا کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اور یہ تو اب ملے تھا کہ مثال اب ان لوگوں کے ساتھ ہی جائے گی۔ جس پر پاپا کی محبت کی اکیلی حصے دار پریشے

پریشانی ہوئی تھی۔ عفت بالکل خاموش تھی۔

وہ پری کی شرٹ پر دھاگے سے تیل بنا رہی تھی۔

”آپ کچھ بول کیوں نہیں رہی ہیں۔ مجھے بہت غصہ آ رہا ہے۔ آپ پاپا کو فون کر کے بلائیں، انہیں کہیں فوراً“

اس سے انکرات کریں۔“ عفت کی خاموشی اسے اور مشتعل کر گئی۔

”پری! تمہارے پاپا آنے والے ہیں۔ وہ راستے میں ہوں گے۔ تم اس طرح ری ایکٹ کرو گی تو شاید انہیں برا

لگ جائے۔ بہر حال مثال بھی ان کی بیٹی ہے اور تم سے پہلے وہ اس کے بارے میں سوچیں گے، یہ ذہن میں

رکھو۔“

عفت خلاف توقع بہت ٹھہر ٹھہر کر بظاہر سلجھے ہوئے صبح جو لہجے میں کہہ رہی تھی۔ پری ششدر سی رہ گئی۔

”آپ۔ آپ اسے ہمیشہ کے لیے قبول کر لیں گی اس گھر میں۔ وہ اب یہیں رہے گی۔ کبھی نہیں جائے گی

کیا؟“ وہ ماں کے سر پر آکر چلاتے ہوئے بولی۔ عفت اسے تاسف سے دیکھ کر رہ گئی۔

”ہر چیز کا نتیجہ فوراً سامنے نہیں آتا۔ اپنے اندر تھوڑا ضبط پیدا کرو۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی عفت اسے

نصیحت کر گئی، جبکہ جانتی بھی تھی کہ یہ موقع بہر حال نصیحت کا نہیں ہے۔

”میں اسے اور اس کے سامان کو اٹھا کر باہر بھی پھینک سکتی ہوں تو آپ اپنی یہ نیک نصیحتیں سنبھال کر

رکھیں اس وقت مجھے کیجئے گا۔“ وہ عفت کی توقع سے زیادہ غصے میں آکر بولی۔

”پری۔ پری۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ عفت بوکھلا کر قیص ایک طرف پھینک کر غصے میں جاتی پری کے

پیچھے لپکی۔

”حد ہے۔ اس لڑکی کی ذرا جو صبر برداشت ہو اس میں خواہ مخواہ ہی میں کوئی نیا تماشا کھڑا کر لے گی۔ رکھو۔

پری بات سنو میری بیٹا! وہ اس کے پیچھے تک چلی گئی۔ مگر وہ ان سنی کرتی جا چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

مثال نے سخت تھکے ہوئے پیروں کو دونوں ہاتھوں سے سہلا کر انہیں کرسی پر رکھا۔ جبکہ اس کے ہاتھوں میں

بھی درد تھا۔

درد اپنی جگہ، مگر یہ چھوٹا سا کاٹھ کباڑ سے سجا کر اس قابل ہو چکا تھا کہ وہ اب باقی کے جتنے بھی دن خدا نے اس

کے اس گھر میں رکھے تھے یا آسانی گزار سکتی تھی۔ اگر اسے گزارنے دیے گئے تو۔

داوی کا پلنگ جھاڑ پونچھ کر جس قدر اسے صاف کر کے چمکایا جاسکتا تھا۔ مثال اسے چمک کر کھڑکی کے ساتھ دیوار

سے ذرا فاصلے پر لگا چکی تھی۔ پرانے پرنٹ کی تھسی ہوئی ٹکڑی صاف چادر تکیہ پرانے میز پر اس کی کتابوں کا ڈھیر اور

پلنگ کے نیچے اس کے تینوں سامان سے بھرے بیگ لگ چکے تھے۔

کمرے میں ایک ہی ٹوٹی پھوٹی الماری تھی۔ جس کے پٹ نہیں تھے۔

”پاپا کا موڈ اچھا ہو۔ کسی دن تو انہیں کموں گی۔ اس الماری کے پٹ لگا دیں۔ میں اس میں اپنے کپڑے بچوتے

وغیرہ رکھ لوں گی۔“

وہ اب دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں سہلا رہی تھی۔

دن مج سے کام میں لگی تھی اور اب نہ صرف بہت تھک چکی تھی۔ بلکہ اسے بھوک بھی لگی تھی۔

اور کسی نے اس سے جھوٹے منہ کھانا تو کیا چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا تھا۔
اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اب جا کر اسے بچن میں بھی سارا کام کرنا پڑے گا تو ہی کھانے کو کچھ ملے گا۔ لیکن اب اس میں اٹھنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ وہ یوں ہی کسلمندی سے بیٹھی رہی۔
”تم یہاں مستقل آگئی ہو کیا مثال۔“ پری اس کے پیچھے دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی تھی۔
کچھ دیر کھڑی کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔ جس کا چند گھنٹوں میں نقشہ بدل چکا تھا۔ پھر بہت کڑوے کسلیے لہجے میں چبا کر بولی۔

مثال نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
”کیوں تھک گئی تمہاری ماں تمہیں اپنے گھر میں رکھ کر اس کے دوسرے شوہر نے تمہیں دھکے دیے کر نکال دیا۔ ایسا ہی ہونا مثال آپ کی تمہارے ساتھ وہاں؟“ طنزاً اس سے جب سخت ناگوار لہجے میں بات کرتی تھی تو آپ کی اور مثال کو بہت حقارت سے چبا چبا کر الگ سے ادا کرتی تھی۔

مثال خون میں اٹھتے ابال کو ضبط کرتی خاموش رہی۔
”سنائے تمہاری ماں کے دوسرے شوہر کا جوان بیٹا بھی ہے۔ کہیں اس کے ساتھ تو رنگ رلیاں مناتی رنگے ہاتھوں نہیں پکڑی گئیں تم۔“ وہ کس قدر کمبختی تھی۔ اس کا اندازہ مثال کو بھی نہیں ہوا تھا۔
وہ تو ابھی اس جیلے کے بولنے سے پہلے تک پری کو ایک معصوم چھوٹی باری ڈول جیسی بہن سمجھتی تھی۔ جس کو مثال نے گودوں کھلایا تھا اور عفت سے چھپ چھپ کر اسے بہت پیار کیا تھا۔ اپنی محدود سی پاکٹ منی سے اس کے لیے چاکلیٹیں اور کنڈیز لایا کرتی تھی۔

وہ پری اس سے اتنی گندی گری ہوئی بات بھی کر سکتی ہے۔ مثال کبھی سوچ نہیں سکتی تھی۔
اگرچہ وہ بات تقریباً کچھ اسی طرح وقوع پذیر ہوئی تھی جیسے پری نے حقارت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ لیکن مثال کو یوں لگا جیسے کسی نے کچھ سے بھرا جوتا کھینچ کر اس کے منہ پر مار دیا ہو۔ اسے چاہنے کے باوجود غصہ بھی نہیں آیا۔ بس جیسے ڈھیر سارا نمک اس کے حلق میں کھل سا گیا۔

وہ پری کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ بلکہ وہ تو کسی کے بھی سامنے نہیں رونا چاہتی تھی۔
لیکن ہر بار اسے اس بچہ پہ پہنچا دیا جاتا تھا کہ وہ سب کے سامنے روئی پڑے۔
”میں چائے بنانے جا رہی ہوں تم بیوی۔“ پیروں سے اٹھتی ٹیٹوں کو دبا کر بدقت اٹھتے ہوئے بظاہر سپاٹ لہجے

میں آنکھوں میں آنی نمی کو چھپا کر وہ رخ پھیرے جاتے ہوئے بولی۔ اس کی اس بے نیکی آفر نے پری کو اور چڑا دیا۔
وہ تیزی سے بٹوں پر گھومی گئی۔

”کیا سمجھتی ہو تم خود کو۔ یوں بے پروا ظاہر کر کے ہم سب کو بے وقوف بنا لو گی۔“ بناؤ وہاں ایسا کیا کر کے آئی ہو کہ انہوں نے تمہیں ہمیشہ کے لیے یہاں پھینک دیا ہے ہمارے سروں پر کسی مصیبت کی طرح۔“ پری عفت نہیں تھی کہ بہت پلاننگ کے ساتھ اپنے بغض کو نرم لفظوں اور مبہم رویے کے پیچھے چھپاتی۔ وہ پری بھی جو ماں اور باپ کے لاؤ سے سرچڑھی تھی۔

”بناؤ مجھے گونگی ہو کر آئی ہو کیا وہاں سے؟“ وہ مثال کی ہنوز چپ پر اور بھی برا فروخت ہو کر چلائی۔
”پری! یہ گھر جتنا تمہارا ہے اتنا ہی میرا بھی ہے یہ مت بھولو تم اگر عدیل احمد کی چھوٹی بیٹی ہو تو میں ان کی بڑی بیٹی ہوں۔ ان کی محبت ان کے گھر ان کی ہر چیز کی پہلی حصہ دار پہلی حق دار۔“ اوکے۔“
پتا نہیں کس طرح اس نے اپنے دل کو سنبھالا تھا جو زور زور سے رونے پر آمادہ تھا اور وہ اسے سنبھال کر اتنے

روکھے لہجے میں بولی تھی کہ لمحہ بھر کو پری بھی اس کے دنگ لہجے پر کچھ خائف سی ہو گئی۔
”بلک میل کر رہی ہو مجھے، میری ماں کو۔“ پری اس کے جواب میں صرف یہی کہہ سکی۔

”نہیں صرف بتا رہی ہوں کہ میں جب جیسے میری مرضی، میری خواہش ہوگی، میں اپنی ماں کے گھر رہوں گی یا اپنے باپ کے گھر۔ تم اس پر اعتراض نہیں کر سکتیں اور جب ہمیں ایک ہی گھر میں رہنا ہے تو بہتر ہے نہ تم مجھ سے بے وجہ الجھو اور نہ میں تم سے الجھوں۔ امن سے رہو، امن سے رہنے دو، مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے۔

اور یہ مت سمجھنا کہ مجھے ماں کے گھر سے کسی نے نکالا ہے یا مجھے وہاں کوئی مسئلہ تھا۔ اصل میں مجھے پیانے زبردستی بلایا ہے۔ وہ اب یہ چاہتے ہیں کہ میں ہمیشہ کے لیے ان کے ساتھ آکر رہوں۔ اور کبھی کبھار اپنی ماما سے ملنے چلی جایا کروں اور اب اس طرح کے جو بھی قصے کہانیاں تمہارے دماغ میں آ رہی ہیں وہ تمہیلا کے آنے پر ان سے شیر کر لینا کہ مجھے وہاں سے کیوں ادھر بھیجا گیا۔ وہ یقیناً“ تمہیں کوئی نسلی بخش جواب دے سکیں گے، اوکے۔“

وہ بہت ٹھنڈے ٹھار لہجے میں سکون سے کہتے ہوئے اسے پلکیں چھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔
اور پری جتنی بھی نادان نا سمجھ سی اتنا تو وہ سمجھتی تھی کہ اس طرح کی بات پیانے سے کرنے کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔
اور وہ اتنی بھی بے وقوف نہیں تھی کہ ایسے گھٹیا سوال کر کے خود کو پیانے کی نظروں سے گراتی۔
”چلو، میں بھی دیکھتی ہوں، کتنے دنوں تک تمہیلا کی گڈ بیک میں رہتی ہو۔ آپ کی مثال! وہ پیچھے سے چیلنج کرنے والے انداز میں بولی تو مثال ان ہی قدموں پر ٹھٹھک گئی۔
اس نے گردن موڑ کر پری کی نفرت بھری نظروں کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر یا ہر نکل گئی۔

”نہیں۔۔۔ پیانے۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ کوئی جھگڑا، نہ کوئی ایسی بات۔“
وہ رات کے اندھیرے میں باپ کے سامنے سر جھکائے اپنی انگلیاں مسلتی مضطرب سی بیٹھی تھی۔
عدیل کی نظریں مثال کے چہرے پر جمی تھیں۔

اسے مثال کی بات سے اتفاق تھا۔ اس کی نسلی ہوئی تھی۔ مگر اس کے چہرے سے چھلکتا اضطراب اور آنکھوں میں جھانکتا خوف اس ان کسی کہانی کی تائید کر رہا تھا جو وہ شام میں بشری کے کچے سے اخذ کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

عدیل اس کی بات کے جواب میں بہت دیر سے چپ تھا۔
مثال نے آہستگی سے پلکیں اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا۔ وہ کسی اور ہی سمت میں دیکھتے ہوئے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

”پیانے۔۔۔ اگر آپ کو اچھا نہیں لگ رہا میرا یہاں آنا تو میں۔۔۔“ وہ کچھ دیر بعد غم لہجے میں ادھر اور اساجملہ بول کر خود کو کمبوڑ کرنے لگی۔

”تو کیا کر دگی؟ کوئی تیسرا ٹھکانہ بھی ہے تمہارا؟“ عدیل کے تلخ لہجے نے مثال کو گنگ سا کر دیا۔ اسے عدیل سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی۔

مگر عدیل بھی کیا کرتا۔ شام سے آفس سے آنے کے بعد اب رات کے کھانے تک اس نے جتنی بکواس عفت اور پری کی نہ ماننے والی ناراضی کو برداشت کیا تھا۔ اسے بخوبی آنے والے دنوں کی سختی کا اندازہ ہو رہا تھا۔
عفت بھی بھی مثال کو ہمیشہ کے لیے اس گھر میں برداشت نہیں کرے گی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ قلمیہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر ویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اور پری عفت کی بیٹی ہے جسے اپنے اکلوتے ہونے کا اور ماں باپ کے لاڈلے ہونے کا بہت زعم ہے۔ بھری محفل میں وہ اور عفت علی الاعلان کہتی تھیں کہ پریشہ ان کی ایک ہی بیٹی ہے۔ ایک بیٹا دانیال اور ایک بیٹی پریشہ۔

اب یہ مثال کہاں سے ٹپک پڑی ان کے گھر میں بڑا ہڈا ڈالنے کے لیے۔ ”اس کی ماں اور باپ کو کچھ عرصے کے لیے مجبوراً ملک سے باہر جانا پڑ گیا ہے۔ کوشش کے باوجود مثال کا ویزا نہیں لگ سکا۔ چھ آٹھ ماہ میں وہ واپس آجائیں گے تو یہ اپنی ماں کے پاس چلی جائے گی۔ ہمیشہ کے لیے نہیں آئی۔“ بہت سوچنے کے بعد عدیل کو یہی ایک مضبوط بہانہ سوچا تھا عفت کے غصے کو کم کرنے کا۔ اس نے عدیل کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔

مگر فی الوقت یقین کرنے کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ”میں چھ آٹھ ماہ میں مثال کا کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کروں گا تو یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔“

عدیل اس بات کو سوچ کر دل میں بہت مطمئن تھا اور آج ہی سے اس نے اپنے ارد گرد روز و نزدیک خاندان میں اور باہر گولی ایسا موزوں رشتہ مثال کے لیے سوچنا شروع کر دیا تھا جلد از جلد اس کی بیٹی کو بخوشی بیاہ کر لے جاسکے۔ ”اگرچہ وہ ابھی کم عمر ہے مگر اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔“ وہ خود کو سمجھا چکا تھا۔

”اور تم پریشان نہیں ہو، تیسرا ایسا کوئی بھی آپشن میں سوچ چکا ہوں۔ تم عفت اور پری سے یہی کہنا کہ بشری تمہیں یہاں صرف چند ماہ کے لیے چھوڑ کر گئی ہے، اوکے“ چند لمحوں بعد معلوم نہیں اسے اپنے جملے کی سختی کا احساس ہوا تھا یا مثال کی تشفی کے لیے اس نے یہ بات کہی تھی۔ مگر مثال اسی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

پاپا تو اسے دنیا سے زیادہ بھروسہ اور مان تھا۔ وہ اسے کبھی بھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے۔ اسے اندھا یقین تھا۔

اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر دو آنسو اس کی ہتھیلیوں پر گرے۔ ”اور کوشش کرنا کہ عفت اور پری کے ساتھ تو تم کسی قسم کا کوئی ایڈجسٹمنٹ کرو۔ وہ دونوں جو بات کہیں سخت یا نرم اسے خاموشی سے سن لیا کرتا۔ چند ماہ کی بات ہے پھر ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ مثال نے چونک کر باپ کو دیکھا۔

”چند ماہ بعد کیا ہونے والا ہے کیا بشری اسے واپس لے جائے گی یا کالیہ خیال ہے تو ان کی بھول ہے احسن کمال اب کبھی بھی مجھے اپنے گھر میں قبول نہیں کرے گا۔“ اسے اور بھی رونا آنے لگا۔ اسے لگا وہ اپنے باپ پر کوئی بہت بڑی مصیبت بن کر نازل ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے اس کے باپ کے کندھے چند گھنٹوں میں جھک سے گئے ہیں۔

”کاش میں یہاں نہ آتی۔“ وہ چپکے سے عدیل کے گہری سوچ میں ڈوبے چہرے کو دیکھ کر خود سے بولی۔ ”تو پھر میں اور کہاں جاؤں؟“ وہ سخت رنجیدہ تھی۔ ”اب جا کر سو جاؤ تم اور سنو مثال! تمہارا یہ فاسٹ سیمسٹر ہے ناکالجز میں؟“ وہ بہت دیر کچھ یاد کر کے بولا تھا۔ ”جی ہاں!“ وہ گھٹی ہوئی آواز میں آہستگی سے بولی۔ ”چھ بات ہے۔ تم اپنا فوکس صرف اپنی اسٹڈیز پر کرنا۔ عفت کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہیلپ کرنا کرنا“

اور اپنے کام سے کام رکھنا اور کوشش کرنا پری سے بالکل نہیں الجھو، تم جتنا میری باتوں کو یاد رکھو گی اور ان پر عمل کرو گی میرے لیے زندگی کچھ باسولت ہو جائے گی۔ تم سمجھ رہی ہونا میں تم سے کیا چاہ رہا ہوں۔“ اسے ایک بار پھر اپنے باپ کی بے بسی پر شدت سے رونا آ رہا تھا۔ وہ چہرہ جھکائے یوں ہی زور سے گردن اثبات میں ہلائے گئی۔

”بیٹا! میں نہیں چاہتا کہ گھر کا ماحول خراب ہو، خواہ مخواہ کوئی بد مزگی، کوئی رنجش ہو۔ عفت دل کی بری نہیں ہے اگر تم تحمل سے اسے اپنی ماں کی جگہ رکھ کر اس کے ساتھ رہو گی تو تمہیں اس کا برتاؤ بہت ناگوار نہیں گزرے گا۔“ وہ رک رک کر اسے آنے والے دنوں کے لیے تیار کر رہا تھا۔ ”پھر پری اور دانی تو تمہاری چھوٹے بہن اور بھائی ہیں جن سے تمہیں بھی بہت محبت ہے نا۔“

مثال اسی طرح سر جھکائے اثبات میں گردن ہلا گئی۔ ”آپ بڑی، بہن ہوان کی۔ ان کا خیال کرو گی تو وہ بھی آپ کا خیال کریں گے۔ آپ سے محبت کر س گے۔ اسی طرح گھر کی فضا اچھی رہے گی اور میں سکون سے آنے والے دنوں میں تمہارے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر سکوں گا۔“ عدیل کی آخری بات پر مثال نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیسا فیصلہ پایا؟“ وہ پوچھے بغیر نہ سکی۔ ”میں چاہتا ہوں میری مثال بہت خوش رہے، اس کے اخلاق اس کا رویہ دوسروں سے سلوک سب اتنا اچھا ہو، مہربان محبت کرنے والا کہ میری بیٹی ایک مثال بن سکے۔ تم سمجھ رہی ہونا۔“

وہ اس کے سوال کو ٹال کر اس کے اوپر رکھی ذمہ داری اور برادری کی گھڑی میں کچھ اور بوجھ بڑھاتا چلا گیا۔ کہ اس گھر کے ماحول کو ٹھیک رکھنے کی تمام تر ذمہ داری مثال کی تھی۔ اس کا رویہ اس کا سلوک سب اتنا مثالی ہونا چاہیے کہ عفت کو اور اس کے بچوں کو اس سے کبھی کوئی شکایت نہ ہو۔ کم از کم عدیل تک ایسی کوئی شکایت نہیں پہنچے۔

”بابا! میں اگر فرشتہ بھی بن کر رہوں گی اس گھر میں تو بھی آپ کی سیکند وائف اور آپ کے بچوں کو خوش نہیں کر سکوں گی۔“ وہ باپ کو دیکھتے ہوئے افسردگی سے دل میں سوچنے لگی۔ ”اب تم جاؤ۔ کافی رات ہو گئی ہے کوئی بھی مسئلہ ہو، کوئی بھی ضرورت ہو۔ تم صرف مجھ سے بات کرو گی۔ اوکے۔“

وہ اسے برسوں پہلے والی نصیحت یاد دلاتے ہوئے بولا۔ جس پر عمل کرنے کی نوبت آج تک نہیں آ سکی تھی۔ اتنے سالوں میں جب بھی مثال اپنے مسئلے اور ضرورتیں لے کر عدیل کے پاس آئی تھی اس کے پاس ان کو سننے کے لیے ان کو حل کرنے کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا۔

سن بھی لے جاتے وہ مسئلے تو ان کو حل کبھی نہیں کیا گیا تھا اور اب پھر وہی ایک باپ کے فرض سے سبک دوش ہونے والی کوشش!

مثال کچھ کمرے بغیر اٹھ کر باہر نکل گئی۔ عدیل اسے جاتا دیکھتے ہوئے ابھی بھی بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

جواب واثق کی توقع سے بہت بڑھ کر تھی۔

کیمیکل بنانے کی اس فیکٹری میں شہزاد نے اسے بہت اچھی سیٹ آفر کی تھی۔ بلکہ سیلری بھی بہت اچھا تھا۔

پھر کام کا اسکوپ بہت تھا اور واثق جو یہ سوچ کر گیا تھا کہ اگر جاب اس کے جی کو نہیں لگی تو وہ مروت اور لحاظ میں آئے بغیر شہزاد کو صاف انکار کر آئے گا۔

”یہ سیلری بھی کچھ اس ماہ کے لیے ہے کہ اس پیریڈ میں ہمیں بہت سے آرڈر پورے کرنے ہیں اگر ہم اس گول کو کامیابی سے اچھو کر لیں گے تو تمہارا بیکج اس سے تقریباً ڈبل کر دیا جائے گا۔“ شہزاد کی بات پر وہ ہنس پڑا۔ ”نہیں بابا! مجھے لاپچی نہیں بننا میں اپنے کام کو پوری دیانت داری سے کرنا چاہتا ہوں کہ میری ماں نے مجھے ہمیشہ رزق کو حلال کر کے کھانے کا سبق پڑھایا ہے، ابھی مجھے صرف اپنے کام میں دلچسپی ہے آگے ملنے والے بیکج میں نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”ویل اینڈ گڈ اور یار ہماری فیکٹری کے کیا بلکہ ہر جگہ موجود کام کرنے والا ایسی سوچ رکھ کر اپنا کام خوب لگن سے کرے تو میرے خیال میں کہیں بھی کوئی کمی نہ رہے اور کرپشن تو جڑوں سے ہل جائے۔“ شہزاد بھی اس کی سوچ سے متاثر ہوا تھا۔

”بالکل۔ کیا ہم آج ہی اپنے پروجیکٹس ڈسکس کر لیں جو ہمیں اگلے تین ماہ کے دوران مکمل کرنے ہیں۔“ واثق کام کرنے کے لیے بے چین تھا۔ فوراً ہی بولا۔ ”کیوں نہیں۔ لیکن پہلے کافی یا چائے۔ بناؤ کیا چلے گا؟“ ”کافی ہی منگو الو۔“ وہ سر ہلا کر بولا۔

”ایک سال پہلے تک پایا ہی سب کچھ دیکھا کرتے تھے۔ میں تو کبھی کبھار جب دل چاہا آفس آجا پا کرتا تھا۔ کچھ ایسی پابندی نہیں تھی مجھ پر۔ لیکن چھ سات ماہ پہلے پایا کی طبیعت خراب ہوئی تو پھر وہ ٹھیک ہی نہیں ہو سکے تو مجبوراً سب کچھ مجھے سنبھالنا پڑا۔ لیکن کرو شروع میں تو جب سارا کچھ میرے سر پر پڑا تو یک بیک میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ کافی وقت لگا مجھے سب کچھ سمجھنے میں۔“ شہزاد اس کے سامنے لیپ ٹاپ کھول کر پروجیکٹس کی فائل نکالتے ہوئے بتانے لگا۔

”وہ کیا ہوا ہے تمہارے فادر کو؟“

”پیرالائز ہیں پچھلے تین ماہ سے۔“

”وہ پری سیڈنٹ انڈ انہیں صحت دے۔ میں کسی وقت جاؤں گا تمہارے ساتھ انہیں دیکھنے۔“

”ہاں ضرور۔ اچھا یہ دیکھو یہ پہلا برڈیکٹس جو ہمیں صرف چالیس دن میں مکمل کرنا ہے۔“

اس نے لیپ ٹاپ واثق کے آگے کھسکایا اور دونوں ڈسکشن کرنے لگے۔

”نہیں بابا! مجھے نہیں جانا۔“ پری نے قطعیت سے کہا۔

عفت کے ساتھ عدیل نے بھی کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔

”لیکن مجھے تو جانا ہے۔ یہ بات صرف تمہاری طرف سے نہیں ہو سکتی بابا! مجھے چلنا ہے میرے لیے۔“ دانی بھی حتمی لہجے میں بولا۔

مثال سب کے لیے گرم چائے لے کر آرہی تھی۔
وہ چائے میز پر رکھ کر خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔
عدیل نے ایک نظر اسے جاتے دیکھا۔

”تم ناشتا نہیں کر رہی ہمارے ساتھ؟“ وہ پیچھے سے مثال کو پکارنا چاہتا تھا مگر عفت کی تیز نظروں سے خائف ہو کر اس نے اپنی پکار کو وہیں خاموش کر دیا۔

”تو ٹھیک ہے تم جاؤ مگر میں نہیں جا رہی۔“ پری اسی تمکنت بھرے لہجے میں بولی۔
”لیکن کیوں پری۔۔۔ جان لپیٹا نے یہ پروگرام صرف تمہاری وجہ سے تو بنایا تھا۔“ عفت اسے چھوٹے بچوں کی طرح چمکار کر بولی۔

”تو کیا اس گھر میں سارے پلان صرف پری بیگم کو خوش کرنے کے لیے بنے ہیں۔۔۔ میری مرضی میری خوشی کچھ بھی نہیں۔“

دانی پری کے انداز پر ہنرک اٹھا اور زور سے ہاتھ میں پکڑا جو اس کا گلاس میز پر پٹخ کر بولا۔

عدیل اور عفت اس کے انداز پر لہجہ بھر کو گنگ سے رہ گئے۔

”دانی۔۔۔ یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا؟“ عفت نے اسے گھر کا۔

”ایک بات آج آپ مجھے کلیر کر دیں۔ میری اس گھر میں کیا پوزیشن ہے۔ سیکنڈ سٹیزن ہوں میں کیا اس گھر کا؟“

وہ جیسے غصے میں بھرا ہوا تھا۔

”دانیال! عدیل کچھ شکستہ سا رہ گیا۔“

”ہر بات میں صرف پری کی رائے پوچھی جاتی ہے۔ اس کا مشورہ جانا جاتا ہے۔ اس کی پسند ناپسند کو فوقیت دی جاتی ہے۔ تو پھر میری کیا حیثیت ہے یہاں پہلے پری کی وجہ سے سیر کا پروگرام بنایا گیا۔ مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا کہ میں جانا بھی چاہتا ہوں یا نہیں، جب میں مینٹلی تیار ہو گیا تو اب آپ کی لاڈلی کے کہنے پر اس پروگرام کو ٹیکسل کر دیا جائے گا۔ آئی نو ایسا ہی ہو گا شٹ۔ میں کون ہوں پھر۔“ وہ ساڑھے پندرہ سال کا ساڑھے پانچ فٹ نکلتا قد بھرے جسم اور میچور چہرے کے ساتھ ماں باپ کے سامنے کھڑا نہیں آنے والے سخت ترین دنوں کی جھلک دکھا رہا تھا۔

”مائی فٹ تو میں بھی اب کبھی نہیں جاؤں گا اوکے۔“ اس نے زور سے میز پر مکارا ٹانشتے کے لوازمات اور برتن بری طرح سے کھٹکنا کر رہ گئے۔

کرسی کو ٹھوکر مار کر لڑھکاتا ہوا دروازے کو لات رسید کرنا وہ کمرے سے ہی نہیں گھر سے بھی باہر جا چکا تھا۔ اور وہ چاروں بالکل گنگ تھے۔

جیسے کسی بڑے طوفان کے گزر جانے کے بعد ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔

”دیکھا تم نے اس کی حرکت کو۔ اسے یہ تمیز ہے بیویوں سے بات کرنے کی۔ کیا پڑھنے جاتا ہے یہ اتنے منگے اسکول میں۔ یہ لڑکا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا عفت! تم اس کی ایسی تربیت کر رہی ہو۔ یہ تو بالکل ہاتھوں سے نکل چکا ہے اور تم ایسی بے خبر ہیں اس سے۔“ عدیل بری طرح سے صدمے میں تھا اور عفت سے تو جواب میں کچھ بولا نہیں گیا۔ پریشہ کے لیے بھی یہ سب خلاف امید تھا وہ بھی جیسے ڈر کر بالکل خاموش ہو گئی تھی۔
عدیل کچھ بھی کھائے بغیر نڈھال سا ڈانٹنگ ٹیبل سے اٹھ کر چلا گیا اور عفت چاہنے کے باوجود اسے روک

نہیں سکی۔

دانی کے ری ایکشن نے اسے بھی سخت خوف زدہ کر دیا تھا۔ ایسا تو وہ کبھی بھی نہیں تھا۔ پھر اسے ہوا کیا۔
وہ بس یہی سوچ رہی تھی۔

وہ پبلک لائبریری کے باہر بیٹھوں پر دونوں گھنٹوں کے گرد بازو کا گھیرا کیے بیٹھی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔
وہ اندر کی طرف آتے ہوئے اسے دیکھ کر بے اختیار ٹھٹھکا تھا۔

اس کے ارد گرد لوگ آ جا رہے تھے۔ مگر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی مشام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔
پرندے شور مچاتے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے وہ ان کے شور کو بھی سن نہیں رہی تھی۔

واثق آہستگی سے اس کے دوسری طرف جا کر بیٹھ گیا۔
وہ اسی طرح کسی اسٹیج کی مانند ساکت تھی۔

”تو جواب ملی پھر نہیں؟“ بہت دیر بعد واثق نے اس گہرے سکوت کو آہستگی سے توڑا۔

”نہیں۔“ اس نے حرکت کے بغیر آہستگی سے جواب دیا۔

تو وہ اتنی بھی غافل نہیں بیٹھی تھی جتنا اسے واثق سمجھتا تھا۔

”تو کوشش ترک کر دی؟“ وہ اسے بولنے پر اکسانے کے لیے بولا۔

”نہیں۔“ جواب پھر مختصر تھا۔

”اگر میں کچھ بھلبھک کر سکوں تو؟“ وہ لہجے میں کچھ اور بھی نرمی اور اپنائیت سمو کر بولا۔

”نہیں۔“ وہ اسی طرح کسی نادیدہ نقطے پر نگاہیں جمائے اسی لہجے میں بولی۔

”نہیں کے سوا اور کوئی جواب نہیں ہے تمہارے پاس۔“ وہ اس کی نہیں کی تکرار پر جھنجھلا کر بولا۔

”نہیں۔“ وہ پھر اس ٹون میں اسے جڑانے کو بولی۔

اور اگلے لمحے اس کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر اٹھ کر جانے لگی اور واثق کو بتا بھی نہیں چلا بالکل غیر ارادی طور پر

اس نے مثال کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑ لیا۔

مثال کو جیسے ہزار واٹ کا کرنٹ لگا۔

وہ تڑپ کر مڑی۔

وہ مسکراتے چہرے کے ساتھ اپنائیت بھری مسکراہٹ سے اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ روز اسی طرح ملا کرتے

ہیں۔

”مسٹر۔“ وہ پورا زور لگا کر ہاتھ کھینچ رہی تھی۔

”واثق۔۔۔ واثق احمد نام ہے میرا اور آپ کا مثال۔ ہے نا۔“ وہ اسی طرح اس کا ہاتھ اپنی مضبوط گرفت میں لیے

اس کے سرخ ہوتے چہرے پر نظریں جمائے بولا۔

مثال کی آنکھیں کچھ حیرت سے پھیل سی گئیں۔

”بھئی اب اتنے مینوں بلکہ شاید سالوں سے تو ہم مل رہے ہیں میرا مطلب ہے آتے جاتے رستوں پر ٹکرا

رہے ہیں تو اتنا حق تو ہے ایک دوسرے کے نام جان سکیں اور ایک دوسرے کے مسائل شیئر کر سکیں۔ ایم آئی

رائٹ؟“ وہ اس کے برابر کھڑا ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

اپنی آئینہ کی اور احسن کی پینٹنگ وہ مکمل کر چکی تھی۔
اور وہ یہ سارے کام کسی ریلوٹ کی طرح نبھاتی رہی تھی۔ اس کی دلچسپی اب کسی بھی کام میں نہیں رہی تھی
اسے یوں لگ رہا تھا۔ اب وہ جس سفر پر جانے والی ہے اس سے کبھی واپسی نہیں ہوگی۔
اس نے تھکی ہوئی نظر سارے گھر پر ڈالی کچھ بھی سمیٹنے کو نہیں رہ گیا تھا۔
رات گیارہ بجے کی فلاٹ تھی ان کی سٹڈی کے لیے سمیٹی دو دن پہلے جا چکا تھا۔ وہ چھ سات ماہ بعد ہمیشہ کے لیے
ان کے پاس آسٹریلیا آجاتا۔
آئینہ اور احسن کمال کچھ ضروری چیزوں کی شاپنگ کے لیے مارکیٹ گئے تھے۔ جہاں انہیں تین چار گھنٹے لگ
سکتے تھے۔

ابھی ساڑھے چار ہوئے تھے اس کے پاس ٹائم تھا۔
وہ اس خیال کے آتے ہی بے چین سی اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

وہ کل کی ایڈیٹنگ کی ہوئی کتابیں لے کر چھت پر آگئی۔
بہت سوچنے کے باوجود بھی وہ اکیڈمی نہیں جاسکتی تھی۔
پہلے پیلا سے بات کروں لیکن آج کل ان کا موڈ بہت آف ہے۔ اگر انہیں بعد میں پتا چلا تو ناراض ہو جائیں
گے۔ وہ بھی سوچ کر نہیں گئی۔
اور گھر کا ماحول تو ابھی بھی بہت خراب تھا۔

دانی نے عفت کے لاکھ سمجھانے بچھانے کے باوجود عدیل سے معذرت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔
عفت کو پہلی بار عدیل سے بہت شرمندگی ہوئی تھی۔ وہ رات بہت دیر سے گھر آیا اور کچھ بھی کھائے بغیر
خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔ اور صبح بھی خاموشی سے خالی چائے پی کر آفس چلا گیا تھا۔ پری بھی بالکل
خاموش تھی۔

اور مثال سے تو کسی کو کوئی غرض نہیں تھی۔ ان دونوں میں اس نے کچن کا گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا کہ کہیں
کو تباہی ہو جانے پر بیٹے کا غصہ عفت اس پر نہ نکال دے۔
مگر عفت بالکل بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔

”ماما نے اتنے دنوں سے مجھے ایک بار بھی فون نہیں کیا۔ مجھ سے بات نہیں کی جیسے انہیں ایسے کسی بہانے کی
تلاش تھی کہ وہ مجھ سے پیچھا چھڑا لیتیں۔ وہ انہیں سینٹی نے دے دیا تھا۔“
ایک دم سے اسے بشری کی بے اعتنائی کا خیال آیا آنکھیں بھر آئیں۔ نیچے سڑک پر گاڑی کے رکنے اور گاڑی کا
دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر وہ یونہی بے دھیان سی بیٹھی رہی۔
”اوہ کہیں ماما مجھے لینے تو نہیں آئیں؟“ بہت دیر بعد اسے اچانک جیسے خیال آیا تو وہ تیزی سے نیچے بھاگ
گئی۔

عفت سامنے کھڑی اس خوب صورت پروقار اور احسن والی ادھیڑ عمر عورت دیکھ کر کچھ چوکی تھی۔
”بشری! مثال ہے گھر پر؟“ وہ بہت رک کر بولی تھی عفت شاکد سی کھڑی رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

”پلیز میرا ہاتھ چھو ڈیں فوراً۔“ وہ غصے میں غرا کر بولی۔
”ورنہ آپ پھنچ کر ماریں گی۔ ہے نا۔“
”میں یہ کر سکتی ہوں جانتے ہیں آپ۔ چھو ڈیں مجھے۔“ وہ اسے پرے دھکیل کر زور سے بولی تو اس نے ایک دم
سے اس کا ہاتھ چھو ڈیا۔
”آپ کہیں بھی چلی جائیں۔ آپ کا ہر راستہ مجھ تک آئے گا۔ اور یہ ہر بار اتفاقاً نہیں ہوتا۔ ستر ہے ہم کہیں
بیٹھ کر بات کر لیں میں صرف یہ چاہتا ہوں۔“
وہ بولتا ہوا اب اس کے برابر چل رہا تھا۔

”مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی؟“ وہ اس سے آگے نکلنے کی کوشش میں اب تقریباً دوڑ رہی تھی۔
”پلیز آہستہ چلیں لوگ سمجھیں گے شاید ہم دونوں کسی میراٹھن میں حصہ لینے جا رہے ہیں۔ سب ہماری
طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔“ اس نے ڈرایا اور وہ ڈر گئی۔

بے اختیار دوا میں بائیں دیکھنے لگی۔ لوگ گزر رہے تھے مگر ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں تھا۔
”مثلاً! میں آپ کو جواب دلا سکتا ہوں بہت اچھی نہیں لیکن ایک مناسب جواب۔ ایک اچھی اکیڈمی کو جو نیئر
ٹیچر کی ضرورت ہے اگر آپ کا موڈ ہو تو اس ایڈریس پر چلی جائے گا۔ آئی ہو آپ کا کام بن جائے گا۔ ظاہر ہے
اسٹڈیز کے دوران آپ ٹائمن ٹو فائینڈ والی جاب تو نہیں کر سکیں گی۔ فی الحال یہ اکیڈمی کی جاب آپ کو سوٹ کرے
گی۔“ کہہ کر وہ وزینگ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھا کر آگے بڑھ گیا مثال وہیں۔ کھڑی اس کو جلتی دیکھتی رہی۔
دوسری نظر اس نے وزینگ کارڈ پر ڈالی۔

”اس کو میرے بارے میں سب کچھ کیسے معلوم ہے۔ میرا نام چلو جواب ڈھونڈنے کا پتا تو اسے میرے بک ایڈو
کروانے پر ہو گیا۔ میں پڑھ رہی ہوں اسے یہ بھی معلوم ہے اور پتا نہیں کیوں میں اس سے بہت سختی سے پیش
نہیں آتی۔“

اور یہ تھیک کہتا ہے کہ ہم دونوں اتنی بار ٹکرائے ہیں کہ اب تو واقعی مجھے بھی اس کی عادت سی ہونے لگی ہے۔
پیلا کے گھر جب بھی آتی تھی میں انجانے پن میں اس کے کہیں نہ کہیں ملنے کی کیوں منتظر رہتی تھی۔“
وہ اب ست روی سے گھر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

یہ پبلک لائبریری عدیل کے گھر سے پیدل کے راستے پر تھی اور کوئی نہ کوئی کتاب ایڈو کروانے کے لیے وہ اکثر
شام کو ادھر آ جایا کرتی تھی اور آج تو سارا دن سارے گھر میں موت کا سا شکار رہا تھا۔ اس نے عفت کو لائبریری
آنے کا بتایا تو اس نے کوئی جواب بھی نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئی تھی۔

کل شام میں اس اکیڈمی جاؤں گی۔ مجھے اس کا نام بھی کچھ دیکھا۔ کھا لگ رہا ہے۔“
وہ کارڈ کو سرسری نظر سے دیکھ کر مٹھی میں دبا تی شام گہری ہونے کے احساس پر تیز قدموں کے ساتھ گھر کی
طرف چل پڑی۔

سارا گھر بیک ہو چکا تھا۔

بھاری فریج پر اور دوسرے سامان کو دو تین کمروں میں اکٹھا کر کے بحفاظت رکھ دیا گیا تھا۔
بہت سا سامان احسن کمال کے کہنے پر ضرورت مندوں میں یونہی دے دیا گیا تھا۔

ننگت سیمما اور عورت کی زندگی

میں ان دونوں سے محبت کرتا تھا اور وہ دونوں مجھ سے

زویا اور ماریہ۔ ایک میری پھوپھی زاد بھی اور ایک چچا زاد۔

ہم تینوں کا بچپن اکٹھے کھیلنے کودتے گزرا تھا۔ اس لیے کہ ہم تینوں ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ پھوپھی شادی کے دو سال بعد ایک سالہ زویا کو گود میں اٹھائے بیوگی کی سفید چادر اوڑھے مکے لوٹ آئی تھیں۔ دادا دادی چاہتے تھے کہ پھوپھی کی شادی کریں۔ مگر پھوپھی نے کہا۔

”آج کے بعد دوبارہ یہ بات مت کیجئے گا۔ میرے پاس میری زویا ہے۔ میں اپنی ساری عمر اس کے سارے گزار سکتی ہوں۔“

اس وقت سب خاموش ہو گئے تھے کہ ابھی نیا نیا زخم ہے بھرنے میں وقت لگے گا لیکن کچھ زخم بھی نہیں بھرتے۔ پھوپھی نے بھی نصر پھوپھا کے ساتھ جو عہد کیا تھا اسے تا عمر نبھایا۔ سو میں نے ہوش سنبھالنے پر پھوپھی کو اپنے گھر میں ہی دیکھا تھا۔ اس وقت میری عمر چار سال تھی۔ میں اپنے دو بھائیوں سے چھوٹا تھا اور میری کوئی بہن نہیں تھی۔ دونوں بڑے بھائی طاہر اور فیب ایک دوسرے کے ساتھ گمن رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی مجھے اپنے کھیل یا سرگرمیوں میں شامل نہیں کیا تھا لیکن وہ دونوں مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ دونوں ہی مجھے اپنی چیزوں میں سے حصہ ضرور دیتے تھے۔

چچا کے دو ہی بچے تھے۔ دو سالہ ماریہ اور مجھ سے دو سال بڑا خرم۔ تو جب پھوپھی اس گھر میں آئیں تو ہم تینوں کے درمیان دوستی کا ایک بڑا مضبوط رشتہ بن گیا

تھا۔

میں اس وقت تک ناشتیا کھانا نہیں کھاتا تھا جب تک زویا اور ماریہ نہیں آجاتی تھیں۔ ایک بار زویا کو خسرہ نکل آئی تو پھوپھی اسے ناشتے پر نہیں لائیں۔ اس کے باوجود جب تک وہ اسے گود میں لے کر نہیں بیٹھیں میں نے کھانا نہیں کھایا۔ اس طرح ایک بار میں میڈیٹھوں سے گر کر زخمی ہو گیا تھا۔ میرے سر پہ

ٹانکے لگے تھے۔ اور میں اسپتال سے جب تک آ نہیں گیا تھا ماریہ نے کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ میری اماں چچی اور پھوپھی کے درمیان کوئی روایتی چپقلش نہ تھی۔ تینوں کے درمیان بہت اچھی اندر اسٹینڈنگ تھی۔

ہم تینوں بچپن سے نکل کر لڑکپن میں داخل ہوئے پھر لڑکپن سے جوانی میں، لیکن ہماری یہ مثلث اسی طرح قائم تھی۔ حالانکہ خرم نے کئی بار کوشش کی تھی اسے مربع بنانے کی، لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

ہم تینوں میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ ہم تینوں ہی ایک دوسرے کا بے تحاشا خیال رکھتے تھے۔ میں اگر زویا کے لیے کچھ خریدتا تو ماریہ کے لیے بھی ضرور لے کر آتا۔ وہ دونوں بھی میری سالگرہ اور میری چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کو بے حد اہتمام سے مناتیں اور میں بھی ہر چھوٹے بڑے موقع پر انہیں چھوٹے چھوٹے تحائف دیتا۔

ہم سمجھتے تھے شاید زندگی ایسے ہی گزر جائے گی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے زندگی بتادیں گے لیکن پہلی بار ہماری اس مثلث کے



خط اس وقت کمزور پڑے جب گھر میں میری شادی کی بات چلی۔

میں نے اسی سال ایم بی اے کیا تھا۔ ماریہ سائیکالوجی میں ماسٹر کر رہی تھی۔ زویا اس سے ایک سال پیچھے۔ مجھے ایم بی اے کرتے ہی فوراً "جواب مل گئی تھی۔ اماں اباج پر جانے سے پہلے میری شادی کرنا چاہتے تھے۔

"لیکن اماں! شادی کس سے کریں گی۔ وہ تو دونوں کا دیوانہ ہے اور دونوں اس کی۔" میری بڑی بھابھی بہت شوخ اور چلبلی تھیں۔ "کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے ضرور پوچھ لیجئے گا۔"

اور اماں نے مجھ سے پوچھ ہی لیا۔ "زین! ہم تمہاری شادی کے لیے سوچ رہے ہیں۔ کیا خیال ہے تمہارا۔" "ضرور سوچے اماں! میں نے کب منع کیا ہے۔" میں آئینے کے سامنے کھڑا اپنی ٹالی درست کر رہا تھا۔ یہ ٹالی اور ایک پرفیوم مجھے ماریہ نے جاب ملنے پر گفٹ کیا تھا۔

"تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہے زین!" "میں لڑکیوں پر نظر رکھتا ہوں آپ ایسا سمجھتی ہیں مجھے۔" میں نے آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے مصنوعی خفگی سے انہیں دیکھا۔ "میرا مطلب ہے یونیورسٹی کالج میں کبھی کوئی لڑکی پسند آئی۔"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے کبھی لڑکیوں سے دوستی نہیں رکھی۔" "تو پھر کیا ہم اپنی مرضی سے تمہارا رشتہ طے کر دیں تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا نا؟" "نہیں پیاری اماں! بالکل بھی نہیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر ان کی پیشانی چومی اور آفس جانے کے لیے گھر سے باہر نکل آیا۔

اس روز آفس میں کام کرتے ہوئے میرے دل میں گدگدی ہوتی رہی کہ صبح میں جلدی نکل آیا تھا اور میں نے زویا اور ماریہ سے یہ بات ڈسکس نہیں کی۔ خیر شام کو ضرور بتاؤں گا کہ اماں کیا سوچ رہی ہیں اور یہ کہ وہ مطمئن رہیں میری بیوی کے آجانے سے ہماری دوستی ہرگز متاثر نہیں ہوگی اور ہماری بڑائی اہنگلی کے خط ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوں گے۔

اماں نے میری پسند پوچھی تھی۔ اس لیے اس روز میں نے اپنے آفس میں کام کرنے والی لڑکیوں کو بھی تدریس دھیان سے دیکھا تھا۔ دو تو میری بھابھی کے ایک کا چہنچہا چلاتا میک اپ میری طبیعت پر انتہائی گراں گزرتا تھا اور ایک اگرچہ غیر شادی شدہ تھی لیکن ادھیڑ عمر تھی۔

مجھے بڑی ہنسی آئی کہ اب زین العابدین صاحب لڑکیوں کو پسند کریں گے۔ "نہیں بھئی یہ اماں کا شعبہ ہے۔ انہی کے پاس رہنے دیا جائے۔"

اس روز گھر آکر شام کے وقت لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے میں نے ان دونوں کو اماں کا خیال بتایا تو وہ دونوں ہی جیسے یکدم پر جوش ہو گئیں۔

اس روز وہ دونوں کتنی ہی دیر تک بیٹھی مختلف لڑکیوں کو ڈسکس کرتی اور رہ جھجکت کرتی رہیں۔ دوسری طرف اماں بڑی بھابھی چھوٹی بھابھی اور دونوں بھائیوں کے ساتھ کانفرنس کر رہی تھیں۔ "مجھے تو خیر دونوں ہی پیاری ہیں لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کے لیے چھوٹی پھیلاؤں۔"

"اماں! یہ بات آپ زین سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں۔ ویسے میرے خیال میں ماریہ بڑی ہے سو پہلا حق تو اسی کا بنتا ہے۔" چھوٹی بھابھی نے کہا تھا۔ "یوں بھی یہ اچھا فیصلہ ہو گا۔" بڑے بھائی بولے

تھے۔ "زویا کا خرم کے ساتھ اور ماریہ کا زین کے ساتھ رشتہ ہو جائے تو دونوں لڑکیاں گھر میں رہ جائیں گی۔" "یہ بات تو تم نے بہت اچھی کہی ہے طاہر۔" اماں خوش ہو گئی تھیں۔

"لیکن زین سے ضرور پوچھ لیجئے گا اماں! چھوٹے بھائی نے اب بھی اماں کو تاکید کی تھی اور اماں نے مجھ سے پوچھ لیا۔ کچھ دیر تک تو میں ہکا بکا سالماں کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں۔۔۔ گھر کی بچیاں ہیں دیکھی بھالی۔ انہیں رہنے بننے میں کوئی مسئلہ نہیں ہو گا اور ہمیں انہیں قبول کرنے میں اور پھر بچپن سے تمہارا ساتھ ہے۔ ان کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ تمہیں سمجھتی ہیں۔ ہم سب کا خیال تو ماریہ کے لیے ہے لیکن اگر تمہارا رجحان زویا کی طرف زیادہ ہو تو۔" "میرا رجحان؟" میں نے خود کو ٹولا۔ میرے لیے تو دونوں ہی برابر تھیں۔

"مایا یا زویا۔"

میرے لیے زویا اور ماریہ دونوں ایک جیسی تھیں۔ میں دونوں کو یکساں عزیز رکھتا تھا اور آج سے پہلے میں نے دونوں کے متعلق اس طرح کی کوئی بات نہیں سوچی تھی۔ اور شاید انہوں نے بھی اس طرح کبھی نہ سوچا ہو میری خاموشی پر اماں نے بڑے بھائی والی بات کہہ سنائی کہ اگر میں ماریہ کے حق میں فیصلہ دوں تو زویا کو چچی خرم کے لیے لے لیں گی۔ اس طرح دونوں لڑکیاں گھر میں ہی رہ جائیں گی۔ مجھے اپنی مثلث کا خیال آیا۔ پھر میں نے واقعی ماریہ کے حق میں ہاں کر دی۔ دوسری صورت میں ماریہ کو اس گھر سے رخصت ہونا پڑتا۔

اماں خوش ہو گئیں اور فوراً "ہی پورے گھر میں بات پھیل گئی۔" "مجھے پہلے ہی پتا تھا زین ماریہ کو پسند کرے گا۔" چھوٹی بھابھی بڑی بھابھی سے کہہ رہی تھیں۔

وہ دونوں اس وقت کچن میں تھیں اور میں فریج سے پانی کی بوتل لینے آیا تھا۔ "کیوں تمہیں الہام ہوا تھا۔" بڑی بھابھی نے ذرا جھکے انداز میں پوچھا تھا۔

"مایا دراصل گوری چنی ہے اور زویا سانولی سی۔" چھوٹی بھابھی نے اپنے تیش بڑی نموس ویل دی۔ دراصل انہیں گورے رنگ کا میکاپ تھا لیکن مجھے نہیں میں نے تو کبھی اس بات پر دھیان بھی نہیں دیا تھا کہ زویا سانولی ہے اور ماریہ گوری۔ دونوں ہی پرکشش تھیں۔

"اور میں زین کی جگہ ہوتی نا تو دونوں سے ہی شادی کر لیتی۔" بڑی بھابھی نے شوخی سے میری طرف دیکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ چکی تھیں۔ "تمہیں فیصلہ کرنا تو بہت ہی مشکل ہوا ہو گا زین!" بڑی بھابھی بخور مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"نہیں تو۔" میں فریج سے بوتل نکال کر مڑا۔ "مجھے اماں اور بھائی صاحب کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ وہ بڑے ہیں بہتر سمجھتے ہیں۔"

لاہور کے لیے خصوصی ٹرک

کے لیے خصوصی ٹرک



پیشہ ورانہ شادی

قیمت - 350 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی

”کیا تمہیں زویا کا خیال نہیں آیا زین؟“ مجھے بھابھی کا لہجہ عجیب سے لگا۔

”کیسا خیال؟“
”یہی کہ تم نے مایا کو منتخب کیا تو وہ ہرٹ ہوگی؟“
”کمال کرتی ہیں بھابھی آپ۔ وہ دونوں تو خود کوئی دنوں سے زور و شور سے میرے لیے لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں۔“

”عجیب ہو تم تینوں بھی۔“
بھابھی سر جھٹک کر پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئیں اور میں پانی کی بوتل لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

اس رات باہر لان میں ٹہلتے ہوئے مجھے مایا کچھ اداس اور خاموش سی لگی تھی اور زویا نارمل۔
میں نے دو تین بار مایا سے پوچھا۔ اور اس نے چونک کر کہا تھا۔ ”ماں ٹھیک ہوں۔“
”زویا! یہ چیٹنگ ہے نا۔ سراسر چیٹنگ کہ مایا کے دل میں کوئی بات ہے اور یہ ہم سے شیر نہیں کر رہی۔“

”تو کیا تم نے چیٹنگ نہیں کی کہ ہمیں بتایا تک نہیں اور ہم خواہ مخواہ تمہارے لیے لڑکیاں تلاش کرتے رہے بلکہ میں نے تو ایک لڑکی فائنل بھی کر دی تھی۔ وہ تو زویا کو اچھی نہیں لگی تھی ورنہ۔“
وہ قدرے اندھیرے میں تھی جبکہ برآمدے میں گے بلب کی مدھم روشنی زویا کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

”مجھے تو خود آج ہی چار گھنٹے دس منٹ پہلے پتا چلا تھا جب میں اپنے کمرے میں تھا اور اماں نے آکر بتایا تھا کہ ان لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔“

”تو تمہیں اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا؟“ مجھے مایا کی آواز بھیگی بھیگی سی لگی۔
”اف یہ لڑکیاں۔ ویسے شادی کے لیے مری جاتی ہیں اور جب شادی ہونے لگتی ہے تو رونا دھونا شروع کر دیتی ہیں۔“
ایک بار نہ جانے کس بات پر چھوٹے بھائی نے کہا

تو اماں نے کہا تھا۔

”بابل کا گھر چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔“
لیکن مایا سے تو بابل کا آنگن نہیں چھینا جا رہا تھا۔ وہ تو اسی آنگن میں رہتی۔ بس کمرہ بدل جاتا تھا۔ اپنے کمرے سے اٹھ کر میرے کمرے میں آ جاتی۔ پھر کیوں اس کی آواز بھیگی بھیگی سی تھی۔

”نہیں! بھلا مجھے کیوں اعتراض ہوتا۔ اماں مایا بھائی جو بھی فیصلہ کرتے۔ چاہے وہ تم ہو تم زویا یا کوئی اور۔“
اس نے ایک گہری سانس لی۔

”کیا تمہیں اعتراض ہے؟“
”نہیں اور اصل۔ میں نے اس سے پہلے اس طرح کبھی نہیں سوچا تھا۔“
”سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا، لیکن کیا یہ زیادہ اچھا نہیں ہے کہ کسی اجنبی سے ہونے کے بجائے کسی ایسے سے شادی ہو جو آپ کو اچھی طرح جانتا ہو۔“

آپ کی پسند ناپسند ہر چیز کا پتا ہو اسے۔
”کیا تمہیں میری پسند ناپسند کا پتا ہے زین!“
”مجھے نہیں تو کس کو پتا ہو گا۔“ میں ہنس پڑا۔
”صوبلا“ تو تمہیں مجھ سے شرمنا چاہیے تھا، لیکن تم ہو کہ پڑ پڑا تمہیں کیے جا رہی ہو۔ کیوں زویا؟“
”ہاں۔“ زویا مسکراتی ”بلکہ اسے تو اب تم سے پرہ کرنا چاہیے۔“

مدھم روشنی میں میں نے اس کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ پھپھکی پھپھکی سی لگی۔ یہ اس مسکراہٹ سے مختلف تھی جو پہلے اس کی بے حد دلکش آنکھوں میں دکتی تھی پھر ہونٹوں پر کھلتی تھی۔ مایا چلی گئی تھی۔

”اے۔۔۔ شرماری ہو؟“
میں نے اسے آواز دی تھی لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ پھر بہت دیر تک میں اور زویا ٹھٹکتے رہے اور باتیں کرتے رہے تھے۔ میں نے زویا کو بتایا کہ اماں کہہ رہی ہیں کہ وہ اور خرم۔
خرم جو کبھی ہماری مثلث توڑ کر مربع نہیں بناسکا تھا

اب بنانے والا تھا۔

زویا نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شاید اسے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ خرم انجینئر تھا اور ایک بہت اچھی کمپنی میں جاب کر رہا تھا۔

گھر کا ہر فرد خوش تھا۔ گھر میں میری شادی اور زویا کی منقنی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ زویا کی بڑھائی ختم ہونے میں ابھی پورا اسل تھا اور خرم کو اس کی کمپنی دو سال کے لیے سعودیہ بھیج رہی تھی سنی الحال زویا کی منقنی ہو رہی تھی۔

بھابھیوں کے بازار کے چکر لگ رہے تھے۔ زویا مایا بھی ان کے ساتھ ہی جاتی تھیں اور اب کم ہی نظر آتی تھیں اور ابھی شادی کی تاریخ طے ہی کی گئی تھی کہ میرا سفر کراچی ہو گیا۔ جس روز میں جا رہا تھا اس روز بھی مجھے وہ دونوں ہی نظر نہیں آئی تھیں۔

”بھئی شادی میں ایک ماہ ہے اس لیے مایا کا تو تم سے پرہ ہے اور رہی زویا کی بات تو وہ غالباً“ مایا کے کمرے میں ہے۔ اس کے دوپٹوں پر گونا گونا ٹانگ رہی ہے۔ اس لیے تم ادھر نہیں جا سکتے۔“
”اچھا۔ زویا کو تو بلا دیں پھر ناراض ہوگی کہ مجھ سے مل کر نہیں گیا؟“

اور بھابھی کے بلا نے پرہ افزا تفری میں آئی اور پھر خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔

میں نے حساب لگایا۔ آج سے ٹھیک آٹھ دن پہلے لان میں ان کے ساتھ ٹھل رہا تھا اور یہ وہی دن تھا جب اماں نے مجھے مایا کے متعلق اپنا فیصلہ بتایا اور میں نے اسے کر دیا تھا۔

”ان آٹھ دنوں میں میں بہت بڑی ہو گیا تھا۔ اکثر گھر پر بھی لیپ ٹاپ پر کام میں مصروف رہتا تھا، لیکن ایسا تو پہلے بھی ہوتا تھا اور تب وہ دونوں ہی میرے کمرے میں آ جاتی تھیں، لیکن اب ان آٹھ دنوں میں شاید دو یا تین بار ہی میں نے مایا اور زویا کو دیکھا تھا۔“

خیر میں کراچی چلا گیا اور اپنی شادی سے صرف دو

دن پہلے آیا۔ میں زویا کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو میں نے بھابھی سے پوچھ ہی لیا۔

”اے وہ تو مایا کے ساتھ پار لڑ گئی ہے۔“
”نہیں۔ لیکن میری شادی تو پر سوں ہے۔“
”تو پر سوں ہی ہوگی نا۔“ بڑی بھابھی ہنسیں۔

اور میری ملاقات زویا سے پھر اگلی صبح ہی ہو سکی تھی کیونکہ میں بے حد تھکا ہوا تھا اور سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی۔ میں کمرے سے نکل کر کچن میں آیا کہ اگر وہاں کوئی ہو تو اسے چائے کے لیے کہوں۔ زویا کھڑی چائے بنا رہی تھی۔

”کہاں عتاب ہو بھئی۔ میں کل سے آیا ہوں اور تم نظر نہیں آرہی۔“

”ہم جب آئے تو تم سو چکے تھے۔“
اس نے بس ایک نظر ہی مڑ کر مجھے دیکھا تھا اور پھر پیالیوں میں قہوہ ڈالنے لگی۔

”میرے لیے بھی ایک کپ بنا دو۔“
”تمہارے لیے ہی بنا رہی ہوں۔“ اس نے مڑ کر مجھے نہیں دیکھا۔

”دوسری محترمہ کا کیا حال ہے۔ کیا اب ان کا دیدار شادی کے بعد ہی ہو گا؟“
”یقیناً۔“

اس نے چائے بنا کر کپ مجھے پکڑایا اور دو سرا کپ اٹھا کر یہ کہتے ہوئے نکل گئی۔

میں چائے کا کپ لیے اپنے کمرے میں آیا تو وہاں چھوٹے بھائی بیٹھے تھے۔

”میں نے تمہاری بھابھی سے کہا ہے، ہم دونوں کا ناشتا ادھر ہی لے آئیں پھر کہیں جانا ہے۔“
”کہاں؟“

”یار لہو زنی سے تمہارے کپڑے اٹھانے ہیں۔“
”اچھا ناشتا کر کے شیوینالوں۔۔۔ پھر چلتے ہیں۔ میں جوتے نہیں لے سکا۔ ٹائم نہیں ملا تھا۔“

”ایک کام کہا تھا۔ وہ بھی نہیں ہو سکا۔ خیر جارہے ہیں تو لے لیں گے۔ لیکن شیو وغیرہ مت کرو

اب کل ہی کرنا دہا بننے سے پہلے۔ وہ مسکرائے۔
”تم خوش تو ہوتا؟“

میں چائے پی رہا تھا جب انہوں نے اچانک پوچھا تو
میں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
”میں نے اماں سے کہا تھا، تم سے ضرور پوچھ
لیں۔“

”ہاں پوچھا تو تھا انہوں نے۔“
”اچھا۔۔۔ میرا خیال تھا شاید تم زویا سے؟ میرا
مطلب ہے تم زویا کو پسند کرتے ہو؟“

☆ ☆ ☆

اس وقت تو مجھے چھوٹے بھائی کی بات صحیح نہیں
لگی تھی لیکن ٹھیک ایک سال ایک ماہ دس دن بعد
میں سوچ رہا تھا چھوٹے بھائی نے کتنا صحیح کہا تھا۔
یعنی میں نے اتنا عرصہ اس غلط فہمی میں گزار دیا کہ
میں مایا کے ساتھ بہت خوش گوار ازدواجی زندگی گزار
رہا ہوں۔ ویسے تو اس میں کچھ اتنا جھوٹ بھی نہیں
تھا۔ میری زندگی بہت خوش گوار تھی۔

مایا دلہن بن کے بے حد حسین لگ رہی تھی جب
اسے اسٹیج پر لایا گیا تھا تو میں ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔ مگر وہ
مجھے اداس سی لگی تھی حالانکہ اسے بہت دور نہیں جانا
تھا۔ مگر شاید لڑکیاں اتنی نازک دل ہوتی ہیں کہ اس
موقع پر دل بھر ہی آتا ہے۔

کچھ دیر بعد زویا کو بھی اسٹیج پر لایا گیا تھا وہ بھی غضب
ڈھا رہی تھی۔ اس کی بے حد خوب صورت آنکھیں
بیونیش نے اور بھی قابلِ بنا دی تھیں۔

اسے مصنوعی پلکوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی
اپنی پلکیں ہی اتنی خوب صورت تھیں۔ جی، کھنی
مڑی ہوئی جیسے خوب صورت جھیلوں کے گرد سیاہ
جنگل۔

وہ دونوں میرے دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔ میرا
نکاح ہو چکا تھا اور اب زویا کو انکو بھی پہنائی جانی تھی
۔ انکو بھی چچی نے پہنائی۔ کیونکہ خرم سعودیہ میں تھا۔
زویا زیادہ دیر نہیں بیٹھی تھی، منگنی کی تقریب کے

فورا بعد اٹھ گئی تھی۔ مایا میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔
دیکتی گلابی رنگت والی سب ہی دلہن کی تعریف کر رہے
تھے۔

اور پھر ولیمہ والے دن بھی وہ مجھے سب سے الگ
اور منفرد لگی۔ اس کی سادہ رنگت میں بلا کی ملاحیت
تھی جو میک اپ سے دکھائی نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

نارائن میں دریائے کنہار کے کنارے بیٹھ کر اس
میں پتھر پھینکتے ہوئے، جھیل سیف الملک کی طرف
جاتے ہوئے، میرا ہاتھ پکڑ کر گلشیر چلتے اور تنک
پگڈنڈی پر آگے پیچھے چلتے ہوئے لالہ زار کی بلندیوں پر
بیٹھے ہوئے مجھے ایک بار بھی وہ اتنی خوش نہیں لگی تھی
جتنا کہ اسے لگنا چاہیے تھا۔

”مایا! کیا تم یہاں اگر خوش نہیں ہو۔ کیا تم کہیں
اور جانا چاہتی تھیں؟“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے یاد تھا جب پہلے ہم یہاں آئے تھے۔ تو تم
نے کہا تھا۔ کاش میں پھر کبھی یہاں آسکوں۔ میں نے

تب ہی یہاں کارپورگم بنایا تھا حالانکہ چھوٹے بھائی
کہہ رہے تھے بھور بن چلے جاؤ لیکن اب مجھے لگ رہا
ہے جیسے تم خوش نہیں ہو میں یہاں آکر۔ ہیں نا۔“

”میں خوش ہوں لیکن پہلی بار جو ایکسٹنشن ہوتی
ہے وہ دوسری بار تو نہیں ہو سکتی نا۔“

”ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ مجھے اس کی بات صحیح
لگی۔

سو میں نے مزید کسی بات پر غور نہیں کیا۔
مایا کے متعلق کوئی بھی شخص پورے یقین سے کہہ
سکتا تھا کہ وہ بہت اچھی بیوی ہے۔ وہ میری بیوی تھی

میری دوست اور غمگسار تھی۔ ہماری زندگی بہت
پر سکون تھی۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی تھی۔ مجھے ہر چیز
تیار ملتی، میرے کپڑے، جوتے، میرے آفس کے

کاغذات فائلیں سب۔
وہ کھانا بہت عمدہ پکاتی تھی۔

مجھے ذرا سا زکام بھی ہوتا تو وہ ساری رات جاگتی

تھی۔ اور جب اسے کوئی تکلیف ہوتی تو میں بھی سونہ
پاتا۔ مثالی زندگی تھی ہماری لیکن پھر بھی کبھی بہت
خالی بن لگتا تھا۔ ایک بار میں نے مایا سے کہا۔

”تیار! تم کیسی بیوی ہو کبھی لڑتی شوقی نہیں ہو۔ نہ
کوئی فرمائش نہ کوئی ضد۔“

”ہم بچپن سے اکٹھے رہتے آ رہے ہیں۔ کیا پہلے
کبھی تم نے سالوں میں ہماری لڑائی ہوئی؟“

”لیکن اب تو تم بیوی ہو۔ بیویوں کا تو حق بنتا ہے
لڑنا۔“

میں شاید اس خاموشی اس سکون کو توڑنا چاہتا تھا جو
کبھی کبھی مجھے بے طرح محسوس ہوتی تھی۔

”لیکن میں تم سے لڑ نہیں سکتی۔ کبھی بھی
نہیں۔“ مایا اس لمحے مجھے بڑی اداس لگی۔

”اچھا۔۔۔ میں اگر دوسری شادی کر لوں تب بھی
نہیں؟“ میں نے سرو کے نیچے ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا
کر پوچھا۔

”تب بھی نہیں۔ کیونکہ مجھے پتا ہے تم دوسری
شادی کبھی نہیں کرو گے۔“

”اور اگر مجھے کسی سے محبت ہو جائے تو؟“
وہ ہنس پڑی۔

”تمہیں کسی سے محبت نہیں ہو سکتی۔“ اس کے
یقین پر میں مسکرا دیا۔

”تم صحیح کہتی ہو مجھے اپنے ماں باپ اور بھائیوں
کے علاوہ اگر کسی سے محبت ہوتی تو وہ صرف تم اور زویا

ہو۔ لیکن جب تک تم سے شادی نہیں ہوئی تھی اس
محبت کی نوعیت مختلف تھی، لیکن اب تم میری زندگی

میں شامل ہو گئی ہو زویا ہمارے درمیان سے نکل کر اپنا
الگ زاویہ بنالے گی خرم کے ساتھ، لیکن ہمارے

درمیان وہ ابتدائی محبت کبھی ختم نہیں ہوگی جس کی
جزیر ہمارے اندر ہیں۔“

”بچپن کی محبتوں کی ڈیمانڈ اور ہوتی ہے اور جوانی کی
محبتوں کی اور۔“ پتا نہیں اس نے کیوں کہا تھا۔

میں اس کی بات نہیں سمجھا تھا، لیکن میں نے اس
کی تائید ضرور کی تھی۔

آج ہمارے درمیان روزمرہ کے معمولات سے ہٹ کر
باتیں ہو رہی تھیں۔ شادی سے پہلے مایا اتنی کم گو نہیں
تھی، جتنی اب ہو گئی تھی۔ میں بھی کچھ سنجیدہ ہو گیا
تھا۔ میں بھی پہلے بہت بولتا تھا۔ ہماری باتیں ختم ہی نہ
ہوتی تھیں۔ جب تک ہم تینوں ایک دوسرے کو دن
بھر کی روداد سنانے لیتے، ہمیں چین نہ آتا تھا۔ لیکن اب
میں گھر آتا تو کھانا کھاتے لی وی دیکھتے کبھی مجھے۔
اسے دفتر میں گزرے دن کا احوال سنانے کا خیال نہ آتا
تھا اور نہ ہی مایا نے مجھے کبھی بتایا تھا کہ دن بھر اس نے
کیا کیا۔ فارغ وقت میں کیا کرتی ہے۔

☆ ☆ ☆

کرچی میں تقریباً ایک سال رہنے کے بعد مجھے
واپس لاہور بلوا لیا گیا۔ لاہور واپس جانے کا سن کر مایا
بے حد خوش ہوئی تھی۔ ہم جب گھر پہنچے تو زویا
یونیورسٹی میں تھی۔ ایک ماہ بعد اس کے فائنل پیپرز
ہونے والے تھے۔

ہم سب لاؤنج میں بہت دیر تک بیٹھے باتیں کرتے
رہے تھے۔ چچی کھانے کا انتظام کرنے کے لیے کچن
جانے لگیں تو مایا بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ دونوں

بھابھیاں پہلے ہی کچن میں تھیں۔ میں کچھ دیر اماں آیا
اور پچاسے باتیں کرتا رہا اس دوران بڑی بھابھی اور
چھوٹی بھابھی نے دو بار چائے بھجوائی تھی۔

”ارے ہو! بیچ بھی کرنا ہے اس نے۔“ چھوٹے
پچانے بڑی بھابھی سے کہا جب وہ دوسری بار چائے
لائیں تو۔

”چچا جان! یہ چائے ان کی نصف بہتر بھجوا رہی
ہیں۔“

اس لمحے مجھے مایا پر بہت پیار آیا۔ وہ جانتی تھی کہ
میں کراچی آنے کے بعد چائے زیادہ پینے لگا تھا۔ اپنی

اماں سے باتیں کرتے ہوئے بھی اسے میرا خیال تھا۔
”بیٹا تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔ پھر کھانے پر ملاقات
ہوتی ہے۔“ چچا اٹھے تو میں بھی ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا

لاؤنج سے باہر آیا تو تھکی تھکی سی زویا اندر آ رہی تھی۔

کشاہ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔
”زویٰ۔“

میں بے اختیار اس کی طرف بڑھتا تھا۔

”زین۔ کیسے ہو۔“
اس نے اپنی لمبی تھنی پلکیں اٹھائیں وہ کھنی لابی پلکیں جنہیں دیکھ کر مجھے سیاہ گھیرے جنگلوں کا خیال آتا تھا۔

مجھے اس کی آنکھیں سیاہ بادلوں کی طرح لگیں جو پانیوں سے بھرے ہوتے ہیں یا پھر نجد جھیلیں جن کے نیچے بہت سارا پانی ہوتا ہے۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس کی طرف۔ اور پھر جیسے کائنات کی گردش ختم گئی تھی کائنات میں صرف ہم دونوں تھے اس پاس کے سب مناظر۔ دھند میں گم ہو گئے تھے۔ میرا دل کسی انوکھی تال پر رقص کر رہا تھا۔

میں سحرزدہ سال سے دیکھ رہا تھا اور وہ میری آنکھوں کے سحر میں گرفتار ہو گئی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اسے گلے لگا لوں۔ اسے اپنے بازوؤں میں بچھڑا لوں اور اس طرح ملوں جیسے برسوں سے بچھڑے ملتے ہیں۔ لیکن میں ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہا اور وہ مجھے دیکھتی رہی پھر شاید کسی کی ہنسی کی آواز آئی تھی۔ شاید بڑی بھابھی کی۔ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بہت ہنسی آتی تھی۔ اس نے چونک کر نظریں جھکائیں اور طلسم ٹوٹ گیا۔

”تم کیسی ہو زویا!“

مجھے اپنی آواز خود اجنبی سی لگی تھی جیسے اس میں ہزاروں آنسو ہوں۔ کسی بہت اپنے کے پھڑ جانے کھوجانے کے غم میں بننے والے آنسو۔

”ٹھیک ہوں۔“

”کمزور لگ رہی ہو۔“

”ہاں نہیں تو۔ ٹھیک ہوں۔“

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور میں نڈھال سا اپنے کمرے میں آکر بیڈ پر گر گیا۔
گیا ہمارے پاس کرنے کے لیے کوئی بات نہیں

تھی۔ ایک سال بعد ملنے کے باوجود ہمارے پاس کرنے کے لیے کوئی بات نہیں تھی؟
وہ کیوں نہیں؟

اس نے مایا کا بھی نہیں پوچھا۔
”مجھے میرا خیال تھا شاید۔ تم زویا کو پسند کرتے ہو۔“

چھوٹے بھائی جان کی آواز میرے کانوں میں گونجی اپنی شادی کے ٹھیک ایک سال نو دن بعد مجھے احساس ہوا کہ دراصل میں زویا کی محبت میں مبتلا ہو گیا اور۔ محبت بھی ایسی جو عشق جیسی ہو۔

جسم و جاں کو جلائی تڑپاتی۔
میرے اندر خاموشیاں اتر آئی تھیں۔

میرے اور مایا کے درمیان جو تھوری بات چیت ہوتی تھی وہ بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ اور یہاں اس گھر میں بطور خاص مجھے اسے مخاطب کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ ناشتا کھانا سب کے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ کر کھالیا جاتا۔

رات کو جب تک وہ فارغ ہو کر کمرے میں آتی تو میں سوچکا ہوتا۔ یا کسی کام میں مصروف ہوتا اور زویا۔ اس سے بھی بہت کم نہ ہونے کے برابر بات ہوتی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں بند رہ کر پڑھتی رہتی تھی۔

کبھی کھانے کی ٹیبل پر وہ نظر آتی تو میری نظریں اسے اپنے حصار میں لے لیتی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا بس اسے دیکھتا رہوں۔ مایا کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی۔

میں تو سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے صرف زویا کو ہی دیکھتا تھا۔ وہ میرے سامنے نہیں ہوتی تو بھی میرے تصور میں رہتی تھی۔ ہر آن ہر لمحہ۔

میں ہر روز خود سے عہد کرتا کہ کل سے مایا پر زیادہ توجہ دوں گا اور زویا کو سوچوں گا بھی نہیں، لیکن زویا کونہ سوچتا میرے اختیار میں نہیں تھا اور مایا۔ میں زبردستی

دوبار اس کے ساتھ باہر بھی گیا کھانا کھانے، لیکن ہمارے درمیان خاموشی نہ ٹوٹی۔
”کبیا بات ہے مایا! یہاں آکر تم کچھ زیادہ ہی خاموش نہیں ہو گئی ہو۔ میں تو ترس گیا ہوں تمہاری آواز سننے کو۔“

میں نے کوشش کی تھی کہ ہمارے درمیان جو فاصلے پیدا ہوتے جا رہے ہیں ختم ہو جائیں۔ اس نے بس ایک نظر مجھے دیکھا۔

”تم خود ہی بہت مصروف رہتے ہو زین!“
میں اندر ہی اندر شرمندہ ہو گیا لیکن اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے ہنسا تھا۔

”نہیں یار! تم بھی تو بہت مصروف رہنے لگی ہو۔“
میں اس کا خیال ذہن سے جھٹکنے کے لیے مایا کے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرتا تو وہ عجیب نظروں سے مجھے دیکھتی۔

میں نے شاید کبھی بھی صحیح فیصلہ نہیں کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں بازار سے کوئی چیز پسند کر کے لے آتا مگر گھر آکر مجھے وہ ناپسند ہو جاتی تھی اور پھر شور ڈالتا کہ یہ واپس کر دو مجھے کچھ اور لیتا تھا۔ لیکن مایا اور زویا کوئی چیز نہیں تھیں کہ میں کہتا مجھے مایا نہیں چاہیے۔ زویا دے دو۔

یہ کیا ہو گیا تھا کہ میں خود سے ہی نظریں چرائے پھرتا۔ آفس سے اٹھتا تو سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا پھرتا۔

”کہاں ہوتے ہو یار۔“ ایک روز چھوٹے بھائی نے مجھے پکڑ لیا۔ ”تمہارا آفس کیا رات کو بھی کھلا رہتا ہے۔“

اس روز میں رات دیر سے گھر میں داخل ہوا تھا۔ ”نہیں، بس یونہی ایک دوست کے پاس چلا گیا تھا۔“

حالانکہ میرے کوئی دوست نہیں تھے۔ جیسے زویا اور مایا کی کوئی خاص مہمہملا نہیں تھیں۔ ہم نے کبھی کسی اور کو دوست بنانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

”کیا کوئی بات تمہیں پریشان کر رہی ہے برادر۔“
چھوٹے بھائی کی نظریں بہت تیز تھیں۔

”نہیں تو۔“ میں نے نظریں پھرائیں۔
”تم دونوں۔ میرا مطلب ہے تم اور مایا خوش تو ہوتا ایک دوسرے کے ساتھ۔“

”ناخوش ہونے کی تو کوئی بات نہیں ہے بھائی!“
تب ہی میں نے زویا کو اپنے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف جاتے دیکھا اور میری نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔

چھوٹے بھائی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
”کوئی ایسی غلطی مت کرنا زین! جس سے پورے خاندان کی بنیادیں مل جائیں۔“

اپنی بات کہہ کر وہ رکنے نہیں تھے اور میں سُن ہو گیا تھا۔ یہ چھوٹے بھائی نے کیا کہا تھا۔

چھوٹے بھائی کی نظر بہت گہری تھیں۔ وہ اس وقت بھی جانتے تھے جب میں نہیں جانتا تھا۔ اور اب بھی وہ جانتے تھے جو میرے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

چھوٹے بھائی کی تنبیہ کے بعد میں نے زویا کی طرف دیکھا ہی چھوڑ دیا۔ کھانے کی بڑی سی ٹیبل پر بھی میں اس طرح بیٹھتا کہ زویا پر براہ راست میری نظر نہ پڑے، لیکن کیا دریاؤں پر بند باندھے جاسکتے ہیں؟

لیکن میں بند باندھ رہا تھا اور ہر بار پانی کا کوئی زور آور رپا آکر اس بند کو توڑ دیتا تھا۔

اس روز زویا تیار ہو کر پورچ میں کھڑی تھی۔ اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ اس کے پیچڑ شروع ہو چکے تھے۔ میں آفس جانے کے لیے نکل رہا تھا۔

”کھڑی کیوں ہو زویا؟“

”بڑے بھائی کا انتظار کر رہی تھی۔“

”بڑے بھائی تو ابھی اٹھے ہیں ناشتا کر رہے ہیں تمہیں دیر ہو جائے گی۔ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔“
وہ تھوڑا سا جھجکی لیکن پھر خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں ہمارے درمیان عجب سی جھجک آگئی

تھی۔ ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی ہمارے درمیان اس طرح کی اجنبیت دور آئے گی۔

”تمہاری تیاری کیسی ہے زویٰ!“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”واپسی پر بھی میں تمہیں پک کر لوں گا۔ کتنے بجے پیپر ختم ہوگا۔“

”بارہ بجے۔ لیکن میں چلی جاؤں گی۔“

”نہیں میں بچ کے لیے انھوں گا تو تمہیں گھر چھوڑ دوں گا اور صبح بھی تمہیں ڈراپ کر دیا کروں گا۔ خواہ مخواہ پوائنٹ کے لیے خوار ہونے کی ضرورت نہیں۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اور مجھے جواب کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں ہر روز صبح اسے لے جانے لگا تھا۔ ہمارے درمیان دو تین مختصر جملوں کے اور کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔

اس روز اس کا آخری پیپر تھا۔

”تحنیک گاڈ۔ آج جا کر خوب سوؤں گی۔“

اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

”یعنی آج فارغ ہو گئی ہو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“

”تو چلو آؤں کریم کھلاتا ہوں تمہیں۔“

اس سے پہلے بھی بہت دفعہ ہم آؤں کریم کھانے گئے تھے لیکن آج اس نے فوراً ”نہی“ میں سر ہلایا تھا۔

”نہیں۔ نہیں زین گھر ہی چلو۔“

لیکن میں نے گاڑی کا رخ اپنے پسندیدہ آؤں کریم پارکر کی طرف کر دیا تھا۔ ہم زیادہ تر شام یا رات کو آتے تھے اس وقت دن کے ساڑھے بارہ بجے وہاں بالکل بھی رش نہیں تھا۔

میں نے بیٹھتے ہی اس کے اور اپنے پسندیدہ فلیور کا آرڈر دیا۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

اس کی لائنی پلکوں کا سایہ اس کے رخساروں پر پڑ رہا

تھا۔ میں مبسوت سا اسے دیکھے جا رہا تھا۔ گرد و پیش سے بے خبر۔

یہ میرے ساتھ کیا ہو گیا تھا۔ میں نے کیا کھو ہوا تھا۔ میرا دل بالکل خالی تھا اور اندھے پالے کی طرح کھوئی ہوئی چیزیں بھی کبھی مل بھی تو جاتی ہیں۔ میرے سامنے پڑی آؤں کریم پھل رہی تھی اور میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔

”کیا مجھے بھی میری کھوئی ہوئی چیز مل جائے گی۔“

میری محبت۔ میری زویٰ۔

زویا نے آؤں کریم کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ میرا ارتکاز ایک لمحے کے لیے ٹوٹا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں پھر اسے دیکھ رہا تھا۔

”زویٰ۔“

میں میرے ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا آگے جھکا ہوا تھا۔

”مجھے پتا۔ کیوں نہیں چلا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ محبت نہیں عشق۔“

”تم شروع سے ہی ایسے تھے۔ تمہیں ہمیشہ بعد میں پتا چلتا تھا کہ کیا ہونا چاہیے۔“

اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائی تھیں۔

”لیکن اب ان سب کا کیا فائدہ۔“

”میں تمہیں بتانا چاہتا تھا۔ نہ بتاتا تو میرا دل پھٹ جاتا۔“

”مجھے پتا تھا۔ پہلے سے پتا تھا۔“

اس نے آؤں کریم کب نیل پر رکھ دیا۔

”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں زویٰ۔ تم نے بھی اور مایا نے بھی۔ کسی نے کچھ نہیں بتایا۔“

”فیصلے کا اختیار تمہارے ہاتھ میں تھا زین! اور اب اسے نبھانا بھی تم نے ہی۔“

وہ یک دم کھڑی ہو گئی تھی۔

”تم نے جو فیصلہ کیا مایا اور میں نے اسے قبول کر لیا۔ کیونکہ ہم نے کبھی تمہاری کسی بات کو دوس

اون نہیں کیا تھا۔ حالانکہ مایا تو۔“

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”فیصلہ میں نے نہیں کیا تھا زویا! میں نے تو سب

کے فیصلے کو تسلیم کیا تھا۔“

”ہاں، لیکن تمہیں اختیار دیا تھا کہ تم اس فیصلے کو تسلیم نہ کرتے۔ کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔“ وہ آگے بڑھ گئی۔

”زویا! ایک بات بس ایک بات اور بتا دو۔“ میں تیز حیر چلتا اس کے ہم قدم ہوا۔

”کیا تم بھی۔ تم بھی ایسا ہی چاہتی تھیں کہ تم اور میں؟“

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا، لیکن اس کی لرزئی پلکوں اور آنکھوں میں پھیلتی نمی سے مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

”مایا بہت اداس رہتی ہے۔“ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ ”اسے خوش رکھنے کی کوشش کیا کرو۔“

یہ مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ۔

اس نے اس رشتے کے حوالے سے مجھے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اس کے دل نے حسان کو پسند کیا تھا جو اس کی کسی کلاس فیلو کا بھائی تھا۔

میں نے اسے آڑے ہاتھوں لے لیا کہ مجھے کیوں نہ بتایا۔ میں خود حسان سے ملتا اور چچا چچی سے بات کرتا۔

”میں نے سوچا اگر میں نے انکار کر دیا تو تم ہرٹ ہو گے۔ شاید تمہیں بہت دھچکا لگے تو اور میں حسان سے کوئی ایسی شدید محبت نہیں کرتی تھی وہ بس اچھا لگتا تھا مجھے۔“ اور میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

”تم نے یہ اچھا نہیں کیا مایا؟“

”تم نے بھی تو اچھا نہیں کیا زین! اپنے ساتھ زویا کے ساتھ۔“

اور ہمارے پاس بات کرنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔

زویا کی شادی ہو گئی۔ چچا کی طبیعت خراب تھی سو خرم ایک ماہ کی چھٹی پر آیا اور ایک ماہ بعد چلا گیا۔

میں مایا کو خوب شاپنگ کراتا۔ محبت کے لیے لمبے

یہ عورت کا دل۔

اور یہ عورت کا دل۔

ڈانٹا لگ بولتا۔ اسے گھمائے کھانا کھلانے لے جاتا۔ آؤں کی ادھر ادھر کی سینکڑوں باتیں کرتا۔ لیکن مایا کبھی پورے طور پر خوش نظر نہیں آتی تھی۔

”عورت کبھی اُدھے ادھورے مرد کے ساتھ خوش نہیں رہتی۔“

ایک بار چھوٹے بھائی نے کہا تھا اور میں زویا کے بغیر ادھورا تھا۔ محبت کا ادراک تو مجھے بعد میں ہوا تھا، لیکن میں پہلے دن سے ہی اسے پورا نہ ملا تھا۔

ہماری مثلث کے تینوں خط الگ الگ ہو گئے تھے۔

بچپن کی معصومیت میں کبھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ہم نے دعا مانگی تھی کہ ہم تینوں ہمیشہ اکٹھے رہیں اسی گھر میں اور وہ واقعی لمحہ قبولیت تھا۔ ہم تینوں اسی گھر میں تھے، لیکن ہماری مثلث ٹوٹ گئی تھی۔ ساتھ ساتھ ہونے کے باوجود ہم میں کوئی رابطہ نہ تھا۔

میں ہر وقت ٹرانسفر کی کوشش میں لگا رہتا۔ میں اکثر بے وقت کھانا کھاتا۔ دیر سے نیل پر آتا جب زویا جا چکی ہوتی، لیکن مجھے پتا تھا وہ خرم کو خط لکھتی ہے اور فون کرتی ہے کہ وہ اسے جلد سعودیہ بلا لے۔

میں کبھی کبھی مایا کے ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔

”مایا میرے لیے دعا کرو۔ میں۔ میں پورا سمو چا

تمہارا ہونا چاہتا ہوں۔ میں اس سحر سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ جس میں شادی کے ایک سال ایک ماہ نو دن بعد میں گرفتار ہو گیا تھا۔“ مایا پورے ضبط سے میری بات سنتی۔

اور زویا فون پر فون کیے جاتی کہ خرم جلد آکر اسے لے جائے۔ تاکہ میں اور مایا خوش رہ سکیں۔

میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ میں نے زویا کی محبت میں مبتلا ہو کر غلطی کی یا مایا کو دل سے قبول نہ کر کے۔ مگر اس اعتراف میں کوئی شبہ نہیں کہ میری زندگی میں آنے والی دونوں عورتیں اعلا طرف ہیں۔ ان دونوں عورتوں کے دل۔ میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔

یہ عورت کا دل۔

اور یہ عورت کا دل۔

سمیرا عثمان گل

دھڑکی کی تصویر

تین سال بعد اس کے قدموں نے اپنے ملک کی سرزمین کو چھوا تو دل کو جیسے پتکے لگ گئے ماکش وہ پہلے اپنے گھر جاسکتی مگر یہ سسرال کے جن جنھٹ خاص آرڈر تھا کہ پہلے وہاں قیام کیا جائے۔

ایرپورٹ سے باہر نکل کر وہ ڈرائیور کے انتظار میں کھڑے تھے جو انہیں دیکھ کر خود ہی قریب آچکا تھا عنصر نے گاڑی میں سامان رکھوایا اور خود گھوم کر بیک سیٹ پر آن بیٹھا جہاں وہ اذان کو اٹھائے پہلے ہی بیٹھ چکی تھی اور پھر گاڑی لاہور کی شاہراہ پر فرار لے بھرنے لگی تھی ایک کے بعد دوسرا منظر گزر رہا تھا مسافت سمٹ رہی تھی اور اس کی بے چینیوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور اسی اضطراب میں گھری وہ دونوں ہتھیلیوں کو بار بار آپس میں رگڑ رہی تھی۔ بھی — عنصر کی آواز آئی۔ ”کچھ کھانا ہے؟“ مگر دن گھما کر اس نے ساتھ بیٹھے اپنے ہم سفر کو دیکھا جو کھڑکی سے سر باہر نکالے مختلف ریسٹورنٹس کا جائزہ لے رہا تھا یہ وہ شخص تھا جسے اس نے زندگی میں سب سے زیادہ چاہا تھا۔ جس سے وہ گھنٹوں باتیں کرنے کے لیے ترسا کرتی تھی آج وہ بول رہا تھا اور وہ محض ہوں ہاں میں ہی جواب دے رہی تھی۔

ابھی بھی بے دلی سے اس نے نفی میں سر ہلایا تھا اس کا موڈ نہ دیکھ کر وہ بھی اب خاموش ہو چکا تھا۔ ابھی یک دم گاڑی نے یوٹرن لیا اور مریم کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا سامنے بایک پر ارحم تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بے اختیار کھڑکی پہ جھکی تھی مگر وہ زن سے بایک کو اڑالے گیا تھا اس نے اسے دیکھ کر بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ مریم کے دل میں جیسے چھن

اپنی بیٹیوں کو گھورا مگر انہیں اپنے گفتگوں دیکھے بغیر کہاں چین تھا بچے الگ اور ہم بچا رہے تھے مریم کو مزید ان کے تبصروں تک وہاں رکنا پڑا۔

اذان راستے میں ہی سوچا تھا جب سب اپنے کمروں میں جا چکے تو اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور عنصر کو بتا کر گھر سے باہر نکل آئی۔ اب اس کے قدم ٹاٹروالے گھر کی سمت اٹھ رہے تھے۔ دل کی عجیب کیفیت سی ہو رہی تھی آج تین

سال بعد وہ اہل سے موسے ملنے والی تھی گیٹ کے قریب پہنچ کر مکمل استحقاق کے ساتھ اس نے ڈورنیل پہ ہاتھ رکھ دیا۔

مگر یہ کیا دروازہ نہیں کھلا تھا وہ کچھ بائوس سی ہوئی اس سے قبل کہ پلٹ جانی عنایہ کی آواز گیٹ کے اس پار سے آئی تھی۔ ”کون ہے؟“ ”میں ہوں۔“ وہ محض اتنا ہی کہہ پائی تھی جب



مگر وہ یونہی پتھر کے بت کی مانند پاٹ سے تاثرات لیے اپنی جگہ جم کر کھڑا رہا تھا۔ ”مریم چلو گھر آگیا ہے۔“ عنصر کی آواز نے اسے چونکایا وہ اس کی گود سے اذان کو اٹھا رہا تھا وہ دوسری جانب سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ سسرال میں اس کا خوب والہانہ استقبال ہوا تھا سب نے ہال میں ہی ڈیرا جمالیا اس کی تینوں مندریں شوخ و شنگ طبیعت کی مالک تھیں بے تحاشا ہنسنے والی مگر اسے ان ساری خوش گہیوں، لطیفیوں باتوں چٹکوں سے شدید کوفت ہو رہی تھی نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا مسکرا کر اس کے جڑ سے کھینچ لگے تھے۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ سب لوگوں کو منظر سے غائب کرنے کے بعد اڑ کر سڑک کنارے موجود ٹیلا ٹاٹروالے گھر کی تختی بجادے۔ ایک ایک نوالہ اس نے گن گن کر کھلایا اس کے بعد کافی کا دور چل نکلا تھا اور پھر گفتگوں کی باری آئی۔ ”اب سو کو وہ گھری آرام بھی کرنے دو۔“ ماما نے

دروازہ کھل گیا۔
”آپ کون؟“ عنایہ نے اس سے سپاٹ سے انداز میں پوچھا تھا۔

”میں مریم ہوں تمہاری خالہ۔“ وہ اسے پیار کرنے کو آگے بڑھی تو عنایہ دو قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اسے خفگی بھری آنکھیں نظروں سے دیکھا۔

”نانو اور مہا بازار گئی ہیں جاتے ہوئے دروازہ بند کر جائیے گا۔“ کہہ کر وہ اوپر چھت پر بھاگ گئی تھی۔
مریم کچھ دیر وہیں سن سی کھڑی رہی پھر اندر برآمدے میں چلی آئی سامنے ہی اماں کی سلائی مشین رکھی تھی۔ خالی کمرے باتیں کر رہے تھے۔ کبھی اسے گھر میں تنہا رہنے کا کتنا شوق ہوا کرتا تھا وہ دعائیں مانگا کرتی تھی کہ اماں آج تو کسی بھائی بہن کی طرف چکر لگا لیں اور وہ گھر میں اکیلی رہے تب اسے غصہ سے خوب ڈھیر ساری باتیں جو کرنا ہوتی تھیں سبیلوں کو اکٹھا کر کے وی سی آر پہ فلمیں دیکھنے کا بھی الگ ہی مزہ ہوتا تھا کچن میں جو ہر ٹونگ مچتی وہ الگ۔

چلتے ہوئے وہ ارجم کے کمرے میں آئی تو وہ کمرہ آج بھی بالکل ویسا ہی تھا۔ اس میں اماں کی بیٹیوں کے علاوہ تین الماریاں اور ایک انگیٹھی تھی ایک الماری میں ان سب کے کپڑے تہہ لگا کر رکھے ہوئے تھے۔
دوسری میں کالج کے برتن اور تیسری میں اماں کی سلائی کا سامان بکرم، نلکیاں، موئریں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ سادس سے چار سینریاں دو گلدان ایک ٹائم پیس اور دو تصویریں تھیں ایک تصویر اس کے اور ارجم کے بچپن کی تھی جس میں اس نے سفید اسکرٹ پہن رکھا تھا اور ارجم نے نیلی پینٹ پہ سفید شرٹ اس کا ایک ہاتھ کمر پہ تھا اور دوسرا ارجم کے شانے پر ارجم زبان باہر نکال کر اسے چڑا رہا تھا اور اس کی صورت کچھ رونی سی بنی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود یہ تصویر بہت کیوٹ تھی۔

دائیں دیوار کے ساتھ کمپیوٹر ٹیبل تھی اور دو چلیاں وہ کپڑوں والی الماری کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی کبھی اس میں ان تینوں بہن بھائیوں کے کپڑے

ہوا کرتے تھے آج اس میں بس اماں اور ارجم کے کپڑے رہ گئے تھے۔
وہ مڑی تو نظر کمپیوٹر ٹیبل کے اوپر لگی انگلی سے ٹکرائی اس پر ارجم کی ڈریس پینٹ لٹک رہی تھی۔
”اماں یہ جان کر پینٹ کی کریز ٹھیک سے نہیں پڑتی۔“ اسے اسکول سے دیر ہو رہی ہوتی تھی اور وہ کبھی اس کا بیگ کبھی کتابیں تو کبھی نوٹس چھاپتا تھا۔
”جب تک کریز ٹھیک سے نہیں لگاؤ گی میں جانے نہیں دوں گا۔“ اسے لگا جیسے وہ ابھی برآمدے میں کھڑے لڑ رہے تھے۔

اس نے دوسرے کمرے میں جھانکا وہاں ایک چارپائی، سنگل بیڈ، فریج اور ایک بڑی سی دیوار گیر الماری تھی دیوار گیر الماری کے آگے اب فریم شدہ شیشے لگ چکے تھے ورنہ جب بھی اس کا اور مہو کا دھواں دھار قسم کا جھگڑا ہوتا تو وہ ساری الماری کے برتن نکال کر دھوئے بیٹھ جاتی تھی مگر ورنہ وہ اسے چڑانے کے لیے ایسا کرتی تھی کیونکہ اماں زبردستی اسے مہو کے ساتھ لگا دیتی تھیں اور پھر گھر میں جو طوفان بد تمیزی پیدا ہوتا، کشن، تنکیے، گلدان وہ تار توڑ ایک دوسرے پہ برساتے اور زبان سے ساری عمر ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھنے کی قسمیں کھائی جاتی تھیں۔

مریم اسے تپانے کی خاطر ڈرائنگ روم کے صوفوں پر چڑھ کر رسالے پڑھا کرتی تھی موصوفے اس نے اپنی کمپنی کے پیسوں سے بنوائے تھے وہ اور ارجم جو گھڑی دو گھڑی کے لیے ان پر لیٹ جاتے تو اس کی جان پرین آتی تھی۔

”جاہلوں کو بیٹھنے کی بھی تمیز نہیں ہے ڈرائنگ روم مہمانوں کے لیے ہوتا ہے۔“ اس کی آواز ماضی کے کسی ادھ کھلے درتچے سے آئی تھی۔ مریم نے صوفے پر بیٹھ کر دیکھا مگر آج اس روز جیسا مزہ نہیں تھا۔ لمحے جیسے ریت کی مانند ہاتھ سے پھسل گئے تھے وقت اتنی جلدی بیت چکا تھا وہ جو خوش گمانیوں بے فکر یوں کا دور تھا کیسے اس نے بن باس کی مانند کاٹا تھا۔
”کب اس قفس سے رہائی ملے گی۔“ ملاقات نہ

ہونے پر وہ تھملا کر سوچا کرتی تھی نمون سننے کے لیے کبھی دانش روم تو کبھی چھت پہ جانا زہر لگا کرتا تھا۔ اور جو کبھی کوئی پیچھے آجاتا تو اسے اور غصہ آتا اور وہ پیچھے آنے والا ہمیشہ ارجم ہی ہوتا تھا۔

”تم چھت پر ہو چلو اک کرتے ہیں۔“
”نہیں میری ٹانگوں میں درد ہے۔“ وہ خاصی بے مروتی سے جواب دیتی اور وہ ڈھٹائی سے کھڑا اپنے کالج کے دوستوں، پروفیسروں کی باتیں سننے جاتا اور وہ منہ پر بیزار سی سجائے اکٹھا ہٹ بھرے انداز میں سنتی اس کا دھیان اپنے سہل پر آنے والے مسیحی کی سمت اٹکا ہوتا تھا۔ اسے سننے نہ دیکھ کر وہ تنگ آکر نیچے آجاتی تھی اور پھر وہ بدلہ لینے کی خاطر صبح اسے لحاف سے باہر نکال کر اپنی بائیک صاف کروایا کرتا تھا وہ ایک اینڈ پروہ اسے پارک میں ٹھما کر لاتا تھا دونوں آنسو کویم کھانے کے دوران نیو کپل پر کمشنس پاس کر کے خوب ہنستے تھے۔

اماں کو اس کا ماتھے سے بال کٹوانا سخت ناپسند تھا وہ ارجم سے اس کی شکایت لگاتیں تو وہ اسے خوب گھورتے ہوئے کہتا۔

”میں نے کہا تھا کترینہ کی طرح سامنے سے ہیر کٹ کرانا تم نے سائیڈ پف کٹوایا۔“ اور وہ ہنستے ہنستے ڈوہری ہو جاتی تھی۔ اور پھر ایک روز وہ تن فرن کرتا اس کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا وہ بیٹھی نوٹس پڑھا رہی تھی۔
”غصہ ہمارے گھر کی طرف کیوں دیکھ رہا تھا۔“
سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ اس کے ہاتھوں کے طوطے، کبوتر سب اڑ گئے وہ منہ کھولے ہونق پن سے اسے دیکھنے لگی جو ماتھے پہ سلوٹیں لیے اسے گھور رہا تھا۔
”مم مجھے کیا پتا۔“ وہ ہٹلائی۔

”آج سے تمہارا اکیڈمی جانا بند گھر سے پاؤں باہر نکالا تو ناٹکس توڑ دوں گا۔“ وہ خوب غصے میں تھا مریم کا میٹر گھوم گیا وہ اٹھ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔
”تم ہوتے کون ہو مجھ پہ پابندیاں لگانے والے؟“
”ہوا کیا ہے تم دونوں کو۔“ اماں ابھی اندر آئی تھیں۔

”اس کے جو ایک دورشتے آئے ہیں ان میں سے کوئی فاسٹل کر کے دفع کرو اسے ورنہ یہ ہماری عزت داؤ پر لگا کر رہے گی۔“ اس نے ہوا میں تیر چلایا تھا جو ڈائریکٹ نشانے پر لگا۔

”میں شادی کروں گی تو غصہ سے۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا ارجم نے ایک زور کا تھپڑ اسے مارا۔ اماں حق دق سی کھڑی سب دیکھ رہی تھیں۔
”غصہ وہ ملکوں کا لڑکا۔“ انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا وہ دل پکڑ کر بیٹھ گئیں مگر ان دونوں کے درمیان جاری تھی۔

گھر کی فضا عجیب بو جھل سی ہو گئی مہو بھی آچکی تھی اسے سمجھانے، مگر زلٹ زبرد وہ اپنی بات پر مصر تھی۔
اکیڈمی جانا چھوڑ دیا کھانا پینا چھوڑ دیا رشتے کے لیے آئے مہمانوں سے بد تمیزی کی نورو کر آنکھیں سجالیں۔

اس سے قبل کہ چرچا زبان زد عام ہوتا اماں نے ملکوں کو رشتہ دے دیا۔ ارجم کا ایک ہی فیصلہ تھا۔
”جائے گی تو ہمیشہ کے لیے۔“ وقتی طور پر اس نے حامی بھری تھی۔

”اب اس گھر کے دروازے خود پر بند سمجھو۔“ وہ کہہ رہا تھا مگر اس نے بے نیازی سے سر جھٹک دیا غصہ کی محبت اس کی رفاقت اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب ہی اس قدر مسرت آمیز تھا کہ وہ ان روایتی دھمکیوں پر کڑھنے کے بجائے آنے والے خوب صورت لکھوں کے متعلق سوچا کرتی تھی۔ اماں اور مہو کا دل جانتا تھا کہ ان پر کیا بیت رہی تھی ان ماں بیٹی کی آنکھیں بھیگی اور نم سی تھیں اور وہ عنایہ کو گود میں اٹھا کر گول گول چکر لگا کر جھومتی۔

”عنایہ تمہاری خالہ کی شادی ہو رہی ہے۔“ سب کچھ بغیر کسی ہنگامے کے ہو رہا تھا وہ اتنے میں ہی بے حد خوش تھی ولیمہ پہ ارجم نہیں آیا تھا بس اماں مہو اور چند دوست احباب وغیرہ اس کا مسکلاوا بھی نہیں گیا تھا مگر اسے ان ساری چیزوں کے نہ ہونے سے کچھ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹمائڈ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹمائڈ :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، ہارمل کوالٹی، کمپریمڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ذکر کیا بلکہ وہ تو لگ رہا تھا جیسے اسے دیکھ کر پریشان ہو چکی تھیں۔

”ارے مریم تم یہاں کیوں چلی آئیں ارحم نے دیکھا تو ہنگامہ مچا دے گا۔“ مہو کے انداز میں اس قدر غلٹ تھی جیسے اسے بازو سے پکڑ کر گھر سے باہر نکال دینا چاہتی ہو، مریم سکتے کے عالم میں جہاں کی تہاں جم کر رہ گئی۔

”تم ابھی نکلو یہاں سے ارحم کے سسرال والے بھی آرہے ہیں انہیں ارحم نے یہی کہہ رکھا ہے کہ اس کی بس ایک ہی بہن ہے میں نہیں چاہتی کہ کوئی سین کری ایٹ ہو۔“

”ہاں ہاں مریم جلدی جاؤ۔“ اماں نے دروازے کی سمت دیکھتے ہوئے اسے باہر کا راستہ دکھایا اور وہ بچھے دل اور شکستہ قدموں سے چلتے ہوئے نیلے ٹائلز والے گھر سے دور نکل آئی اس کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اماں اور مہو تو کب کا اسے رو چکی تھیں مگر اسے لگ رہا تھا جیسے آج ہی اس کی رخصتی ہوئی ہو جیسے وہ ابھی ابھی سب کے لیے مرجھی ہو جیسے ابھی اس گھر کے دروازے اس پر بند ہوئے ہوں جیسے آج وہ اپنوں سے چھڑی ہو۔

دو روز بعد اس نے نیلے ٹائلز والے گھر کو برقی لمپوں سے سجے ہوئے دیکھا تھا وہ ملک ہاؤس کی چھت پر کھڑی تھی۔

”اب اس گھر کے دروازے خود پر بند سمجھو۔“ اس کی سماعتوں میں وہ بچھے ہوئے سیدھے جیسے لفظ چٹکھاڑے مگر وہ سپاٹ سے تاثرات کے ساتھ وہاں کھڑی رہی اس کے ساتھ عنصر اور اذان بھی تھے مگر اماں، مہو اور ارحم تو نہیں تھے رشتے کی اس مکمل تصویر کو اس نے خود ہی دو حصوں میں بانٹا تھا اور اب اسے اس ادھورے حصے کے ساتھ ہی زندگی گزارنی تھی اور یہ کتنا مشکل تھا اسے لگ رہا تھا جیسے سب ہوتے ہوئے بھی وہ خالی ہے بالکل خالی۔



خاص فرق نہیں پڑتا تھا اس نے یہ سوچ کر سر جھٹک دیا تھا کہ ابھی نئی نئی بات ہے بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

عنصر سعودیہ سے چھٹی پر آیا ہوا تھا جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ لے گیا اور اس کے بعد وہ اب لوٹی تھی۔

اماں اور مہو سے رابطہ بس ٹیلی فونک گفتگو تک ہی محدود رہا تھا عنایہ اس سے بات نہیں کرتی تھی اس کا کہنا تھا خالہ مجھے اچھی نہیں لگتی اور یہ ضرور ارحم کا سکھایا ہوا تھا۔

آنگن میں لگے سفید پھولوں کی پتیاں نوچتے ہوئے اسے احساس بھی نہ ہوا کہ پورا ایک گھنٹہ گزر چکا تھا اس گھر میں اس کی فیورٹ جگہ سیرھیاں تھیں۔ اس وقت بھی وہ الماس کے نیچے خاموش بیٹھی وہ سہانے دن تلاش کر رہی تھی وہ الزہرا، وہ بے نیازی وہ کنوار پن کا زمانہ شادی تو ایک دن ہو ہی جانی تھی پھر کیوں اس کی فکر سوار کر کے وہ ان خوبصورت دنوں سے بے زار رہا کرتی تھی۔ کل تک وہ جن کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی تھی آج انہیں دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا اماں کی گود میں سر رکھ کر خوب گہری نیند سوئے مہو سے خوب باتیں کرے۔

اپنے اس گھر میں بہت سارے دن رے اور ارحم ہمیشہ کی طرح اسے ستائے اسے تنگ کرے مگر گرم گرم لحاف سے نکال کر اپنی بائیک صاف کروائے وہ اب کی بار اس کی پیٹنٹ کی گریز بالکل ٹھیک بنائے گی اور اس کے ساتھ چھت پر واک بھی کرے گی۔

ڈور بیل بجی تھی عنایہ جو اوپر کرائے داروں کے پاس بھی بھاگتے ہوئے نیچے آئی۔

”مما آگئیں۔“ اس نے شور مچا دیا تھا۔ مریم سیرھیلوں سے اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھی۔

”شکر ہے دلہن کی شاپنگ تو مکمل ہوئی۔“ مہو بولتے ہوئے آرہی تھی۔ مریم نے والہانہ انداز میں اسے دیکھا لیکن یہ کیا مہو اور اماں نے نہ تو اسے گلے سے لگایا تھا نہ اس کی خیریت پوچھی نہ اس کے لوٹنے کا

صباحت یا سمین ملک

گرہستانی

تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے اس نے سلیب صاف کی۔ ناشتا فاطمہ نے بنانا ہوتا تھا اور اسے سلیب صاف چاہیے ہوتی تھی لہذا وہ لازماً ہی سلیب صاف کرتی، سلیب صاف ہو چکی تو اس نے صافی دھو کر پھیلا لی، تو اچولے سے ہٹایا، ابو بکر کے لیے دودھ کے برتن کو ہاتھ لگا کے چیک کیا کہ ٹھنڈا ہوا یا نہیں۔ دودھ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ لہذا اس نے دودھ کی دیکھی پانی سے بھری پر اسے نکال کر سائینڈ پر رکھی اور گرم پانی گرا کر ٹوٹی سے ٹھنڈا پانی بھرا تاکہ چائے کے لیے گرم کیا گیا دودھ ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھا جاسکے۔ سینے کے قطرے اس کی کمر پہ رینگ رہے تھے اور حلق خشک ہو چکا تھا۔ ابو بکر کے مسلسل رونے بلکہ چیخنے کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی، جب ہی اس نے روٹیاں بنانے کے دوران ہی جیسے تیسے کر کے تمام برتن دھوئے پانی کا گلاس لینے کے لیے وہ برتنوں کی ٹوکری کی طرف بڑھی ہی تھی کہ فون بجنے لگا۔ اس نے گلاس وہیں چھوڑا، فافٹ ابو بکر کے فیڈر میں دودھ ڈالا۔ چائے والے دودھ کو پر اس میں رکھ کر ہاٹ پاٹ سائینڈ پہ رکھا اور فون کی طرف بھاگی۔

”السلام علیکم باجی!“

”وعلیکم السلام کیسی ہو شمسہ؟“

”شکر ہے اللہ کا، ٹھیک ٹھاک ہوں۔“

”ابو بکر کیسے؟“

”نہیں باجی ٹھیک ہے۔“ اس نے کہنے کے ساتھ ہی اپنے کمرے کے اوپر کھلے دروازے کو دیکھا۔ رو رو کر اس کا گلا بیٹھ چکا تھا۔ لہذا اب رونے کی آواز کم

آ رہی تھی۔

”کیا کر رہی تھیں تم؟“

”کچھ نہیں فارغ ہی تھی، آپ بتائیں۔ منہ چلی گئی آپ کی؟“

”ہاں، میری منہ تو چلی گئی تمہاری منہ آنے والی ہے!“

”جی باجی۔! وہ بے حد خوش ہوئی۔“

”ہاں جی۔! اچھا سنو۔ فاطمہ کو بلاؤ ذرا ایک ضروری بات یاد آئی ہے کہیں ذہن سے نکل نہ جائے۔“

”جی اچھا۔ ہولڈر رکھیں۔“

”فاطمہ! باجی کی کال ہے۔“ اس نے جھانک کر بتایا تو بیڈ پہ نیم دراز ڈانچسٹ بڑھتی فاطمہ کسل مندی سے اٹھی۔ شمسہ اب ابو بکر کے لیے فری تھی۔ اسے اٹھا کر ساتھ لگایا کمر سہلائی، وہ شکوہ کنال انداز میں رونے لگا۔

”میں سوری بیٹا! سوری۔“

کچھ ہی دیر میں وہ چپ ہو گیا اور ماں کی گود میں سکون سے فیڈر پینے لگا۔ ہولے ہولے چلتی فاطمہ اب فون تک پہنچی تھی۔

”جی باجی۔“ فون اٹھا کر وہ سستی سے بولی، جواباً باجی نے شاید فون پہ دیر سے آنے کا کہا کیونکہ بعد میں وہ وضاحت دیتے ہوئے بولی۔

”کپڑے پرئیں کر رہی تھی ابھی تو بچوں کو کھانا بھی دیتا ہے۔“

ابو بکر کو جھولے میں لٹا کر وہ سیدھی ہوئی تو حارث

نے پوچھا۔
 ”کیسا ہے تمہارے شانوں کا درد؟“
 ”ٹھیک ہے، آج تو بہتر ہے بہت کیونکہ باجی اور باجی کے بچوں نے اسے بہت دیر اٹھائے رکھا۔“
 ”چلو اچھا ہے تمہاری بھی اہلیں ہو گئی۔“ اخبار کا ورق پلٹتے ہوئے اس نے کہا۔ اسے صبح وقت نہ ملا تھا۔ اس لیے اس نے شام کا اخبار لگا رکھا تھا جسے وہ رات گئے پڑھتا۔
 ”پتا ہے فاطمہ بہت اچھی ہے۔“ وہ صوفیہ اس کے ساتھ آ بیٹھی۔
 ”اچھا۔ اب نئی اچھائی کیا کر دی اس نے؟“
 حارث نے اخبار اور نظر کا چشمہ دونوں بند کر کے ٹیبل پر رکھ دیے۔
 ”جب کوئی آیا ہو تو وہ مجھے میرے حصے کے کام بھی نہیں کرنے دیتی، حالانکہ اسے تو کمزور رہتا ہے اور عام روٹین میں اس نے کبھی اتنے کام نہیں کئے، لیکن اسے بہت احساس ہوتا ہے کہ کام بڑھ گئے ہیں اور وہ ایک آدھ دن کے لیے تمام گھر کی ذمہ داری مکمل طور پر سنبھال لیتی ہے تاکہ میں ابو بکر کو دیکھ لوں۔“
 ”ہوں۔ ہم سے بھی زیادہ اچھی ہے کیا؟“ وہ قریب ہوتے ہوئے شرارتی ہوا۔
 ”جی بالکل کیونکہ جب میں فرش صاف کرنے کے لیے ٹاول دھو کر لائی تو اس نے میرے ہاتھ سے لے لیا اور تمام کمروں میں بھی لگایا اور لاؤنج میں بھی۔ آپ نے کبھی کیا ایسا؟“ شمسہ پر جوش بھی مسکرا رہی تھی حارث سوچ میں پڑ گیا کہ اتنی زیادہ بھلائی کی بھلا اسے کیا ضرورت تھی؟
 ”ارے ارے نیچے بہت لیٹے گا۔“ وہ دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے لاؤنج میں داخل ہو رہی تھی کہ اس نے حارث کو فرش پر تکیہ رکھتے دیکھا۔
 ”کیوں بھی؟“ اس نے حیرانی سے پوچھا، روزی تو وہ آفس سے آکر کچھ دیر فرش پر لیٹا تھا پھر آج بھلا اس نے کیوں روکا۔

”بتاتی ہوں اگر۔“ اس نے کپڑوں کے ڈھیر کو صوفے پر رکھا، اپنے حارث اور ابو بکر کے کپڑے اس میں سے نکالے۔
 ”وہ آج کام بہت زیادہ تھے تو میں نے اپنے کمرے کی صفائی نہیں کی۔“ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے بتایا۔
 ”چلو خیر ہے۔ اتنا فیل نہیں ہو رہا، اینڈ ایم بھی کہ تم نے تھوڑی بہت ڈنڈی مار کر خود کو ذرا ریلیکس کیا۔“ اس نے تکیہ اٹھا کر بیڈ پر واپس رکھ لیا تھا۔
 ”اچھا۔ میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ کپڑے نوکری میں رکھ کر وہ جانے کے لیے مڑی تھی۔
 ”آپ کے کام ختم ہو گئے ہوں تو ضرور!“
 وہ مصنوعی ناراضی سے بولا تھا۔ چند ہی منٹوں میں وہ چائے لے آئی۔ آلو کے ساتھ پکوڑے چائے اور پانی۔
 ”کچھ نہیں ہے؟“ حارث کو فوراً ہی کی محسوس ہوئی۔
 ”جی وہ ختم ہو گیا۔“
 ”اتنی جلدی ختم کیسے ہو سکتا ہے؟“ حارث نے برا سامنے بتایا۔
 ”نہیں ہے جب ہی نہیں لائی تا، فریج میں کاؤنٹر پر ٹیبل پر ہر جگہ دیکھا۔“ وہ نوکری سے کپڑے اٹھا کر نہ کرنے لگی۔
 ”کل بھی تم نے ہی کہہ کر نہیں دیا اور شام میں ثنا فائزہ رول کے ساتھ کھا رہی تھیں۔“ وہ بچوں کی طرح نروٹھے بن سے بولا۔
 ”ہو سکتا ہے انہوں نے نیا منگو لیا ہو۔“
 ”وہی پرانا والا پکٹ تھا۔“
 ”اچھا پھر کیا سزا ہے میری؟“
 ”یہ کہ تمہیں چکھنے کو بھی پکڑا نہیں ملے گا۔“
 ”ہائے اللہ آپ نے سب ختم کر دیے!“ وہ یکایک افسردہ ہو گئی۔

”ہاں وہ پانچ سات ہی تو تھے اور کچھ میری اسپینڈ بھی تیز ہے تو پتا ہی نہیں چلا۔ اچھا شمسہ! سنو۔“
 ”کمرے کا دروازہ بند تو نہیں رکھتیں تمہیں بھر؟“
 ”دن بھر تو نہیں، لیکن رکھتی ہوں۔“
 ”کیوں؟ کیوں رکھتی ہو؟ کھلا رکھا کر دینا!“
 ”ابو بکر سو رہا ہو اور فائزہ یا ثنا لاؤنج میں کھیل رہی ہوں تب تو دروازہ بند کیے بنا چارہ ہی نہیں۔“ وہ اس کے پاس آن بیٹھی۔
 ”بہر حال تم زیادہ سے زیادہ دیر دروازہ کھلا رکھا کرو۔“
 ”آپ اتنی تاکید سے یہ بات کیوں کر رہے ہیں؟“
 ”وہ حیران ہوئی۔
 ”بڑی بھابھی سے بات ہوئی تھی آج اس کا پتہ۔“
 ”وہ دھیسے سے بولا۔
 ”اچھا؟ کیسی ہیں وہ؟ اوہ سب کیسے ہیں؟“
 ”ٹھیک ہیں۔“
 ”اور کیا کیا بات ہوئی؟“
 ”کہہ رہی تھیں کہ تمہیں سمجھاؤں۔“ حارث کچھ کچھ پریشانی سے بول رہا تھا۔
 ”بھلا کیا؟“ وہ متحسّس ہوئی۔
 ”یہ کہ کمرہ بند کر کے ہر وقت سوئے رہنا اور کام چوری خدو وغیرہ اچھی بات نہیں سب سے مل جل کر رہو گھر کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹاؤ۔“
 ”شمسہ بن کر روٹنگ رہ گئی اور بغور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی کہ آیا وہ واقعی وہی سب کہہ رہا ہے یا اسے سننے میں غلطی ہوئی۔
 حارث نے اس کی آنکھوں کے نیچے موجود حلقوں سے نظر چرائی۔ رات میں ابو بکر کئی بار جگاتا اور اکثر بہت دیر تک جگائے رکھتا، دن میں اسے سونے کی فرصت یوں نہ ملتی کہ پہلی بار جب وہ سوتا تو شمسہ بمشکل صفائی ستھرائی کرتی اور وہ اٹھ جاتا، دوبارہ سوتا تو اس کے کپڑے دھوئی نہاتی۔ نماز پڑھتی۔ کالم لکھتا شروع کرتا، اور وہ پھر اٹھ جاتا۔ اسے سلا کر بھی وہ سوتی

نہیں تھی تبھی حارث کے کپڑے استری کرنے ہوتے کبھی برتن دھونے ہوتے کبھی آنا گوندھنا ہوتا۔
 ”تمہیں سمجھ داری سے رہتا ہے شمسہ!“ حارث نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شمسہ نے دھیرے سے سر ہلایا اس کے اندر تک اواسی اتر آئی تھی۔
 ”اور سنو تم نے گھر میں کسی کی کوئی بات ٹالی ہے؟ ابو بکر کے متعلق کوئی مشورہ یا کوئی اور بات؟“
 ”نہیں تو۔ میں تو خود فاطمہ سے پوچھ لیتی ہوں اگر کوئی مسئلہ ہو تو۔ اماں کے ٹوکے بھی آزمانی ہوں، لیکن حارث اگرچہ میں تجربہ نہیں رکھتی میں نے پہلے بچے نہیں سنبھالے، لیکن میں اس کی ماں ہوں تجربہ نہ ہونے کے باوجود بھی کبھی کبھار مجھے یہ لگتا ہے کہ میں اس کا مسئلہ بہتر طریقے سے سمجھ جاتی ہوں، ایسے میں کبھی کبھار میں اپنی مرضی بھی کرتی ہوں۔“ وہ رکی اور پھر اچانک کچھ یاد آنے پر دوبارہ بولی۔ ”میں بھی ہوتا ہے کہ اماں مجھے ایک بہت الگ بات بتاتی ہیں اور فاطمہ بہت الگ، ایسے میں کسی ایک کی بات ہی مان سکتی ہوں بعد میں یا اماں فاطمہ کو قائل کر لیں گی یا فاطمہ اماں کو۔ تو سختی پھر بھی میری ہی آتی ہے کہ اپنی من مانی کی۔“
 ”اچھا چھوٹے میں نے پہلے ہی انہیں کہہ دیا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں اور یہ بھی کہا کہ تین چار ہفتوں سے ہی تو موسم کھلا ہے ورنہ صبح شام اتنی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی کہ دروازہ کیا کھریں بھی ہم بند رکھتے تھے۔“
 ”تھینک یو حارث۔“ وہ بے پناہ ممنون ہوئی اور مزید گویا ہوئی۔
 ”اور ہاں میں ڈانپ چھیچ کرتے ہوئے بھی دروازہ بند کر لیتی ہوں تاکہ کسی کو کراہیت نہ ہو۔“
 حارث دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں سسلانے لگا تھا۔ ”نو نو شمسہ سگے بن بھائیوں میں بھی باتیں ہوتی ہیں مگر کسی تیسرے کو شکایت کرنا تب زیب دیتا ہے کہ اگر قصور وار نہ سنے نہ مانے قصور وار بے خبر ہو اور جہاں بھرنا خبر تو شکایتیں رفع نہیں ہوتیں بلکہ نان الیٹوز

بھی انٹو بن جاتے ہیں۔ خیر یواٹ میں نماز کو جا رہا ہوں۔“

اچانک ہی اس کی گھڑی پر نظر پڑی تو وہ بات سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شمسہ کچن میں برتن رکھنے چلی گئی۔ اماں اپنے لیے کٹکٹس فراہم کر رہی تھیں۔ شمسہ برتن دھونے لگی۔

”فاطمہ کچھ ہے؟“ اماں نے آواز لگائی۔

”جی اماں میں خود دیتی ہوں اگر۔“

اس نے فوراً ”جواب دیا اور چند ثانیوں بعد کچن میں آگئی۔

”کوئی کچھ رہنے ہی نہیں دیتا تو۔ بچیوں کے لیے منگوائی ہوں سوسائٹیز پر رکھ دیجی ہوں۔“

اس کے ہاتھ سے برتن چھوٹ کر سنک میں گرا۔ آنکھیں یکدم نم ہو گئیں۔

”آہستہ آہستہ آرام سے۔“ اماں نے برتنوں کی فکر میں ہانک لگائی تھی۔ اس نے سر کے اندر کچھ یوں ہلنے لگا جیسے اندر اپنے شیل میں چھلک رہا ہوتا ہے۔

”پانی زیادہ ٹھنڈا ہے تھوڑا سا تازہ پانی مکس کر لاؤ اس میں۔“ وہ کچن سے نمک لے کر آئی تو حارث نے کہا۔ پانی کی بوتل اٹھا کر وہ اٹے قدموں کچن کی طرف گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں بوتل کے ساتھ سالن کی پلیٹ بھی تھی۔ حارث کے ساتھ بیٹھ کر اس نے بھی کھانا شروع کیا۔

”بھئی۔ چکن سے کیا پڑے تمہیں؟ کبھی تو کھالیا کرو!“ حارث اس کی پلیٹ میں کل کا آلو قیمہ دیکھ کر بولا۔

”کھاتی تو خیر میں یہ بھی نہیں مگر اب اس میں قیمہ برائے نام ہی بچا ہے تو سوچا جیسے تیسے کر کے ہی کھا لوں آخر بیٹ تو بھرتا ہے۔“

”پتا نہیں تمہاری کیا خوراک ہے۔ گوشت کسی قسم کا تم کھاتی نہیں، دودھ سے تمہیں رعشہ ہو جاتا ہے۔“

”حارث چڑ لڑ لڑا تھا۔“

”پھر بھی تمام آس پڑوس والے پرانے محلہ دار اور سب رشتہ دار کی جانتے ہیں۔ میں بہت پیڑھ ہوں ہر وقت کھاتی رہتی ہوں۔“

حارث نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ واقعی میل جول کا ہر بندہ اس سے کوئی اور بات کرے نہ کرے یہ ضرور کرتا تھا کہ سنا ہے تم تین چار کلو دودھ پی جاتی ہو بہت اچھا کھاتی پیتی ہو وغیرہ وغیرہ شروع سے ہی حد درجہ حساس تھی اس لیے سوچ سوچ کر کڑھتی رہتی تھی کہ اگر پریگنسی میں اس کی بھوک ڈبل ہو گئی تھی تو کیا یہ ضروری تھا کہ ہر ملنے جلنے والے کو بتایا جائے؟

”شمسہ تم نے پریگنسی میں پسند ہی وہ چیزیں کیں جن سے وزن بڑھتا ہے جیسے چاول، چپس، فرائز۔ اس لیے ورنہ کوئی بات نہیں۔“ اپنے مخصوص ہلکے پھلکے لہجے میں اس نے غیر محسوس انداز میں اس کی شکوہ کنال سوچ کر بدلتا چلا۔

”حارث! میں خود بہت پختہ رہی ہوں، مگر کیا کرتی میرا دل ایسی ہی چیزیں کھانے کو کرتا تھا۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”چلو کوئی بات نہیں۔ اب ڈے بائے ڈے تمہارا وزن کم ہو تو رہا ہے ان شاء اللہ جلد ہی پہلے جیسی ہو جاؤ گی۔“

”فرق میں سالن رکھا تھا آلو قیمہ کا۔“ فاطمہ اچانک سامنے آکر بولی۔

”وہ تو میں کھا چکی۔ بس یہ لاسٹ باٹ ہے۔“ شمسہ نے ہاتھ میں موجود نوالے کی بابت کہا باقی پلیٹ خالی تھی۔

”یہ تو میرا تھا۔ میں نے خاص اپنے لیے رکھا تھا۔“ فاطمہ عجیب ہی طرح سے بولی، جانے کیا تھا اس کے لہجے میں کہ شمسہ جس نے باتوں باتوں میں فوراً ہی اپنی روٹی ختم کر لی تھی، آخری نوالہ حلق سے اتارنے ہوئے اسے بہت وقت لگا۔

”شمسہ یار ریلیکس۔ کچھ نہیں ہوا۔“ حسب

معمول حارث نے فوراً اس کا دھیان ہٹایا۔

”کچھ ہوا تو ہے حارث، میری وجہ سے سب کو اپنے کھانے بننے کی چیزیں سنبھال کر رکھنی پڑتی ہیں اس بات کا تو تجھے اندازہ تھا، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ انجانے میں اگر ان کی کوئی شے کھا لوں گی تو منہ یہ اگر بات کی جائے گی، پوچھا جائے گا وہ بھی اس طرح سے۔“ اس نے کھوئے کھوئے انداز میں یہ بات کی تھی۔

”لیٹ اٹ گو (Let it go) شمسہ میں نے شادی سے پہلے ہی تمہیں کئی بار بتایا کہ ہمارے گھر میں کوئی بھی زیادہ حساس نہیں ہے، ایسا نہیں ہے جیسی تم ہو!“

”لیکن تم نے ان سب کو جیسا بتایا یہ ویسے بھی تو نہیں ہیں۔“ اس کے لہجے میں، آنکھوں میں، باتوں میں شدید اداسی در آئی تھی۔

”اچھا تم یہ برتن سمیٹو اور چائے بنا دو مجھے ورنہ ابو بکر اٹھ جائے گا اور تم کچھ بھی نہیں کر پاؤ گی۔“

ایک دفعہ پھر حارث نے اس کی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنا چاہی تاکہ وہ پہروں کڑھتی نہ رہے اور اس دفعہ وہ کامیاب بھی رہا۔ شمسہ جی اچھا کہہ کر برتن سمیٹنے لگی۔

”شمسہ۔“

کروٹ بدلتے ہوئے ذرا کی ذرا اس کی آنکھ کھلی تو اس نے شمسہ کو کمرے کے بیچوں بیچ کھلتے پایا، اس کی آواز یہ وہی کہہ کر رہی۔

”گھنٹہ ہو گیا ہے تمہیں کبھی یہاں کبھی وہاں نیند نہیں آ رہی کیا؟“

”گھنٹہ نہیں حارث چار گھنٹے۔“ وہ بیڈ پہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

”چار گھنٹے؟“ حارث نے حیرت سے وال کلاک کو دیکھا۔ اس کی چمکتی سوئیاں تین بیس کا ٹائم دکھا رہی تھیں اور وہ لوگ گیارہ بجے لیٹے تھے۔

”تم دودھ پی لیتیں تھوڑا سا۔“ وہ ساتھ پریشانی کے

اٹھ بیٹھا۔

”پتا تھا نیند آئی بھی مگر پھر میں سخت ڈر گئی۔“ وہ تھکی تھکی بیڑھال اور کچھ ڈری ہوئی تھی۔

”ایسے کیسے چلے گاتے دنوں سے تمہاری نیند بھی ڈسٹرب ہے اور بھوک بھی۔ تم زبردستی آنکھیں بند کر کے لیٹو پلیز۔“

”لیٹی رہی ہوں حارث میں نے تو سکون کی دوا بھی لی تھی گم۔“

”سکون کی دوا؟“ اسے سن کر دھچکا لگا۔

”کب سے لے رہی ہو اور کس کے مشورے سے لی؟“ حارث نے اسے بے طرح جھجھوڑ دیا۔

”خود ہی لی ہے۔ ابھی کچھ ہی دن ہوئے۔“ وہ بے طرح گھبراتے ہوئے بولی۔

”مالی گاؤ شمسہ! تم مجھ سے تو مشورہ کرتیں، اتنی سی عمر میں تم مصنوعی نیند اور مصنوعی سکون کا عادی کرنے والی ہو خود کو!“ اسے جیسے بے یقینی سی تھی۔

”تو میں کیا کروں پھر؟“ بہت بے بسی سے اس نے پوچھا۔

”تمام باتیں دلغ سے نکال دیا کرو۔ ریلیکس رکھا کرو خود کو بس۔“ اب کے وہ نرمی سے بولا۔

”ہوں۔ اچھا!“ غائب دماغی سے وہ کہہ رہی تھی۔

”اچھا تم آکر لیٹو اور جتنی بھی دیر گزر جائے آنکھیں بند ہی رکھنا اور سونے کی کوشش کرتی رہنا۔ ضرور نیند آئے گی۔“

اس کی بات پر شمسہ نے عمل تو فوراً کیا، مگر پھر بھی وہ بہت مضطرب لگ رہی تھی۔

کھانے کی میز پر سب جمع تھے اور رغبت کے ساتھ چکن منچورین سے انصاف کر رہے تھے کھانے کی کوشش تو شمسہ بھی کر رہی تھی، مگر حارث نے نوٹ کیا کہ اس نے ابھی تک برائے نام ہی کھایا ہے نوالہ لیتے ہوئے اس کا چہرہ ایسے زاوے دکھا تاکہ جیسے وہ کوئی بہت اذیت ناک کام کر رہی ہو۔ کچھ دیر مارے باندھے بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ گئی۔

حارث کا دل اچانک ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ دو چار

نوائے مزید زہر مار کر کے وہ بھی اٹھ گیا اور میرس پہ جا کر ٹھلنے لگا۔ ابو بکر کے رونے کی آواز آنے لگی اور ساتھ میں شمسہ کی با آواز بلند لوریاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ چپ ہوا تو شمسہ غالباً برتن صاف کرنے لگی۔ اسے کافی انتظار کرنا پڑا اور جب وہ آئی تو ابو بکر کو کندھے کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا اور ایسے میں اسے ہاں کی گود میں رہنا بہت پسند تھا۔ اس کی کمر مسلسل تھکتے ہوئے وہ چپ چاپ حارث کے ساتھ ٹھلنے لگی۔

”مجھے ان سب سے چڑھنے لگی ہے۔ بہت دیر بعد حارث بولا۔

”حارث پلینز۔“ اس نے فوراً ہی احتجاج کیا۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں کہ اب مجھے یہ بھی سننے کو ملے کہ میں آپ کو سب سے دور کرنا چاہتی ہوں۔“ ”نہیں یا۔ مگر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں، کوئی تم سے نفرت کرے تو میں کیسے برداشت کروں؟“ بہت پریشانی سے بولا۔

”آپ کو کس نے کہا کہ کسی نے مجھ سے نفرت کی ہے؟“

”دیکھتا نہیں ہوں کیا؟“ ”ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو آپ نفرت پہ محمول کر رہے ہیں؟“

”باتیں چھوٹی ہوتیں تو ان کے اثرات اتنے گہرے نہ ہوتے۔“ حارث کے ذہن میں اس کا بجھا بجھا چہرہ۔

”کوئی ایک فریق کبھی بھی مکمل قصور وار نہیں ہوتا حارث۔ دوسرے کی غلطی کم ہو، برائے نام ہو مگر ہوتی ضرور ہے۔“

”اچھا؟ تمہاری کیا غلطی ہے جو کبھی دکھائی نہ سنائی دی۔“

”میری غلطی حد سے بڑھی حساسیت ہے۔“ ”لیکن تمہیں کبھی بھی کسی کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ میں بہت غلطی مل کرتا ہوں کہ میری وجہ سے تم کتنا برداشت کرتی ہو۔“ وہ لہجے سے ہی بے حد

پشیمان لگ رہا تھا۔ ”تو کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں کہیں اور ہوتی تو کچھ نہ سہاڑتا۔ یہ سب نہ ہوتا تو کسی اور طرح کے مسائل ہوتے مگر آئینڈیل ماحول تو کبھی بھی کسی کو نہیں ملا۔“ ”جب تم یہ سب جانتی ہو، سمجھتی ہو، خاموشی سے سہتی ہو تو پھر تمہیں چپ کیوں لگ گئی ہے؟ مسکراتا کیوں بھول رہی ہو؟“ وہ روہاسا ہو رہا تھا۔

”کیونکہ میں سب ہمیشہ سے نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اس کے لیے تیار تھی، مگر ہر گزرتے دن کے ساتھ میں ان حقائق کو بہتر طریقے سے سمجھنے لگی ہوں اور خاموشی کی وجہ یہ نہیں کہ میں بہت عظیم ہوں بلکہ ہر ایک کی اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں، میری بھی ہیں، میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کا نام بدنام ہو، کیونکہ آپ مجھے ہر طرح کا آرام مہیا کرتے ہیں، ایک بندے کے بولنے سے شور نہیں ہوتا، مگر آوازیں دو ہو جائیں تو دیواروں سے پار ہو جاتی ہیں، پھر کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ کون صحیح ہے اور کون غلط؟ ہاں ایسا ضرور ہو سکتا ہے کہ چہ گوئیاں ہونے لگیں کہ حارث کی بیوی نے بدکلامی کی۔“

”لیکن تم کام کی باتیں تو کیا کرو یا راجتایا کرو کہ تم فارغ نہیں رہیں اور تمہیں کوئی ضد نہیں سب کی باتیں ٹالنے کی ہیں کبھی کبھار کوئی بات ماننا ممکن نہیں بھی ہوتا۔“

”پتا ہے حارث! جو ہمیں سمجھ سکتا ہے نا اسے ہماری وضاحتوں کی ہمارے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور جس نے سمجھنا ہی نہیں، کبھی آپ کی بات کو درست اور صحیح تسلیم ہی نہیں کرتا اسے آپ ملتی ہی بار تائیں کسی بھی طریقے سے بتائیں، بے سود رہے گا میں یہ کر کے دیکھ چکی ہوں۔“

”جو بھی ہو یا راجت، تمہاری یہ خاموشی برداشت نہیں ہوتی اب تو تم عام حالات میں بھی چپ چاپ رہتی ہو۔“ حارث کی سوتی وہیں ایچی تھی۔

”پتا ہے حارث میں سمجھتی تھی کہ خاموشی سب مسائل کا حل ہے، پھر مجھے لگا کہ یہ خاموشی ہی کافی

میں اس کے ساتھ مسکراہٹ اور خوش دلی بھی ہوتی چاہیے، میں نے اسے بھی آزمایا تھا، مگر تب بھی خوش ترش تھی سننے کو ملیں تو میرا دل اچاٹ ہو گیا اب تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جاتا۔“

وہ گلو گیر لہجے کے ساتھ بولی، ”من تو تھا کہ پھوٹ پھوٹ کہ روئے، مگر آل ریڈی حارث اتنا پریشان تھا کہ وہ مزید نہ کر سکتی تھی۔“

”تو کیا میں تمہیں کبھی پہلے جیسا نہتا بولتا نہیں دیکھ سکوں گا؟“ بہت ڈر کر اس نے پوچھا تھا۔

”دیکھیں گے۔ ضرور دیکھیں گے وقت کے ساتھ ساتھ میں سب کے مزاج کو مزید بہتر طریقے سے سمجھنے لگوں گی مجھے سارے کام مہینچ کرنے اور سب معاملات ہنڈل کرنے آتے جائیں گا، میری حساسیت کم ہوگی، جو کوتاہیاں کمیاں مجھ میں آج ہیں وہ نہ ہوں گی اور ہو سکتا ہے تب سب لوگ میری پیچر بھی سمجھنے لگیں پھر سب ٹھیک ہو جائے گا، ٹھیک ہو جائے گا۔“ ”ہو پ سو کہ ایسا ہی ہو۔“ حارث نے اس کے لیے صدق دل سے دعا کی۔

”ان شاء اللہ ضرور ہو گا اور بہت جلد ہو گا۔“ شمسہ جھٹ سے بولی تھی۔

تالی تو اب بھی بجتی ہے، مگر اس کی نوعیت بدل چکی۔

شیشے کے سامنے کھڑی شمسہ نے چٹیا کو بل دیتے ہوئے گداز ہو کر سوچا۔

اب ہم ہاتھ بہ ہاتھ مار کر کسی بات پہ ہنس رہے ہوتے ہیں، کسی چیز کو انجوائے کر رہے ہوتے ہیں۔

نوکری میں نیا برتن آئے تو ٹکرانے کی آوازیں پہلے سے زیادہ ہو جاتی ہیں، مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ ایک دوسرے کو توڑنے پھوڑنے کے اور ایک دوسرے کی جگہ لینے کے درپے ہو جائیں، کچھ کچھ جھگی ہر ایک کے حصے میں آتی ہے، مگر پھر سب ایڈجسٹ ہو جاتے ہیں، اس قدر کہ کوئی موجود نہ ہو تو ادھورا لگنے لگتا ہے، کی محسوس ہونے لگتی ہے۔

سننے میں عجیب لگے گا، مگر ہوا ایسی تھا۔ گھر گھر ہستی میں مصروف رہنے والی عورت ہوں نا تو مجھے زندگی کا گڑ

بھی گرہستی کے کاموں نے ہی سکھایا اور سمجھایا، جی ہاں برتنوں اور برتنوں کی نوکری نے، جانتی ہوں کہ آپ کو سن کر ہنسی آئے، مگر اکثر میری ہم خیال ہوں گی بلکہ ساری گرہستن عورتیں ہی، ہم خیال ہوں گی جب میں مستقل پریشان رہنے لگی تو سوچا کہ اس سب کا انجام کیا ہو گا؟ اور میں سوچ کے ہی لرز گئی کہ شاید سب کے دل دور ہو جائیں۔

”نہیں نہیں یہ نہیں ہونا چاہیے۔“ میرا ضمیر کر لایا، دل دویا، ”پیشک۔“ کچھ مسائل ہیں، مگر چاؤ ارمان بھی تو بہت کیے گئے تھے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ تم بھی عورت ہی بنو؟ تاکہ یہ غصہ رکھنے والی ہمہ وقت ناراضی کے لیے تیار رہنے والی؟“

کوئی میرے اندر سے بولا۔ ”دیکھو، نہ تم گرہستن بنو، ہر وقت مصروف رہنے کے باوجود مسلسل مسکراتے والی کیونکہ خار تو تم سے کوئی نہیں کھاتا، نفرت بھی نہیں، پیڑ بھی نہیں، بس ذرا ذرا سی باتیں ہی تو ہیں۔“

آئینڈیا اچھا تھا۔ دل کو لگا، دقت ضرور ہوئی کیونکہ گلاس کے خالی حصے کو نظر انداز کر کے بھرے ہوئے حصے کو دیکھتے رہنا مشکل ہی نہیں مشکل ترین تھا، مگر بہر حال ناممکن نہیں تھا۔ دودھ سے دھلا ہوا تو میں نے خود کو کبھی کہا نہ سمجھا ہاں مگر گرہستن بننے کی عقل مندی ضرور کی اور اس پہ مجھے فخر ہے۔

ارے یہ کیا۔ شاید ہانڈی لگ گئی ہے اور شاید کوئی تیز تیز۔ بڑبڑا بھی رہا ہے، میں کچن کو چلی۔ مگر اس بڑبڑاہٹ کو سر پر سوار کر کے میں اپنی پلکیں نم نہ ہونے دوں گی۔

جی ہاں اختلاف رائے اب بھی ہو جاتا ہے، ایک دوسرے کی باتوں کو کبھی کھلے عام اور کبھی ڈھکے چھپے پائند بھی کیا جاتا ہے، مگر اب میں سر پہ سوار نہیں کرتی، دل پہ نہیں لیتی۔ اس سب کی عادی جو ہو گئی ہوں اچھی گرہستن بننے کے لیے میں نے ہر مطلوبہ طریقہ اپنایا ہر عادت اپنائی اور کامیاب ہو گئی، مجھے سراپے کا ضرور آئینڈیل ایک گرہستن کو سب سے زیادہ چاہ پزیرائی کی ہی تو ہوتی ہے۔

شاہد طلعت



”کو بر خور دار۔ کیا کہنا چاہتے ہو، اگل دو ماہ سکون ملے کچھ تمہیں بھی ہمیں بھی۔“
احسن نے چونک کر انہیں دیکھا۔ پھر سنبھل کر سیدھا ہو بیٹھا۔ جیسے اسی انتظار میں ہو۔
”یاما۔ مجھے شامہ سے شادی نہیں کرنی۔ کسی صورت بھی نہیں۔“

رمیز حسن کامنہ کھل گیا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ احسن کے دل میں یہ کچھڑی پک رہی ہے۔
”پاگل ہو گئے ہو تم؟ اگر یہ مذاق ہے تو نہایت بھونڈا ہے۔“ انہوں نے حق سے کہا۔

”یہ مذاق نہیں ہے یاما۔ میں سیریس ہوں۔ اور اگر آپ کو میری زندگی عزیز ہے تو آپ کو میری بات ماننا ہوگی۔“

”مگر کیوں؟“ رمیز نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے شامہ کو دیکھا تھا۔ پسند کیا تھا۔ باتیں کیں۔ ملتے جلتے رہے۔ یہ منگنی تمہاری پسند اور مرضی سے ہوئی اور۔“

”موراب میں اپنی مرضی سے ہی یہ منگنی توڑ رہا ہوں یاما! اس کا اور میرا مزاج بالکل نہیں ملتا۔ میں مشرق کو چلوں تو وہ مغرب کو چلتی ہے۔ میں دن کوں تو وہ رات۔ یاما! ایسی لڑکی کے ساتھ دو قدم چلنا بھی مشکل ہے نہ کہ ساری زندگی۔“ اس کا لہجہ مستحکم تھا۔

”تو پہلے تم کیا سوئے ہوئے تھے؟“ رمیز حسن نے مشتعل ہو کر کہا۔ ”چھ ماہ ہو گئے تمہاری منگنی کو اور

رمیز حسن بظاہر تو چائے پی رہے تھے مگر گاہے گاہے احسن پر بھی نظر ڈال لیتے، جو کسی الجھن میں تھا۔ اس کی حرکات و سکنات، اضطراب، بے چینی کچھ بھی ان کی نظروں سے چھپا نہ تھا۔ کوئی چیز اسے پریشان کر رہی تھی مگر کیا۔ وہ یہ سمجھنے سے فی الحال قاصر تھے۔

چائے ختم کر کے خالی کپ میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے پھر احسن کو دیکھا۔ اس کی پرسوج نگاہیں چائے کے کپ پر تھیں اور وہ اضطرابی کیفیت میں سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرے جا رہا تھا۔ رمیز حسن ہلکا سا کھنکھارے۔

نااہلیٹ



اب تمہیں بتا چلا ہے کہ تمہارے مزاج نہیں ملتے؟
”مگر شادی کے بعد بتا چلتا تو اور برا ہو تا یا! احسن
نے جھٹا کر کہا۔ ”تمہارے درمیان وہ انڈر اسٹینڈنگ
ڈیولپمنٹ نہیں ہو سکی جو عمر بھر ساتھ بھلنے کے لیے
ضروری ہے۔“

”یہ کوئی جواز نہیں ہے احسن! ریمز حسن تھوڑا
نرم ہے۔“ تمہاری ماما کے ساتھ میری انڈر
اسٹینڈنگ شادی کے بعد ہوئی اور ہماری خوش گوار
زندگی تمہارے سامنے ہے۔“

”وہ اور زیادہ تھاپا۔ اب ایسا نہیں ہوتا۔ ماما آپ
کی ہم مزاج تھیں۔ یہ آپ کی خوش قسمتی تھی۔ نہ
ہو تیں تو روتے سر پکڑ کر شام لکھ کی الٹی کھوپڑی ہے۔
میرا اس کا گڑا ممکن نہیں۔ لوگ تو سبزی بھی خریدتے
ہیں تو تھوک بھاگتے۔ یہ تو عمر بھر کا معاملہ ہے۔“

”بند کرو یہ بکواس۔“ ریمز حسن غصے سے کھڑے
ہو گئے۔ ”تنی مدت ملتے رہے تب نہ جانچا نہ پرکھا۔
اب خیال آیا تمہیں۔ یہ سب تمہیں منگنی سے پہلے
سوچنا چاہیے تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“ ان کا انداز
قطعی تھا۔

”تو کیا اب اس بھول کا خمیازہ ساری عمر بھگتوں؟
زندگی ایک بار ملتی ہے اور مجھے اپنی زندگی عذاب نہیں
بنانی۔“

”مجھے غصہ مت دلاؤ۔ ایسا نہیں ہو سکتا، کبھی بھی
نہیں۔“ ریمز نے کمال ضبط کیا۔

”یہ تو ہو گا پاپا۔ اگر آپ کو میری زندگی عزیز ہے
تو۔“ احسن کا انداز حتمی تھا۔ وہ جو دم بخود بیٹھی باپ
بیٹے کی تکرار سن رہی تھیں۔ ایک دم ہول پڑیں۔

”حسن بیٹا! فضول ضد مت کرو۔ ہماری بھی کوئی
عزت ہے۔ اپنے پاپا کی بات مان لو۔“

”یہ ضد نہیں ماما! میرا فیصلہ ہے اور پاپا سوری۔
میں نے شام لکھ کو بھی بتا دیا ہے اور اس کے گھر والوں کو
بھی۔“

”حق‘ تالاق‘ گدھا۔“ ریمز حسن کا چہرہ غصے

سے لال بھسوکا ہو گیا۔ ”سارے فیصلے خود ہی کر لیے
اور ہمیں خبر تک نہیں۔“

”سوری پاپا! اتنا اختیار تو مجھے اپنی زندگی پر ہونا
چاہیے۔“

احسن نے مدھم لہجے میں کہا اور میز سے گاڑی کی
چابی اٹھا کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔

انہوں نے ریمز حسن کی طرف دیکھا جو کمرے کا
طول و عرض باپ رہے تھے۔

”دیکھا تم نے اپنے لاڈلے سپوت کو۔“ وہ چکر
لگاتے لگاتے ان کے سامنے رکے۔ ”کیا بے ہودہ

حرکت کی ہے۔ انکار تک کھلا بھیجا۔ خود مختار ہو گیا ہے
تمہارا ہونا۔“

افسوس تو انہیں بھی ہوا تھا مگر طنز کیے بنا نہ رہ
سکیں۔

”آپ کا بیٹا ہے۔ آپ پر ہی جائے گا۔“

”بیٹا ہمارا ہے مگر ہم جیسا ہے کہاں۔ ہم والدہ کے
انتہائی فرماں بردار۔ تابع دار تھے۔ اسی جان مرحومہ نے
کہا۔ چڑھ جاؤ بیٹا سولی۔ چڑھ گئے چپ چاپ بغیر
اعتراض و جھجک کے۔“ ریمز حسن غصے میں اسی طرح
بلا سوچے سمجھے بولتے تھے۔

”خیر اتنا مبالغے سے بھی کام نہ لیں۔“ انہوں نے
تحمل سے کہا۔

”یاد نہیں جو او دم چائے تھے آپ نے میرے
والدین کو کیسے کیسے پیغام بھیجے کیا کیا ٹانگ رچائے
تھے؟“

”وہ تو بس یوں ہی ضد میں۔ ورنہ اسی جان آگ
میں چھلانگ لگانے کو کہتیں تو کو کو جاتے چپ چاپ ہٹا
سوال کیے اور تمہارے صاحب زادے۔ بد لحاظ“

گستاخ بد تمیز۔ اور تم اس کی حمایت کر رہی ہو۔ اس
تالاق کی؟“ فرحین کی بات پر وہ تھوڑا جھجکے تھے مگر پھر
اپنی ٹون میں واپس آ گئے۔

”میں حمایت نہیں کر رہی۔ اس نے برا کیا بہت
برا مگر کہا اس نے درست یہ ہمارا زمانہ نہیں کہ والدین

نے جس کھونٹے سے باندھا بندھ گئے۔“
”ہمارا زمانہ۔“ انہوں نے پُر خیال نظروں سے

بیگم کو دیکھا۔
اور ان کی آنکھوں کے سامنے کھلتے گلابوں جیسا وہ

دلربا چہرہ آ گیا۔ جو پل بھر میں ان کے حواسوں پر چھا گیا
تھا۔ ان کے اعصابی تناؤ سے کچھ کچھ۔ نقوش

ڈھیلے پڑنے لگے۔
اور وقت جیسے تیس سال پیچھے چلا گیا۔ جب انہوں

نے پہلی بار ان کو دیکھا تھا۔
وہ بھی شاید ماضی میں پہنچ گئی تھیں۔ ان کی کھوئی

کھوئی آنکھیں جیسے کوئی خواب دیکھنے لگی تھیں۔
گزرا وقت ہاتھ باندھے ان کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

اور وہ اس کے ایک ایک پل کو اپنے سامنے گزرتے
دیکھنے لگے۔

بات کچھ زیادہ بڑی نہ تھی مگر گھر میں طوفان آ گیا
تھا۔ بابا جان گرج رہے تھے۔ اسی جان بھی غصے میں
تھیں۔ بھابھی اور بھائی جان دم بخود تھے۔ ضیا جو رمزی
کا پیغام لایا تھا، سر جھکائے کھڑا تھا اور فرحین کھڑکی سے
لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

”اسے جرات کیسے ہوئی ایسی بات کہنے کی۔“ بابا
جان مارے طیش کے منہ سے کف اڑا رہے تھے۔

”کہہ دو جا کر اس سے شریف گھراؤں میں ایسا نہیں
ہوتا۔ نکال دے یہ خیال ذہن سے اور خبردار جو آئندہ
کوئی ایسا ویسا پیغام بھیجا۔“

”اے اس کی اماں نے دسیوں بار ٹھوک بجا کر
دیکھا۔ چوکھٹ گھسا ڈالی تب جا کر ہم نے ہاں کی۔“

ای جان نے تنک کر کہا۔ ”ہمیں کوئی لڑکی بھاری نہیں
پڑی تھی۔ اب بھلا یہ رمزی میاں کو سوچ بھی کیا؟“

”جتنا نہیں۔ مگر وہ کہتا ہے کہ ایک نظر دیکھنے کا تو
شرع نے بھی حق دیا ہے۔“ ضیا نے دبی زبان میں کہا۔

”شرع؟“ بابا جان آگ بگولہ ہو گئے۔ ”شرع
نے حق دیا تھا تو یہ حق پہلے مانگتے۔ اب جبکہ باقاعدہ

منگنی ہو چکی ہے۔ اب انہیں اس حق کا خیال آیا ہے۔
یوں بھی ہمارے گھرانے میں ایسا کوئی رواج نہیں۔ اگر
انہیں ماں، بہنوں پر اعتماد نہیں ہے تو کوئی اور گھر

دیکھیں۔“
”ہائے میری بد نصیب بچی۔“ امی جان واویلا کرنے

لگیں۔
”جب رشتہ ہوا تھا تو کیسے دشمنوں کے سینے پر تیر

چل گئے تھے۔ ایسا اچھا، اعلا تعلیم یافتہ، مقبول لڑکا،
ضرور دشمنوں نے کچھ کر دیا ہے، ہائے میری بچی کے

نصیب۔“
”تم چپ رہو۔“ بابا جان نے امی جان کو ڈانٹ دیا۔

”یہ آؤ بکا گھر لے لے۔“
”کہہ دو میاں! جا کر کہہ یہ ناممکن ہے، سمجھے؟“ وہ

دوبارہ ضیا سے مخاطب ہوئے۔
”جی۔ اچھا۔“ ضیا کندھے اچکا تا کمرے سے

نکل گیا۔

فرحین لڑکھڑاتی ہوئی کھڑکی سے ہٹی اور بستر پر
اوندھے منہ گر پڑی۔ ”یہ کیا ہو گیا میرے خدا!“
اس کا سر چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے
ترمے سے ناچ رہے تھے۔

”اگر رمزی ضد پر اتر آئے تو۔“ بابا جان تو کسی
صورت ان کی بات نہ مانیں گے۔ پھر کیا ہو گا آخر؟“

اس کا دل انجانے خدشات سے لرز رہا تھا۔
”خدا انخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو۔“ وہ

کانپ اٹھی۔ رمزی جیسے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔
”بولو سنی پاؤ کی میرے ہٹا۔ رہ لوگی میرے بغیر؟“

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ چہرہ بازوؤں میں چھپا کر
سک اٹھی۔ میں میر جاؤں گی۔ خدا یا۔ یہ کیا ہو گیا؟“

بات صرف یہ تھی کہ رمزی، فرحین کو ایک نظر
دیکھنا چاہ رہا تھا۔ جس وقت ان کی منگنی ہوئی وہ لندن
میں ایف آر سی ایس کرنے کے بعد وہیں ایک اسپتال
میں جاب کر رہا تھا۔ گھر سے خط پر خط آرہے تھے۔
”جلدی واپس آؤ ماما تمہاری شادی کے فرض
سے سبکدوش ہو سکیں۔“

مگر رمزی ٹال مٹول کر رہا تھا کہ ایسی کیا جلدی ہے؟ وہ پلاسٹک سرجری میں اسپیشلائزیشن کرنے کے بعد ہی واپس آنا چاہتا تھا۔ مگر ندانے لکھا کہ ان کو فرحین پسند آگئی ہے اور وہ ان کی منگنی کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ ابھی اسپیشلائزیشن کرنے کا خیال چھوڑ دیں اور اگر شادی کریں پھر چاہے جو کرتے رہیں۔

رمزی حیران ہوا کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ وہ باشعور تھا۔ تعلیم یافتہ تھا۔ پھر وہ بغیر دیکھے بغیر رکھے کیسے ایک اجنبی لڑکی کے لیے ہاں کر دے۔ اس نے فوراً "کال کی اور بہن سے صاف کہہ دیا کہ وہ کسی انجان ان دیکھی لڑکی سے شادی کرنے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ ندانے کہا۔

"میری بیمار ہیں اور اگر انہیں ان کی زندگی عزیز ہے تو تاخیر نہ کریں اور فوراً واپسی کا قصد کریں۔ امی جان اپنی آنکھوں سے انہیں ہستابستاد کھنا چاہتی ہیں اور وہ سہرا بند ہوا کر ان کی آرزو پوری کریں اور یہ کہ فرحین اچھی لڑکی ہے۔ اس سے شادی کر کے وہ بچھتا میں گے نہیں۔"

رمزی جھنجھلا رہا تھا۔ مگر ماں کی بیماری کاسن کر نرم پڑ گیا۔

"ٹھیک ہے، اگر امی جان کی خوشی یہی ہے تو آجاتا ہوں۔" اس نے فوری فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "مگر میرے آنے سے پہلے کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔ میں پہلے اسے ایک نظر دیکھنا اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" "مگر۔" ندانے کچھ کہتے کہتے رہ گئی۔ "چھا خیر۔" آپ آجائیں۔ اس کی بھی کوئی نہ کوئی سبیل نکال آئے گی۔ میں ملوا دوں گی۔"

"ندانے تم ان کو بتاؤ۔ میری بس یہی ایک شرط ہے۔ وہ بھی اس لیے کہ کہیں بعد میں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ شادی عمر بھر کا معاملہ ہے۔ مجھے انتخاب کا حق تو ہونا چاہیے۔"

ندانے کچھ ہچکچائی۔ اسے یوں ہی کچھ احساس سا ہوا کہ جیسے ندانے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔ وہ اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔ مگر رابطہ

منقطع ہو گیا۔

وہ واپس آنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ امی جان کی بیماری کاسن کر وہ درحقیقت پریشان ہو گیا تھا۔ اور ہر صورت ان کی خوشی پوری کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس سال کی تمام تعطیلات وہ ختم کر چکا تھا۔ اور اب جولائی سے پہلے اسے کوئی چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ کچھ اور بھی چھوٹے موٹے مسائل تھے۔ واپس آتے آتے اسے چھ ماہ لگ گئے۔ اس اثنا میں اس کی منگنی کر دی گئی۔ ندانے نے معذرت کرتے ہوئے بتایا۔

"فرحین جیسی لڑکیاں بیٹھی نہیں رہتیں۔ اس کے رشتے آ رہے تھے۔ اور گھر والے منگنی کرنے کو تقریباً تیار تھے۔ چنانچہ انہیں مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ کیونکہ فرحین جیسی لڑکی کو کھو دینا بڑی بد قسمتی ہوتی۔"

رمزی بہت جھنجھلا یا۔ غصہ ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ان سب کو وہ اتنی پسند تھی کہ وہ اسے کھو دینے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ رمزی چپ ہو رہا کہ جو ہوا سو ہوا۔ دل میں طے کر لیا کہ شادی مگر اس وقت تک نہیں کرے گا۔ جب تک فرحین سے مل نہ لے گا۔ کیونکہ وہ سمجھوتے کی زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔ وہ ایسا جیون ساٹھی چاہتا تھا جو اس کا ہم مزاج ہو۔ اسے سمجھ سکے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ خیالات کا تضاد ٹکراؤ کا سبب بنتا ہے۔ وہ گھر میں اور زندگی میں جھگڑا نہیں سکون اور پیار و خلوص کی فضا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ندانے کو بتا دیا کہ وہ فرحین کو دیکھے بنا شادی نہیں کرے گا اور ندانے اپنا وعدہ پورا کرے۔

ندانے اسے بتایا کہ اس کا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جہاں پرانی اقدار و روایات کی پاسداری جان سے بڑھ کر کی جاتی ہے۔ ان کے ہاں شادی سے پہلے لڑکی کا سسرال عزیزوں کے سامنے جانا سخت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ منگنی ترے چاہ تو اس کی جھلک تک نہیں دیکھ سکتا۔ فرحین کو صرف امی جان اور ندانے دیکھا۔

"یہ کیا جمالت ہے؟" رمزی بڑبڑایا۔ "انتا چھپا چھپا کر کیوں رکھ رہے ہیں؟ کیا عیب ہے اس میں؟"

"کوئی عیب نہیں۔" ندانے اطمینان سے کہا۔ "میں نے بتایا تاکہ ان کے ہاں روایات کی پابندی سختی سے کی جاتی ہے۔ پھر بھی میں کوئی نہ کوئی صورت نکال لوں گی۔ آپ کچھ صبر کریں۔"

"یاد رکھنا۔ جب تک میں اس سے مل نہیں لوں گا۔ شادی نہیں کروں گا۔" اس نے وارننگ دی۔ "ٹھیک ہے۔ ایک دو دن تک موقع نکال کر ادھر جاؤں گی اور کسی نہ کسی بہانے آپ کو ملوا دوں گی۔"

رمزی مطمئن ہو گیا۔ مگر ندانے اپنا وعدہ پورا نہ کر سکی۔ اسرار احمد کو گردے کی تکلیف تھی۔ ندانے امی کی بیماری کاسن کر پاکستان آئی تھی۔ پھر ماں کی خاطر رمزی کے لیے لڑکیاں دیکھنے لگی۔ اور پھر رمزی کی منگنی کے بعد بھی نہ جاسکی۔ اس کا ارادہ بھائی کی شادی کے بعد جانے کا تھا۔ کینیڈا سے آئے اسے سال بھر ہونے کو تھا۔ اس دوران اسرار احمد کی تکلیف بڑھ گئی۔ چنانچہ اس نے فون کر کے ندانے کو بلوایا۔ بے چاری ندانے کو افزائش کے عالم میں کینیڈا جانا پڑا۔ اس کے اس طرح جانے کا افسوس سب کو ہی تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ سب سے زیادہ اثر رمزی پر ہوا۔ سالوں بعد وہ بہن سے ملا تھا۔ دوسرا اس کا کام نہ ہو پایا تھا۔

رمزی اپنی ضد پر قائم تھا کہ جب تک فرحین کو دیکھے گا نہیں شادی نہیں کرے گا۔

ان ہی دنوں اسے معلوم ہوا کہ ضیا فرحین کا کزن ہے۔ اس نے ساری صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔ ضیا نے اس کی بددعا کو عدہ تو کر لیا، مگر اسے بھی کوئی تدبیر نہیں سوجھ رہی تھی۔

"کیوں نہ ماموں جان سے براہ راست بات کروں۔ کیا پتا مان جا میں۔" ضیا نے رمزی سے کہا۔ "یار۔ کچھ بھی کرو۔ اس سے ایک بار ملو ضرور۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر میں ان ہی سے بات کرتا ہوں۔ انہیں قائل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔ آگے تمہاری قسمت۔"

مگر جب ضیا نے بات کی تو اعجاز حسن ہتھ سے اکھڑ

گئے اور رمزی کے ساتھ ساتھ ضیا کو بھی بے نقط بنا ڈالیں۔ ضیا نے جاکر رمزی کو بتایا کہ بات بگڑ گئی ہے اور اب تو وہ کسی صورت فرحین کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکتا۔ کچھ بات کرنا۔

ضیا کو افسوس ہو رہا تھا۔ "مجھے عذرا بھائی یا ارسلان بھائی سے کہنا چاہیے تھا۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتے۔"

"مگر اس میں اتنا پیش میں آنے کی کیا بات تھی؟" رمزی کو سخت برا لگا۔ منگنی ترے میری۔ مجھے اس سے ملنے کا حق ہے۔ میں کوئی ان کی لڑکی کو اغوا نہیں کرنے جا رہا۔ نہ میں کوئی آوارہ ہوں اور ایسا ہی انہیں میری شرافت پر شک ہے تو بٹھائیں لڑکی کو اپنے گھر میں۔"

"ٹھیک ہے۔ ہمیں لڑکی کوئی بھاری نہیں ہے۔" اعجاز حسین غصے سے ضیا پر برس پڑے۔ "ہم کسی صورت اس کی بات ماننے کو تیار نہیں۔ خبردار! جو ہماری لڑکی کا نام لیا یا کبھی ہمارے گھر آئے گا کبھی وہ اسے وہیں لندن جاکر بیاہ رچالے، دیکھ سن کر۔ ہمارے ہاں نمائش نہیں لگتی۔" ضیا نے پیغام پہنچا دیا۔

"لندن میں جاکر بیاہ کیوں رچاؤں۔" رمزی نے پیغام بھیجا۔ "جس سے منگنی کی ہے اسی سے بیاہ رچاؤں گا۔"

"ہم شریف لوگ ہیں۔ آن پر جان دینے والے۔ ایسی ذلت آمیز شرط پر شادی کے لیے تیار نہیں۔ کوئی اور گھر دیکھو۔ ہماری طرف سے جواب ہے۔" اعجاز حسن نے کہلا بھیجا۔

"بد معاش ہم بھی نہیں۔" رمزی نے تھلا کر جواب بھیجوا یا۔ "فرحین ہماری مانگ ہے۔ دیکھتے ہیں کوئی اور کیسے لے جاتا ہے۔"

"خبردار۔ جو فرحین کا نام لیا۔" اعجاز حسن نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے پیغام بھیجا۔ "زبان کاٹ ڈالوں گا کم بخت کی۔ سمجھا لو اپنے اس چمیتے کو۔ ورنہ بچ جان سے جائے گا۔"

"نام کیوں نہ لیں فرحین کا۔ نام بھی لیں گے،

میں گے بھی، بیاہ بھی رچائیں گے اور جو کسی نے روکا تو اٹھالے جائیں گے۔ تم بھی کہہ دو جا کر۔“
ضیا ادھر سے ادھر پیغام لانے لے جانے میں گھن چکر رہا ہوا تھا۔ معاملہ سلجھانے کی کوشش میں اور زیادہ بگڑا جا رہا تھا اور وہ جس کے بارے میں یہ سارے فیصلے ہو رہے تھے اس سے کوئی نہیں پوچھتا تھا۔

اسے غش پر غش آرہے تھے آنکھیں سوچ کر انگارہ ہو رہی تھیں اور آنسو تھے کہ خشک ہونے میں نہ آتے تھے۔ عذرا بھائی بار بار بے چین ہو کر اس کے پاس آئیں۔ اسے گلے لگائیں، تسلی دیتیں، مگر وہ روئے چلی جاتی۔ کتنی بار ان کا جی چاہا کہ بابا جان سے جا کر کہہ دیں۔

”بابا جان! اتنی معمولی سی بات کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ اگر رمزی اسے ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں تو اس میں کیا حرج ہے۔“
مگر حوصلہ نہ پڑا۔

بابا جان اندر ضیا پر گرجتے پرستے رہے۔ وہ اپنے کمرے میں رو کر بے حال ہوتی رہی۔
ضیا بابا جان کے کمرے سے باہر نکلا تو منہ لٹکا ہوا تھا۔ جاتے جاتے وہ ذرا دیر کو فرحین کے پاس آیا۔
”کیا ہوا فرحین رو کیوں رہی ہو؟“

فرحین اور زور زور سے رونے لگی۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ گھبرا کر ضیا بانی لانے دوڑا۔ بمشکل اس کے آنسو ٹھہرے۔

”ہاں اب بتاؤ۔ کیا بات ہے؟“ اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں مرنے والی کی ضیا بھائی۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”میں۔ وہ کیوں؟ اچھا۔ سمجھا۔ مگر مرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم خود ہی کیوں نہیں مل لیتیں اس سے؟ اکڑا ہوا ہے۔ دونوں طرف سخت کشیدگی ہے۔ معاملہ سیریس ہے۔ اب جانے کیا ہو۔ کو کیا کہتی

ہو؟“

وہ سر جھکائے روتی رہی۔
”بولو۔ ملوگی رمزی سے؟“ ضیا بھائی نے اصرار سے پوچھا۔
اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر رونے دھونے کا فائدہ بڑھلے۔ جو ہوتا ہے ہونے دو۔ رونے جاتی ہیں بس۔ ذرا سی ہمت نہیں کر سکتیں۔“ ضیا بھائی خفا ہو کر چل دیے۔

اس کے آنسو اور بھی روانی سے بہنے لگے۔ وہ کیا کرے؟ کس قدر بے بس ہو گئی تھی وہ۔ نہ تو وہ بابا جان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانا چاہتی تھی اور نہ ہی اسے دل پر کوئی اختیار تھا جو رمزی کے نام پر دھڑکے چلا جاتا۔

منگنی کے بعد جب اسے رمزی کی تصویر دکھائی گئی تو وہ دیکھتی رہ گئی۔ اسے اپنی قسمت پر ناز ہونے لگا۔ خوش رو، جاذب نظر، ہنستی ہوئی روشن آنکھوں والا رمزی بل بھر میں اس کے دل میں اتر گیا۔ چپکے چپکے اس کی آنکھوں نے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے اور وہ جیسے اس کی رگ رگ میں لہو کی طرح دوڑنے لگا۔ کبھی کبھی اسے حیرت ہوتی، کیسے وہ ایک بالکل اجنبی، ان دیکھے، انجان شخص کی محبت میں پور پور ڈوب چکی ہے۔ حالانکہ اسے اس شخص کی عادات، مزاج، کسی چیز کا پتا نہ تھا۔ وہ تو یہ تک نہیں جانتی تھی کہ اسے کیا چیز پسند ہے اور کیا ناپسند۔ اس کے باوجود وہ اس کے دل کی گہرائیوں میں بڑے ٹھاٹھ سے براجمان تھا۔ اس کے نام کی انگوٹھی پہن لینے کے بعد وہ اسے کتنا اپنا اپنا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اسے اپنی ملکیت سمجھنے لگی تھی، مگر اب یہ اعزاز جھٹنے والا تھا۔ وہ امی جان سے بابا جان سے، اسے اسے اسے اسے اسے پوچھنا چاہتی تھی کہ اسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ کیوں اس سے پوچھے بنا اس کی زندگی کا فیصلہ کیا جا رہا ہے؟

وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ اسے رمزی ہر حال میں پسند ہے۔ چاہے اس میں ہزار عیب ہوں۔ مگر وہ یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ کیونکہ اس کی زبان پر حیا

کے تالے تھے۔ وہ تو انہیں یہ بھی نہ جانتا تھی کہ یہ منگنی اس نے اپنی مرضی سے نہیں کی تھی۔ اس کی زندگی کا سارا ہی انہوں نے چٹا تھا اور اس نے اسے قبول کر لیا تھا۔ ذہن و دل اور روح کی پوری گہرائیوں کے ساتھ۔

اور اب اس کے دلی احساسات سے بے خبر بابا جان اس بندھن کو توڑنا چاہ رہے تھے۔ گویا اس کے جسم سے روح نکال لینا چاہتے تھے۔ وہ اندر ہی اندر مرد رہی تھی۔ مگر منہ سے کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ وہ چپکے چپکے روئی اور رو دھو کر خود ہی چپ ہو جاتی۔ کسی کام سے کمرے سے باہر نکلتا تو اپنی روئی روئی آنکھوں کو چھپانے کی کوشش کرتے لگتی۔ بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔

عذرا بھائی کو تو اس کی دلی کیفیتوں کا کچھ اندازہ تھا۔ البتہ ضیا بھائی کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑنے پر وہ شرمندہ تھی۔

بل بھر کے لیے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ رمزی کو خط لکھ کر اس سے التجا کرے کہ وہ فی الحال بابا جان کی بات مان لیں۔ بعد میں اگر وہ ان کی پسند پر پوری نہ آتری تو خاموشی سے ان کی زندگی سے نکل جائے گی۔ مگر وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

کیا پتا رمزی کا مزاج کیسا ہو؟ اگر وہ اس کے لفظوں کی خوشبو کو محفوظ نہ رکھ سکتا تو وہ کیسے بابا جان سے نظریں چار کر سکے گی؟ کیا پتا وہ ضدی شخص اس کا خط جا کر سیدھا بابا جان کے سامنے رکھ دے کہ حضرت! صاحب زادی تو یہ کہتی ہیں اور آپ ہیں کہ خواہ مخواہ اکڑے جا رہے ہیں۔

نہیں۔ وہ بابا جان کو شرمندہ نہیں کر سکتی تھی۔ نہ ہی اس میں اتنا برا قدم اٹھانے کا حوصلہ تھا۔

پھر بھی بار بار اسے یہ خیال آتا رہا کہ کسی بھی طرح منت سماجت کر کے ہاتھ جوڑ کے اور ضرورت پڑے تو پاؤں پڑ کے رمزی کو روک لے۔ اس طرح امکان تھا کہ شاید رمزی اسے پسند کر لے۔ آخر اس میں کمی کیا تھی۔ گھٹاؤں جیسے سیاہ گھنے، لمبے بل، خوب صورت

مدھ بھری آنکھیں۔ سانچے میں ڈھلا جسم اور تکیے تکیے دل میں اتر جانے والے نقش و نگار جو دیکھنے والے کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچ لیتے۔ اسے اپنی قوتِ تخیل سے اچھی طرح آگاہی تھی۔ اسے امید تھی کہ شاید وہ اس کی سیاہ زلفوں کے گھنے جنگلوں میں سے واپس جانے کا راستہ بھول جائے اور اس کی جادو نگاہ آنکھوں کے طلسم میں گرفتار ہو جائے۔ جبکہ بابا جان کا فیصلہ اسے یکسر اس کی دنیا سے جدا کر رہا تھا۔

ضیا رمزی کے پاس آیا تو رمزی بند پر لیٹا ریلوے کا انجن بنا منہ اور ناک سے دھواں اڑا رہا تھا۔ ضیا سخت جھنجھلایا۔

”یار رمزی۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ پیغام رسائی کا واپس کام۔ ادھر سے تم ہٹ لگاتے ہو۔ ادھر سے ماموں جان ٹھوکر مارتے ہیں۔ میں غریب تو مارا گیا خواہ مخواہ اور ایک وہ صاحبہ ہیں کہ رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔ جان بڑے رہی ہیں۔“

رمزی جو ضیا کا غیر دلچسپ بیان بے نیازی سے سن رہا تھا اٹھ بیٹھا۔

”کون۔ کون صاحبہ؟“

”فرحین اور کون۔ جان دینے پر تلی ہیں۔ وہ تو میں نے سمجھایا کہ ٹھہرو ابھی۔ کیا پتا حالات سدھر جائیں۔“ ضیا نے مبالغے سے کہا۔

”اچھا۔ فرحین۔“ رمزی سیدھے ہو بیٹھا آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی۔ ”کیا کہتی ہیں وہ محترمہ؟“

”کہتی ہیں۔ زہر پھانک لوں گی مگر رمزی کے علاوہ کسی اور سے۔ ارے وہ تو تنکھیا منگوائے بیٹھی ہیں کہ ادھر منگنی کے جوڑے واپس ہوئے اور ادھر انہوں نے اس دنیا سے ناکھڑا کر ڈالا۔ تجھ سے باگڑو، ضدی، ہٹ دھرم کے لیے جان دے رہی ہے۔ زیادتی ہے کہ نہیں؟“

”اچھا۔ واقعی؟“ رمزی کو اچھا سا ہوا۔ شاید مشرقی دفا اسی کا نام ہے۔

”جان کیوں دیتی ہیں؟“ رمزی زیر لب بڑبڑایا۔
”پہلے ابابو کیوں نہیں سمجھاتیں جو ظالم سناج بنے بیٹھے ہیں۔“

”ماموں جان کو؟“ ضیا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ ”وہ تو زندہ گاڑ دیا اسے۔“
”ضدی تو میں بھی کچھ کم نہیں۔“ رمزی کے ہونٹ بھنج گئے۔ ”دیکھتا ہوں کیسے نہیں مانتے۔“
ضیا جو مبالغہ آمیزی سے رمزی کے جذبہ ہمدردی کو ابھارتا چاہ رہا تھا۔ سر پیٹ کر رہ گیا۔

”یاس۔ تم دونوں ہی ظالم ہو۔ ایک ہی مٹی سے بنے۔ ایک معصوم کی جان سے کھیل رہے ہو۔ اب کیا اپنی ضد میں اسے جان سے مار دو گے؟“
”نہیں۔“ رمزی نرم پڑ گیا۔ ”تم ایسا کرو کسی طرح انہیں متنگنی توڑنے سے روکے رکھو اور اگر معاملہ حد سے بڑھ جائے تو بے شک کہہ دینا کہ رمزی شرمندہ ہے۔ معافی مانگنے کو تیار ہے۔ میں اتنے میں کچھ سوچتا ہوں۔“

”کیا سوچو گے اب؟“ ضیا نے پوچھا۔
”بہتر تو یہ ہے کہ اپنی ضد چھوڑ دو۔ فرحین بہترین لڑکی ہے۔ تم بچھتاؤ گے نہیں اور جب وہ تجھ جیسے احق کو بن دیکھے قبول کر رہی ہے تو تم ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟“

”چاہتا تو میں بھی نہیں کہ متنگنی ٹوٹے۔ کیونکہ امی جان کو وہ بہت پسند ہے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ بہت اثر لیں گی۔“

ضیا نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔
”تم فکر مت کرو۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو میں نے اس تک سیدھے راستے سے پہنچنا چاہا۔ اب میں کوئی اور طریقہ سوچتا ہوں۔“

”یار ابو کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔“ ضیا نے ہاتھ جوڑے۔

رمزی نے ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔
”چھایہ بتاؤ۔ یہ ارسلان حسن کیسے شخص ہیں؟“
”مطلب؟“ ضیا نے اسے گھورا۔

”مطلب یہ کہ کیا اتنے براؤ مائنڈ ہیں کہ ہمارا ساتھ دیں۔“

”براؤ مائنڈ تو ہیں۔“ ضیا نے ہچکچا کر کہا۔ ”مور ماموں جان کی ضد پر تھوڑا برہم بھی۔ مگر معاملہ ان کی بن کا ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے ارادہ کیا ہے تمہارا؟“ ضیا نے تجسس سے اسے گھورا۔

”یاس۔ یہ فرحین تمہاری ماموں زاد ہے نا۔“
رمزی نے اچانک پوچھا۔ ”کیا یہ تمہارے گھر نہیں آتی جاتی؟“

”ہاں مہینے میں ایک آدھ بار آ جاتی تھی۔ ممانی یا عذر ابھائی کے ساتھ۔“ ضیا نے غلطی سے کہا۔

”اور میں نے کہا بھی تھا کہ تھوڑا صبر کرو۔ مگر تم تو ہتھیلی پر سرسوں جملنے کو تیار تھے۔ میری عقل پر بھی پتھر پڑ گئے کہ دوڑا ماموں جان کے پاس۔ انتظار کرتے تو میں کسی دن اپنے گھر ہی دکھا دیتا۔ مگر اب تو جب سے یہ سلسلہ چلا ہے۔ اس نے کہیں آنا جانا چھوڑ دیا ہے۔“

”تم نہیں لاسکتے کسی طرح؟“
”نہیں۔ کیونکہ میں ہی اس معاملے میں پڑا ہوں۔ اصرار کیا تو انہیں شک ہو جائے گا اور میں ماموں جان کے ہاتھوں جاں بحق ہونا نہیں چاہتا۔“
”غلطی ہوئی جو تم سے مدد مانگی۔“

”اسے کہتے ہیں نیکی کر دریا میں ڈال۔“ ضیا نے تھملا کر کہا۔

”چھایہ خیر۔ تم اب اس معاملے سے نکل جاؤ۔ میں خود ہی کچھ سوچ لوں گا۔“

ضیا منہ بنا کر آٹھ کھڑا ہوا۔
رمزی کی والدہ کو کوئی خبر نہ تھی کہ صاحب زادے کیا گل کھلا رہے ہیں۔ نذا کے جانے کے بعد کچھ تو

بریشالی کی وجہ سے وہ کہیں آ جانہ سکیں۔ پھر ان کی طبیعت بھی نرم گرم رہی۔ فرحین کے گھر سے بھی کوئی نہ آیا تھا جو انہیں حالات کی خبر ہوتی۔ خدا خدا کر کے ان کی طبیعت سنبھلی تو انہوں نے سوچا کہ اب شادی کی تاریخ طے کر لی جائے۔ نذا تقریباً تمام تیاری

کر چکی تھی۔ بری کے تمام جوڑے، زیور تیار تھے۔ صرف کپڑے سلوانے رہ گئے تھے تو اس میں کون سا وقت لگتا تھا۔ تاریخ طے ہوتے ہی وہ کپڑے سنے کو دے دیتیں۔ چنانچہ اپنے طور پر وہ مطمئن تھیں۔

اس دن ان کی طبیعت بہتر تھی۔ سوانہوں نے فرحین کے گھر جانے کا سوچا۔ ابھی وہ تیار ہو رہی تھیں کہ ان کی ایک ملنے والی بیگم وقار آگئیں۔ بیگم وقار کا فرحین کے ہاں بھی آنا جانا تھا۔ اس لیے انہیں حالات کی تھوڑی بہت خبر تھی۔

”کہاں کے ارادے ہیں؟“ انہوں نے انہیں تیار ہوتے دیکھا تو پوچھا۔ ”فرحین کے لیے دل تڑپ رہا ہے۔ بہت دن ہو گئے بی بی کو دیکھے۔ پھر شادی کی تاریخ بھی طے کر لی ہے۔ رمزی کی چٹھیاں ختم ہو رہی ہیں۔ پہلے ہی بہت وقت ضائع ہو گیا۔“ انہوں نے بیگم وقار کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

”وہ لوگ تو رشتہ توڑنے کو تیار بیٹھے ہیں اور آپ ہیں کہ شادی کی تاریخ لینے جا رہی ہیں۔ حد ہو گئی ہے خبری کی۔“ بیگم وقار کا لہجہ طنزیہ تھا۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

”کچھ غلط نہیں۔ یقین نہ آئے تو خود پوچھ لیں جا کر۔“

”مگر کیوں؟ وہ لوگ تو اتنے خوش۔ اتنی عزت کرتے تھے۔ کوئی ایسی بات بھی نہیں ہوئی جو رشتہ ٹوٹنے کی نوبت آتی۔“ انہوں نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

”بات تو آپ اپنے صاحب زادے سے پوچھیں۔ ویسے یہ میں جانتی ہوں کہ وہ رشتہ توڑنے والے نہیں۔“

”تو کیا رمزی نے کچھ کہا؟“ انہوں نے چونک کر پوچھا۔

جواب میں بیگم وقار نے تمام قصہ ان کے گوش گزار کر دیا۔ وہ جیسے سکتے کے عالم میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ انہیں رمزی سے یہ امید نہ تھی۔

رمزی آیا تو وہ منہ سرپیٹے پڑی تھیں اور ان کا پی

ہاں ہو رہا تھا۔ وہ گھبرا گیا۔

”امی جان! کیا طبیعت زیادہ خراب ہے۔ ڈاکٹر کو بلاؤں؟“ وہ — چنچ رہی ہیں۔

”کیا بات ہے امی جان! صبح تو آپ کافی بہتر نظر آ رہی تھیں۔“

”مجھے تم سے یہ امید نہ تھی رمزی!“ وہ بمشکل کہہ سکیں۔ رمزی انجان بن گیا۔

”تم نے مجھے ساری دنیا کے سامنے شرمسار کر دیا۔“

یہ کہہ کر وہ اس بری طرح روئیں کہ رمزی کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

”اگر میری کوئی بات بری لگی ہے تو مجھے جو چاہے سزا دیں۔ الٹا لٹکا دیں یا پھاسی چڑھا دیں جو چاہیں سلوک کریں میرے ساتھ۔ اچھا۔ اسی میں خوش ہیں تو کھڑے کھڑے شادی کر ادیں میری۔“

”تم نے ایسا کیوں کیا رمزی! میں کسی سے آنکھیں چار کرنے کے قابل نہیں رہی۔“

”اف امی جان۔ آپ نے ذرا سی بات کو مسئلہ بنا دیا۔ میں فرحین کو دیکھنا چاہتا تھا اور بس۔ آپ نہیں چاہتیں تو نہ سہی۔“ اس نے ہاتھ جھاڑے۔

”وہ لوگ رشتہ توڑنا چاہ رہے ہیں۔“

”کیا ان کی طرف سے کوئی پیغام آیا؟“ رمزی چونک پڑا۔

”نہیں۔ مگر میں نے سنا ہے کہ وہ رشتہ توڑنے کی سوچ رہے ہیں۔“

”ایسا نہیں ہو گا امی جان!“ رمزی نے یقین دلایا۔

”اگر انہوں نے رشتہ توڑنا ہوتا تو اب تک توڑ چکے ہوتے۔“

”شاید وہ ابھی فیصلہ نہیں کر پا رہے۔ مگر چلیا بدیہ۔ اگر بھائی صاحب نے کوئی فیصلہ کر لیا تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ تم نے آخر ایسی بچکانہ حرکت کی کیوں؟“

”غلطی ہو گئی۔“ اس نے معصوم سی صورت بنا کر کہا۔ ”آپ جو چاہیں کریں۔ اب میں آپ کے

معاملات میں بالکل دخل نہیں دلا گا۔
”مجھے حوصلہ نہیں پڑ رہا ان سے بات کرنے کا۔“
ای جان ہچکچاتی تھی۔
”آپ بات کر کے دیکھیں۔ زیادہ سے زیادہ انکار کر دیں گے، تو ٹھیک ہے، دنیا میں صرف فرحین ہی نہیں۔“
”تمہاری ان ہی باتوں کی وجہ سے معاملہ بگڑا ہے۔ اگر بات بن گئی تو میں اسی ماہ کی کوئی تاریخ شادی کی رکھ دوں گی۔“
”جو مرضی آئے کریں۔ میں نے کہا، میں آپ کے معاملات میں کوئی دخل نہ دلا گا۔“
رمزی نے سر جھکا کر کہا۔ ای جان نے رمزی کی پیشانی چوم لی۔
”بتاؤ کہ مجھے فرحین کا ساتھ منظور ہے کہ نہیں؟“
”مبارک ہو منظور ہے۔ ہزار بار منظور ہے۔ بس آپ ناراض نہ ہوں اور یوں ہی خوش خوش رہا کریں اچھا۔“
”ٹھیک ہے۔ تو پھر میں بات کرتی ہوں فرحین کی امی سے۔ دیکھتی ہوں کیا کہتے ہیں وہ۔“ ای جان نے کچھ سوچ کر کہا۔ رمزی سر جھکا کر رہ گیا۔

نازمین بیگم اب اس معاملے کو زیادہ التوا میں نہیں ڈالنا چاہتی تھیں۔ وہ اسی شام بیگم وقار کے ساتھ فرحین کے گھر پہنچ گئیں۔
گلے، شکوے ہوئے، ناراضی، غصہ، بے اعتنائی۔ اعجاز حسن پہلے تو ہتھ سے اکھڑنے لگے مگر نازمین بیگم نے سارا قصور رمزی کا مان کا معاملہ سنبھال لیا۔ نرمی سے کہا۔
”بے شک ساری غلطی رمزی کی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کی خواہش کچھ بے جا بھی نہ تھی۔ ہر ایک کو اپنی منسوبہ کو دیکھنے کا اشتیاق ہوتا ہے۔ مگر اب اپنی فرمائش شرمندہ ہے۔ بے شک آپ اسے دو جوئے لگائیں۔ میں اف بھی نہیں کروں گی۔“

اعجاز حسن بھی نرم پڑ گئے۔ جانتے تھے رمزی اچھا لڑکا ہے۔ ضدی تو ضرور ہے۔ مگر اب خود جھک رہا ہے۔
”ٹھیک ہے۔ اب آپ آئی ہیں تو۔ مگر سمجھا دیجئے اس نالائق کو۔ آئندہ ایسی کوئی حرکت نہ کرے اور جہاں تک تاریخ کی بات ہے تو اگلے ماہ کی کوئی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔ آج اس میں رجب ہے۔ شعبان کی پندرہ تاریخ کیسی رہے گی؟“
”لیجئے، پہلے منہ میٹھا کریں۔ مبارک ہو، تاریخ طے ہونے کی۔“ بلقیس خاتون نے ان کی طرف گلاب جامن بھائے۔
”آپ کو بھی۔“ نازمین بیگم نے گلاب جامن اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اور اگر آپ لوگوں کے دل میں کوئی ملال ہے بھی تو نکال دیں۔ میں ایک بار پھر معافی مانگتی ہوں۔“
”نہیں۔ نہیں۔ بہن۔ شرمندہ نہ کریں۔“ بلقیس خاتون نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”بچہ ہے۔ غیر ملک میں پلا بڑھا ہے۔ اسے یہاں کی روایات کا کیا پتا۔ اور یہ جو آپ اتنے ٹوکے مٹھالی کے لے آئی ہیں۔ کیا ضرورت تھی اس کی؟“
”یہ بھی تو ہماری روایات میں ہے۔“ نازمین بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور بہن۔ میرا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ ساری رسمیں، دستور کروں گی، مندی، مایوں، تیار رہے گا اور اب اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنی بیٹی سے مل لوں۔“
”ضرورت ضرورت۔ کیوں نہیں آئیں۔“ بلقیس خاتون انہیں فرحین کے پاس لے گئیں۔ فرحین سے ملے ہوئے انہوں نے اپنے دوس تو لے گئے ننگن فرحین کی کلائی میں پھنسا دیے۔
”ارے۔ یہ کیا۔ ابھی اس کی کیا ضرورت۔ شادی پر آپ جو چاہیں مگر ابھی تو۔“
بلقیس خاتون نے منع کرنا چاہا۔ مگر نازمین بیگم نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا۔
”یہ بھی ہمارے ہاں کی رسم ہے۔ ایک قسم کا

شکل۔ تاریخ طے ہونے پر بہو کو خاندانی ننگن پہنانا۔ اور فرحین اسے اب شادی تک ہاتھ سے نہ اٹارنا۔ اچھا۔“
انہوں نے فرحین کو پیار کیا اور خوش خوش تاریخ طے کر کے گھر آ گئیں۔ رمزی کو ساری بات مناسب لفظوں میں بتا کر سمجھایا کہ اب وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرے۔ رمزی کی یقین دہانی پر وہ مطمئن ہو کر شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔

رمزی نے ماں کو تو مطمئن کر دیا مگر دل میں ٹھان لیا کہ اپنی ضد پوری کر کے رہے گا۔ مگر جب اس مسئلے کا کوئی حل سمجھ میں نہ آیا تو پریشان سانس کی طرف چل دیا۔
”یار رمزی! وہ سالگرہ والی اسکیم تو ناکام ہو گئی۔“
”اس۔۔۔ وہ کیوں۔ ابھی تو سالگرہ آئی نہیں۔ اور اسکیم پہلے ہی ناکام۔“ رمزی کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔
”ہاں۔۔۔ وہ ماموں جان سے باتوں باتوں میں پہلو کی سالگرہ کا ذکر کیا کہ میرے پہلو کی پہلی خوشی ہے۔ سب کو اتنا ہو گا۔ مع فرحین کے۔ ماموں جان چونک پڑے کہ آج تک تو سالگرہ منائی نہیں۔ پھر اچانک یہ خیال کیسے؟ میں نے کہا۔ ماموں جان۔ کیا کروں فضا کی ضد ہے۔ پہلو تین سال کا ہو رہا ہے۔ تھوڑا ہلاک ہو جائے تو کیا حرج ہے؟ کہا۔ ”حرج تو کوئی نہیں، پر میاں۔ یہ خاص طور پر فرحین کیوں؟ وہ شادی تک اب گھر سے نہیں نکل سکتی۔ سمجھ۔ ہاں۔ ہمیں آنے میں کوئی اعتراض نہیں۔“ قیام نے منہ لٹکا کر ساری بات کہہ سنائی۔
”خوب۔“ رمزی نے قہقہہ لگایا۔ ”لگتا ہے تمہارے ماموں جان کو شک ہو گیا۔ جانتے ہیں کہ تم میرے دوست ہو۔ اسی لیے منع کر دیا۔“
”تو اور کیا۔“ قیام نے منہ بنایا۔ ”لب خواہ خواہ کا فریج آپرا مجھ غریب پر۔“
”خیر۔ اتنے غریب بھی نہیں ہو کہ اپنے بیٹے کے

لیے چار پیسے نہ خرچ کر سکو۔ مگر اب۔ وقت کم ہے۔ بتاؤ کیا کیا جائے؟“
”بہتر تو یہ ہے کہ اپنی ضد چھوڑو اور چپ چاپ سرا باندھ لو۔ شریف بچوں کی طرح۔“
”تو گویا اب تم کوئی مدد نہیں کرو گے؟“ رمزی نے کہا۔
”نہیں۔“ قیام نے دو ٹوک انداز میں کہا۔
”ہونہ۔“ رمزی نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

رمزی گھر آ کر بھی اسی سوچ میں ڈوبا رہا کہ ایسا کیا کرے کہ فرحین کو بھی دیکھ سکے اور بات بھی نہ بگڑے۔ دو دن اسی سوچ میں غلطاں رہا۔ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ناچار تنگ آ کر فضا کو فون کیا۔
”یا۔۔۔ میں اتنی مشکل میں پڑا ہوں اور تم ہو کہ نہ فون کیا۔ نہ خود آئے اور وقت ہے کہ بھاگا جا رہا ہے۔“
”پہنی ضد چھوڑ دو۔ ساری مشکلیں آسمان ہو جائیں گی۔ اور جہاں تک میرے آنے کا تعلق ہے تو یا۔۔۔ میں ڈیڈ بزی ہوں۔ ارسلان کو حیدر آباد جانا پڑ گیا ہے اور ماموں جان نے ان کے حصے کا سارا کام میرے ذمے لگا دیا ہے۔ ابھی ماموں جان کے ساتھ میرج ہال بک کروانے گیا تھا اس کے بعد فرنیچر والے کے پاس۔ تم جانتے تو ہو شادی والے گھر میں کتنے کام ہوتے ہیں۔“
”ہاں۔ ہاں پتا ہے سب۔ مگر یہ ارسلان حیدر آباد کیوں گئے؟ خیریت تو ہے۔“ کسی فوری خیال کے تحت رمزی نے پوچھا۔
”کمپنی کے کام سے گئے ہیں۔ چھ سات دنوں کے لیے۔ پھر آگے بھی چھٹیاں لپٹی تھیں شادی کے لیے۔ اس لیے ضروری تھا۔“
”سو طے ہوا۔ تم میرے کسی کام کے نہیں کیا۔“
”نائدہ ایسی دوستی کا۔“ رمزی نے جل کر فون رکھ دیا۔
”تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ کیسا ہو، اگر وہ ارسلان کا دوست بن کر فرحین کے گھر پہنچ جائے تو؟“

جب کوئی بہتر ترکیب سمجھ میں نہ آئی تو ناچار رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔
نازمین بیگم کو جا کر بتایا کہ اسے کسی دوست سے ملنے بھاول پور جانا ہے۔ وہ دن کے لیے بڑا ضروری۔
نازمین بیگم نے بادل خواستہ جانے کی اجازت دے دی۔
رمزی نے برف کیس میں ضروری سامان رکھا۔
ای جی جان کو خدا حافظ کہا اور ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں جا کر کراہک کر الیا۔

رمزی نے کوئی لمبا چوڑا اہتمام نہ کیا۔ صرف ایک چھوٹی سی فریج کٹ واٹر می لگائی۔ سیاہ شیشوں والا چشمہ لگایا اور فرحین کے دروازے پر جا بیٹھا۔
ایک بل کے لیے رک کر دروازے پر نظر ڈالی پھر تیل کے بین پر انگلی رکھ دی۔
”جی فرمائیے۔ کس سے ملنا ہے؟“ تھوڑا سا دروازہ کھول کر پوچھا گیا۔
رمزی کے تمام حواس بیدار ہو گئے۔ بے حد چوکنا ہو کر آنکھیں پوری کھول کر نظریں دروازے پر جما دیں۔ مگر جو کوئی بھی تھا دروازے کی اوٹ میں تھا۔
”ہم جی۔ دلدار حسین ہیں۔ بھاول پور سے آئے ہیں۔ ارسلان سے ملنا چاہتے ہیں۔“
”وہ تو یہاں نہیں ہیں۔“ اجڈ گنوار روکھا لہجہ۔
فرحین تو نہیں ہو سکتی۔ شاید کوئی ملازم۔ رمزی نے اندازہ لگایا۔
”کہاں گئے۔ ہم تو اتنی دور سے آئے ہیں۔“
”کیا پتا تھا کہ۔“
”وہ تو حیدر آباد گئے ہیں۔ وہ دن بعد لوٹیں گے۔“
عجلت بھر انداز۔ جیسے بات سننے کی بھی فرصت نہ ہو اور دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔
رمزی سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔
یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ خواہ وہ ہی اتنا تردد کیا۔ لمحہ بھر حسرت سے بند دروازے کو دیکھتے رہے۔ پھر اپنی ناکامی

پر دل گرفتہ سے ملنے تو اعجاز حسن پر نظر پڑی۔ جو چل قدمی کے سے انداز میں گیٹ کی طرف آرہے تھے۔
بریف کیس دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ میں غفلت کرتے ہوئے رمزی ست قدموں سے آگے بڑھا اور بہت مودب ہو کر سلام کیا۔
”میاں۔ کس سے ملنا ہے۔ کہاں سے آئے ہو؟“ چھڑی کو گھماتے ہوئے وہ رک گئے اور بغور اس سے پاؤں تک انہیں دیکھا۔
”کیا بتائیں صاحب۔ یہاں اپنا جگہ یا رہتا ہے ارسلان۔ اس سے ملنے آئے تھے بھاول پور سے سربراہان کے چکر میں بغیر اطلاع کے آگئے۔ مگر یہاں نہیں ہے۔“
”اور اب کہاں جا رہے ہو؟“ انہوں نے چھڑی زمین پر مارنے ہوئے پوچھا۔
”ہوٹل جانے کے سوا اور کہاں جاسکتے ہیں محترمہ وہاں ٹھہر کر ارسلان کی واپسی کا انتظار کریں گے۔ اب ملے بغیر تو ہم جانے والے نہیں۔“ رمزی نے قدرے بے زاری سے کہا۔
”میاں! ارسلان یہاں نہیں ہے۔ مگر اس کا گھر تو یہیں ہے۔ اب آئی گئے ہو تو بیٹھو۔ چائے والے پی کر کھانا کھا کر جانا۔“
”مگر آپ۔“ رمزی نے الجھے ہوئے انداز میں انہیں دیکھا۔
”ہیں ارسلان کا والد ہوں۔“
”آداب۔ تو آپ ہیں ارسلان کے والد۔“ رمزی نے نہایت تباہی سے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
”کس قدر اشتیاق تھا مجھے آپ سے ملنے کا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ ارسلان آپ کی اتنی تعریفیں کرتا تھا کہ حد نہیں۔ بہت عظیم ہیں آپ انکل۔ بہت گریٹ۔“
رمزی نے لپک کر ان کے ہاتھ چوم لیے۔
”چھا۔“ انہوں نے قدرے تعجب سے رمزی کے عقیدت بھرے انداز کو دیکھا۔
”جی ہاں۔ آپ کی محبت و شفقت کا ذکر سن کر

میں تازہ آب کا مشتاق ہوتا گیا۔ سوچتا تھا جب بھی اس طرف سے گزرا آپ سے ضرور ملوں گا۔ سو آج یہ سعادت نصیب ہوئی۔“ رمزی نے بے حد نیاز مندی سے کہا۔
”چھا میاں۔ اندر تو چلو۔“ وہ کچھ متاثر سے ہونے لگے۔
تیل پر دروازہ ملازمہ نے کھولا۔ ”برکت۔ بی بی سے کہو ارسلان کے دوست آئے ہیں۔ اچھی سی چائے بھجوا دیں اور ہاں کھانے کا انتظام بھی کر لیں۔ یہ کھانا کھا کر جائیں گے۔“ انہوں نے ملازمہ سے کہا۔
”نہیں۔ نہیں۔ کھانے کا تکلف رہنے دیں۔ چائے البتہ ہم پی لیں گے۔“ رمزی نے جلدی سے کہا۔
”تکلف تو میاں تم کر رہے ہو۔ اتنی دور سے آئے ہو۔ کھانے کے بغیر تو جانے نہ دیں گے۔“ اعجاز حسن نے اقرار کیا۔
”دراں میں ہمیں ایک اور دوست سے بھی ملنے جانا ہے۔ اس لیے جلیز آپ۔“
”چھا ٹھیک ہے۔ کھانے کے بعد چلے جانا۔“ انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔
رمزی جب ہو گیا۔ کیا پتا اس اثنا میں فرحین کو دیکھنے کی کوئی شہینہ نکل آئے۔
تھوڑی دیر بعد پر تکلف سی چائے آگئی۔ چائے کے دوران رمزی کچھ جچ کچھ جھوٹ ملا کر باتیں کرتا رہا۔
تب ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اعجاز حسن نے معذرت کر کے ریسیور اٹھایا اور کلن سے لگایا۔ چائے پیتے ہوئے رمزی کا سارا دھیان اوہر ہو گیا۔ اعجاز حسن گھر رہے تھے۔
”تم پنچو تو کھانا کھٹے کھاتے ہیں اور سنو! تمہارا ایک دوست بھی یہاں تمہارا منتظر ہے۔ دلدار حسین۔“ رمزی کے کان کھڑے ہو گئے۔ ”کون دلدار؟ ارے بھی یہ خود بات کرلو۔“ انہوں نے ریسیور رمزی کی طرف بڑھایا۔

”یہ لو بھی۔ فون ہے ارسلان کا۔ پہنچ رہا ہے۔“ چائے کا گھونٹ بھرتے بھرتے رمزی کو بڑے زور کا اچھوٹا لگا۔
اوہر اعجاز حسن کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا۔ اٹھاتے اٹھاتے کل کٹ چکی تھی۔
”اوہ لائن کٹ گئی۔ مگر پہنچ رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں۔ یہیں سے فون کیا تھا۔ آفس سے ہو کر آنا ہے۔“ انہوں نے بتایا۔
”جی۔ جی۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔“ رمزی نے قدرے ہلکاتے ہوئے کہا۔
”برا ہوا۔ اب تو گئے جان سے۔ یہاں سے نکلنے کی کوئی صورت، کوئی طریقہ۔ کیسے جان چھڑائیں؟“ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ آن کیا تو چمکتی اسکرین پر ضیا کا نام جگمگا رہا تھا۔
”اوہ ہیلو۔ ہاں سہیل۔ پہنچ رہا ہوں، ابھی گھنٹہ ڈیڑھ میں۔“ رمزی نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔
”اس۔ کیا ایک رہے ہو۔ میں ضیا ہوں۔ سہیل نہیں۔“ ضیا نے اچھے سے کہا۔
”کیا؟ تمہارے والد کا ایکسیڈنٹ ہو گیا؟ اسپتال میں ہو۔ کون سے اسپتال؟“ رمزی اپنی ہی ہانگ رہا تھا۔
”کون ہو تم؟ دلخ تو ٹھیک ہے تمہارا؟ اور یہ رمزی کہاں ہے؟“ ضیا نے اب کے بدلی ہوئی آواز پر غور کیا۔
”نکرنہ کرو سہیل۔ ابھی پہنچ رہا ہوں، منٹوں میں۔“ اس نے جھپٹ کر برف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔
”ارے کھانا تو کھا کر جاؤ۔ اعجاز حسن نے روکا۔
”نہیں۔ نہیں۔ سہیل بہت پریشان ہے۔ اس کے والد کا ایکسیڈنٹ۔ پھر آؤں گا۔ ارسلان کو میرا سلام۔“
اعجاز حسن ارے ارے کرتے رہ گئے اور وہ آدمی ادھوری بات کرتے ہوا کے گھوڑے پر سوار باہر نکل

گیارہ روزے کے پاس پاؤں رکھ کر گرتے گرتے بچا۔
مگر بل بھر رکنے کی زحمت نہ کی۔ فوراً رکشا کیا اور
ہوٹل پہنچ کر بی دم لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ضیا کا دوبارہ فون آگیا۔
”کہاں ہو بھئی؟ اور یہ تمہارا سیل کس کے پاس
تھا۔ عجیب اونگ بیونگی مار رہا تھا حق۔“
”ہاں وہ ہے ایک جاننے والا مسخو ہے بالکل۔
مذاق کر رہا ہو گا۔“ رمزی نے بات بتائی۔ وہ ابھی اسے
بتانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

”عجیب بے تکا انسان تھا۔ خیر کہاں تک پہنچیں
شادی کی تیاریاں۔ مجھے تو ماموں جان نے کچھ اس
طرح مصروف کر دیا ہے کہ حد نہیں۔ ارسلان آئے
تو کچھ فرصت ملے۔“

”ارسلان تو۔“ رمزی نے بمشکل بات دی۔
”اور ہاں۔ یہ کون سا دوست ہے تمہارا بھول پور
میں جسے میں نہیں جانتا۔ آئی بتا رہی تھیں کہ تم
بھول پور۔“

”ہاں ادھر ہی ہوں۔ اور ضروری نہیں کہ تمہیں
ساری خبریں ہوں۔ کوئی گھبراہٹ نہیں۔ ان
دنوں ہالینڈ میں ہے۔ شادی کے لیے آیا ہے تو جانا
ضروری تھا۔“ رمزی نے فی الحال ضیا کو اپنی ناکامی کی
واستان سنا مناسبت نہ سمجھی کہ جب ملاقات ہوگی تو
دیکھا جائے گا۔

”شکر ہے تم نے فرحین کو دیکھنے کی ضد چھوڑی۔
بلادج کی سنشن۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے
بھی۔“ ضیا کو خیال آیا۔

”اوں ہوں۔ ضد چھوڑنے والے نہیں ہم۔ مرد
بچے ہیں۔ فرحین کو دیکھ کر رہیں گے۔“ رمزی نے
ڈینگ ماری۔ خود بھی جانتا تھا کہ ممکن نہیں۔ بری
طرح مایوس تھا۔ ناامید۔ بے آس۔ مگر دعویٰ
کرنے میں کیا حرج تھا۔

”اب تو ہفتہ دس دن رہ گئے مایوں مندی کی رسم
میں۔ پھر نکاح اور رخصتی۔ کیا کر لو گے اتنے دنوں
میں۔“

”آپ سے مطلب؟“ رمزی نے ناراضی سے کہا۔
”یار خفا نہ ہو۔ میرے بس میں ہو تا تو ضرور پکڑ
کرتا۔“

رمزی جانتا تھا کہ ضیا کے اختیار میں کچھ نہیں۔
پھر بھی تھوڑے غرے غصہ ناراضی دکھائی۔ فون بند
کیا تو ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ وقت تھا کہ اڑا
جا رہا تھا۔ اور کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تھی۔

جب کچھ نہ سوچا تو غصہ غالب آنے لگا۔ موبائل
ابھی ہاتھ میں ہی تھا۔ بے اختیار فرحین کے گھر کا نمبر
ملا دیا۔ ماسوچے سمجھ۔

”ہیلو۔“ دوسری طرف کسی لڑکی کی آواز تھی۔
”کون فرحین؟“ رمزی نے باریک لڑکیوں والی آواز
میں پوچھا۔

”جی۔ میں فرحین۔ مگر آپ کون؟“ نرم۔ ملائم
آواز۔ شائستہ لہجہ۔

”ہم۔ رمیز حسن۔ کے دیتے ہیں۔ جب تک
دیکھ نہ لیں گے۔ شادی نہ کریں گے۔ عین نکاح
کے وقت انکار کر دیں گے۔ ہاں۔ اپنی ہٹ سے ہٹنے
والے نہیں۔“ اب کے رمزی نے اپنی اصل آواز میں
کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

فرحین ہکا بکا۔ بھونچکا کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ منہ
سے آواز تک نہ نکلی۔

”یہ کیا۔ کیا واقعی یہ رمیز تھے۔ اور اگر وہی تھے
تو کیا اٹھنے والے کی طرح ضد کیے جا رہے ہیں۔“
اسے ہنسی آئی۔ ساتھ ہی منتظر ہو گئی۔ اگرچہ
انہوں نے مگر شرفا میں کب ایسا ہوتا ہے؟ پھر ان کی
ای کی یقین دہانی، شرافت اور رکھ رکھاؤ۔ لیے
گھرانے بات پر جان دینے والے ہوتے ہیں۔ وہ کیا
اپنے بیٹے کو ایسا کرنے دیں گی؟

خدا شات، واہے، ریشانی۔ مگر آخر فیصلہ کیا۔ کچھ
بھی ہو۔ کسی کو بتاؤں گی نہیں۔ آگے میری قسمت
جو ہو سو ہو۔

رمزی فون کر کے مطمئن ہو گیا، اچھا ہے ذرا ابھی
تو تڑپے، جلے، اکیلا میں ہی کیوں؟

بل بھر کے لیے خیال نہ آیا کہ اگر انکار ہو گیا تو کیا
ہو گا۔ کسے ماں کو سنبھالے گا۔

اپنے کیمے پہ خوش خوش رمزی گھر آیا تو نازنین بیگم
منظر پیش تھیں۔ کتنی ہی کام رکے پڑے تھے۔

بے دلی سے سوچے منہ کے ساتھ سارے کام پٹاتا
رہا۔ مگر دل میں گاتھ سی پڑی تھی۔ ایک کسک سی کہ جو
کہا تھا پورا نہ کر سکا۔ جذبات میں اگر جو حرکت کر بیٹھا
تھا۔ اس پر پچھتاوا بھی تھا۔ سوچتا کیا حماقت کی۔ اگر

فرحین نے گھر میں بتا دیا تو سمجھو شادی کی ساری
تیاریاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ صاف انکار۔ اور
ایسا تو وہ قطعاً نہ چاہتا تھا۔ ای جان بے انتہا خوش
تھیں۔ اور ان کی خوشیوں کو آگ لگانا اسے کسی طرح

بھی گوارا نہ تھا۔ دل کو دھڑکا سا لگا تھا۔ مگر جب دوسری
طرف خاموشی رہی تو سکون سا ہوا۔ یقین ہو گیا کہ
فرحین نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ شاید مذاق سمجھا
ہو۔ بڑبڑلاں۔ یاد دلوانے کا خواب۔

پھر ضیا آگیا تو تھوڑا سا دل بہل گیا۔ مگر ضیا نے
رمزی کی بے زاری۔ اکتاہٹ۔ بے دلی صاف
محسوس کی۔ چہرے پر وہ رونق نہ تھی جو ہمیشہ نظر آتی
تھی۔

”کیوں۔“ وہاں میاں اتنے اکھڑے اکھڑے سے
کیوں ہو؟“ ضیا نے بغور اسے دیکھا۔

”تو کیا بھنگڑے ڈالوں۔ ملی چڑھا رہے ہیں۔
قربانی کا بکرا۔ کوہو کا بیل۔ آنکھوں پر ٹوہ چڑھا دیا
ہے۔ کہ لوسے گھومتے رہو آنکھیں بند کر کے۔ اور
میں احق، بے وقوف گدھالے بھاگا چلا آیا وہاں
سے۔ ماں کی آرزو۔ شادی کی خواہش۔“ رمزی
بھرا بیٹھا تھا۔ ضیا نے ذرا سا چھیڑا تو پھٹ پڑا۔

”وہیں شادی رچا لیتا۔ اپنی مرضی سے تو اچھا
تھا۔ اس طرح آنکھیں باندھ کر تو کنوس میں نہ
پھینکتے۔ اور جو کنواں پھانڈا ہی پڑتا۔ تو کم از کم اپنی
مرضی سے آنکھیں کھول کر چھلانگ لگاتے۔ کسی سے
گھٹ تو نہ ہوتا۔“ ضیا منہ کھولے حق دیکھتا رہ گیا۔

”اتنی بے زاری۔ خفگی۔ غصہ۔ اور اپنے

بارے میں ایسی گل افشانی۔ یہ تیل منڈھے چڑھ بھی
گئی تو کیا ہو گا اس کا انجام۔“

اندر سے بے حد منتظر۔ مگر ظاہر ہلکے پھلکے انداز
میں اس نے سمجھایا۔

”چھوڑو یا۔ اب ان باتوں کو۔ کل مندی ہے
اور وہ تمہاری فرحین جائے گی بیوی پار لرتیار ہونے۔
تو تم کیا یوں ہی چل پڑو گے؟ جانے دو ساری ناراضی۔
اور چلو ذرا میرے ساتھ۔“

”ہیں۔ بیوی پار لرس۔“ رمزی نے چونک کر کہا۔
”ویسے تو بڑے روایت پسند بنے ہیں۔ پھر تھوپ
لیتے میک اب خود ہی۔ اور کون سے بیوی پار لرس؟ کیا
تمہارے ساتھ۔“

”نہیں۔ ارسلان آگیا ہے تو اسی کے ساتھ۔
دھنک بیوی پار لرس۔ اور تم کوئی الٹی پلٹی مت سوچو۔
شادی بالکل تیار ہے۔ اب راضی برضا ہو جاؤ۔ ویسے
بھی ارسلان تمہیں اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ یہ نہ ہو
کہ جا کر بیوی پار لرس کے دروازے پر کھڑے ہو جاؤ۔“

ضیا جیسے اس کے دل کی بات سمجھ رہا تھا۔
رمزی سوچ میں ڈوب گئے۔

”سن بھی رہے ہو یا نہیں؟ اب سب بے کار ہے
رمزی میاں۔“ ضیا نے جیسے تھک کر کہا۔

”ہاں جانتا ہوں۔ سب کچھ۔ اور میں ایسے ہی
جاؤں گا نکاح میں بھی۔ اور بارات میں بھی۔ بغیر تیار
ہوئے اور کوئی مجھے مجبور کر کے تو دیکھے۔“

رمزی مایوس بھی تھا، ناراض بھی اور مشتعل
بھی۔ کسی ضدی بچے کا سا انداز۔ ہشوہری۔ ضیا
نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیا ہو گیا ہے یا۔ تم تو اچھے بھلے سمجھ دار ہو۔“
وہ دیر تک اسے سمجھا تا رہا۔



اگلے دن پہلے تو دھنک بیوی پار لرس فون کر کے معلوم
کیا کہ فرحین کب تک فارغ ہوگی پار لروالی نے ٹائم
بتا دیا۔ رمزی وقت سے کچھ پہلے گیا اور بیوی پار لرس کے

دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

وہ ہی پرانا گیت اپ 'فریج کٹ واڑھی' سیاہ گاگنز، کرتا پا جاما اور بے نیاز سا انداز۔ کچھ دیر بعد ارسلان کی گاڑی آکر رکی تو وہ ذرا ترچھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ارسلان بھائی گاڑی سے باہر نکلے۔ وہ موبائل کانوں سے لگائے بات کر رہے تھے۔ رمزی آہستہ آہستہ پارلر کے دروازے کی طرف بڑھا۔

"ہاں۔ میں پہنچ گیا ہوں۔ کتنی دیر ہے؟"

ارسلان کہہ رہے تھے۔

"اچھا۔ گیت کے پاس ہو۔ آجائے۔ میں بیٹھ ہوں۔" وہ غالباً 'فرحین' سے بات کر رہے تھے۔ رمزی نے ارسلان کی بات سنی تو گیت پر نظریں جمادوس۔ لڑکیوں کے ہنسنے، کھلکھلانے اور باتوں کی آواز کے ساتھ گیت بڑی تیزی سے کھلا۔ سرخ جوڑے میں ملبوس گہرے میک اپ اور بھرے نقوش والی جھلاوا سی لڑکی بڑی عجلت میں باہر نکلی اور ادھر ادھر دیکھے بغیر بے نیقے تیل کی طرح رمزی سے ٹکراتی ارسلان کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

رمزی جو ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑا تھا۔ گرتے گرتے بجائے گاگنز زمین پر گر گئے۔ اٹھانے کے لیے جھکاؤ کانوں میں ارسلان کی آواز آئی۔

"دیکھ کر نہیں چلا جاتا۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔ اس طرف۔" رمزی چھکا کا جھکارا گیا۔

"اس۔" تو یہ بھی وہ چپا کلی جو امی نے پسند کی۔ اپنے اتنے ہونہار، خوب صورت، شہزادوں جیسے بیٹے کے لیے۔ وہ سخت شاک میں آ گیا۔

بمشکل گاگنز اٹھا کر سیدھا ہوا تو محسوس ہوا کہ جیسے واڑھی اپنی جگہ سے اکھڑ رہی ہے۔ ہاتھ لگا کر دیکھا تو واقعی واڑھی ایک طرف سے اکھڑی تھی۔ گھبرا کر چپکانا چاہی۔ ساتھ ہی ارسلان کو دیکھا کہ وہ تو متوجہ نہیں۔

وہ سیل کانوں سے لگائے بڑے مصروف سے انداز میں کسی سے بات کر رہے تھے۔

اس کے پاس اس چھلاوا لڑکی کے علاوہ ایک اور لڑکی بھی کھڑی تھی۔ جس نے سر سے پاؤں تک آف وائٹ چادر لپیٹ رکھی تھی۔ چادر ٹھیک کرنے کے لیے لڑکی نے ہاتھ اوپر اٹھایا تو اس کی کلائی میں سنہری کنگن چمکے۔

"اس۔" یہ تو ہمارے خاندانی کنگن ہیں، جو امی جان ہمیشہ پہنے رکھتی تھیں۔ تو کیا یہ۔؟"

وہ آنکھیں پھاڑے آف وائٹ چادر والی کو دیکھ رہا تھا۔ جس کا چہرہ مکمل طور پر چادر سے ڈھکا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

"تو گویا ساری تک دو لا حاصل۔" رمزی نے مایوسی سے سوچا۔ تب ہی چادر ٹھیک کرتے کرتے لڑکی کی نظر رمزی پر پڑی۔

رمزی کو اپنی حالت کا احساس ہوا۔ سٹائلاکراس نے اپنی اکھڑی واڑھی پر ہاتھ رکھ لیا مگر نظریں لڑکی پر ہی جمی رہیں۔

لڑکی کی آنکھوں کا تاثر۔ کچھ ناقابل فہم سا۔ حیرت۔ بے یقینی۔ شناسائی۔

چادر ٹھیک کرتے کرتے اس کے ہاتھوں سے چادر کا پلو گر گیا۔ اور چہرے نے نقاب ہو گیا۔ رمزی کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوندھی۔ اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

سنہری دھمکتی رنگت، مسکراتے لب، سحر آگیاں آنکھیں یعنی کہ۔۔۔ ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں کی مکمل نفسیہ۔

پل بھر کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے اس نے پلو چہرے کے گرد لپیٹ لیا۔ کنگن ایک بار پھر چمکے۔ زور سے چمکے۔ لڑکی نے کچھ کہتی بولتی، مسکراتی، مہمیز لگا ہوں سے اسے دیکھا۔ اور مڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

گاڑی چلی گئی تو بت بنا رمزی جیسے کسی سحر کے اثر سے باہر آیا۔

یہ تو سچ چپا کلی تھی۔ مڑی ہوئی تھنی پلکوں والی خوب صورت سیاہ آنکھیں، سیدھی اس کے دل میں ترازو ہو گئی تھیں۔

رمزی نے ایک گہری سانس لی۔ دنوں سے مضطرب دل میں سکون سا اثر آیا۔ بے حد مطمئن اور خوش خوش وہ واپس لوٹا۔

مندى اور نکاح کا فنکشن ایک دن تھا۔ ضیا کو ڈر تھا کہ یوں ہی سر جھاڑ منہ ہار چلا آتا۔

مگر رمزی کو دیکھ کر حیرت سے آنکھیں کھل گئیں۔ رمزی تک سک سے درست پوری آن بان کے ساتھ نکاح کے لیے آیا۔ یہ ہی نہیں نکاح کے بعد دوستوں کے ساتھ مل کر بھنگوا بھی ڈالنے۔ ضیا ششدر

اسے دیکھتا رہا۔ دل میں کھدک سی لگی تھی۔ کہاں تو منہ پھلائے پھرتا تھا۔ اور کہاں بھنگوے ڈالے جا رہے ہیں اور دانت ہیں کہ اندر ہی نہیں جا رہے۔ موقع نہ ملا اور رمزی بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا۔

بارات والے دن کام دار کار اور کف والی سیاہ شیر والی اور آف وائٹ کلاہ پہنے شہزادوں کی سی شان سے چھ گھوڑوں والی بکھی سے اترے۔

دودھ پلائی اور سلامی کے وقت رمزی کی شکفتگی، برجستگی اور بذلہ سنجی عروج پر تھی۔

ہر کوئی فرحین کے مقدر پر رشک کر رہا تھا۔ ایسا خوبرو، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اتنا خوش مزاج دولہا۔

جبکہ فرحین کو دیکھ کر رمزی کو اپنی خوش بختی پر کوئی شک نہ رہا تھا۔ گلاب کی پتوں اور دودھ سے گندھی خوشبوؤں سے مہکتی، سحر انگیز آنکھوں پر پلکوں کی چلمن گرائے وہ سیدھی دل میں اتر رہی تھی۔ نکاح تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لیے رخصتی بھی جلدی ہو گئی۔

رات گئے رمزی اپنے کمرے میں آیا تو گلاب اور موتیا کی ملی جلی خوشبو کے ساتھ کسی انجانی سی مدھوش کن منک نے استقبال کیا۔ پھولوں کی لڑیوں کو ہٹا کر اس کے قریب بیٹھا تو اس کے بے دماغ حسن کو دیکھ کر مہموت رہ گیا۔ آنکھیں تو جیسے پھپھکیاں بھول گئیں۔

حالا نگہ اسٹیج پر رسومات کے دوران اور فونو گرائی کے وقت بھی چوری چوری دیکھتا رہا تھا۔ مگر یوں اپنے روبرو

اتنے نزدیک سے دیکھنا۔ اور پھر تاب لانا کاردار رہے۔ وہ رمزی کی محویت پر ذرا سا کسمسائی۔ کنگن ہلکے سے بجے تو رمزی جیسے ہوش میں آیا۔ کلائی میں پڑے کنگنوں کو دیکھ کر مسکرایا اور اس کے خوب صورت، نازک، ملائم، مندی سے سجے ہاتھ کو بڑی نرمی سے تھام کر ہیرے کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا دی۔ پھر مقبسم نگاہوں سے فرحین کو دیکھا۔

"اور اگر ہم نکاح کے وقت انکار کر دیتے تو؟"

رمزی کے لبے میں شرارت تھی۔ فرحین کے لبوں پر دلی دلی سی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے پل بھر کے لیے نظریں اٹھائیں۔

"اور اگر ہم چہرے سے پلو نہ گراتے تو؟" مدھ بھری سحر آگیاں آنکھیں رمزی کی خمار آلود نگاہوں سے ٹکرا کر جھک گئیں۔

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر وہ اسے نہ دیکھ پاتے تو کیا سچ انکار کر دیتے؟

وہ بتانا چاہتی تھی کہ اس نے تو ان کے چہرے کے

دار و ستاد کی طرف سے ہونے کے لیے خوش صورت ہونا

شیریں کھجور

نہیں گھبراؤ



قیمت - 550/- روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹھکانہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↩ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیگر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہے۔ یہ آج کے بچے ہیں۔ اڑ جانے والے، ڈٹ جانے والے، اپنی منوانے والے اور نہ ماننے کی صورت میں جان سے گزر جانے والے۔ ان کی مانتی پڑتی ہے ریمز حسن صاحب۔ ”فرحین نے بھرپور طریقے سے بیٹے کی وکالت کی۔

ریمز حسن نے قائل ہو جانے والے انداز میں اپنی رفیقہ حیات کو دیکھا۔ جو حسین ہی نہیں معاملہ فہم اور ذہین بھی تھیں۔

”اور اگر ہم بھی اڑ جاتے، ڈٹ جاتے، انکار کر دیتے تو۔“ نرم نرم سی مسکراہٹ نے ان کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔ شاید وہ ابھی پوری طرح ماضی کے اثر سے باہر نہ نکلے تھے۔

”تو۔“ فرحین نے مسکراتی نظروں سے انہیں دیکھا اور ایک گرمی طمانیت کا احساس انہیں سرشار کر گیا۔ ”تو ہم بھی مر جاتے، مٹ جاتے، فنا ہو جاتے۔“ وہ کہنا چاہتی تھیں مگر کوئی بھولی بھری یاد ان کے ذہن سے نکل گئی۔ مدتوں پہلے کا کہا ہوا جملہ۔

”اگر آپ ہمارے مقدر میں تھے تو آپ انکار کیسے کرتے؟“

گزرے ہوئے کسی خوب صورت لمحے نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ریمز حسن نے تہقیر لگایا۔

”ہم نے تو آپ کی بات رکھی تھی۔ سوچا تھا احسان کریں جناب پر۔“

”بہت شکریہ۔ احسان مند تو ہم آج تک ہیں آپ کے۔“ ریمز حسن نے تھوڑا جھک کر کہا۔

دونوں کے قہقہے ایک ساتھ گونجے۔ ماضی کی خوش گوار یادوں نے ان کے چہروں کو بھی نہیں سارے ماحول کو روشن کر دیا تھا اور گزری حقائق پر ہنستے مسکراتے وہ بھول گئے کہ کچھ دیر پہلے ماحول میں کتنا تناؤ تھا۔

ایک ایک نقش کو اذیر کر لیا تھا۔ ان کی تصویر ساری ساری رات اس کے ہاتھوں میں رہتی تھی۔ تب ہی تو ان پر نظر پڑتے ہی اس نے ان کی روشن چراغوں جیسی فروزاں آنکھوں کو پہچان لیا تھا۔ یہ رمزی جیسی فروزاں آنکھیں بھلا کسی اور کی بھی ہو سکتی ہیں؟ بل بھر کے لیے اس نے تھیر سے سوچا۔ مگر اگلے ہی لمحے رمزی کو سٹپٹاتے اور اکھڑی ہوئی دائرہ پر ہاتھ رکھتے دیکھ کر سب سمجھ گئی۔ سارا تھیر جاتا رہا۔

سوچا۔ رمزی پر احسان کرے اس کی ضد پوری کر کے۔ سوچو چہرے سے گرا دیا۔

”ہیں۔۔؟“ رمزی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

”جی۔“ ناز و اداسے کہا گیا ایک مختصر سانس۔

”جب آپ ہمارے مقدر میں تھیں۔ تو ہم کیسے انکار کرتے۔“

بے پناہ حیرت کے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے رمزی نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانکا۔ جذبوں میں ڈوبا مسکور کن لہجہ، نگاہوں کا دلہانہ پن، بے تابی اور محبت۔

فرحین کے سارے شکوے جاتے رہے۔ اور نظریں بے اختیار جھٹکتی چلی گئیں۔

ریمز حسن ماضی کے سفر سے واپس آئے تو ان کے چہرے پر طمانعت اور نرمی تھی۔ انہوں نے فرحین کی طرف دیکھا۔ اتنے سالوں بعد بھی ان کا چہرہ اتنا ہی روشن، اتنا ہی شاداب تھا۔ فرحین کی کھوئی کھوئی آنکھیں ان کی نگاہوں سے نکلا ائیں۔

”فرحین حسن! اگر تم اتنی حسین، اتنی دلربا نہ ہوتیں۔ تب بھی ہم یوں ہی نبھاتے عمر بھر۔ بخدا ہم اپنی والدہ کے کہے سے کبھی باہر نہ تھے۔“ انہوں نے بے ساختہ کہا۔ فرحین بھی جیسے حال میں آگئیں۔

”نا فرمان آپ کا بیٹا بھی نہیں۔ آپ کا غصہ، ملامت، ڈانٹ، پھٹکار سب سر جھکا کے سنتا ہے۔ ہر بات مانتا ہے۔ ہاں مگر یہ اس کی زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ وہ کچھ دباؤ نہیں کرے گا۔ زمانہ بہت آگے نکل چکا



نعمت ناز دوست کی لاکھڑائی

وہ دو گھنٹے سے لیپ ٹاپ لیے بیٹھا تھا۔ وجہ
چہرے پر سنجیدگی اب ایک معمول بن چکی تھی۔
شانزے آہستہ سے اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ
گئی۔

مکمل ناول



”ابھی تک کام ختم نہیں ہوا تمہارا؟“
”نہیں“ ابھی کچھ دیر اور لگے گی، تم سو جاؤ۔“ احمد
نے لگے ہاتھوں جواب کے ساتھ مشورہ بھی دے ڈالا۔
یہ مشورہ بھی اب ایک معمول بننا جا رہا تھا۔
”ڈھائی بج رہے ہیں۔“ شانزے نے گویا اطلاع
دی۔

”ہاں میں نے ابھی کچھ دیر پہلے ٹائم دیکھا ہے، مگر
مجھے اپنا کام ختم کرنا ہے۔“ احمد کی سنجیدگی اور اٹھنا
میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔
”بچوں کے اسکول میں کل پیر میں میٹنگ ہے۔“
شانزے نے چند لمحوں بعد ایک اور اطلاع دی۔
”اچھا!“

”کچھ کہا ہے میں نے۔“ شانزے سے اس کی مختصر
سی اچھا ہضم نہیں ہوئی۔ تو کچھ دیر بعد دوبارہ بولی۔
”سن لیا ہے میں نے کیا کروں؟“
اس کی یہ لاپرواہی اور بے نیازی دیکھ کر شانزے کی
جان بری طرح جل گئی۔

”تمہیں نہیں پتا کیا کرنا ہے؟“ اپنے غصے اور
کھولن پر قابو پاتے ہوئے شانزے نے اس سے الٹا
سوال کیا۔

”مجھے اپنے فرائض بہت اچھی طرح یاد ہیں اور
انہیں میں بخوبی بھارتی ہوں، البتہ تمہیں ضرورت ہے
اپنے فرائض یاد رکھنے کی۔“ احمد لیپ ٹاپ آف کر
کے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔
”کیا کوئی بات ہو رہی ہے مجھ سے؟“ اپنی تمام تر

مصروفیات میں سے تمہارے بچوں کے لیے ٹائم نکالتی ہوں، ہر ممکن توجہ دینے کی کوشش کرتی ہوں۔ گھر کو بچوں کو خود کو سب کو ہی مین مین رکھا ہوا ہے۔ اتنی نفی رو مین میں مزید اور کیا کروں؟ شانزے نے چپٹی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا، وہ جب دور تھا تو دھڑکنوں سے بھی زیادہ قریب تھا اور اب قریب آکر جیسے اس سے میلوں دور ہو رہا تھا۔

”جب تم ماشاء اللہ سے اچھی طرح ہر چیز مینج کر رہی ہو تو کل پیر مینس مینٹنگ میں بھی چلی جانا۔ مجھے بتانے کی یا فورس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”میرا مارنگ شولائیو ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے، میں کیسے پیر مینس مینٹنگ میں جاسکتی ہوں۔ تمہیں معلوم نہیں ہے کیا انجان بننے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“

شانزے ترش گئی۔

”تمہارے مارنگ شول!“ احمد کے لہجے میں تلخی اور طنز کی آمیزش برابر تھی۔

”تم اپنے گھر اور کیریر میں سے ایک چیز کو چھوڑ نہیں کر سکتیں؟“ احمد نے آج وہ بات کھلے لفظوں میں کہہ دی، جو وہ کئی مہینوں سے وہ لفظوں میں کہہ رہا تھا۔

”ایک چیز کا انتخاب؟“ شانزے بیک وقت صدمے اور حیرانی سے دوچار اسے دیکھنے لگی۔

”یہ نام، یہ عزت، یہ شہرت اور یہ صلاحیت، ہزاروں لاکھوں میں سے کسی ایک کا نصیب ہوتی ہے۔ میں تمہارے فضول اعتراضات کے پیچھے اپنے جگمگاتے فیوج کو ٹھوکر مار دوں؟“

”جب تک بچے کچھ بڑے نہیں ہو جاتے، انہیں تمہاری زیادہ ضرورت ہے شانزے!“ احمد کے لب و لہجے میں بہت عرصے بعد وہی ملاحت در آئی تھی جو کبھی اس کا خاصا تھی۔

”بچے اور گھر صرف میرے نہیں تمہارے بھی ہیں۔ ہم دونوں ہی اس گاڑی کے دوہمے ہیں۔ اسے چلانے کی آگے بڑھانے کی ذمہ داری ہم دونوں کی ہے۔ تم سارا وزن میرے پلڑے میں ہی کیوں ڈال دیتے

ہو؟“

”اس لیے کہ تم پہلے ایک بیوی اور ایک ماں ہو، اس کے بعد کچھ اور۔“ احمد نے سنجیدگی سے اسے دیکھا تھا۔

”یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں ایک عورت ہوں، دوسرے تیسرے درجے کی مخلوق، اسی لیے میں اپنے کیریر کی قربانی دے کر گھر میں باندی چولہا کروں۔ تم کیوں نہیں دے دیتے یہ قربانی، تم چھوڑ دو نا اپنی جانب اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی، اپنا کیریر۔“ شانزے ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔

”یہ میرا فرض ہے، اپنی فیملی کے لیے کمانا اور اس سپورٹ کرنا میں۔“

”یہ سب میں بھی کر سکتی ہوں، اس کے لیے تمہیں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ شانزے نے چیزی سے اس کی بات کالی۔

”بس۔۔۔ اسی بات کا زعم ہے تمہیں۔“ احمد نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی کشادہ پیشانی پر نمودار ہونے والا ایل غماز تھا کہ اندر ہی اندر وہ اشتعال میں آ چکا ہے۔

”زعم نہیں ہے، حقیقت کا ادراک ہے۔ مروی محتاجی اور غلامی ہی عورت کو اس کا محکوم بناتی ہے۔ میں نے اپنے پیروں میں یہ زنجیریں نہیں ڈالی ہیں۔“

شانزے پھر تلخ ہو گئی۔

”زنجیریں تو آل ریڈی تمہارے پیروں میں ہیں۔ ایک گھر، شوہر اور بچے۔“ احمد نے کانتی ہوئی ایک بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ جو کبھی بے حد محبوب تھی اب کتنی اجنبی سی لگنے لگی تھی۔

”میرے قدم کسی بھی زنجیر کی مجبوری میں نہیں بندھے۔ اپنی مرضی سے اپنے قدم روکے ہوئے ہیں میں نے، لیکن اگر پانی سر سے گزرنے لگا تو ضرور مجھے کچھ سوچنا پڑے گا۔“ شانزے ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

احمد اپنے لب بچنے چند ثانیہ تک اسے دیکھا اور پھر

یوں سر جھٹکا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”میں میں جاؤ۔“

شانزے اس کے انداز اور مزاج کے ایک ایک رنگ سے واقف تھی، اپنے اندر اپنے غصے اور اشتعال کے دباؤ کو بمشکل دبا لی وہاں سے چلی آئی۔

تین بجنے والے تھے۔ اسے علی الصبح ہی اٹھنا ہوتا تھا۔ بچوں کے اسکول جانے کی تیاری، احمد کے آفس جانے کی تیاری، سب کو نمٹا کر پھر اس کی اپنی تیاری۔

کبھی کبھی تو وہ بغیر ناشتے کے ہی بھاگ بھاگ اسٹوڈیو پہنچتی۔ اگر کبھی دس پندرہ منٹ ہوتے اس کے پاس تو ہکا بھکا سا کوئی اسنیک، جوس، دودھ چائے یا کالی اپنے موڈ کے مطابق لے کر وہ مقررہ وقت پر اپنا شو اسٹارٹ کر دیتی۔

وہ ایک مشہور و معروف مارنگ ہوسٹ تھی۔ ابتدا میں اس نے ایک دو ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھائے اور چند ایک کمرشلز میں بھی کام کیا مگر اصل شہرت اسے اپنے مارنگ شو کی بدولت ہی ملی۔ اس کی خوب صورت مہکتی آواز، پُر اعتماد لب و لہجہ، مقناطیسی شخصیت اور مقابل کو اپنے سحر میں گرفتار کرتی گفتگو۔ سب نے مل کر اسے شہرت کی بلندیوں پر کھڑا کر دیا تھا اور بلندی شہرت کی ہوا عزت کی دولت کی ہوا کامیابیوں کی۔ کسی بھی بلندی پر اپنے قدم جما کر مضبوطی سے ساتھ کھڑے رہنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ معمولی سی ہوا سے بھی توازن بگڑ جاتا ہے، قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں۔

شانزے کے قدم بھی اب لڑکھڑانے لگے تھے۔ حالانکہ اس نے اپنی پوری کوشش کی تھی اب تک اپنے قدم جما کر مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہونے کی، مگر سارا قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ وہ جو اس کی محبت تھا، اس کا شریک سفر، ہم دم و ہم ساز، اس کی آنکھوں میں جلتی محبت کی لوگم ہوتی جا رہی تھی۔ شانزے کیسے اپنا راستہ دیکھتی۔ احمد کے ہاتھوں کی گرفت اس کے ہاتھوں پر ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ وہ بھلا کیسے اپنا توازن قائم رکھتی۔

”نہیں تو اب لگتا ہے صبح ہی آئے گی، جب اٹھنے کے لیے الارم بجے گا۔“ شانزے نے جھنجھلا کر کروش لی تھی۔

☆ ☆ ☆

صبح شانزے کا موڈ خراب تھا۔ احمد کا منہ اس سے زیادہ پھولا ہوا تھا وہ بغیر ناشتے ہی تیار ہو کر گھر سے نکل گیا۔

”ہو نہ! ناشتہ کیا، لچ اور ڈنر بھی چھوڑ دے، مجھے کیا۔“ شانزے کا دل جل کر کباب ہو گیا تھا۔ احمد تیار ناشتا ٹیبل پر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

ملازمہ کی مدد سے اس نے جلدی جلدی بچوں کا لچ بنایا، بچوں کو اسکول بھیج کر اس نے سکون کا سانس لیا، مگر سکون کا یہ سانس محض لمحائی اور وقتی تھا۔ اسے اپنی تیاری کرنی تھی۔ وقت کم تھا، جلدی جلدی شاؤر کے گر اس نے ناشتے کے نام پر سلاکس کا ایک کونا کترا، جوس کا گلاس پیا اور بھاگ بھاگ اسٹوڈیو جا پہنچی۔

میک اپ کروا کر وہ کیمرے کے سامنے آئی تو ایک بدلی ہوئی شانزے تھی۔ ہنسی مسکراتی، تروتازہ چہرے کے ساتھ، ایک تروتازہ صبح کا آغاز کرنے والی۔

ڈراموں میں اس کی اداکاری بہت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مگر مارنگ شو میں وہ خوش باش نظر آنے کی اتنی اچھی ایکٹنگ ضرور کر سکتی کہ اسے دیکھنے اور سننے والا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کے دل اور گھر کے حالات کیسے ہیں۔

شو ختم ہونے بعد وہ کچھ دیر یاسیت اور بے زاری کے عالم میں بیٹھی تھی جب فواد حسن اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ وہ ماڈل بھی تھا ایکٹر بھی اور آج کل اس کا مارنگ شو پروڈیوس کر رہا تھا۔

”کیا ہوا اعلیٰ بیت تو ٹھیک ہے نا؟“

”ٹھیک ہے۔“

”پریشان لگ رہی ہو؟“

”پریشانی تو زندگی کا حصہ ہیں۔ دنیا کا ہر شخص ہی کسی نہ کسی وجہ سے پریشان ہے۔“ شانزے نے گول

مول جواب دیا۔
 "فلسفہ مت بگھاو۔ ٹھیک ٹھیک جواب دو میری بات کا۔" فواد حسن نے اسے بڑے استحقاق کے ساتھ ڈپٹا۔ پچھلے آٹھ ماہ میں دونوں کے درمیان اتنی اچھی انڈر اسٹینڈنگ اور فرینڈشپ ہو چکی تھی کہ وہ شانزے کو ڈپٹ بھی لیتا تھا۔ دھونس بھی جمالیتا تھا اور اس کی بہت سی مشکلات اور پریشانیوں کو شیر بھی کر لیتا تھا۔
 "بچوں کے اسکول میں پیرٹس میننگ بھی احمد سے کہا تھا مگر بتا نہیں وہ گیا کہ نہیں۔ اس کے آفس سے ڈانگ ڈسٹینس ہے اسکول اور ایک آدھ گھنٹہ نکالنا اس کے لیے کوئی مسئلہ بھی نہیں۔ پچھلی دو میٹنگز میں بھی ہم دونوں میں سے کوئی نہیں جاسکا۔" شانزے کا منہ لٹکا ہوا تھا۔
 "تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ احمد کو فون کر کے پوچھ لو کہ وہ کیا یا نہیں۔" فواد نے اسے مشورہ دیا۔
 "اس نے انکار کیا کہ وہ نہیں گیا تو میری مینشن اور برہہ جائے گی۔"
 "ایک تو تمہیں مینشن پالنے کا بہت شوق ہے بات بات پر مینشن ہو جاتی ہو ایسے لائف گزارو گی تو بس گزار چکیں۔"
 "کبھی ہم لائف کو گزارتے ہیں، کبھی لائف ہمیں گزارتی ہے بس اس گزارا گزاری میں زندگی اور ہم دونوں ہی گزر جاتے ہیں۔"
 "تم نے کہیں فلاسفی میں تو ماسٹرز نہیں کیا؟" فواد نے بے حد سنجیدگی سے سوال کیا۔
 "نہیں۔" شانزے نے بھی سنجیدگی سے نفی میں سر ہلایا۔
 "صبح ناشتا ٹھیک سے کیا تھا؟" اگلا سوال ہوا۔
 "جوس پیا تھا ایک گلاس۔" شانزے نے جج جج بتایا۔
 "تب ہی۔" فواد نے سر ہلایا۔
 "خالی پیٹ اسی قسم کی باتیں سوچتی ہیں۔ چلو آؤ

میں تمہیں اچھا سا بچ کرانا ہوں۔"
 "اونٹنوں! شانزے نے موبائل میں ٹائم دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ "دیر ہو جائے گی مجھے بچوں کے اسکول سے آنے کا وقت ہو جائے گا۔"
 "بچوں کو ڈرائیور لے کر آتا ہے اسکول سے اور گھر پر میڈ ہوتی ہے میرا خیال ہے اتنا تو وہ سنبھال ہی لے گی فون کر کے انٹرکشن دے دو کہ بچوں کو پہنچ کر واکے کھانا کھلا دے۔ تم دیر سے آؤ گی اس سے پہلے بھی تو دو چار بار جب تم لیٹ ہو میں تو ایسے ہی پہنچ کیا تھا تم نے۔"
 "ہاں کیا تو تھا۔" شانزے کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ اس کا ذہن منتشر تھا اور طبیعت بے زار ہو رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔
 "احمد کو فون کرنے کے لیے اس نے موبائل اٹھایا کچھ دیر اسے گھورتی رہی پھر موبائل بچھڑا۔
 "ہو نہ مائی فٹ! اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں مینس ہو رہی ہوں گی۔ وہ خود بھی تو فون کر کے بتا سکتا تھا مگر کیوں کرے اکڑو۔ تو وہ شروع سے ہی ہے۔ میں ہی ہمیشہ جھکتی آئی ہوں، کب تک جھکوں جتنا میں نرم ہوتی ہوں وہ اتنا ہی سخت ہو جاتا ہے جتنا میں کمزور و ماتر کرتی ہوں وہ اتنا ہی اکڑ جاتا ہے۔"
 "چلیں؟" فواد تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر چلا گیا تھا واپس آکر دوبارہ پوچھنے لگا۔
 "ایک منٹ! پہلے میں گھر فون کر لوں، میڈ کو بتا دوں کہ میں لیٹ ہو جاؤں گی۔ وہ بچوں کو دیکھ لے۔" شانزے نے پھر موبائل اٹھالیا۔
 * * *
 فواد اسے ساحل سمندر پر بنے ایک ریسٹورنٹ میں لے آیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ریسٹورنٹ میں لوگ آ جا رہے تھے۔
 "یہاں کیوں آئے ہو؟" شانزے نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

"اس لیے کہ تمہیں سی فوڈ پسند ہے جو یہاں بہت اچھا ہوتا ہے اور یہاں کی ہوائ لگے گی تو تمہارا موڈ بھی فریش ہو جائے گا۔"
 "کچھ زیادہ ہی نہیں جان گئے میرے بارے میں؟" شانزے مسکرا دی۔
 "آئر آل میری پیاری سی دوست ہو۔ دوست کی معمول پسند ناپسند بھی معلوم نہ ہو تو فرینڈشپ کا فائدہ؟"
 "فرینڈشپ فائدے کے لیے کی جاتی ہے؟"
 "شانزے نے اس کا جملہ پکڑ لیا۔
 "اوہ، منہ سے کچھ غلط نکل گیا۔" فواد حسن نے سر کھچایا۔ "آئی مین کہ ایسی فرینڈشپ بھلا کس کام کہ آپ کو اپنے دوست کی پسند ناپسند بھی معلوم نہ ہو۔" فواد نے تصحیح کی۔
 "اچھا اب کچھ منگوالو۔ بھوک لگ رہی ہے بہت ذبردست قسم کی۔"
 "بالکل بالکل۔ بھوک تو مجھے بھی ذبردست قسم کی لگ رہی ہے۔ آج میں نے بھی ناشتا ڈھنگ سے نہیں کیا۔ آٹھ ہی دیر سے کھلی۔ اتنا ٹائم بھی نہ ملا کہ اپنے لیے ایک کپ چائے ہی بنالیتا۔ جلدی جلدی تیار ہو کر بھاگ نکلا۔ اسٹوڈیو آکر بھی کچھ نہیں کھایا۔ سوچا لچ گھڑا قسم کا کر لوں گا۔" فواد ہلکے پھلکے لہجے میں معمول کے مطابق باتیں کر رہا تھا۔
 "اکیلے رہو گے تو یہی ہو گا۔ مینے میں مشکل سے پانچ دن ہی اپنے گھر سے ناشتا کر کے آتے ہو۔ کوئی اچھی لڑکی دیکھ کر شادی کر لو، کم سے کم تمہارے کھانے بنے کا خیال تو رکھ لے گی۔"
 "جب کوئی اچھی لڑکی ملے گی تو سوچیں گے۔ ابھی تو ایک ہی اچھی لڑکی سے بڑی مشکل سے چھٹکارا حاصل کیا ہے۔" فواد حسن مسکرایا۔ پچھلے سال اس کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہوئی تھی۔ دو سالہ ازدواجی زندگی بڑے بھونڈے طریقے سے گزری اور بڑے بڑے طریقے سے انجام سے دو چار ہوئی۔

شانزے خاموشی سے فرائی فش کا ٹکڑا پلیٹ میں رکھ کر کھانے لگی۔
 گھر پہنچی تو بچے کھانا کھا کر سو چکے تھے۔ ملازمہ اپنے کوارٹر میں تھی۔ بس جو کیدار گیٹ پر اونگھ رہا تھا۔ شانزے کھکی کھکی سی لاؤنج میں صوفے پر آن گری۔ بورے گھر میں سنائے کا راج تھا۔ ایر گنڈیشن کی مخصوص گھوں گھوں کے سوا کہیں اور کوئی آواز نہ تھی کچھ دیر وہ وہیں آڑی ترچھی پڑی رہی، پھر ہاتھ روم میں گھس گئی۔ ٹھنڈے پانی کا ایک طویل شور لے کر وہ باہر آئی تو اس کی ساری سٹکھن، ٹینشن سب غائب تھی۔ فقط ایک تازگی کا احساس باقی رہ گیا تھا۔
 کل رات سے اس کے کشیدہ اعصاب اب خاصے بر سکون تھے، اپنے تراشیدہ بالوں کو ڈرائرز سے خشک کر

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور جہول

دستِ کدوگر

نوزیرہ یاسمین



قیمت - 750/- روپے

مکھانے کا پتہ:
 مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

کے خشک اور معطر فضا میں آرام سے لیٹ گئی۔

احمد نے بڑی محنت اور جدوجہد کے بعد اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا آغاز کیا تھا۔ اس کی ٹیم کو مختصر مگر محنتی اور باصلاحیت افراد تھے۔ ان کے بنائے ہوئے بہت سے کمرشلز ہٹ ہوئے تھے اور انہی کمرشلز کے ذریعے کچھ نئے چہرے بھی شہرت پا رہے تھے۔ انہی میں ایک نام کوئل خان کا تھا۔ کوئل اسم باہمی تھی۔ اسے دیکھ کر کسی بہت ہی نازک مگر بے حد خوب صورت کھلے ہوئے پھول کا خیال دل میں آتا تھا۔ وہ طرح دار تھی۔ باصلاحیت تھی مگر ابھی شو بزمی دنیا میں اپنا نام و مقام بنانے کے لیے جدوجہد کے مراحل سے گزر رہی تھی ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق ہونے کے باوجود بہت مڈرن اور آزاد خیال بلکہ کسی حد تک بے باک تھی۔ احمد ویسے تو عام طور پر ایک سنجیدہ مزاج اور لیے دیے رہنے والا شخص تھا مگر کوئل کے ساتھ آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی دوستی اب بے تکلفی میں ڈھل گئی تھی۔

خوش شکل اور خوش ادا کوئل بدترج اس کے قریب آرہی تھی۔
”اف!“

دو گھنٹے کی بحث کے بعد کلائنٹ رخصت ہوا تو احمد نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس فیلڈ میں اس کے پاس انواع و اقسام کے لوگ آتے تھے۔ یہ کلائنٹ موصوف بھی ان ہی میں سے ایک تھے۔ رنگ گورا کرنے والی کریم کا کمرشل بنوانا چاہتے تھے۔

اشتہار میں انہیں زیادہ منٹ اور زیادہ لوگ چاہیے تھے معاوضہ کم سے کم ہو اور پھر ان کا مزاج اور معیار اللہ کی پناہ۔ بحیثیت کونسیسٹ رائیٹر احمد انہیں تقریباً پچیس سے تیس آئیڈیاں دیتا چکا تھا مگر ان کو اب تک کوئی آئیڈیا پسند نہیں آیا تھا۔

”احمد صاحب! کوئی نئی چیز، کوئی نئی سوچ لائیں نا“

مارکیٹ میں یہ سب تو عوام پہلے ہی اسکرین پر دیکھ چکے ہیں۔“

ان کے اعتراض پر احمد سلگ کر رہ گیا۔ وہ تھکی پٹی لکیروں پہ چلنے کا قائل نہیں تھا۔ اب تک اس نے جتنے بھی کمرشل بنائے تھے۔ وہ اپنی انفرادیت اور تھیم کی وجہ سے کافی پسند کیے گئے تھے۔ مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کا کام کتنا ہی اچھوتا اور خوب صورت کیوں نہ ہو وہ کسی کسی کو متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ یہ کلائنٹ بھی ان ہی میں سے ایک تھے، احمد نے انہیں اگلے ہفتے آنے کا کہہ کر رخصت کر دیا تھا۔

اس وقت وہ آنکھیں بند کیے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھا تھا۔

آج وہ اتنا موصوف رہا کہ لچ کے نام پر فقط دو بسکٹ اور ایک چائے کا کپ لیا تھا اور اب شام کے چھ بجے محاورہ ”نہیں حقیقتاً“ اس کے پیٹ میں بھوک کے مارے چوہے دوڑ رہے تھے۔ صبح ناشتا بھی نہیں کر کے آیا تھا۔ نہ ہی آفس آکر کچھ کھایا یا۔

”گھر جاؤں یا کسی ریستورنٹ؟“ وہ بیٹھایا سی سوچ رہا تھا۔

جس دن شانزے کے ساتھ کچھ کھٹ پٹ ہوتی، اس کا گھر جانے کا موڈ مشکل سے ہی بنتا تھا۔ شانزے ٹھیک کہتی تھی اس کے مزاج میں سنجیدگی کے ساتھ واقعی تھوڑی اکر بھی، جو شانزے کے ساتھ جھگڑے کے بعد کچھ زیادہ ہی عود کر آجاتی۔ موبائل پہ میسج آیا۔

”کوئل نیچے بلڈنگ کی پارکنگ میں کھڑی تھی اس کی گاڑی خراب ہو گئی تھی اسے لفٹ چاہیے تھی۔“

”میں آرہا ہوں۔“ جوابی میسج کر کے وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔

نیچے پہنچا تو کوئل اس کی بلیک کرولا کے پاس ہی کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی سفید سوٹ میں ملبوس سفید موتیوں کی بالیاں بہت لائٹ میک اپ بال سمیٹ کر

ایک طرف کیے ہوئے تھے۔ وہ بہت فریش اور بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔
”ہیلو!“ وہ احمد کو دیکھ کر مسکرائی۔

”ہائے!“ احمد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ ”تمہارا شوٹ ختم ہو گیا؟“

”ہاں، کل لاسٹ ڈے تھا نا۔“

”کیسا ایکسپرنس رہا؟“

”بہت اچھا بلکہ بہت زبردست۔ اتنا مزا آیا کہ کیا بتاؤں۔“ وہ بچوں کی طرح آنکھیں میچ کر پرجوش سی کہہ رہی تھی۔

”بس ذرا۔“ بولتے بولتے وہ ایک لمحے کو رکی۔

”بس ذرا تھکن ہو گئی۔“ کوئل کے لہجے میں بے ساختگی کے ساتھ معصومیت بھی تھی۔

”ظاہر ہے، جس کام میں محنت ہوتی ہے اس میں تھکن بھی ہوتی ہے۔“ احمد مسکرا دیا۔ ”اسکرین پر ایک آدھ منٹ کا کمرشل دیکھ کر کون سوچتا ہو گا کہ اس کے پیچھے کتنے لوگوں کی کتنی محنت ہے۔ اپنی دیر باہمی تو تمہارا اشارت ہے، جتنی محنت کر سکتی ہو کرو، تھکنے کی پروا مت کرو۔ اگر تم آگے بڑھنا ہے تو۔“

”آپ کو کیا لگتا ہے مجھ میں اسپرٹ نہیں محنت کرنے کی؟“

”آف کورس ہے، صلاحیت کے ساتھ تم میں لگن بھی ہے جذبہ بھی، میں نے تو بس ایزاے فرینڈ یونی ایڈوائز دے دی۔ کیا تم نے مائنڈ کیا میری بات کو؟“

”نہیں نہیں بالکل بھی نہیں۔ بلکہ مجھے تو آپ کا اس طرح کہنا بہت اچھا لگا۔“ کوئل نے جلدی سے وضاحت پیش کی۔

”کیوں؟“

”کیونکہ جناب! انسان اس کو ہی ایڈوائز دیتا ہے جسے وہ کچھ سمجھتا ہے۔ مجھے تو اچھا لگتا ہے یہ سوچ کر کہ آپ مجھے اہمیت دیتے ہیں یا مجھے کچھ سمجھتے ہیں۔“ کوئل جلدی جلدی بولتی چلی گئی۔

احمد خاموش رہا مگر مسکرا دیا۔ اے سی کی خشک فضا

کا کمال تھا یا کوئل کی سنگت کا۔ اس کا موڈ بہت خوشگوار ہو چلا تھا۔

پوش اسیریا کی رہائشی بلڈنگ کے بیس منٹ میں احمد نے گاڑی روکی تو کوئل نیچے اترنے کے بجائے اس سے مخاطب ہوئی۔

”آئی ایم سوری احمد! میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا، میری گاڑی ٹھیک ہے، یہیں کھڑی ہے۔“ کوئل نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ احمد نے حیرانی سے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اس کیوں کا جواب اوپر ہے۔ آپ میرے فلیٹ میں چلیں گے؟“

”شیوور۔“ احمد نے کندھے اچکائے، آج وہ پہلی بار اس کے ساتھ اس کے فلیٹ پر جا رہا تھا۔

تھوڑا دیر پر تین کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ بہت خوب صورتی اور نفاست سے سجا ہوا تھا۔ احمد دیکھ کر متاثر ہوا تھا۔

”آپ ایزی ہو کر بیٹھیں، میں ایک منٹ میں آتی ہوں۔“

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو لوازمات سے لدی پھندی ٹرائی کے ہمراہ تھی، جس میں سب سے نمایاں کیک تھا، اس پر لگی شمعیں روشن تھیں۔

”اوہ۔!“ احمد آنکھیں بند کر کے بے اختیار مسکرا دیا۔

کوئل ایک بار پھر کمرے سے باہر گئی، واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں گٹار تھا۔

احمد کو کیک کاٹنے کا اشارہ کر کے وہ گٹار کے تار چھیڑنے لگی۔

ابھی برتھ ڈے ٹوپو۔ کی دھن گٹار کے تاروں سے نکل کر فضا میں پھیل رہی تھی۔

”اف!“ احمد نے بے حد حیرانی اور سرخوشی کے عالم میں گردن ہلاتے ہوئے کچھ دیر اسے یوں دیکھا جسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو پھر ایک مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کیک کاٹنے لگا۔

”تمہیں کیسے پتا آج میری برتھ ڈے ہے؟“
 ”آپ کو یاد ہے میں نے ایک بار آپ کا اشارہ پوچھا تھا۔ آپ نے اپنی ڈیٹ آف برتھ کے ساتھ اپنا اشارہ بتایا تھا۔ مجھے یاد رہ گیا۔“
 ”اچھا اور یہ؟“ احمد نے گٹار کی طرف اشارہ کیا۔
 ”تمہیں آتا ہے یہ پلے کرنا؟“
 ”نہیں! صرف ابھی برتھ ڈے کی دھن بجانی سیکھی ہے تین دن میں۔“ کومل نے سر ہلاتے ہوئے سچ بتایا۔
 ”کیوں سیکھی؟“ احمد نے روانی سے پوچھا۔
 ”آپ کے لیے۔“ کومل نے بھی اسی بے ساختگی اور روانی سے جواب دیا۔ احمد یکدم خاموش ہو گیا۔
 ”آپ کو برا لگا؟“ کومل نے گھبرا کے سوال کیا۔
 ”نہیں برا تو نہیں لگا۔“ احمد نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔
 ”پھر؟ اچھا لگا؟“

وہ جواب دے رہا تھا یا اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ کولڈ ڈرنک کے گھونٹ لے رہا تھا جب کومل نے ایک چھوٹا سا گفٹ پیک اس کے سامنے رکھا۔
 ”یہ کیا بھی؟“
 ”برتھ ڈے گفٹ۔“
 ”اس سب کے بعد یہ ضروری تھا؟“
 ”بالکل۔۔۔“
 ”میری سالگرہ یہ مجھے کوئی خالی دوش کرے اور گفٹ نہ دے تو مجھے تو بالکل بھی اچھا نہیں لگے گا۔ اسی سے تو پتا چلتا ہے کہ آپ کسی کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ کتنی محبت کرتے ہیں اس سے اور۔۔۔“ کومل نے روانی اور بے اختیار سی باتیں بولتے ہوئے ایک دم ہی خود کو روک رکھا۔
 ”گفٹ دیکھ لوں۔ اجازت ہے۔“ احمد نے اس کے چہرے پر خجالت کے آثار دیکھ کر بات پلٹی۔
 ”آپ کا گفٹ ہے۔ جب چاہیں دیکھ لیں مگر یہاں نہیں۔“

”اس کا جواب بعد میں بتاؤں گا۔ ویسے سچ بتاؤں تو اس وقت مجھے زبردست قسم کی بھوک لگ رہی ہے اور غالباً تم نے میرے بارے میں کافی ریسرچ کی ہے تب ہی کیک کے کٹر اور فلیور سے لے کر اس ٹرالی میں موجود تمام چیزیں میری فیورٹ ہیں۔ میں ٹکلف بالکل نہیں کروں گا۔ بانی داوے ان میں سے تم نے کیا بنایا ہے؟“
 ”کچھ بھی نہیں سب کچھ بازار کا ہے، میری کوکنگ کوئی خاص نہیں ہے۔“ کومل نے گٹار ایک طرف رکھا۔
 ”آپ تو اٹھ کر ہی بھاگ جاتے میرے ہاتھ کا بنا کچھ کھا کر۔“ احمد مسکرا دیا۔
 ”اپنی ویز؟“ آپ ان باتوں کو چھوڑیں اپنی برتھ ڈے انجوائے کریں۔“
 ”تم کچھ نہیں لوگی؟“
 ”ہاں بس یہ کیک پس۔“ کومل نے ایک چھوٹا سا کیک پس کٹ کر پلیٹ میں رکھا۔
 ”احمد پیٹ پوجا کے دوران ہلکی پھلکی ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا بلکہ زیادہ تر باتیں تو کومل ہی کر رہی تھیں۔“

”یہاں کیوں نہیں؟“
 ”بس ایسے ہی۔“
 ”کوئی، ہم وغیرہ تو نہیں ہے کہ میں گفٹ کھولوں اور۔۔۔“
 ”میرا دھماکے کرنے کا انداز مختلف ہے۔ میں اس کے لیے کسی بم کو استعمال نہیں کروں گی۔“ کومل نے ہنستے ہوئے اسے جواب دیا۔
 ”اوکے“ اب میں چلتا ہوں باتوں باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ ”کچھ دیر بعد احمد اٹھ کھڑا ہوا۔“
 ”تھینکس فار ایوری تھنگ۔“
 ”تھینکس تو مجھے کرنا چاہیے، آپ نے میری جرات کو عزت بخشی۔“ کومل بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”دروازے پر پہنچ کر وہ ایک بار پھر رکا۔“
 ”ایک سربراہ تم نے مجھے دیا اور ایک گڈ نیوز میرے پاس ہے تمہارے لیے۔“
 ”کیسی گڈ نیوز؟“
 ”ریکا اینڈ کمپنی والوں نے اپنے ایڈ کے لیے دو ماہ فاسٹ کی ہیں ان میں ایک تم ہو۔“ احمد نے توجہ سچ

دھا کر ڈالا۔
 ”کیا؟“ کومل انتہائی حیرت اور خوشی کے عالم میں چیخ پیڑی ریکا اینڈ کمپنی سے منسلک ہونے کا مطلب، شہرت اور دولت کے دروازے کھلا۔
 ”اب اپنا یہ کھلا ہوا منہ بند کرو اور آرام سے بیٹھ کر اس نیوز کو انجوائے کرو۔“ احمد ہائے کرتا ہوا نکل گیا۔
 ”اوکے ہائے۔ ٹیک کیمرہ۔“ کومل جیسے کسی خواب سے جوقی گئی اور واقعی یہ ایک خواب ہی تھا۔ ریکا اینڈ کمپنی کے ساتھ منسلک ہونے کا خواب ہر ماڈل دیکھتی تھی مگر بہت کم خوش نصیب ایسی ہوتیں جو یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوتیں۔ کومل دروازہ بند کر کے اندر آئی تو مارے خوشی کے اس کا برا حال تھا۔
 ”کمرے کے وسط میں خوشی کے عالم میں جھومتی ہوئی، گھومتی ہوئی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ بالآخر اس کے سنے پورے ہونے کا وقت قریب آ رہا ہے۔“

☆ ☆ ☆
 شانزے شام میں سو کر اٹھی تو بالکل فریش تھی۔ مزاج کی گرمی اور احمد کے ساتھ ہونے والی جھڑپ کی تلخی کے اثرات بہت حد تک کم ہو چکے تھے۔
 ”بچے بھی کب کے سو کر اٹھ چکے تھے اور گیمز لگا کر بیٹھے تھے“ شانزے نے ٹائم دیکھا۔ ٹیوٹر کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔
 ”تو سرونٹ کو ارٹھر سے آگئی تھی“ اس وقت وہ بچوں کو تیار کر دیتی تھی ٹیوٹر کے آنے سے پہلے بچے ریڈی ہوتے تھے۔
 ”میڈم جی!“ بتول نے اسے مخاطب کیا۔
 ”ہو۔۔۔“
 ”کل شام میں مجھے چھٹی چاہیے“ میں کام جلدی پنہا کر چلی جاؤں؟“
 ”خیریت؟“
 ”وہ جی کل میرے چھوٹے بیٹے کی سالگرہ ہے۔ وہ الدین جانے کی ضد کر رہا ہے اسے الدین بابر کے لکھ جانا ہے۔“
 ”اچھا“ کل سالگرہ ہے تمہارے بیٹے کی؟“
 ”شانزے نے چھینل بدلتے ہوئے سرسری سا کہا۔
 ”جی کل بارہ اپریل ہے نا پورے آٹھ سال کا ہو جائے گا میرا شانزادہ۔“ بتول کے لہجے میں مامتا بھری محبت تھی۔
 ”کل بارہ اپریل آج۔۔۔“ اکدم ہی شانزے کے ذہن نے کچھ کلک کیا۔
 ”آج گیارہ اپریل۔۔۔ اے خدا! میں اتنا ہم دن کیسے بھول گئی۔ ہر سال ہی تو اس اکڑو خان کو دوش کرتی ہوں اس کی سالگرہ یہ۔“ شانزے ٹی وی آف کر کے مضطرب ہو کر کھڑی ہو گئی۔
 ”کیا ہوا میڈم جی؟“ بتول نے گھبرا کر اسے دیکھا۔
 ”کچھ نہیں ذرا کمرے سے میرا بیگ تو لے کر آؤ۔“
 ”بتول جا کر اس کا ہینڈ بیگ لے آئی۔
 ”یہ لو اپنے بچے کے لیے کوئی گفٹ لے لینا میری طرف سے۔“ شانزے نے ہزار ہزار کے تین نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔
 ”بتول ہچکچائی۔ میری! اللہ آپ کا سکھ چین سلامت رکھے، آمین!“ بتول نے احسان مندی سے اسے دیکھا اور نوٹ لے لیے۔
 ”کل آج کل چھٹیوں پر گیا ہوا تھا“ اس کی غیر موجودگی میں بتول با آسانی بچن سنبھل گئی تھی اسے کانٹا نیشل کھانے بنانے تو نہیں آتے تھے مگر کسی اور روایتی پکوان وہ بنا لیتی تھی اور خوب بناتی تھی۔
 ”بات سنو بتول!“ شانزے نے کچھ سوچتے ہوئے اسے پکارا۔
 ”جی۔۔۔!“
 ”ایسا کرو رات کا کھانا رہنے دو ہو سکتا ہے ہم لوگ ڈنر باہر ہی کریں تم بس اپنے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے کچھ بناؤ۔“ بتول کو رہائش کے ساتھ ساتھ کھانا پینا بھی فری تھا۔
 ”فریج میں کافی ساری چیزیں پڑی ہیں ان میں سے کچھ لے لوں گی دوپہر کا کھانا بھی اچھا خاصا بچا ہوا

ہم چاروں کے لیے بہت ہو گا۔
”جیسے تمہاری مرضی۔“ شانزے اپنے بند روم میں چلی گئی۔ اب وقت کم تھا اور مقابلہ سخت۔ چھینچ کر کے خود کو ہلکا پھلکا سا سنوار کر رہا ہوا۔
”بتول! بچوں کا دھیان رکھنا، میں ابھی آتی ہوں۔“

گاڑی نکال کر مین روڈ پر آئی تو سڑکوں پر ٹریفک کا سیلاب رواں دواں تھا۔
”یا اللہ! بس آگے ٹریفک جام نہ ہو۔“ شانزے نے دل ہی دل میں دعا کی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ احمد کے گھر آنے سے پہلے وہ گھر پہنچ جائے تاکہ اس کے لیے ایک چھوٹی سی سربراہاننگ برتھ ڈے کا اہتمام کر سکے۔

مقام شکر تھا کہ بے پناہ اور بے ہنگم ٹریفک کے باوجود کہیں بھی ٹریفک جام نہیں تھا۔ شہر کی سب سے مہنگی اور مشہور بیکری سے احمد کے پسندیدہ فلیور کا کیک لیا۔ فلاور شاپ سے ٹیولپس کا بو کے خاص طور پر بنوایا۔ موتیا کے ڈھیروں پھول لیے دونوں پھول احمد کے پسندیدہ تھے۔

گھر واپس آئی تو کیک فریج میں رکھ کر پھول ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ بچوں کو پتا چل جاتا تو فوراً پاپا جان کو فون کر کے اس کے سربراہاننگ کی تیشی ہو جاتی۔

شیشے کی میز کو ٹیولپس اور موتیوں کے پھولوں سے سجا کر اس نے درمیان میں کیک کی جگہ چھوڑ دی۔
پچھلے آٹھ سال سے ان کا یہی معمول تھا کہ سالگرہ دونوں میاں بیوی میں سے کسی کی ہو، بچوں کی ہو یا دونوں کی ویڈنگ ایجو سرسی احمد ڈنر کرانے ضرور لے جاتا سب کو۔ پہلے تو عام دنوں میں ابھی اکثر وہ لوگ ڈنر پر چلے جاتے تھے مگر پچھلے سال ڈیڑھ سال سے جب سے دونوں کے درمیان تلخیوں اور فاصلوں نے جنم لینا شروع کیا تھا، ایک ساتھ باہر جانے کا سلسلہ بہت کم ہو گیا تھا۔ بچوں کی کوئی خوشی یا موقع تو پھر بھی ایک ساتھ سیلیبریٹ کر لیتے مگر دونوں کے ذاتی معاملات اور

خوشیاں اب پس پشت جاتی جا رہی تھیں۔
”اور کیا ضروری ہے کہ یہ سلسلہ یونہی چلے۔ یہ خلیج اور گہری ہوتی رہے۔ فاصلے اور بڑھتے ہی رہیں۔ کسی نہ کسی کو تو اپنے رویے میں لچک لانی ہے۔“

شانزے نے حقیقت پسندی کر سوجا۔
”محبت کر کے شادی کی تھی پھر شادی کر کے محبت کہاں چلی گئی؟“ شانزے کبھی کبھی حیران ہو کر سوچتی تھی۔

جو کچھ بھی ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے، ٹھیک نہیں ہے۔ حالات اور معاملات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہو جائیں، آپس میں ڈسکس کر کے ٹھیک بھی ہو سکتے ہیں۔ وہی ڈانٹا گز تھیوری۔ شانزے سوچتے سوچتے مسکرائی۔
”گفت کا کیا کروں؟“ اس کے خیالات کی رواب دوسری جانب مڑ گئی، احمد کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ جب احمد آئے تو وہ اسے گھر پر ہی ملے۔
”چلو گفت کی خیر ہے، ڈنر پر جائیں گے تب ہی کچھ لے لوں گی۔“

ٹیوٹر بچوں کو پڑھا کر جا چکا تھا۔ شانزے بچوں کے ساتھ مگن ہو گئی۔ یہ ٹائم اس کا اور بچوں کا ہوتا تھا پھر احمد بھی آ جاتا، چھینچ کر کے فریش ہو کر وہ بھی شامل ہو جاتا۔

مگر آج کافی دیر ہو گئی تھی، احمد اب تک نہیں آیا تھا۔ شانزے کی منتظر نظرس بار بار گھڑی کی جانب اٹھ رہی تھیں اور کان احمد کی گاڑی کے مخصوص ہارن پر لگے ہوئے تھے، اکثر وہ لیٹ ہو جاتا تھا مگر مسج کر دیتا تھا کہ دیر ہو جائے گی۔ مگر آج ابھی تک کوئی مسج بھی نہیں آیا تھا۔

”میں ہی فون کر کے پوچھ لوں؟“ اس کے دل نے کہا مگر پھر فوراً ہی دل کے گہرے برائے غالب آ گئی۔ تاک تو شانزے احمد کی بھی بہت اونچی تھی۔
”ساری لچک میں ہی دکھاؤں۔ ہر بار میں ہی کھپو وائز کرتی ہوں، اب فون کر کے بھی میں ہی پوچھوں کہ موصوف کہاں ہیں۔ خود بھی تو بتا سکتے ہیں کہ کب آئیں گے۔“ شانزے کی تنگ مزاجی عود کر آ

رہی تھی۔
”چلو، تیار ہو جاتی ہوں، تھوڑی دیر تو ہو ہی جاتی ہے، کیا پتا ٹریفک میں پھنسا ہوا ہو۔“ شانزے نے احمد کو مار جن دیتے ہوئے خود کو تسلی دی۔

اپنی وسیع و عریض وارڈ روب سے اس نے پستی رنگ کے سوٹ کا انتخاب کیا۔ اصلی شیفون پرچے ریشم اور چاندی کے تاروں کا بے حد خوب صورت اور نفیس کام تھا۔

پون گھنٹہ لگایا اس نے تیار ہونے میں۔ آئینہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ بہت خوب صورت لگ رہی ہے۔
”میں ہی فون کر کے پوچھ لیتی ہوں اب تک کیوں نہیں آیا۔“ شانزے نے پرفیوم لگاتے ہوئے خود کو تنقیدی نظروں سے آئینے میں دیکھا اور مطمئن ہو کر اپنے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عین اسی لمحے اس کا موبائل بج اٹھا۔

”فون آگیا موصوف کا۔“ شانزے نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا، مگر اسکرین پر چمکتے نمبر دیکھ کر اس کی خوشی کچھ کم ہو گئی۔
”ہیلو۔“

”ہیلو، شانزے کیسی ہو؟“
”ٹھیک، تم سناؤ۔“

”بس، میں نے سوچا تمہاری خیریت معلوم کر لوں، صبح والا ڈریشن اور ٹینشن کچھ ختم ہوا یا نہیں؟“
”بالکل ختم ہو گیا۔“ شانزے کھلکھلائی۔
”گڈ وی ری گڈ۔ یونہی ہنسی رہا کرو اور سناؤ، کیا ہو رہا ہے۔“

”انتظار۔“
”کس کا؟“

”آئی تھنک کہ اس وقت عموماً ہر اچھی بیوی اپنے ہرینڈ کا انتظار کر رہی ہوتی ہے۔“
”بعض اچھی بیویاں بہت بھولی بھالی ہوتی ہیں۔“
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اچھی بیوی کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا ہرینڈ کہاں ہے اور کس کے ساتھ

ہے۔“ فواد حسن کا معنی خیز لب و لہجہ سن کر وہ ٹھنک گئی۔
”انکسپلین کرو۔“

”میرا خیال ہے احمد آج دیر سے گھر آئے گا۔ شام میں کوئل کے ساتھ دیکھا تھا میں نے اسے ویسے۔“ وہ ایک لمحے کور کا۔

”مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا تمہیں بتاتے ہوئے مگر تمہارے علم میں یہ بات ضرور ہونی چاہیے کہ احمد اور کوئل ایک دوسرے کے کافی قریب ہو رہے ہیں۔ دونوں کے قریبی حلقوں میں گوسپس شروع ہو چکی ہیں۔ حیرت ہے کہ تم ابھی تک لاعلم ہو۔ آئی ایم سوری شانزے! میں نے شاید تمہیں ہرٹ کیا مگر۔“

”تم نے مجھے ہرٹ نہیں کیا فواد! بلکہ میری آنکھیں کھولی ہیں، ہرٹ تو کسی اور نے کیا ہے۔ تم کیوں گلشی فیل کر رہے ہو۔“ شانزے بمشکل مسکرائی۔ ایک بے حد تلخ مسکراہٹ۔ اندر تک وجود پورا کڑوا ہو رہا تھا، مسکراہٹ کیوں نہ کر ڈی ہوتی۔

”ویسے کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ بیوی وہ فرد ہوتی ہے جسے سب سے آخر میں اپنے شوہر کی بے وفائی کا علم ہوتا ہے۔ اپنی ویز، تھینکس ٹو نیل۔“

”بات سنو! زیادہ ٹینشن لینے کی اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ گرانسبس آتے ہیں، گزر بھی جاتے ہیں یہی لائف ہے۔“

”فواد! میں بعد میں بات کروں گی، ٹھیک ہے۔“
شانزے نے شہر شہر کر کہا۔ یہ شہر اویسے سمندر کی سطح جیسا تھا، جس کی تہ میں بے شمار طوفان چل رہے ہوں۔

”اوکے، اوکے، ہم بعد میں بات کر لیں گے، خدا حافظ۔“ فواد نے جلدی جلدی کہا۔
”خدا حافظ۔“ شانزے نے زیر لب کہہ کر فون آف کر دیا۔

کتنی دیر وہ خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی رہی۔ اندر سے دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے مگر حیرت انگیز طور پر اس کی آنکھیں خشک تھیں۔

”کیا یہ میرے لیے صدے کی بات نہیں؟“
شانزے نے خود سے سوال کیا۔ اسے اپنی کیفیت پہ
چرائی ہو رہی تھی۔ رونا آرہا ہے مگر آنسو نہیں آرہے
آنکھ میں۔

”یا پھر میں مینٹلی اتنی اسٹونگ ہو چکی ہوں کہ
بڑے سے بڑا شاک بھی بغیر آنسوؤں کے سہ جاؤں۔“
وہ ڈرنگ روم میں چلی گئی۔ آئینے کے سامنے کھڑے
ہو کر اس نے خود کو غور سے دیکھا۔

کچھ دیر پہلے جب اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تھا
تو خود پر کسی بے حد خوب صورت مجسمے کا گمان ہوا تھا۔
ہر عیب اور شکن سے پاک، بے داغ سرپا، مگر اب اس
مجسمے میں دراڑیں پڑنا شروع ہو گئی تھیں۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے جیولری اتارنی
شروع کی، لباس تبدیل کر کے میک اپ صاف کیا اور
بالوں کو ہینڈ میں جکڑ کر باہر آگئی۔
”بتول! لاؤنج میں آکر اس نے بتول کو مخاطب
کیا۔

”جی!“
”فریج میں کیک رکھا ہے۔ لے جانا اپنے بیٹے کی
برتھ ڈے پہ کٹ لینا اور ڈرائنگ روم میں ٹیبل
صاف کر کے سارا کچر اڈسٹن میں ڈال دو۔“

بتول نے اچھے سے اسے دیکھتے ہوئے سوچا، کچھ
پوچھنے یا کہنے ہمت نہ ہوئی۔
شانزے کچھ دیر وہیں بیٹھی جانے کیا سوچتی رہی، پھر

بید روم میں آکر فرینڈ کی ایک گولی پانی کے گلاس کے
ساتھ پھانکی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ اس وقت
وہ ہر چیز سے بے خبر ہو کر ایک پرسکون نیند چاہتی تھی۔
صبح اس کا اسپیشل مارننگ شو تھا۔

☆ ☆ ☆
اچھا خاصا گھر جاتے جاتے اس نے گاڑی کا رخ سی
ویلو کی طرف موڑ دیا۔ اک دم ہی اس کا دل بو بھل ہو گیا
تھا۔

”تو تمہیں یاد ہی نہیں رہا کہ آج کیا دن ہے؟“

جھاگ جھاگ سمندر کی بھری لہروں کو دیکھ کر وہ سوچنا
رہا۔
”نہ کوئی میسیج، نہ کوئی کال۔“ اس نے موبائل
نکال کر ایک بار پھر چیک کیا۔ حالانکہ نتیجہ اچھی طرح
معلوم تھا۔

”تم ہی کر لو کال۔“ اس کے دل نے چپکے سے
مشورہ دیا۔
”مگر میں کیوں کر لوں۔ آج میرا دن ہے، میری
برتھ ڈے۔ کتنی بھی ناراضی ہو، لڑائی جھگڑا ہو، وہ ہر
سال خود مجھے دس کرتی ہے، سالگرہ منانے کا اہتمام
کرتی ہے، ساری رنجشیں اور تلخیاں یوں ختم ہو جاتی
ہیں کہ جیسے تھیں ہی نہیں۔ مگر اس بار یہ رسم بھی گئی
تو تم خود یہ چاہتی ہو کہ فاصلے قائم رہیں، دوریاں اور
برہہ جائیں۔ کیا انڈیپنڈنٹ ہونے کا زعم انتہا طور ہوتا
ہے کہ محبت کو نگل جائے؟“ احمد کی نظریں سامنے جمی
تھیں۔ شوریدہ سر لہریں بڑے جوش کے ساتھ آگے
تک آئیں اور پتھروں سے سرخ پتھر کی طرح دم توڑ
دیتیں۔

”پتھروں سے سر کرنا سراسر بے وقوفی ہے مگر پھر
بھی یہ لہریں باز نہیں آئیں۔“ احمد نے موبائل پینٹ
کی جیب میں ڈالا تو انگلیاں کسی اور چیز سے بھی
نکرائیں۔ اس نے وہ پیکٹ کھینچ نکالا۔
”کومل کا دیا ہوا آگٹ۔“ اس نے غور سے پیکٹ کو
دیکھا۔

ایک لمحے کو اس کا دل چاہا اسے سمندر کے سپرد کر
دے، مگر بس ایک لمحے کو یہ خیال آیا اور گزر گیا۔
وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے یہ سوچنا۔
”بہت ہی خوب صورت اور منگنی رسٹ وائچ تھی،
ایک مختصر سی عبارت کے ساتھ۔“

”دیکھتے ہیں یہ تعلق وقت کے ساتھ کمزور ہوتا ہے
یا مضبوط۔“
تعلق؟ کیا تعلق ہے ہمارا آپس میں، ایک اچھی
فرینڈ شپ یا اس سے بھی آگے بڑھ چکا؟ احمد ابھین
میں تھا، وہ ابھی تک خود بھی اپنی فیلنگز ٹھیک سے

سمجھ نہیں پاتا تھا۔
کیا شانزے کے ساتھ بڑھتی ہوئی دوری اسے کومل
سے قریب کر رہی تھی۔ کیسا عجیب تھا یہ بندھن،
مجبوری کا یا مرضی کا؟
کتنی دیر وہ وہاں بیٹھا رہا ہلکے اندھیرے میں تاحد نگاہ
تک۔ بس ایک سیاہی مائل سی چمکتی چادر پھیلی ہوئی تھی۔
لہروں کا شور اور ہنگامہ اس پر سوار تھا۔
بالآخر بڑے مضطرب انداز میں وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

زندگی بہت عجیب سی ہو چلی تھی۔ دونوں نے ایک
ساتھ اپنے کیرئیر کے لیے جدوجہد کی تھی، محنت کی تھی،
ایک ساتھ مل کر خوشیوں کے اور کامیابیوں کے
خواب دیکھے تھے، بہت سے خواب اک اک کر کے
پورے ہوئے مگر دونوں کے آپس کے تعلقات اور
خوشیوں میں بہت سی دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ دونوں کو
ایک دوسرے سے قریب رکھنے والی ایک دوسرے
سے جوڑنے والی محبت کی، الفت کی نازک سی ڈور
ہاتھوں سے پھسل جاتی رہی تھی۔
اور اگر کسی دن یہ ڈور پوری ہی ہاتھوں سے نکل گئی
تو؟ احمد نے دانت چبھتے کر بڑی تیزی سے موڑ کاٹا تھا، کار
کے نازچر چر اٹھے تھے۔

☆ ☆ ☆
وہ گھر میں داخل ہوا تو پھر بھی جانے کیوں ایک
موہوم سی امید کا دیا اس کے دل میں روشن تھا۔
اس کی محبت کرنے والی بیوی ہر سال اسے سربراہ
دیتی تھی شاید آج بھی۔ کاش آج بھی۔
اپنی سوچوں میں ابھرا الجھاؤ تھا کہ سالانہ منج میں
صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر بعد کسل مندی سے اٹھ
کر اس نے پانی نکال کر پیا۔
ریفریجریٹر کے منج پانی نے اسے اندر تک کافی
پرسکون کر ڈالا تھا۔

پورے گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ اس نے بچوں کے
بید روم کا دروازہ کھولا۔ کمرے کی نیلگوں اور ٹھنڈی
فٹائل میں دونوں بچے سو چکے تھے۔ احمد نے ایک نظر اپنی

گھڑی پر ڈالی۔
گیارہ بجتے والے تھے۔
”نام نہ بھی تو بہت ہو گیا آج۔“ اس نے سوتے
ہوئے دونوں بچوں کو باری باری پیار کیا۔
دونوں ذرا کی ذرا اکسمسٹے احمد ان کو تھپک کر
باہر آگیا۔ آہستگی سے دروازہ بند کیا۔
اپنے بید روم میں آیا تو ایک تلخ مسکراہٹ اس کے
لبوں پہ بکھری۔
شانزے دنیا دانیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔
دل میں غمناک اس کا دیا لکھت بکھ گیا۔
نازک سی ڈور، دھیرے سے کچھ اور پھسل ہاتھ
سے۔

بھولی بھری سی کوئی بازگشت کاتوں میں گونجی۔
”تمہارا برتھ ڈے میری زندگی کا سب سے اسپیشل
دن ہے۔ پتا ہے کیوں۔ کیونکہ تم دنیا میں آئے ہو تو
مجھے ملے ہوتا۔ تمہارا ساتھ میری خوش بختی ہے،
تمہارا دنیا میں آنا میری خوش نصیبی بہت ہی مبارک
دن ہے میرے لیے تمہارا برتھ ڈے، ہم ہر سال یوم
الفت کے نام سے منایا کریں گے، ٹھیک ہے۔“
افسوسہ باتیں!

”اتنی جلدی فراموش کر گئیں سب کچھ؟“ احمد
نے ایک شکایتی نظر شانزے کے خوب صورت
خوابیدہ چہرے پر ڈالی۔
چھینچ کر کے آڑا تر چھائیڈر لٹ گیا مگر کتنی دیر ہو
گئی کرو میں بدلتے بدلتے نیند کا نام و نشان تک نہیں
تھا۔ وہ بید روم سے ملحق اپنی اسٹڈی میں چلا آیا۔
ایک سگریٹ سلگا کر ہونٹوں میں دبائی اور دھیرے
دھیرے کش لینے لگا، وہ عادی نہیں تھا، بس کبھی کبھار
جب بہت زیادہ ٹینشن میں ہوتا تو کڑوا دھواں اپنے اندر
اتار آتا تھا۔

لیپ ٹاپ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کا
موبائل منج اٹھا۔ اسکرین پر چمکتے نمبر دیکھ کر اس نے کال
ریسیو کر لی۔
”ہیلو، کیسے ہیں آپ۔“

☆ ☆ ☆
اپنا خاصا گھر جاتے جاتے اس نے گاڑی کا رخ سی
ویلو کی طرف موڑ دیا۔ اک دم ہی اس کا دل بو بھل ہو گیا
تھا۔
”تو تمہیں یاد ہی نہیں رہا کہ آج کیا دن ہے؟“

☆ ☆ ☆
اپنا خاصا گھر جاتے جاتے اس نے گاڑی کا رخ سی
ویلو کی طرف موڑ دیا۔ اک دم ہی اس کا دل بو بھل ہو گیا
تھا۔
”تو تمہیں یاد ہی نہیں رہا کہ آج کیا دن ہے؟“

☆ ☆ ☆
اپنا خاصا گھر جاتے جاتے اس نے گاڑی کا رخ سی
ویلو کی طرف موڑ دیا۔ اک دم ہی اس کا دل بو بھل ہو گیا
تھا۔
”تو تمہیں یاد ہی نہیں رہا کہ آج کیا دن ہے؟“

☆ ☆ ☆
اپنا خاصا گھر جاتے جاتے اس نے گاڑی کا رخ سی
ویلو کی طرف موڑ دیا۔ اک دم ہی اس کا دل بو بھل ہو گیا
تھا۔
”تو تمہیں یاد ہی نہیں رہا کہ آج کیا دن ہے؟“

☆ ☆ ☆
اپنا خاصا گھر جاتے جاتے اس نے گاڑی کا رخ سی
ویلو کی طرف موڑ دیا۔ اک دم ہی اس کا دل بو بھل ہو گیا
تھا۔
”تو تمہیں یاد ہی نہیں رہا کہ آج کیا دن ہے؟“

”فائن اور تم سناؤ؟“
”بس سوچاؤن کر کے پوچھ لوں گفت پسند آیا؟“
”ہاں اچھا ہے۔“
”صرف اچھا؟ من کرنا یو سی ہوئی۔“
”پھر کن الفاظ میں تعریف کروں کہ تم خوش ہو جاؤ۔“

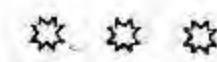
”لفظوں کے جادوگر تو آپ ہیں۔ ہم تو بس سیدھے سادے انداز میں اپنی بات کہنے والے لوگ ہیں؟“
”کوئل نہیں۔“

”میں بھی سیدھے سادے انداز میں ہی اپنے بات کہتا ہوں پتا نہیں کیوں کسی کو جادوگری لگتی ہے کسی کو ساحری۔“ احمد کا موڈ غیر محسوس طریقے سے خوشگوار ہونے لگا۔ تقریباً ”آدھ گھنٹے کوئل سے بات کر کے اس نے فون آف کیا تو اسے یوں لگا جیسے اس کا وجود بہت ہلکا پھلکا ہو گیا ہو۔“

اس کی ہنسی میں اس کی باتوں میں کچھ تو تھا اس کی اداسی، افسردگی سب کچھ اس ہنسی نے سمیٹ لی تھی۔ دل کا بوجھ لکھت غائب ہو گیا تھا۔

”کس رستے پہ قدم رکھ رہے ہو میاں صاحبزادے؟“ اندر سے کسی نے سرزنش کی۔ جب ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی کسی کی قربت اور ہم سفری کا احساس نہ ہو، آنکھوں میں اجنبیت اور رویے میں سرد مہری اتر آئے تو ریتے بدل ہی جاتے ہیں۔ یہ تسلی شاید دل نے اسے دی تھی یہ دل بھی عجیب بے ایمان سا ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ پرانے رستے کو چھوڑتے ہوئے دھڑک بھی رہا تھا اور نئے رستے پہ قدم رکھنے کے لیے ہمک بھی رہا تھا۔

”کیا صحیح ہے کیا غلط اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔ میں سوچ سوچ کر خود کو ٹینشن میں کیوں مبتلا کروں۔“ وہ خود غرض نہیں تھا مگر اس وقت خود غرضی کے ساتھ ساتھ سوچتے ہوئے وہ سونے کی کوشش کر رہا تھا۔



دونوں کے درمیان ایک خلیج تھی جو دن بدن گہری

ہو رہی تھی۔ ایک فریق ایک قدم پیچھے ہٹا تا تو دوسرا قدم پیچھے ہٹ جاتا۔
شانزے ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب تھی۔ ازدواجی زندگی میں پھیلتا تنہائی کا خاموشی کا فاصلوں کا خلا تیزی کے ساتھ بڑا ہوتا جا رہا تھا وہ بے بسی سے اس بڑھتے خلا کو دیکھ رہی تھی۔

وہ ذہنی ابتری کا شکار تھی۔ بکھر رہی تھی۔ قریب تھا کہ وہ اپنا مارننگ شو ختم ہی کر دیتی مگر سارے مشکل حالات اور ہر کڑے لمحے میں ایک شخص تھا جو اس کے ساتھ ساتھ کھڑا تھا۔ اسے تسلی دینے کو اس سے ہمدردی کرنے کو اسے سہارا دینے کو۔ فواد حسن اس کا غم گسار بھی تھا اور چارہ ساز بھی۔ تسلی و تشفی دینے کا ہر لفظ اسے ازبر تھا، زخموں پہ پھلے رکھنے کے انداز اسے خوب آتے تھے، اسی کا دم تھا کہ وہ خود کو سمیٹ کر رکھنے کی اور معمولات زندگی جیسے تیسے جاری رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

چائے کا کمرشل تھا۔ بہت محنت سے بنایا گیا تھا۔ سب نے ہی اپنی اپنی جگہ خوب محنت کی تھی۔ محنت تو کوئل نے بھی بہت کی تھی مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ کمرشل اور ماڈل کو تھوڑی بہت پسندیدگی تو ملی مگر اس طرح ہٹ نہیں ہوا جیسے کہ سب کو خصوصاً کوئل کو توقع تھی اسے اپنی امیدوں کے پورا نہ ہونے پر خاصا دھچکا لگا تھا۔

اس کے چہرے پہ چھائے مایوسی کے رنگ احمد سے پوشیدہ نہ رہ سکے تھے۔
”آج رات فارغ ہو؟“ احمد نے اسے کال کر کے پوچھا تھا۔

”ہاں، میری کیا مصروفیت ہوگی بھلا؟“ کوئل کا لہجہ پھیکا پھیکا سا تھا۔

”آج ڈنر میرے ساتھ کروگی؟“
”اس مائی ہلیڈر۔“ کوئل کے پھیکے سے لہجے میں خوشی کا رنگ سج گیا۔

”میں یک کر لوں گا تمہیں کتنے بچے آؤں؟“
”جب بھی آجاؤ میرا انتظار تو ابھی سے شروع ہو گیا“

”ابھی تو لچ ٹائم بھی شروع نہیں ہوا۔ اتنا لمبا انتظار کروگی؟“

”میں اس سے بھی لمبا انتظار کر سکتی ہوں، آزما کر دیکھ لیں۔“ کوئل نے معنی خیز انداز میں دعو کیا۔
”ہم آزمانے کے قائل نہیں ہیں کوئل بھلا مانس آزمائش پہ پورا نہ اترے تو؟“

”اور جو کوئل بھلا مانس آزمائش پہ پورا اتر جائے تو؟“
”کوئل اسی کی ٹون میں بولی۔“

”پھر تو اس کا انعام ڈیو ہے۔“
”مرضی کا۔ منہ مانگا انعام؟“
”بالکل۔“

”یہ انعام دے گا کون؟“ کوئل نے سوال کیا۔
”یہ انعام لے گا کون؟“ احمد نے اسی کے انداز میں سوال کیا۔

”جو آزمائش پہ پورا اترے گا۔“ کوئل کا جواب برحسہ تھا۔

”تو پھر انعام بھی وہی دے گا جو کسی کو آزمائے گا۔“ احمد کو نہ جانے کیوں اپنے مزاج سے ہٹ کر اس غیر سنجیدہ اور کسی حد تک بے سرو پا گفتگو میں مزا آ رہا تھا۔
”ہم تو منتظر ہیں مگر۔“ کوئل نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑا۔

”کسی کسی انتظار میں بڑا لطف ہوتا ہے۔“ احمد ذرا سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”کوفت بھی تو ہوتی ہے۔“ کوئل نے ایک گہری سانس لی۔

”بے یقینی بھی ہوتی ہے، کسی انتظار میں مایوسی اور ناامیدی کی چھین بھی ہوتی ہے۔“ کوئل کو یکایک یاسیت نے آن گھیرا۔

”ایک تو تم بڑی جلدی ملکہ جذبات بن جاتی ہو اتنی جلدی نہ تو ناکام ہوتا چاہیے نہ ہی مایوس۔ اب ابھی سے اچھا اچھا سوچنا شروع کر دو تاکہ آگے بھی اچھا اچھا ملے۔“ احمد نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔
”ایک اچھا تو رات میں ہونے والا ہے۔“

”کیا؟“ احمد چونکا۔
”آپ کے ساتھ ڈنر۔“
وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

”چلو پھر اس اچھے کے بارے میں سوچو۔ بالکل فریش اور بھی فیس چاہیے مجھے۔ نوٹیشن نوڈ پریشن۔“

احمد نے فون آف کیا اور کچھ سوچ کر مسکرائے لگا۔

وہ اپنی گاڑی پارکنگ سے نکال رہی تھی جب فواد حسن تیزی سے اس کی گاڑی کی طرف آیا۔ ہاتھ لہرا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا تھا۔ شانزے نے کار روکی اور شیشہ نیچے کیا۔

”کیا ہوا۔ خیریت تو ہے؟“ اس نے کچھ حیرانی اور پریشانی سے فواد کو دیکھا۔

”ہاں ہاں خیریت ہی ہے، تم پروگرام ختم ہوتے ہی اتنی جلدی بھاگ لیں۔ مجھے کچھ کہنا تھا تم سے۔“ وہ کھڑکی پہ دونوں ہاتھ جمائے جھکا ہوا اس سے مخاطب تھا۔

”بولو۔“

”تمہیں بتانے آیا تھا آج کا پروگرام بہت زبردست، بہت ہی شاندار کیا ہے تم نے مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ تم جن کرائسز سے گزر رہی ہو، اسے ایک طرف کر کے اتنی زبردست پرفارمنس بھی دے سکتی ہو، یو آر ریelly آبریلینٹ اینڈ ریولینڈی۔“

”کبھی کبھی نہ بریلینٹ ہونا اپنے کچھ کام آتا ہے نہ بریو ہونا، بلکہ یہ دونوں باتیں بعض اوقات ہمارے گلے کا طوق بن جاتی ہیں۔ شانزے پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

”سب کچھ ہماری تھکنگ اور دے آف تھکنگ پر ڈیپنڈ کرتا ہے، میرے نزدیک تمہاری یہ دونوں خوبیاں ایسی ہیں جو تمہارے گلے کا طوق نہیں بلکہ تمہارے پیروں میں پڑی زنجیروں سے آزاد ہونے میں تمہاری مدد کر سکتی ہیں۔“ فواد سنجیدگی سے گویا تھا۔

شازے کے دل کو کرب کی ایک لہر کاٹی ہوئی گزر گئی کوئی بہت زیادہ پرانی بات تو نہیں تھی مگر لگتا یہی تھا کہ وہ کوئی بہت بھولا بسرا اور تھا جب ان دونوں کی شادی کے دن قریب تھے۔

”میں تو شادی کے بعد جاب و اب سب چھوڑ دوں گا“ احمد اکثر اسے چھیڑتا۔

”کیوں؟“ وہ کچھ خفگی اور کچھ پیار سے اسے گھورتی۔

”بس۔“

ابھی سے دل چاہتا ہے کہ

خوب صورت سی پیروں میں اک زنجیر ہو

گھر میں بیٹھا رہوں میں گرفتار سا“

وہ ہنس پڑی۔

”ہیلو کہاں کھو گئیں؟“ فواد کی آواز پر وہ چونک پڑی۔

حال سے ماضی میں جانا تکلیف دہ تھا اور ماضی سے واپس حال میں آنا اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ۔

”اوکے“ تم جاؤ۔ دھیان سے جانا اور خیریت کے ساتھ گھر پہنچنا، ٹیک کیر۔“ فواد نے اس کے گم صم چہرے کو دیکھ کر ہدایت کی۔

”اللہ حافظ!“ شازے ایک گہری سانس لے کر گاڑی اشارت کرنے لگی۔

فواد پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اس کے جانے کے بعد بھی وہ کچھ دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ عموماً چھٹی کے دن وہ دیر سے سو کر اٹھتی تھی۔ پورے پینتے کی جھلن اور نیند ان دونوں میں ہی پوری ہوتی تھی مگر اب تو کئی ہفتوں سے چھٹی کے دن بھی سو رہے آکھ کھل جاتی اور پھر کروٹیوں پہ کروٹیوں بدلتے پر بھی نیند آنے کا نام نہیں لیتی تھی وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی باہر لان میں نکل جاتی، نیچے پاؤں چل قدمی کرتے ہوئے کتنے ہی چکر لگاتی۔

آنکھوں کو تراوٹ بخشا سبزہ رنگ و خوشبو لٹاتے پھول

اب کچھ بھی تول کو نہیں بھاتا تھا۔

حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ احمد اور اس کے درمیان فاصلوں کی دراڑ بڑھ کر خلیج بن چکی تھی اور بڑھتی ہی جا رہی تھی، تلخ جھڑپیں اور لڑائی جھگڑے ختم ہو کر اب بات چیت بھی برائے نام ہی رہ گئی تھی۔ کوئل اور احمد کے بڑھتے ہوئے تعلقات اب دوستوں اور شناساؤں کی زبانوں سے آگے نکل کر اخبارات اور میگزینز کی چٹ پٹی خبروں کی ذمہ داری بن رہے تھے۔

کتنی دیر لان میں چل قدمی کر کے وہ اندر آئی تو ٹھنک گئی۔ خلاف معمول احمد تک سب سے تیار ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھا تھا۔ بتول ناشتا بنا کر کچن سے لا رہی تھی۔

”اب کا ناشتا بھی لے آؤں گی؟“ بتول نے اس سے سوال کیا۔

”بس ایک گلاس جوس۔“ شازے کرسی تھپیٹ کر بیٹھ گئی۔

چھٹی کے دن کہاں کی تیاری ہے؟ احمد کو کن اکھیوں سے ایک نظر دیکھتے ہوئے اس نے سوچا مگر انہوں نے سوال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس نے ٹیبل پر پڑا تازہ اخبار اٹھالیا، مین بیج احمد کے پاس تھا۔ وہ دوسرے صفحے کھولنے لگی۔ معا احمد کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”ایک گھنٹہ بعد میری فلائیٹ ہے ملائیشیا کی۔“

شازے کی سماعتوں پر جیسے کوئی بم پھوٹا تھا۔

”بہت جلدی خیال آگیا بتانے کا۔“ اس نے جیبتی ہوئی نظروں سے احمد کو دیکھا۔

”تم ملتی ہی کب ہو۔ صبح میرے اٹھنے سے پہلے جا چکی ہوئی ہو رات کو سوئی ہوئی ہوئی ہو۔ کس وقت بتانا؟“

”موبائل کس مرض کی دوا ہے؟“ شازے کی بات آدھی منہ ہی رہ گئی۔ وہ اب بے یقینی کے ساتھ اخبار کے اس اندرونی صفحے کو دیکھ رہی تھی جہاں شوہر کی چٹ پٹی خبریں چھپی ہوئی تھیں۔

اس کی بے یقینی نظریں تیزی کے ساتھ اخبار کی سطروں پر پھسل رہی تھیں۔

”ابھرتی ہوئی ماڈل کوئل خان اور معروف ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے مالک احمد مغل کی بڑھتی ہوئی دوستی اور قربت رشتہ ازدواج میں بدل گئی۔ شدید ہے کہ مہنی مون کے لیے دونوں نے ملائیشیا کا انتخاب کیا ہے۔“

آگے اور جانے کیا کیا لکھا ہوا تھا۔ شازے کی نظریں دھندلانے لگیں۔

”اس لیے جا رہے ہو ملائیشیا؟“ شازے نے شوہر کی خبر والا صفحہ اس کے سامنے پٹا۔

احمد نے پہلے تو کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں ایک نظر اسے دیکھا۔ ایک نظر اخبار کو پھر وہ صفحہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

جیسے جیسے وہ پڑھتا جا رہا تھا اس کے ماتھے کے بل بڑھتے جا رہے تھے۔ ”واٹ رٹش!“ اس نے طیش میں اخبار ایک طرف پھینکا۔

”بتا نہیں کیا کیا کو اس چھاپے رہتے ہیں یہ لوگ۔“ وہ بڑبڑایا۔

”کچھ بکواسیں سچ بھی ہوتی ہیں۔“

”مگر یہ جھوٹ ہے۔“ وہ غر کیا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے میں تمہارے اس جھوٹ پر یقین کر لوں گی؟“ شازے کا پورا وجود جیسے کسی طوفان کی زد میں تھا۔

”تمہیں یقین کرنا ہے کرو نہیں کرنا تو مت کرو۔“ وہ ناشتہ اور چھوڑ کر تن فرن کرنا کھڑا ہو گیا۔

”ہمت ہے تو ج کاسمانا کرو۔ میدان چھوڑ کر کیوں بھاگ رہے ہو۔“ شازے حلق کے بل چلائی۔

”یہ میدان نہیں۔ میری زندگی اور گھر ہے جسے میں نے بڑی محنت اور محبت سے بنایا تھا مگر تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی نے سب کچھ تباہ کر دیا ہے۔“ وہ لب بھینچے کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

”وہ کہتا ہے میں نے۔ میں تباہ کر دیا ہے سب کچھ۔“

اس کی زندگی اور یہ گھر یہ گھر جسے میں نے بڑے ارمانوں سے بنایا تھا جس کے لیے اتنی جان ماری اتنی قربانیاں دیں۔ شادی اس نے کی ہے اور گھر کی تباہی کا الزام مجھ پر۔ کیا خوب لطیفہ ہے۔“

شازے فواد حسن کے سامنے پھٹ پڑی۔ وہی ایک تھا اس کا رازدار، غم گسار، وگرنہ دوست تو بہت تھے مگر ہر ایک کے سامنے اسے اپنے دکھ رونے کی عادت نہیں تھی۔

”یہ تو ہونا ہی تھا اک دن۔“ فواد ترتم سے اسے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

”اب اب کیا کرو گی تم؟“ فواد نے بدستور اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میرے پاس کیا آپشن ہے کچھ کرنے کے لیے؟“

شازے نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بدقت پیچھے دھکیلا۔

”جو آپشن احمد کے پاس تھا وہی تمہارے پاس بھی ہے۔ وہ اپنے لیے نئے راستے، نئے لوگ جن سکتا ہے تو تم بھی۔“ فواد حسن نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کے رد عمل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

”نئے راستے نئے لوگ؟“ شازے کو جیسے چند لمحے لگے تھے اس کی بات سمجھنے کے لیے۔

”تو کیا بی ہوئی زندگی گزارو گی؟ کچھ وائز کرو گی؟“ فواد نے اناس سے سوال کر ڈالا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ شازے نے قطعیت کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

”کچھ بھی ہو تم کچھ بھی کرو خود کو کبھی اکیلا مت سمجھنا۔ زندگی کے ہر مرحلے اور مرحلے پر میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ فواد کی بات پر شازے چونک کر اسے دیکھا۔

”احمد بہت بد نصیب ہے تمہاری قدر نہیں کر سکا۔“ چند لمحے بعد وہ پھر دھیرے سے بولا تھا اور شازے یک ٹک اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ آج تک اسے ایک دوست اور بہت اچھا دوست سمجھ کر اپنے معاملات شیر کرتی چلی آئی تھی مگر اس وقت

اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس دوستی نے یکایک ایک نیا رخ ایک نیا انداز اختیار کر لیا ہو۔ زندگی کب کس وقت کیا ہو جاتی ہے کچھ پتا نہیں چلتا شانزے نے بے اختیار ایک گہری سانس لیتے ہوئے سوچا۔

”فواد! میں اس وقت بہت پریشان اور بہت الجھی ہوئی ہوں۔ تم پلیز ایسی کوئی بات مت کرنا جس سے میری الجھنوں میں اضافہ ہو۔“

”میں تمہاری الجھنوں اور پریشانیوں کو برعکس نہیں انہیں بانٹنا چاہتا ہوں۔“

”بہت بڑا دعوا کر رہے ہو۔“ شانزے نے بغور اسے دیکھا۔

”آزما کر دیکھ لو۔“ فواد نے چیلنج کیا۔

شانزے فقط سر ہلا کر رہ گئی۔

احمد ملا کشیا سے واپس آگیا تھا۔ دونوں کے درمیان تباہ اور سرد مہری کی دیوار اونچی سے اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

کیا سچ تھا کیا جھوٹ۔

کیا حقیقت تھی کتنا فسانہ تھا۔

نہ احمد نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی نہ شانزے نے اس سے کوئی وضاحت طلب کی۔

کومل نے بھی یہ خبر بڑھی اور احمد کے سامنے ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔

”اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے؟“ احمد نے انتہائی سنجیدگی سے اس کے گلابی ہونٹے چرے پہ نظریں جمائیں۔

”اوہ سوری“ آتم سوری! مجھے بس یہ سوچ کر ہنسی آ رہی تھی کہ ہمارے فیوچر کے بارے میں بھی ہم سے پہلے ان میڈیا والوں نے فیصلہ کر دیا ہے۔ کومل اسے سنجیدہ دیکھ کر اپنی ہنسی کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”ان لوگوں کو کوئی اور کام نہیں ہے۔ رائی کا پھاڑ

بنانے میں ماہر ہیں۔“ احمد بڑبڑایا۔

”کومل ڈاؤن احمد! شوہر میں آنے اور رہنے کی قیمت تو چکانی پڑتی ہے۔ یہ اسکیڈلر بھی اسی قیمت کا ایک حصہ سمجھ لو اور ویسے بھی۔“ کومل ایک لمحے کو رنگی۔

”رائی ہوتی ہے تو پھاڑ بنتا ہے نا۔“

”رائی اور پھاڑ کے وجود میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔“ احمد نے اسے حتمی کیا۔

”آف کورس!“ کومل نے کندھے اچکائے۔

”ویسے اگر تمہیں یہ نیوز یا گوسپ اتنی ہی بری لگی ہے تو تم ڈینے کر سکتے ہو۔“ وہ گزرتے دنوں میں کالی بے تکلف ہو گئی تھی۔

”مجھے کیا ضرورت ہے ان بکھیڑوں میں الجھنے کی“ آج میں تردید کر دوں کل کو یہ صفائی اس کا بھی یقین نہیں کریں گے اور پھر کچھ نہ کچھ چھاپ دیں گے۔ یہ لوگ ہر معاملے ہر شخص کو شک کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ دال میں کچھ نہ کچھ کالا نظر آتا ہے۔“ احمد نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔

”بائی داوے“ یہ ڈینے تو تم بھی کر سکتی ہو ہم کیوں نہیں کر دیتیں یہ نیک کام؟“

”کیونکہ مجھے یہ خبر بری ہی نہیں لگی۔“ کومل بیک کندھے سے ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

”دیکھا مطلب؟“ احمد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”کم آن احمد! تم بچے نہیں ہو نہ ہی میں۔“ بھر سوچنا ضرور۔“ وہ ہائے کشی ہوئی مسکرا کر نکل گئی اور احمد نہ جانے کیوں متحیر سا بیٹھا رہا۔

یہ تو ہونا ہی تھا دوستی اور بے تکلفی نئی منزلوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے کومل نے کھل کر اظہار کر دیا تھا مگر وہ خود کیا کر رہا تھا۔

کیا وقت گزاری؟

یا پھر اپنی ازدواجی زندگی کی الجھنوں اور پریشانیوں سے فرار کی ایک غیر شعوری کوشش؟

وہ سوچتا رہا اور اپنے آپ سے الجھتا رہا۔

شانزے اپنے بیڈ روم میں تھی۔ بچے ٹیوٹر سے پڑھ

رہے تھے۔ مضحکہ خیز وہ یونی آکھیں بند کیے لیٹی جائے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ ماضی کے بارے میں حال کے بارے میں مستقبل کے بارے میں۔

وہ اپنے خیالات میں گم تھی جب ایک مافوق آواز پر چونک اٹھی۔ وہ میٹھی، محبت بھری آواز لاؤنج سے دوبارہ آئی تو وہ بے اختیار اٹھ بیٹھی۔ تقریباً بھاگتے ہوئے لاؤنج میں آئی تھی۔

بڑی خالہ کا مہربان چہرہ سامنے تھا۔ وہ دوڑ کر ان کی ہانہوں میں سما گئی۔

”خالہ! آپ اچانک کیسے؟“ شدت جذبات سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ صرف بڑی خالہ ہی نہیں بلکہ اس کی ماں بھی تھیں۔ دو سال کی عمر میں اپنی می کی وفات کے بعد وہ خالہ کی گود میں آگئی تھی اور انہوں نے خالہ کے ساتھ ساتھ ماں ہونے کا بھی پھر پورا حق ادا کیا تھا۔ شانزے کی شادی کے بعد وہ کینڈا اپنے بڑے بیٹے کے پاس شفٹ ہو گئی تھیں۔ ابتدا میں شانزے کا ان سے مستقل رابطہ رہا تھا، پھر وقت کے ساتھ ساتھ ذمہ داریاں اور مصروفیات بڑھیں تو اس رابطے میں کمی آنے لگی، پھر بھی دو چار مہینوں بعد خیر خیریت دریافت ہو ہی جاتی تھی۔

آج انہیں اچانک یوں اپنے روپو پا کر شانزے کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

”کیسی ہو میری جان؟“ ایک گرم جوش اور بھرپور معافی کے بعد انہوں نے شانزے کی پیشانی بڑی محبت کے ساتھ چومی۔

”میں ٹھیک ہوں“ آپ سنائیں اتنی ویک کیوں ہو گئی ہیں؟“ شانزے نے بیک وقت انہیں غور اور تشویش سے دیکھا۔

”ویک؟ ارے بھی پاکستان آنے کے لیے اسپیشلی ایکسپریس سائز کر کے فائیو کے جی ویٹ لوڈ کیا ہے۔ میری اسمارٹ فون کو ویک نہیں تو نہ کہو۔“ خالہ نے زندہ دل سے بھرپور انداز میں بھانجی کو دیکھا۔

”اوہ سوری“ غلطی ہو گئی۔“ شانزے نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان چھو کر دل سے ہنسی تھی۔

لاؤنج دونوں کی ہنسی اور آوازوں سے گونج رہا تھا۔ جب احمد آیا۔

بڑی خالہ سے وہ بھی بہت اچھے طریقے سے ملا۔ پھر معذرت کر کے اٹھ گیا۔ فریش ہو کر چیلنج کر کے دوبارہ واپس آیا اور ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔

”میں ذرا بتول کو دیکھ لوں۔“ شانزے بچن میں چلی گئی۔

احمد کی طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالی اس نے، ایک سرد مہری تھی جو اس کے دل اور پورے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

خالہ نے اس کے اس طرح اٹھ جانے پر ایک گہری سانس لی تھی۔ احمد کا چہرہ بے اثر تھا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ بے حد نارمل ہو کر بڑی خالہ سے باتیں کر رہا تھا۔

”آج کا ڈراما سٹیشنل ہونا چاہیے۔ کسی چیز میں کوئی کمی نہ ہو ٹھیک ہے۔“

وہ یونی بتول کو ہدایت دے رہی تھی۔ حالانکہ وہ اچھی خاصی ماہر تھی شاید ہی شکایت کا موقع دیا ہو۔

”آپ اطمینان رکھیں میڈم جی! نہ آپ کو کوئی شکایت ہوگی نہ بڑی بیگم صاحبہ کو۔“ بتول بڑے اطمینان سے ڈنر کی تیاری میں لگن لگی۔

شانزے کچھ دیر بے مقصد وہیں کھڑی رہی پھر باہر آگئی۔

”مما جان! آپ ریسٹ کر لیں کچھ دیر۔“ احمد کو نظر انداز کر کے وہ بڑی خالہ سے مخاطب ہوئی۔

”ہاں“ میں شاور لوں گی، مگر ابھی نہیں تھوڑی دیر میں۔“

”اچھا“ میں ابھی آتی ہوں۔“ شانزے کھڑے کھڑے ایسے غلٹ میں بولی جیسے سچ کچ کوئی بہت ضروری کام ہو۔

خالہ نے بڑی حیرت سے اسے دیکھا۔

احمد کو آئے اتنی دیر ہو گئی تھی اور شانزے نے اسے مخاطب کیا تھا نہ ہی احمد نے اس سے کوئی بات کی تھی۔ خالہ جان کے لیے یہ بڑے اچھے کی بات تھی۔

رات کو وہ اپنے بیڈ روم کے بجائے خالہ جان کے ساتھ گیسٹ روم میں تھی۔ ان کے انتظار کرنے پر شانزے نے انہیں اپنی پوری رام کہانی سنا ڈالی تھی۔ وہ حیران ہوئیں مگر نہایت سنجیدگی سے سب کچھ سنا۔

”آج تو بہت سلیجھا ہوا اور سمجھ دار لڑکا تھا اسے کیا ہو گیا۔“ خالہ جان دھیرے سے بڑبڑائیں۔

”یہ وہ احمد نہیں ہے جسے میں جانتی تھی آپ جانتی تھیں۔ یہ تو کوئی اور ہے بالکل اجنبی سا۔ جسے میں بھی بری لگتی ہوں میرا فیم، میری کامیابی، میرا کیریئر اسے سب کچھ برا لگنے لگا ہے۔“ شانزے بھٹ پڑی۔

”مگر کیوں؟“ خالہ نے بے یقینی سے آنکھیں پھاڑیں۔

”بس وہی سبب شانزے میں کما رہا ہوں کہانی ہے تم گھر بیٹھ کر بچے پالو گھر کو دیکھو ہونہ! میں تو اپنے اچھے بھلے کیریئر پر لات مار کر گھر بیٹھ جاؤں جاہل عورتوں کی طرح گھرواری کروں اس کے بچے پالوں اور یہ باہر جوں جوں چاہے کرنا رہے دوستیاں کرے، انیر چلائے یا شادی کرے، مرد کو ہر بات کی آزادی ہے۔“ کئی دنوں سے شانزے کے اندر پکنا ہوا لاوا آج پھٹ کر مہ نکلا تھا۔

”شان! تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ گھرواری کرنے والی عورتیں جاہل ہوتی ہیں؟“ خالہ نے بے حد تأسف سے اسے مخاطب کیا۔

”جن عورتوں میں باہر نکل کر کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی وہ گھر میں بیٹھ کر گھرواری نہیں کریں گی تو اور کیا کریں گی۔“ شانزے نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں انہیں جواب دیا۔

”تمہاری اس بات پر کئی گھنٹے بحث ہو سکتی ہے کہ بچوں کو پالنے پوسنے، اچھی تربیت کرنے اور طریقے سیکھنے سے گھر گریہ ہستی کی ذمہ داریاں نبھانے والی عورت معاشرے کی کتنی باصلاحیت اور کارآمد رکن ہوتی ہے۔ ویسے تمہارے منہ سے اس طرح کی بات سن کر

خاصی تکلیف ہوئی مجھے۔“ خالہ جان نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”جاہل عورت وہ ہوتی ہے جو اپنے منہ سے بے گھر کی بنیادیں ڈھا کر اس پر اپنے کامیاب کیریئر کی بنیاد رکھتی ہے۔“ وہ دوبارہ بولیں تو شانزے چند لمحے کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہی۔

”آپ مجھے ہلیم کر رہی ہیں ماما!“

”نہیں! میں فقط جاہل عورت کی اصطلاح کی وضاحت کر رہی ہوں۔“

”کیا عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کا اپنے ہنر کا اظہار کر سکے اسے کام میں لاسکے۔ عزت، دولت اور شہرت کے سفر میں عورت اگر مرد سے آگے نکل جاتی ہے تو مرد کی اتنا سے برداشت نہیں کپاتی۔ فوراً اسے گھرواری کے نام پر پتھرے میں کیوں قید کر دیتا چاہتا ہے؟“ شانزے نے تباہ توڑ سوال کر ڈالے۔

خالہ جان کی کشادہ پیشانی پر شکنیں ابھریں۔

”میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ اصل مسئلہ ہے کیا، ایک طرف تم یہ بتا رہی ہو کہ وہ کسی ماڈل سے شادی کر چکا ہے یا کرنے والا ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ تم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر بیٹھ جاؤ۔“

”وہ کئی سالوں سے یہی چاہ رہا تھا کہ میں شو بیز چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤں۔ بچے پالوں، گھر سنبھالوں۔ پہلے بے لفظوں میں کہتا تھا پھر واضح لفظوں میں کہنے لگا۔ بہت ریشہ ناز کیا مجھے، مگر میں نہیں مانی، پھر کوئل والا معاملہ شروع ہو گیا۔ سننے میں تو یہی آیا ہے کہ دونوں نے شادی کر لی ہے مگر کفرم نہیں ہوا ابھی۔“

”تم نے احمد سے بات کی اس معاملے پر؟“ خالہ نے سوال کیا۔

”مجھے کیا ضرورت ہے اس سے کچھ پوچھنے کی یا بات کرنے کی۔ چور کب اعتراف کرتا ہے کہ اس نے چوری کی ہے؟ ایک نہیں دس شادیاں کر لے میری طرف سے۔ بھاڑ میں جائے مجھے کیا۔“ شانزے کا لہجہ پھنکارا مارنے لگا۔

خالہ نے ایک گہری سانس لی۔

”شان! بیٹا! گھر بیٹانا آسان نہیں ہوتا۔ بہت وقت اور محنت لگتی ہے مگر بگڑنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ تم نے اتنی آسانی سے اسے آرام سے سرخیز کر کے خود کو حالات کے دھارے میں چھوڑ دیا؟“

”میں نے سرخیز نہیں کیا۔“ شانزے نے تیزی سے جواب دیا۔ ”اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے آگے روؤں گی یا گڑبگڑاؤں گی تو یہ اس کی خوش فہمی ہے۔ میں کسی بھی لحاظ سے نہ اس سے کمزور ہوں نہ کم تر وہ نئے راستے تلاش کر سکتا ہے تو نئی راہیں میرے لیے بھی کھلی ہیں۔“ ناواستہی میں وہ فواد حسن کی کسی ہوئی بات اپنی زبان سے دہرا رہی تھی۔

”تم آج بھی اتنی ہی جذباتی اور بے وقوف ہو، جتنی شادی سے پہلے تھیں۔“ خالہ جان نے اسے بغور دیکھتے ہوئے بڑے آرام سے تبصرہ کیا۔

”اب سو جاؤ باقی باتیں کل کریں گے، میں بہت تھکی ہوئی ہوں تین دن آرہی ہے اب۔“

”اچھا ٹھیک ہے، آپ آرام کریں، گڈ نائٹ!“

شانزے نے جھٹ ان کی بات مانی۔

”گڈ نائٹ!“ خالہ جان نے آنکھیں موند لیں۔ وہ تو شاید فوراً ہی سو گئی تھیں مگر شانزے کو نیند کی مہمان بانہوں نے بہت دیر میں لیا۔

”تمہارا ڈریس بہت اچھا ہے آج، کافی کول لگ رہے ہو۔“ شانزے نے کھلے دل سے فواد کی تعریف کی۔ سفید اسٹائٹس کرتا شلوار میں وہ واقعی بہت فریش اور ہینڈسم لگ رہا تھا۔

”یہ ڈریس۔“ وہ ہنسنا۔ ”گفٹ ہے۔“

”ڈریس ڈیزائنر سے فرینڈ شپ کے یہی بنی فٹنس ہیں۔ ویسے نیہا کا دو آئی بڑی مہمان ہیں آج کل تم پر۔“ شانزے نے مسکراتے ہوئے اس پر فقرہ کسلا۔

”وہ مہمان ہو تو ہو۔ ہم تو کسی اور کی نظر عنایت کے منتظر ہیں۔“ فواد کا لہجہ گھبیہر ہو گیا۔ اس کی والدہ انہ اور پڑشوق نظریں شانزے کے خوب صورت چہرے پر جمی

تھیں۔

شانزے اس کی نظروں اور باتوں کے مضموم خوب سمجھتی تھی مگر فی الحال اس کی واضح حوصلہ افزائی سے گریز کر رہی تھی۔

”تانیہ بلال کی پارٹی میں آؤ گی کل؟“ فواد نے خود ہی موضوع بدلا۔

”مشکل ہے۔“

”کیوں؟“

”بتایا تو تھا تمہیں، میری امی آئی ہوئی ہیں کینڈا سے۔ آج کل میرا جتنا بھی فارغ وقت ہے ان کے لیے ہے۔“

”کب واپس جائیں گی یہ محترم خاتون؟“ فواد نے شرارت سے اسے دیکھا۔

”فواد! شانزے نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

”مذاق کر رہا ہوں یا راتم سیریس مت ہو۔“

”اچھا ہوا تم نے بتا دیا کہ مذاق کر رہے ہو۔ سورنہ میں تو سیریس ہونے والی تھی۔“ شانزے نے ہنسنے ہوئے ذمہ کی بات کی۔

”میری ہر بات مذاق نہیں ہوتی۔ کچھ معاملات میں میں واقعی بالکل سیریس ہوں۔ بلیوی۔“ فواد نے فوراً اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”ایک بار بھروسہ ٹاٹ جائے تو کسی پر بھی یقین کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔“ شانزے سنجیدگی سے کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”چلتی ہوں۔“ اس نے اپنا موبائل بیگ میں ڈالا۔

”ایک شخص پر سے بھروسہ اٹھ جائے تو کیا ساری دنیا بے اعتبار ہو جاتی ہے؟“ فواد نے بھی سنجیدگی سے سوال کیا۔

”کبھی کوئی ایک شخص ہی ہماری پوری دنیا اور کل کائنات ہوتا ہے۔ اس سے اعتبار ختم ہو جائے تو سمجھو ساری دنیا سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے۔“ شانزے نے بمشکل مسکراتے ہوئے اسے ہائے کہا اور باہر نکل گئی۔

رات۔ بہت سنجیدگی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے خالہ نے جو کچھ کہا اسے سن کر شانزے اچھل پڑی۔

”آپ نے احمد سے بات کی ہماری ریلیشن شپ کے بارے میں؟ کیوں آپ سے کس نے کہا تھا اس شخص کے آگے گڑگڑانے کو؟“ شانزے بیک وقت صدمے اور حیرانی کی کیفیت سے دوچار ان سے مخاطب تھی۔

”پہلی بات تو یہ کہ میں نے احمد سے صرف بات کی تھی نہ اس کے آگے گڑگڑائی ہوں نہ کسی قسم کی کوئی ریکورسٹ کی ہے اور جہاں تک تمہارے ”کیوں“ کا سوال ہے تو یاد رکھو میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارا گھر اور زندگی آباد رکھنا چاہتی ہوں میں۔“

”میں نے بھی تو یہی کوشش کی تھی مگر میں ایسی کب تک اس گاڑی کو کھیتی رہوں۔ تھک گئی ہوں۔ بے زار ہو گئی ہوں میں۔ جب اسی نے ہاتھ چھوڑ کر راستہ بدل لیا تو میں کیوں اس کے پیچھے پیچھے اس کی ہمراہی کی بھگنا گئی۔“ شانزے چیخ پئی۔

”احمد کا کہنا ہے کہ تمہارے رویے نے اسے تم سے دور کیا ہے، بقول اس کے۔ بچے بہت سنگین کٹ ہو رہے ہیں وہ مرد ہے اس کی ذمہ داریاں اور فرائض کا دائرہ گھر سے باہر ہے۔ تمہاری ذمہ داریاں اور فرائض کا دائرہ گھر کے اندر ہے انہیں نبھاتے ہوئے اپنے کیرئیر کو بناؤ یا صلاحیتوں کا اظہار کرو مگر سب کچھ چھوڑ چھاؤ کر۔“

”آپ بھی اسی کی زبان بول رہی ہیں خالہ۔“ شانزے ان کی بات کاٹ کر سختی سے گویا ہوئی۔

”وہ غلط نہیں ہے بیٹا! اس وقت تمہارے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔“

فرائض صرف میرے حصے میں آئے ہیں۔ یہ کون سا اصول ہے؟ اور آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ دوسری شادی کر کے وہ خود اپنے بیوی بچوں کے کون سے حقوق ادا کر رہا ہے۔“ شانزے بولنا شروع ہوئی تو بولتی ہی جلی گئی۔

”مجھے یقین نہیں ہے کہ احمد ایسا کر سکتا ہے۔“ وہ دھیرے سے بدبوا میں۔

”یہی یقین“ بھروسہ اور اعتبار ہی تو ہمیں مار ڈالتا ہے۔“ شانزے کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

”چپ رہنے سے غلط فہمیاں اور دوریاں بڑھتی ہیں۔ وہ تم سے خفا ہے تم اس سے خفا ہو۔ بات کرو تو مسائل کا کوئی حل نکلو۔“ خالہ نے دھیمے دھیمے اسے سمجھاتے ہوئے تجویز دی۔

”ہم اتنی دور جا چکے ہیں ایک دوسرے سے کہ نہ میں اسے نظر آتی ہوں نہ وہ مجھے نظر آتا ہے۔“

”یہ تمہارا وہم ہے۔ وہ اب بھی تمہارے قریب ہے۔ اسے دیکھو تو محسوس ہو کر۔“

”یہ وہم مجھے پہلے تھا کہ وہ میرے قریب ہے۔ اب تو ساری خام خیالی اور غلط فہمی دور ہو گئی ہے۔“ شانزے کے چہرے پہ درد و کرب کے سائے پھیل گئے۔

”تم کیا فیصلہ کرنے والی ہو؟“ خالہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا جیسے اس کا فیصلہ اس کے چہرے اور خدو خال میں کہیں چھپا ہو۔

”فیصلہ تو تقدیر کرے گی، میرے اختیار میں کیا ہے۔“ شانزے نے گول مول جواب دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے پہ الجھن اور کشمکش کے آثار اس کی اندرونی حالت کی غمازی کر رہے تھے۔

”یہ آنکھ مچولی کب تک رہے گی احمد! تم کوئی فیصلہ کر کیوں نہیں لیتے۔“ اپنی گداز گوری کلائی میں ٹکٹن ٹکٹاتے ہوئے وہ بہت سنجیدگی سے بول رہی تھی۔

”فیصلہ؟“ احمد نے کسی حد تک بے بسی سے اسے

دیکھتے ہوئے سوچا۔ وہ نہ جانے کیوں اتنا الجھا ہوا اور متذبذب تھا۔ اپنی مرضی سے دریا میں اترتا تھا اب وزیدہ نظروں سے اس ساحل کو دیکھ رہا تھا جہاں سے اس دریا میں چھلانگ لگائی تھی۔

وہ تو ہمیشہ ہر معاملے میں بہت کلیئر رہا تھا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک مبہم اور غیر واضح رستے کا انتخاب کر بیٹھا تھا جس پر وہ چل بھی رہا تھا۔ اتنا بے بس اور بے اختیار تو وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔

”اب کیا سوچنے لگے؟“ کومل نے جیسے آکٹا کر سوال کیا۔

”تم کیا چاہتی ہو؟“ احمد نے گیند اس کے کورٹ میں ڈالی۔

”وہی جو تم چاہتے ہو۔“ کومل کا جواب فوری اور برجستہ تھا۔

”میں کیا چاہتا ہوں؟“ احمد نے دل ہی دل میں خود سے سوال کیا۔

شانزے اور اس کی محبت کی دوری نے اسے کومل سے قریب کر دیا تھا۔ مگر اس دوستی اور قربت میں محبت کیس نہیں تھی؟ اپنے سکون اور خوشی کے لیے وہ کوئی انتہائی قدم اٹھا بھی لیتا مگر بچوں کا خیال آتے ہی اس کے قدم ہٹیں رک جاتے۔

”اس سارے معاملے میں بچوں کا کیا قصور ہے؟“ ہر خیال کی تان میں اس آکر ٹوٹ جاتی اور وہ بے بسی سے خود کو دیکھتا رہتا۔

”لوگوں کی گوسپ سے تنگ آگئی ہوں میں۔ نیوز میں آئے دن ہمارے بارے میں کچھ نہ کچھ آتا رہتا ہے۔ میں تنگ آگئی ہوں اس سب سے۔“ وہ بھی چھنچھلا گئی تھی حالات کی سختی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

”شانزے کو کب ڈائیورس کر رہے ہو؟“ کومل نے اس کی سماعتوں پہ ایک دم بھوڑا تھا۔

”میں اپنی محبت کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتی۔ وہ تمہاری زندگی سے نکلے گی تب ہی میں تمہاری لائف میں آؤں گی۔“ کومل اس کے

احساسات سے بے خبر اس کی سنے بغیر اپنی اپنی جا رہی تھی۔

”اور بچے؟“ احمد کی کچھ سوچتی ہوئی نظریں کومل پر مرکوز ہو گئیں۔

”واٹ ڈو یو مین! کیا بچے تم رکھو گے اپنے پاس؟ کیا وہ ایگری ہے اس بات کے لیے؟“ کومل کو اس کے سوال سے خاصا دھچکا لگا تھا۔

”ہو سکتا ہے میں ہی رکھ لوں اپنے بچوں کو پھر؟“

”میرا نہیں خیال کہ تمہاری سسرانہی آسانی سے بچوں کو تمہارے پاس رہنے دے۔ ایک ماں کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے یہ سب۔“ کومل نے نفی میں سر ہلایا۔

”میری سسر کے لیے یہ سب بہت آسان ہے۔“ احمد پلک جھپکے بنا اس کی طرف دیکھ کر بات کر رہا تھا۔

”میں تو توئی الحال کئی سال تک اپنے بچے بھی پالنے کے موڈ میں نہیں ہوں تو۔“ کومل نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی مگر اس کا مفہوم عیاں تھا۔

”ڈونٹ مائنڈ احمد! بچوں کو جو پیارا ان کی سگی ماں دے سکتی ہے جیسے وہ ان کی کیر کر سکتی ہے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ مجھ سے اس قسم کی کوئی انکسپیکشن نہیں رکھنا۔“ کومل نے صاف گوئی سے اسے حتمیٰ کیا۔

”ہوں! احمد نے لب بھینچے۔“

کومل کا موڈ کچھ خراب سا ہو گیا تھا۔ وہ شیشے سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی اور احمد اس کے چہرے کو۔

آج پارلر میں کافی دیر لگ گئی۔ بالوں کو نئے انداز میں ترشوا یا تھا پھر اپنی معمول کی بیوٹی ٹرینمنٹ گھر پہنچی تو بچے اور خالہ کھانے کی میز پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”آٹم سوری۔ ویری سوری! میری وجہ سے آپ کو ویٹ کرنا پڑا۔ حالانکہ اتنی جلدی جلدی چٹائی میں نے پھر بھی دیر ہو گئی۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے اس نے معذرت کی۔“

”ہم بس ابھی ابھی ہی بیٹھے تھے“ خالہ جان نے اپنی پلیٹ میں سالن نکالا۔ شانزے نے بچوں سے پوچھ کر انہیں چاول دیے اور خود اپنے لیے سلاوا نکالا۔ ”کھانا کھاؤ ٹھیک سے۔ یہ کیا کھا رہی ہو؟“ خالہ نے اسے ٹوکا۔

”خالہ امی! چار پونڈ وزن بڑھ گیا ہے میرا۔ کھانے پینے میں پرہیز کیا تو چار کالری بڑھ کر آٹھ بارہ اور سولہ بھی ہو سکتا ہے۔“ شانزے نے کھیرے کا ٹکڑا کانٹے میں پھنسا یا اور منہ تک لے گئی۔

کھانے کے بعد خالہ اپنا چائے کا کپ اور شانزے گرین ٹی کا کپ لے کر بیٹھ گئیں۔ ”ٹی وی دیکھیں گی؟“ صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے شانزے ریوٹ ہاتھ میں لیا۔

”میں یہاں ٹی وی دیکھنے نہیں آئی۔ ہٹاؤ اسے!“ خالہ نے کچھ کوفت اور کچھ بے زاری سے کہا۔ ”تم لوگوں کو دیکھنے“ ملنے اور باتیں کرنے آئی ہوں۔“ انہوں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اپنی بات میں مزید اضافہ کیا۔

”کیا ہوا؟“ شانزے کو لگا کوئی خاصی بات ہے۔

”شانو بیٹا! میری بات سمجھنے کی کوشش کرنا۔“ خالہ نے ایک توقف کے بعد آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ”احمد کو تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی نے تم سے دور کیا ہے، تمہارے اس زعم نے اسے راہ بھٹکنے پر مجبور کیا کہ تمہارے جیسی کامیاب کیریئر وومن کو شوہر کی کوئی خاص پروا اور ضرورت نہیں ہوتی۔“ خالہ امی نے اسے آئینہ دکھایا۔

”اچھا! وہ تلخی سے مسکرائی۔

”میں نے مان لیا کہ مجھ میں بہت ساری برائیاں ہیں، خامیاں ہیں مگر کیا ان سب کا حل یہی ہے کہ وہ کسی اور کی بانہوں میں جھولنے لگے یا پھر مجھے نچا کھانا سبق سکھانا مقصود ہے۔“ عورت اپنے شوہر کے ہاتھوں شاید ہر قسم کی ذلت برداشت کر لے مگر یہ ذلت کبھی برداشت نہیں کر سکتی جسے بے وفائی کہتے ہیں۔“ شانزے کے خوب صورت چہرے پر غصہ بھی تھا۔

برہمی بھی اور بے بسی بھی۔

”احمد راستہ بھٹکا ضرور ہے مگر راستہ بدلا نہیں ہے اس نے نہ وہ عیاش ہے نہ بے وفا اور۔“

”لوگ جو کچھ بتاتے ہیں اس کے متعلق وہ جھوٹ ہے؟“ میگزینز میں جو کچھ چھپتا ہے اس کے اور کوئل کے متعلق وہ سب بکواس ہے؟“

”لوگ رائی کا پہاڑ بھی تو بناتے ہیں۔“ خالہ مسلسل احمد کا دفاع کر رہی تھیں۔

”رائی کا وجود ہوتا ہے تو پہاڑ بنتا ہے نا۔“ شانزے اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔

”رائی اور پہاڑ کے فرق کو سمجھو شانزے! انہیں ایک ترازو میں تولنا کہاں کا انصاف ہے؟“

”آپ کیوں اتنی وکالت کر رہی ہیں اس شخص کی؟“ شانزے جڑ گئی۔

”آپ بالکل بھی اندازہ نہیں کر سکتیں کہ اس کی اور کوئل کی خبروں کو لے کر مجھے کس کس طرح کی نظروں اور باتوں کو فیس کرنا پڑا ہے۔“ لوگ بظاہر ہمدردیاں جتاتے ہیں۔

پٹھ پیچھے مذاق اڑاتے ہیں۔ میں تو خود اپنی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گئی ہوں۔“

”میری احمد کے ساتھ تفصیلی بات ہوئی تھی نہ تو اس نے کوئل کے ساتھ شادی کی ہے اور نہ ہی فیوج میں ایسا کوئی ارادہ ہے۔“

”آپ کر لیں اس بات پر یقین، مگر میں نہیں کر سکتی۔“ شانزے نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے جس نے ان دونوں کے نکاح کے بارے میں بتایا ہے وہ میرا سچا ویل و شر ہے۔ اتنا بڑا جھوٹ مجھ سے نہیں بول سکتا۔“

”کس نے گمراہ کیا ہے تمہیں احمد کے بارے میں اتنا زہر بھر دیا دل و دماغ میں کہ صحیح بات سننے کی بھی روادار نہیں رہیں۔“ خالہ امی بھی جھنجھلا اٹھیں۔

”میرے دل و دماغ میں یہ زہر خود احمد نے ہی بھرا ہے اپنی حرکتوں سے، کسی اور کو کیا ضرورت ہے یہ حرکت کرنے کی۔“ شانزے نے دوبارہ جواب دیا۔

”کیا چاہ رہی ہو تم۔ کھل کر تو بتاؤ۔“

”سینئریشن۔“ شانزے کے دو ٹوک جواب نے ان پر جیسے کوئی گم گرایا تھا۔ وہ خاموش ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

”پھر کیا سوچا تم نے؟“ فواد نے آج واضح الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ پھر یہ سوال۔

”میں نے احمد سے کہہ دیا ہے کہ وہ مجھے ڈائیسورس کر دے۔“ ایک لحظے کو شانزے کی آواز کپکپا گئی تھی۔ حالانکہ احمد کے سامنے تو اس نے بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا مگر اس وقت۔

”کیا کہا اس نے؟“ فواد کے لمحے میں چھپی بے تابی پر شانزے نے غور نہیں کیا۔ ابھی ابھی اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔“

”کیا مطلب کچھ بھی نہیں۔“ فواد تقریباً چلا اٹھا۔

”وہ خود تو دوسری بیوی کے ساتھ رنگ رلیاں منارہا ہے۔ تمہیں کیوں بچ میں لٹکا کے رکھا ہے؟ فیصلہ کیوں نہیں کرتا۔“

”فیصلہ تو اسے کرنا ہی پڑے گا۔“ شانزے ابھی ابھی سی تھی۔

”ڈونٹ وری شانزے! میں ہوں نا تمہارے ساتھ خود کو اکیلا مت سمجھو۔“

”میں اکیلی نہیں ہوں فواد! میرے دو بچے بھی ہیں۔“ شانزے نے اسے بتایا نہیں دیتا تھا۔

”اس بات کا کیا مطلب ہے؟“ فواد نے نسبتاً محکمہ لوجہ اختیار کیا۔

”مطلب یہ کہ میرے ساتھ میرے بچوں کو بھی قبول کرو گے؟“ شانزے نے واضح الفاظ میں اس سے کہا۔

”بچے صرف تمہاری ذمہ داری تو نہیں ہیں، وہ بھی تو کچھ لگتا ہے ان کا۔“

”احمد نے میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ان کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی تو اب الگ ہو کر یہ ذمہ داری کیسے اٹھائے گا۔“

”ٹیک اٹ اپری یار! ہاسٹل اور بورڈنگ کس مرضی کی دو ہیں۔“ فواد نے لاپرواہی سے بولتے ہوئے اسے تسلی دی۔

”ہاسٹل؟“ شانزے نے حیرت میں لپٹی بے یقینی کے ساتھ اسے دیکھا۔

”میں اپنے بچوں کو اپنے ساتھ اپنے پاس رکھوں گی۔ ہاسٹل میں نہیں۔“ شانزے کا لہجہ قطعی اور الفاظ دو ٹوک تھے۔

”اوکے، اوکے۔“ فواد نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔

”جو تمہاری مرضی اور خوشی، وہی کرنا۔ میں تمہاری مرضی، راضی اور تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔“ فواد نے کہا۔

”پتا نہیں کیا ہو رہا ہے، میں کیا کر رہی ہوں۔“ شانزے نے دھیرے سے بڑبڑاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

”تم جو کچھ کر رہی ہو بالکل ٹھیک کر رہی ہو۔“ فواد کے حساس کانوں تک اس کی بڑبڑاہٹ پہنچ گئی۔

”تم اسٹرونگ ہو تو اسے برو کرو! احمد کو دکھاؤ کہ تم اس کے سہارے کے بغیر بھی ایک کامیاب اور پرفیکٹ لائف گزار سکتی ہو۔ اب وہ دور نہیں رہا کہ عورت ایکسپلاٹ ہوئی رہے، روتی رہے، سسکتی رہے پھر بھی مرد کے آگے پیچھے گھومتی رہے کہ اس کے پاس اور کوئی راستہ ہی نہیں۔“

فواد کی جوشیلی تقریر بھی اس کی ابھی ابھی آنکھوں میں رونق کی کوئی جوت جگانے میں ناکام ہی رہی، وہ خالی خالی نظروں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

”کم آن یار! چیر اپ۔“

شانزے نے زبردستی مسکرانے کے انداز میں ہونٹ پھیلادیے۔

”یوں نہیں۔ جیسے تم مسکراتی ہو دل سے ویسے ہی مسکراؤ۔“ فواد نے آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

”گڈ گرل۔“ وہ مسکرا دیا۔

”میں چلتی ہوں۔“ وہ اک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی

تھی۔

”پلے لینڈ اور۔۔۔“ چھوٹی بہن کی بات شاہ میر نے جلدی سے کاٹی دی۔

”میں یہاں کی بات نہیں کر رہا فوٹس گرل! ہم آؤٹ آف کنٹری نہیں جائیں گے۔ بے ٹاپا! اس نے باری باری کنفریشن کے لیے۔۔۔ ماں باپ کا منہ دیکھا۔

”ضرور جائیں گے بیٹا! احمد نے اسے تسلی دی۔

”کہاں؟“ دونوں بچوں کے چہروں پہ بے حد اشتیاق تھا۔

”جہاں آپ کہیں۔“

”ہر امس۔“ شاہ میر نے جگمگاتی آنکھوں سے احمد کو دیکھا۔

”نکار امس۔“ احمد مسکرایا۔

”ٹھیک ہے، پھر ہم لندن چلیں گے۔ میں علیزے سے ممال اور پاپا ہم سب ڈن؟“

”اوکے۔ ڈن۔“

”ہم ڈننی لینڈ بھی جائیں گے۔“ علیزے نے بھولپن سے اپنی فرمائش بیان کی۔

”ڈننی لینڈ امریکا میں ہے اسٹوڈنٹ! لندن میں نہیں! شاہ میر نے فوراً اپنی معلومات کا رعب جھاڑا۔

”ڈونٹ وری! ہم اپنی بیٹی کو ڈننی لینڈ بھی دکھائیں گے۔ نیکسٹ ایر چلیں گے ٹھیک ہے۔“ احمد نے بیٹی کو تسلی دی۔

کیسی خزاں خزاں سی سہ پہر بے رنگ اجاڑ ویران سی، سرمئی شام اپنے پر پھیلانے کو تھی۔

کچھ ضروری شاپنگ کر کے وہ مال سے نکل رہی تھی۔ تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ شانزے نے چیک کیا۔

”ہیلو!“

”ہیلو، کیسی ہو؟ کہاں ہو؟“ اس نے ایک ساتھ دو سوال کر ڈالے۔

”ٹھیک ہوں، تم سناؤ۔“ وہ مال کی سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔

”اب فون پر کیا سناؤں، تم آؤ تو کچھ کہو۔“

شانزے خاموش ہو گئی۔

”آج کا کیا پروگرام ہے تمہارا۔ آجاؤ ڈنر ساتھ کرتے ہیں۔ کچھ یاد ہے آخری بار ایک ساتھ ڈنر کب کیا تھا؟“ فواد کا لہجہ جتنا نے والا تھا۔

”آج تو میں بڑی ہوں! خالہ امی نیکسٹ ویک چلی جائیں گی، میں زیادہ تر ٹائم ان کے ساتھ ہی گزارتی ہوں۔“

”چلو ڈنر نہ سہی، شام کی چائے ہی ساتھ پی لو۔ کچھ ٹائم نکال لو مجھ غریب کے لیے بھی۔“

”وعدہ نہیں کرتی، کوشش کروں گی آنے کی۔“

شانزے نے آہستہ سے کہا۔

”تو آرہی ہو ابھی؟“

”ابھی نہیں، کل پرسوں یا اس کے بعد۔“

”بہت انتظار کروائی ہو تم۔ خیر کرتے ہیں انتظار تمہاری کل پرسوں کا۔ اوکے اللہ حافظ۔“

”خدا حافظ۔“

موبائل آف کر کے وہ اپنی گاڑی میں بیٹھی۔ اشارت کرنے سے قبل چند لمحے اس نے کچھ سوچا پھر مسکرا کر گاڑی اشارت کرنے لگی۔

اس کا ارادہ تھا فواد حسن کو سربراہ بننے کا۔ گاڑی کا رخ اس نے فواد کے آفس کی طرف موڑ دیا۔

شام کا وقت تھا۔ سڑکیں ٹریفک سے بھری ہوئی تھیں مگر خوش قسمتی سے کہیں زیادہ ٹریفک جام نہیں ملا۔

بیچ ٹائم پر وہ پہنچ گئی اور پھر شاید ساری عمر اب اسے اللہ کا شکر ادا کرنا تھا کہ وہ صحیح وقت پر وہاں پہنچی تھی۔

والپس کا سفر کچھ طویل اور کچھ مشکل تھا مگر واپس تو اسے آنا ہی تھا۔ وہ جسے ٹھنڈے، پیٹھے، خوشگوار پانی کا چشمہ سمجھی تھی وہ گندا، بدبودار سڑے ہوئے پانی کا جوہڑ تھا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس گندے جوہڑ کو دیکھ

رہی تھی جس کی بدبو اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ اس متعفن جوہڑ سے فوراً دور چلی جائے۔ وہ واپس ہو رہی تھی۔ دور چارہ ہی تھی، مگر خنجر کی سی نوک تھی کوئی جو دل میں اترتی جا رہی تھی، تکلیف بے پناہ تھی۔

”مرد کی فطرت میں ہی دھوکے بازی ہے۔ عیاری ہے، چال بازی ہے۔ بے ایمانی ہے۔“ وہ شدت کرب سے لب بھنے مرد کو مورد الزام ٹھہرا رہی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ خود کتنی غلط تھی۔ اپنی خامیوں اور برائیوں پر کبھی نگاہ ہی نہ کی انسان تھی نا، بیشتر انسانوں کی طرح بے ضمیر اپنی ناشکراہی اس میں بھی تھا، وہ بھی بزم خود

بارسا تھی اور اپنی زندگی میں آنے والے دو مردوں احمد فضل اور فواد حسن کو کٹرے میں کھڑا کر کے فرد جرم عائد کر رہی تھی۔ خود کو مظلوم سمجھ کر آنسو بہا رہی تھی۔

اتنی باصلاحیت اور اتنی مشہور کامیاب، شانزے احمد کے ساتھ کیا کچھ غلط ہوا اور کیوں ہوا؟

شانزے گھر پہنچی تو سارا وجود یوں شل تھا۔ جیسے صدیوں کا سفر طے کر کے آئی ہو اور شاید یہ صدیوں کا ہی سفر تھا۔ کتنا کچھ بدل گیا تھا اس دوران۔ وہ خود اس کا دل اور زندگی۔ اور آج کا یہ دن۔ اس سے زیادہ برا دن اس سے زیادہ تکلیف دہ دن شاید ہی اس کی زندگی میں آیا ہو۔

”کیا ہوا؟“ خالہ امی نے تشویش سے اس کا چہرہ دیکھا جس پر دکھ کی تحریر تھی۔ صدمہ بھی رقم تھا اور ساتھ ساتھ شکست کا احساس بھی۔

”کچھ نہیں بس سر میں درد ہے۔“ وہ ان سے نگاہیں چراتی سرد رو کا بہانہ کر کے کمرے میں بند ہو گئی۔ رات کا کھانا بھی نہیں کھایا مگر صبح تو اسے اٹھنا تھا۔ اپنا مارننگ شو کرنا تھا۔

”زندگی میں کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب انسان خواہ مرد ہو یا عورت، مشین بن جاتا ہے۔ ہر احساس سے عاری صرف اپنا کام سرانجام دیتا ہے، جو اس کے

131

ماہنامہ شعاع ستمبر 2014

130

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

دے ہو۔ آج شانزے احمد مشین بن گئی تھی۔ صبح معمول کے مطابق وہ بیدار ہوئی۔ تیار ہو کر کمرے کے سامنے آئی اور اپنا پروگرام شروع کر دیا۔ کسی چالی والی گڑیا کی مانند۔ چالی بھرد تو ہستی مسکراتی رقص کرتی ہے۔ دل لہاتی ہے۔

شو ختم ہوا تو کچھ دیر بعد فواد حسن اس کے پاس آیا۔ معمول کے مطابق مسکراتا ہوا۔ اس کے چہرے پر اتنا خلوص بکھرا ہوا تھا کہ اس کے اندر فواد حسن کا اصلی چہرہ کھوجنا انتہائی مشکل ہو رہا تھا۔

شانزے ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ وہ واقعی بہت اچھا لاکار تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ وہ چونکا۔

”میں کل تمہارے آفس گئی تھی شام میں۔“

”میرے آفس۔ شام میں؟“ فواد کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”ہاں شام میں۔ جس وقت تم کو مل سے باتیں کر رہے تھے۔“ شانزے کے اطمینان میں ہنوز کوئی فرق نہیں آیا تھا مگر اس کا یہ اطمینان مصنوعی تھا۔ اس کے اندر تو جیسے بھانپ رہے تھے۔

”کک۔ کوئل سے۔“ انتہائی باصلاحیت اور برا اعتماد فواد حسن کی نہ صرف زبان لڑکھائی بلکہ وہ خود بھی لڑکھا گیا۔ اس کی حالت ایسے کوہ پنا جیسی تھی جو جونی سے محض چند قدم کے فاصلے پر ہو اور اچانک پاؤں پھسل گیا ہو۔

وہ بے بسی سے خود کو گرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ممکنہ تسخیر شدہ جونی اس سے دور بہت دور ہو رہی تھی۔

”میری بات سنو شانزے! لیٹ می ایکسپلین۔“

فواد نے خشک ہوتے لیوں پر زبان پھیری۔

شانزے نے بیک اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

فواد حسن ناکامی اور نامرادی کی انتہا گہرائیوں میں غم جان پڑا ہوا تھا۔

کتنی دیر ہو گئی تھی اسے دراز میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے۔ چہرے نکالتی اور واپس رکھ دیتی۔ جلنے لگا ڈھونڈ رہی تھی۔

”کیا ڈھونڈ رہی ہو؟ اتنی دیر ہو گئی ہے مجھے دیکھتے ہوئے۔“ بالآخر خالہ امی نے مداخلت کر دی ڈالی۔

”کچھ بھی نہیں وہ۔ پتا نہیں کیا ڈھونڈ رہی تھی بھول گئی۔“ شانزے غائب دماغی سے کتتی بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔

”شانزے مجھے بتا دو کہ کیا بات ہے۔ پچھلے تین دن سے تمہیں دیکھ رہی ہوں آنسوؤں کو اپنے اندر مت روکو رونا آ رہا ہے تو رو لو جی بھیر کے۔“

خالہ امی کے کہنے کی دیر تھی کہ شانزے جیسے بکھر گئی۔ ان کے کندھے پر سر رکھ کر وہ ہلکے ہلکے گریوئی۔

بہت دیر رونے کے بعد اس نے اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کر کے خالہ امی کی طرف دیکھا۔

احمد کی بے رخی بے اعتنائی اس کے ساتھ لڑائی جھگڑے احمد اور کوئل کا فیر تعلقات اور شادی کی خبریں ان سب نے اسے فواد حسن کی طرف مائل ہونے پر مجبور کر دیا جو کب سے دوستی سے آگے بڑھ کر اس کی محبت کا دم بھرنے لگا تھا۔ اور آخر میں اس نے تین دن پہلے والی اس شام کے بارے میں بھی بتایا۔

جب فواد حسن کا مکروہ چہرہ اس کے سامنے آیا۔

”مجھے معلوم ہے غلطی میری تھی میں۔“

شانزے نے الف سے لے کرے تک سب کچھ بتانے کے بعد مزید کچھ کہنا چاہا تھا کہ خالہ امی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”غلطی؟ یہ صرف غلطی نہیں تھی شانزے! لہذا تھا۔ شوہر کے ہوتے ہوئے تم کسی اور کی طرف مائل کیسے ہوئیں۔ خیانت محض عملی نہیں ہوتی ذہنی بھی

ہوتی ہے۔ اپنے شوہر کے علاوہ تم نے کسی اور کے بارے میں سوچا کبھی کیسے؟“

”آپ جانتی ہیں میں نے احمد سے کتنی محبت کی ہے۔ کتنا چاہا ہے اسے اسے چاہنا میری عادت بن گئی تھی ایسی عادت جسے انسان کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔ اس نے کسی اور کی طرف نگاہ کی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ مجھے فواد سے کوئی قلبی لگاؤ نہیں تھا خالہ۔ محض دوستی تھی مگر احمد کو نیچا دکھانے کے لیے اس سے انتقام لینے کے لیے میں فواد کی طرف بڑھی۔“ شانزے فکرت خورہ لہجے میں بول رہی تھی اور ساتھ ساتھ رو بھی رہی تھی۔

”مجھے معلوم ہے میرے اندر برداشت کی کمی ہے۔ میری طبیعت میں انتقام کا جذبہ ہے۔ اسی لیے اسی لیے تو آج میں اپنی نظروں میں ذلیل ہو کر رہ گئی ہوں۔“

شانزے سچائی اور دیانت داری سے اپنا محاسبہ کر کے سارے اعترافات کرتی جا رہی تھی۔

تین روز پہلے کی وہ شام کیسے بھول سکتی تھی جب وہ ذلت کی انتہا گہرائیوں میں گری تھی۔

وہ فواد حسن کو سربراہ اندر دینے اس کے آفس پہنچی تھی اور خود سربراہ اندر ہو گئی تھی۔

”تم سے اتنا ذرا سا کام نہیں ہو سکا۔ اتنا عرصہ لگا رہا۔ کیسی حسینہ ہو تم؟ تمہارے حسن اور اداؤں کا جادو چلا نہیں احمد پر؟“

”افسوس! جو اس مت کرو۔“ کوئل شاید بھڑک کر بولی تھی۔

”پہلے تم اپنی بات کرو۔ تم نے برا مس کیا تھا کہ جہاز برباد دہائی کے ساتھ میرا کنٹریکٹ سائن کرواؤ گے تم پتا نہیں کیا کر رہے ہو اور وہ نہ ہوا اڈیا کو سائن کر رہا ہے۔“

کوئل نے ایک نئی ابھرتی ہوئی ماڈل کا نام لیا۔ اور جمل تک احمد کو رام کرنے کی بات ہے تو میں کسی انسان کو اپنے بس میں کر سکتی ہوں پتھر کو نہیں اس جہان کو اپنے مرکز سے ہٹانا میرے بس کی بات نہیں۔

وہ کیا شخص ہے۔ میں تمہیں کیسے جتاؤں وہ میرے

قریب آتے آتے مجھ سے یکایک دور ہو جاتا ہے۔ کبھی بہت اپنا اپنا سا لگتا ہے اور کبھی بالکل اجنبی بن جاتا ہے۔ کوئل نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

”میں نے بہت کوشش کی مگر اس کی روٹس اپنی فیملی میں ہی گڑی ہوئی ہیں۔ وہ وقتی طور پر اپنی فیملی سے دور ہو سکتا ہے مگر ہمیشہ کے لیے نہیں؟“

”امیزنگ! اس ویری امیزنگ۔ پوسی! ایک عورت جو وفا ایثار اور قربانی کا پیکر سمجھی جاتی ہے جسے فیملی میکر کہا جاتا ہے اسے میں نے کیسے ٹھنڈی میں کر لیا۔ اپنے شوہر بچوں اور گھر کی پروا کیے بغیر وہ میرے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے اور تم ایک مرد کو اپنی ٹھنڈی میں نہیں کر سکیں۔ وہ مرد جسے راستہ بدلنے کو منہ کا ڈالنا لگے کو محض بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔ وہ تو منظر ہوتا ہے۔ کسی کی نظروں سے شکار ہونے کا کسی کی اداؤں سے گھائل ہونے کا۔ تم سے تر نوالہ بھی نہیں کھایا گیا۔“ فواد حسن کچھ استہزائیہ انداز میں اور کچھ طیش میں کوئل کا مذاق اڑا رہا تھا۔

”شانزے احمد تمہارے لیے سونے کا اندھا دینے والی مرغی ہے۔ اس کی دولت اور صلاحیت سے تمہیں آئندہ کئی فائدے اٹھانے ہیں تم جیسے فلاش اور کنجال انسان کو اس کا زرخیز بنک بیلنس زمین سے آسمان پر

نصحتیں

حسن کا احمد

قیمت - 300 روپے

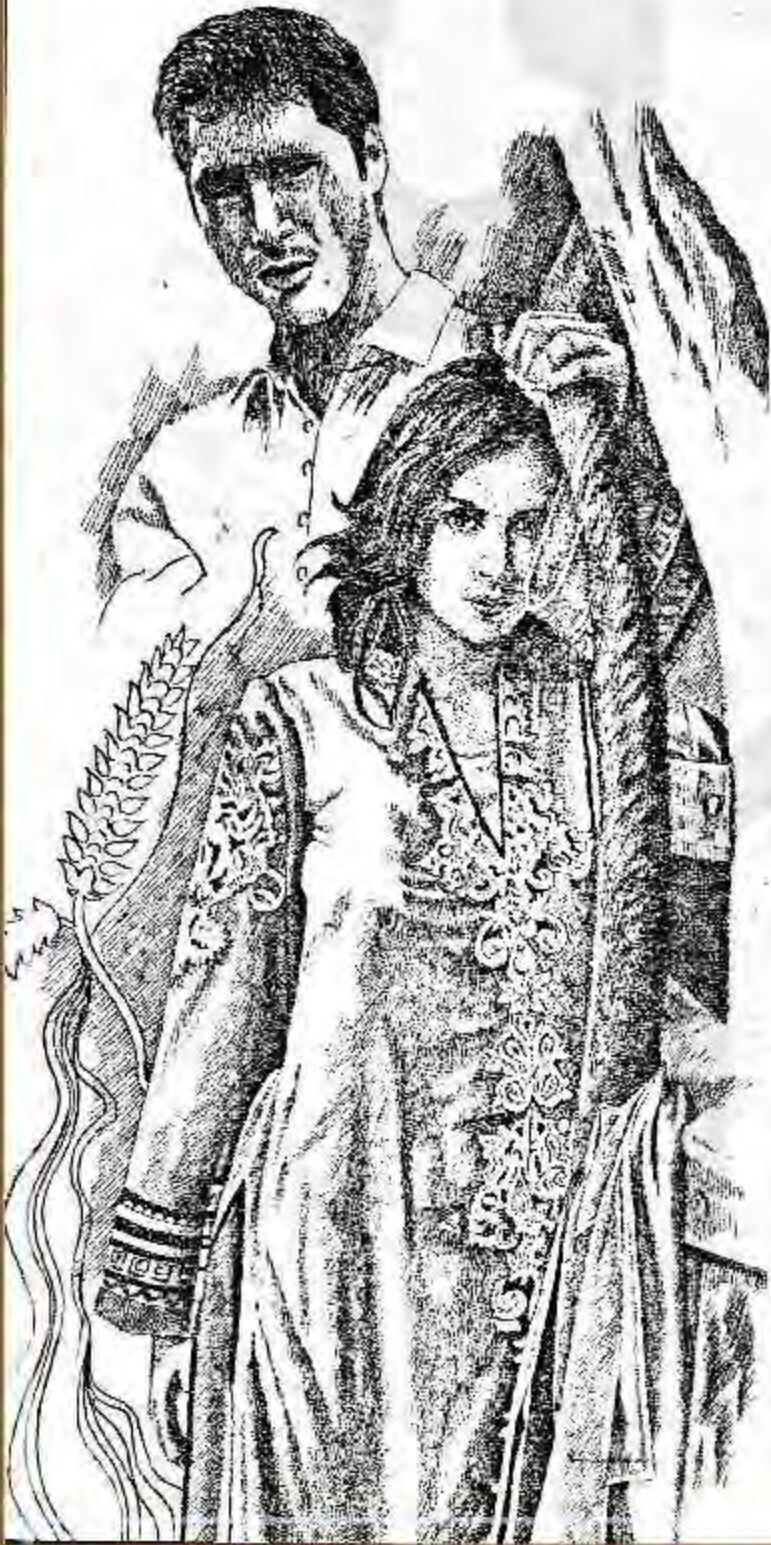
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر: 32735021

37، اردو بازار، کراچی

مصباح علی

گنگوڑی



اس نے پانچویں بار کروٹ بدلی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے نہیں بلکہ دل سے روٹتی تھی۔ وہ جت لیتی بس چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے چھت پر کئی برسوں کی دھول پڑی ہو جو وہ اپنی پلکوں سے جھاڑ رہی ہو۔ اس کی سوچوں میں کچھ محل تھا تو وہ اس کے بلکے خرابے اس نے ذرا سی گردن موڑ کر اس کی پشت کو گھورا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہا تھا۔ خرابوں میں اس کا شمار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

”کتنے بے خبر ہیں یہ کیسے سمجھاؤں؟ مجھے تو کبھی کسی قابل سمجھا ہی نہیں۔“ اس نے آہ بھر کر سنجھن پھیر لیا۔ ڈرنک میبل کے آئینے میں اس کا چہرہ خاصا بجا لگا رہا تھا۔ وہ اپنی حلقہ زد آنکھیں دیکھنے لگی۔

”اٹھارہ برسوں میں شکل کیا سے کیا ہو گئی۔ بھاگتے بھاگتے جوڑ جوڑ دیکھتے لگا، مگر اس کے معیار تک نہ پہنچ سکی۔“

اس نے تاسف بھری سانس کھینچی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ باؤں میں چپل اڑی، دوپٹا اٹھا کر گلے میں ڈالا۔ اک نظر۔ اسے دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس کی نظر سامنے کمرے کے اوپر کھلے دروازے میں سے آتی روشنی کی لکیر پر پڑی اور ساتھ ”کھی کھی“ ہااا کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ سوچیں جھٹک کر کمرے کی طرف چل دی۔

”تم ابھی تک سوئے نہیں۔“ وہ دروازے کھول کر اندر آئی۔ ریجہ، ضاد، عفتان بیڈ پر پھسکڑ مارے منوبلی کھیل رہے تھے۔ ریجہ نے ضاد کا کان زور سے پکڑ رکھا تھا اور وہ ”اوئی اوئی“ کرتا چلا رہا تھا۔ جبکہ عفتان بند منہ سے ہنسی روکنے کی ناکام کوشش میں۔

”ریجہ! چھوڑو بھالی کا کان، شرم نہیں آتی اتنی بڑی ہو گئی ہو اور جانوروں کی طرح لڑتی ہو۔“ ارم نے کہا۔

”جانوروں کی طرح کہاں کہاں! میں نے تو انسانوں کی طرح پکڑ رکھا ہے۔ یہ دیکھیں۔“ اس نے اور زور سے اس کا کان کھینچا اور ہنستے ہوئے بولی۔

”مما! یہ چور کی سزار کھی ہے اس نے پہلے یہاں

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے نظر اٹھا کر شانزے کو دیکھا۔ ”کتنے دن کی چھٹیاں لی ہیں تم نے؟“ احمد لپٹ پڑا۔ چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”چھٹیاں تو نہیں لی ہیں میں نے۔“ شانزے نے دھیرے سے جواب دیا۔

”اوہ! احمد نے ایک گہری سانس لی۔

”تو تم۔ ہمارے ساتھ نہیں جا رہی؟“

”میں نے یہ تو نہیں کہا۔“

”پھر؟“ احمد کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

”مجھے ایک دوسرے چیل سے برج شوکی آفر تھی، میں نے اسے جوائن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، نیکسٹ مہینے سے میرا شو اسٹارٹ ہو گا۔“

”یہ چیل کیوں چھوڑ دیا؟“ احمد اب بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

”برج شوڈیر سے شروع ہو گا۔ مارنگ میں گھر اور بچوں کے لیے ٹائم مل جائے گا۔“ شانزے ساہ سے انداز میں بولی۔

احمد خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”تمہاری واپسی اچھی لگ رہی ہے۔“ وہ اک دم ہی مسکرایا تھا۔

شانزے کے لبوں پہ بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ بے اختیار آ گئی۔

”میں اس لیے واپس نہیں آئی کہ میرے گھر کو میری ضرورت ہے بلکہ اس لیے واپس آئی ہوں کہ مجھے تم سب کی ضرورت ہے۔“ شانزے نے اعتراف کیا اور آخر اعتراف کرنے میں حرج ہی کیا تھا پھر اس پر بہت سا شکر بھی واجب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی عزت رکھ لی تھی جو ذلت اس نے اپنے اوپر جمیلی نہ دینا کے سامنے طشت ازبام نہیں ہوئی۔ وہ رسوائی احمد کے سامنے نہیں آئی۔

وہ ندامت اور توبہ کے عمل سے گزر رہی تھی اپنی جنت اور محبت اسے واپس مل ہی جاتی تھی۔

☆

لے جا سکتا ہے، سو تمہیں جو کچھ چاہیے تم نے اس کے حساب سے محنت کی اور کامیاب ہو گئے یا پھر شاید وہ عورت ہی ایسی ہے، شاخ سے ٹوٹے پھل کی طرح کسی کی بھی آغوش میں گرنے کو تیار ہو سکتا ہے تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی شانزے کو اسی طرح ٹریپ کر لیتا۔ اس کی کمزوریوں اور خامیوں نے تمہیں اتنا طاقت ور بنا دیا کہ وہ تمہارے پھیلانے جال میں آسانی سے آ گئی، مگر اس کا شو ہر وہ کچھ اور ہی ہے۔“

کوئل سانس لینے کو رکی۔ ”سچ کہوں۔ احمد مجھے اتنا اچھا لگنے لگا ہے کہ میں سوچتی ہوں مکاش اس کے جیسا لاف پارنٹر مجھے بھی مل جائے جو میرا وفادار ہو۔“

”اوہو! شکاری خود شکار ہو گئے۔“ ٹوٹاؤ نے زور سے تہقہ لگایا۔

باہر کھڑی شانزے احمد پتھر کی صورت بن چکی تھی۔ اپنی ذات کا زعم اپنی صلاحیت کا سارا گھمنڈ سب کچھ فواد حسن کے پیروں تلے کچلا جا رہا تھا۔

بڑی مشکل سے خود کو ٹھہرتی وہ باہر آئی تھی۔ اس کا پورا وجود بری طرح کانپ رہا تھا، غصے سے بھی اور توہین اور ذلت کے احساس سے بھی۔

وہ کس طرح گھر پہنچی تھی وہی جانتی تھی۔ خالہ امی کے آگے دل کا بوجھ ہلکا کر کے اب وہ چپ چاپ بیٹھی تھی۔

☆☆☆

بچوں کے کپڑے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر سب چیزوں کا جائزہ لیا، کہیں کچھ رہ نہ جائے۔ اپنے جائزے سے مطمئن ہو کر شانزے نے سکون کی ایک گہری سانس لی۔

تیار ی تقریباً مکمل ہی تھی۔ دونوں بچے بے حد خوش اور پرجوش تھے احمد اسٹڈی روم میں تھا۔ شانزے کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی پھر دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔

احمد لپٹ پڑا پر کام کر رہا تھا۔ تیزی سے مصروف اس کی انگلیاں ایک لمحے کو رکیں۔

سے پانچ سو پونڈز کا کارڈ چرایا تھا اور اب آکسفورڈ اسٹریٹ کا کارڈ۔ اس نے ایک جھٹکا اور دیا۔
”نہیں ماما۔ آکسفورڈ اسٹریٹ کامیں نے نہیں چرایا۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“ ضاد چلا، چلا کر اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ مگر وہ مانے تب تا وہ مسلسل ”نکل نکل“ کی تکرار کر رہی تھی۔ عفتان فوراً بیڈ سے چھلانگ مار کر اتر گیا اور سامنے کھڑا ہو کر آکسفورڈ اسٹریٹ کا کارڈ ”تاج تاج“ کر دکھا رہا تھا۔

”یہ تو میرے پاس ہے۔“
”غیبت، کمینے۔“ اس نے ضاد کا کان چھوڑا اور تکیہ اٹھا کر عفتان کو مارا، مگر وہ موقع پر ہی بیٹھ گیا۔ اس کی توجہ تھمت ہو گئی۔ لیکن سامنے رکھا ٹیل کا گل دان تکیے کی چوٹ سے نیچے جا گرا۔ آج ویسے کمال تھا۔ ارم کو غصہ نہیں آیا۔ نہایت شرارتی لاپرواہی سے توجہ نہ دیا۔ مگر چھوٹے بھائیوں سے ابھی تک کھیل کود یا پٹائی جاری تھی۔ اور منع کرنے پر یا تو رونے لگ جاتی یا پھر مہل کے آگے منہ پھاڑ کر ہنستی رہتی۔ اپنی بچکانہ حرکتوں پر اکثر ہی ارم سے ڈانٹ سنتی اور کبھی کبھار دھموکے بھی کھالتی۔ مگر ملے گلے کے علاوہ اس کی زندگی میں کچھ تھا ہی نہیں۔ مگر آج وہ خاموشی سے اسے دیکھ گئی۔ اس کی کسی حرکت پر غصہ نہیں آیا تھا۔ پھولے پھولے ہنسنے والے بالوں کی مزید ابھی ہوئی پونی ہٹائے کمینوں تک آستینیں چڑھائے اور دوپٹا تو جلنے کہاں تھا۔ مگر بھائی کو مارنے پر پورا دھیان تھا اور ایم پی تھری الگ اس کی گود میں راگ الاپ رہا تھا۔

”ریجہ! تمہارے پیپرز ہونے والے ہیں اور تم کتنی بے فکری سے کھیل رہے ہو۔“ وہ کھوٹی سی بولی۔
”میں کہاں کھیل رہی تھی؟ تو یہ بد مزہ چور اچکے کھیلنے کی ضد کر رہے تھے۔ چلو اٹھو۔ میری کتاب پر ہی بیٹھ گئے جاہل۔“
اس نے ضاد کو دھکیلتے ہوئے اس کے نیچے سے کتاب پھینچی اور نیمہ راز ہو گئی۔
”بارہ تو بج گئے ہیں۔ اب کیا پڑھو گی۔ سو

جاؤ اب۔“

ارم نے ایک اور بڑا کمال کیا۔ ”کیا پڑھو گی؟ سو جاؤ۔“ وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑے ماں کو دیکھنے لگی۔
”اے کیا دیکھ رہی ہو۔“ وہ گلہ ان ٹیل پر رکھتے ہوئے مسکراتی۔

”دیکھ رہی ہوں آپ کا غصہ کہاں گیا؟“ وہ اس کی بات پر پھر مسکراتی۔
”چلیں آپ کہتی ہیں تو لیٹ جاتی ہوں۔“ اس نے کتاب بند کر کے سر ہانے رکھی۔ ”ماما! اب صبح آٹھ بجے ہی نہ آوازیں دینا شروع ہو جائے گا۔ کل کالج سے چھٹی ہے، دیر سے اٹھوں گی۔“ اس نے رضائی ٹانگ مار کر کھولی اور لیٹ گئی۔

”اور ہاں۔“ جب ارم جانے کے لیے مڑی تو اس نے پھر پکارا۔

”ماما! اپنا لنگور ساتھ لیتی جائیں۔ اسے کبھی ڈر لگتا ہے۔ کبھی پانی مانگتا ہے۔ مجھ سے نہیں پلایا جاتا راتوں کو اٹھ اٹھ کر پانی۔“ اس کا اشارہ چھوٹے عفتان کی طرف تھا جو اس کی رضائی میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ارم اس کی بات پر ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ غالباً ”سوچ رہی تھی۔“ یہ تو کسی کو اٹھ کر پانی نہیں پلا سکتی اور باپ کے ارادے دیکھو۔“ وہ سوچ ہی رہی تھی۔ جب ریجہ کی لاتیں کھا کر بارہ سالہ عفتان اپنا سا منہ لے کر اس کے ساتھ چل پڑا۔

”لائٹ تو بند کرتی جائیں۔“ اس کی ہانک پر وہ پھر مڑی، اک نگاہ اس کی بے خبری کو دیکھ کر لائٹ بند کی اور باہر نکل گئی۔

شام کا پنجھی اپنے پروں میں دن سمیٹ چکا تھا۔ بچوں کے کمرے سے خوب اودھم مچانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جن میں نمایاں ریجہ کی تھی۔ ارم بھی اپنا کام سمیٹ کر ان کے درمیان آئیں۔ لیوی پر ایلیا کب لگا تھا اور آخری گیندوں پر آفریدی کے چھکوں کی بارش ہو رہی تھی اور پھر آفریدی نے آخری بال پر چھکا

لگایا تھا شاید۔

”ہرے۔“ اس نے دونوں ہاتھ اونچے اٹھا کر زمین سے تقریباً ڈیڑھ فٹ اونچی چھلانگ ماری تھی۔ یقیناً ”پاکستان“ چیت گیا تھا۔ جس کی خوشی ریجہ کے آنک سے پھوٹی نظر آرہی تھی۔ وہ تینوں بہن بھائی ٹی وی کے ساتھ جیکے کھڑے تھے اور ارم کرسی کے بازو پر کہنی ٹکائے ایسے بیٹھی تھی کہ بند مٹھی پر گل ٹکا تھا اور نظریں اسکرین کے بجائے ریجہ پر تھیں۔ جانے وہ سوچوں کی کس کشتی میں سوار تھی۔ مگر یقیناً اس کمرے میں بالکل نہیں تھی۔

”ای! پلیز آگے سے ہٹ جائیں، پلیز۔ پلیز ای۔“ ارم سر پر اچھی طرح دوپٹا لپیٹے ہاتھ میں سورہ یاسین پکڑے خوب بل بل کر دعا مانگ رہی تھی۔ جب الماس بیگم اس کے سر پر پہنچ گئیں۔ اس نے آیت پر انگلی رکھ کر پھر ان کی منتیں کیں۔

”ای! پلیز! اب آگے سے تو ہٹ جائیں، راجہ کی پنجری مکمل ہونے والی ہے۔“

”راجہ کھیل رہے ہیں اور رانیاں دعائیں مانگ رہی ہیں۔“ وہ اپنی ہاتھ وار آوازیں بولیں۔

”کب سے آوازیں دے رہی ہوں سنائی نہیں دیا۔“ چلو اٹھو آنا گوندھو! ابا آنے والے ہیں تمہارے۔“

”اچھا گوندھ دیتی ہوں، آپ بیٹھ تو جائیں۔“ اس نے کھسک کر الماس کے بیٹھنے کی جگہ بتائی۔

اس کا خشوع تو تب تو نا جب الماس نے آگے بڑھ کر ٹی وی کا تار کھینچ دیا۔

”سارا دن برباد کر دیتا ہے یہ بیچ۔ اللہ کرے شروع میں ہی بار جائیں کم بخت، ہمیدہ تو چین سے گزرے گا۔“

”اول ہوں امی۔“ بد دعا پر دونوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ”ان بے چاروں کے ایسے ہی پیچھے پڑتی ہیں، آٹا ہی گوندھتا ہے نا گوندھ دیتی ہوں! ابا بڑا افریقہ سے

روزہ رکھ کر آرہے ہیں، وہ بھی کہیں بیٹھے بیچ ہی دیکھ رہے ہوں گے۔“ وہ بڑبڑاتی اٹھی۔

جائے جائے ٹی وی کا تار لگا کر فل آواز برمہادی۔ ابھی اس نے آٹا گوندھنا ہی شروع کیا تھا۔ جب فارینہ کی تالیاں پینے کی آواز آگئی۔ یقیناً ”رمیز راجہ کی شاندار سنچری مکمل ہوئی تھی۔ پھر بھلا ارم کیسے بچن میں ٹک سکتی تھی۔ وہ آلے میں تھڑے ہاتھ لیے چلائی ہوئی کمرے میں آگئی۔“

”راجہ کی سنچری ہو گئی۔“ فارینہ زور سے اس کے گلے جا لگی اور گوندھا آٹا فارینہ کی پشت سے الماس نے ان کی لاپرواہی پر دو حرف بھیجے اور خود ہی بچن میں چلی گئیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کتنی تھی۔ ارم سولہ سال کی اور فارینہ پندرہ سال کی۔ کھیل کود، پھول رنگ، تتلیاں موسم اس کی عمر کے یہی تقاضے تھے اور وہ اپنی عمر کے رنگوں پر کھلکھلاتی ہوئی بالکل پوری اترتی تھی۔ لالہ لالی، کچھ شرارتی اور کچھ نا سمجھ۔ اور بے ضروری خواہشات، ان تھی منی خواہشات پر اسے اکثر ہی ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔

چند دن پہلے الماس تین فینسی سوٹ لے کر آئی تھیں۔ گھر آتے ہی پہلے اسے پیار سے دکھائے اس کی رائے لی اور پھر اٹھا کر بیٹی میں ڈال دیے۔

”ای! وہ لجاجت سے بولی۔“ وہ آپ نے رکھ کیوں دیے؟ ہمارے اسکول میں پارٹی ہونے والی ہے۔ ہم دونوں کو اس پر سلوا دیں۔“

”سل جائیں گے، پہلے جو رکھے ہیں وہ پہنو۔“ ان کی اتنی بے نیازی پر اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

”بیٹی میں رکھے رکھے کیسے سل جائیں گے باہر نکالیں۔ میں درزن کو دے آئی ہوں۔“ وہ پیار بھرے لہجے میں کہتی ان کے کندھے پر جھول رہی تھی۔

”جب شادی ہو جائے گی نا تب سلوا کر پین لیتا“ اب میرا دلغ نہ کھائے۔ جا کر برتن دھو۔“ وہ مٹر کے دانے نکالتے ہوئے اسے کام بتاتے لگیں اور وہ حیرانی سے انہیں تک رہی تھی۔

”میں نوکرائی بنی کام کروں اور چھریں بیٹی کے لیے ایویں۔“

وہ منہ ناک چڑھا کر چمت پر چلی گئی۔ بات بھی کسی حد تک جات رہی۔ بھئی ہر چیز ہی شادی کے لیے اتنا خوب صورت و نر سیٹ لائیں، سنبھال کر رکھ دیا۔ شہر رخ رنگوں کی بیڈ شیٹ لائیں، پلاسٹک کے لفافے چڑھا کر بیٹی میں پھینک دی۔ کلچ کے گلاس شادی کے لیے نرم رضائیاں شادی کے لیے زیور بنوائے شادی کے لیے اور تب تو حد ہی ہو گئی۔ ارم کی سہیلی کی سالگرہ تھی۔ اس نے جانے کی ضد کی مگر الماس تو مان کر نہ دیں۔

”جب شادی ہو جائے گی تا تو جہاں مرضی آنا جانا جیسا مرضی کھانا پینا، اوڑھنا پہننا، اب بھلا کنواری لڑکیوں کو کون راتوں میں کسی کے گھر جانے دے۔“ وہ الماس کی بات پر ششدر کھڑی تھی۔ اس کی ہر خواہش کو دبائے کے لیے ان کے اندر ایک روایتی ماں انگرائی لیتی جو ڈانٹ ڈپٹ کر اسے راضی کر لیتی تو بھی وہ رو دھو کر انہیں منالیتی۔

دوپہر سے تیز بارش ہو رہی تھی۔ دونوں بہنیں رسی لے کر چمت پر چڑھ گئیں۔ موسلا دھار تیز بارش قہقہے لگاتی تالیاں پٹپٹی رسی کو دتی دونوں بہنیں۔ الماس نے انہیں کتنی آوازیں دی۔ مگر ان کی سماعتوں میں قہقہے اور بارش کے سر تھے آخر تک اگر وہ خود ہی اوپر آگئیں۔ بھیکے بالوں سے پانی ٹپکتا، گیلے کپڑے جسم پر چپکے اور انگ انگ میں رعنائی۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہیں۔ پھر اپنی آواز میں بجلی کی کڑک پیدا کر کے بولیں۔

”کب سے آوازیں دے رہی ہوں، سنائی نہیں دیتا کیا؟“ مستی میں ہونٹ بھینچ کر ہنسی روکتے ہوئے ارم نے دونوں ہاتھ سے ”نہیں“ کا اشارہ کیا رسی کو دتے ہوئے گردن بھی نفی کی ترجمانی کر رہی تھی۔ اس کے معصوم انداز پر انہیں پیار تو ٹوٹ کے آیا۔ مگر

چہرے پر مصنوعی فگلی ہنسی اکر کے گھر کا۔

اس نے اسی انداز میں اچھلتے ہوئے ہاں میں گردن ہلائی۔

”بد تمیز نیچے چلو جلدی سے۔“ وہ قدرے مسکرائی ہوئی آگے بڑھیں اور رسی پکڑ لی۔

”امی۔“ قاری نے منہ بتایا۔

”آجائیں گے نا بارش تو رکنے دیں۔“ ارم منتیں کرتی ہوئی ان کے گلے کا ہار بن گئی۔ الماس اس کی آنکھوں کے رنگ دیکھ رہی تھیں۔ جو خوشی کے مارے بار بار بدل رہے تھے انہوں نے اس کے لیے ہاں چہرے سے ہٹائے اور ہاتھ پر برس لیا۔

”ارم! اب تم بڑی ہو گئی ہو، پچھنا چھوڑ دو اور چلو نیچے۔“ حلیہ درست کرو، کسی مہمان نے آنا ہے۔“ وہ ان کی رسی ہاتھ پر لپیٹتے ہوئے نیچے اترنے لگیں، جب قاری نے ہانک لگائی۔

”امی کس نے۔“

”بیٹاؤں کی۔ نیچے آؤ۔“ وہ تقریباً ”ساری بیڑھیاں اتر گئی تھیں۔“

انہیں اوپر گئے تقریباً ”گھنٹہ ہوا تھا۔ اس ایک گھنٹے میں نیچے کا سارا انتظار نامہ ہی بدل گیا تھا۔ ہر چیز ضرورت سے زیادہ قریب سے رکھی تھی۔ صاف ستھری اور اپنی اپنی جگہ پر۔ کچن سے آنے والی خوشبوؤں نے نتھنوں سے گزر کر منہ میں پانی بھر دیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے کچن میں ہی آگئیں۔

”امی! کیا بتایا ہے۔“

”جو بھی بتایا ہے، چھوڑ دو اور جلدی سے کپڑے بدل کر آؤ تمہارے ابا بھی آنے والے ہوں گے۔“

عالمبا ”جو بھی آ رہے تھے خالص وی آئی پی تھے۔ تب ہی الماس بہت پر جوش تھیں۔ ڈھیر چیزیں بنا ڈالیں اور بطور خاص ارم کو تیار ہونے کے لیے اچھے کپڑے اور چیزیں دی گئیں۔ جب وہ دونوں نہادھو کر صاف ستھری اندر آئیں تو ڈھیر ساری نصیحتیں بھی کرویں جن میں سرفہرست خاموش بیٹھنا، دوپٹا سر پر رکھنا، بے

دو ٹونوں کی طرح منہ بھاڑ کر نہ ہنسا اور ہاں ان کے منہ کو بھی کھتی نہ رہتا۔“ وہ آنکھیں بند کیے قوالوں کی طرح سر دھنتی رہیں اور یقیناً ”وہ سر دھنتے کا ہی اثر تھا کہ وہ بہت سمجھ دار بنی خاموش بیٹھ رہی۔ جس کی آنے والی مہمان خاتون بھی قائل ہو گئیں۔

”بہت کم گو ہے، آپ کی بیٹی۔“ امی کی گردن فخر سے تپتی تھی کہ ارم کو اپنا گونگا بن کھٹک۔

”نہیں آنٹی! امی نے منع کیا تھا زیادہ بولنے سے۔“

اس کی بات پر جہاں امی کھسپائی ہو کر زبردستی مسکرائی تھیں۔ وہیں مہمان خاتون کو اس کی خوب صورت شکل اور بر جستگی پسند آئی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ الماس نے پانچویں چھٹی بار انہیں کھانا کھانے کی یاد دہانی کروائی تھی۔ غالباً ”نی وی پر کوئی سیریل لگا ہوا تھا اور دونوں ہی وقفے کے انتظار میں تھیں۔ جیسے ہی وقفہ آیا وہ کھانا لینے کے لیے کچن کی جانب بڑھی۔ اس کے قدم صحن کے بیچ ہی رک گئے تھے۔ غالباً ”امی! ابا آپس میں کوئی بات کر رہے تھے۔“

”دیکھ لو ارم کے ابا۔ سوچ کر ہی فیصلہ کرنا، ابھی تو وہ سولہ کی ہی ہے۔“ امی کی نظر بھری آواز پر لبا خالص مضبوط لہجے میں بولے تھے۔

”وہ کون سا آج ہی شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں کرتے کرتے بھی سال ڈیڑھ سال لگ جائے گا اور دیے بھی شادی کے بعد خود ہی لڑکیاں بڑی ہو جاتی ہیں۔“

”کہہ تو تم صحیح رہے ہو مگر۔“ امی کی فکر کسی طور دور نہ ہو رہی تھی۔

”مگر۔“ مگر چھوٹے قسمت بار بار دستک نہیں دیتی الماس بیگم۔ اتنا بڑا گھر کاروبار ہے، پھر سارے بس، بھائی شادی شدہ اور لڑکا بھی بڑا شریف ہے، ہماری بچی عیش کرے گی۔“

”گھر کاروبار کی بات تو ٹھیک ہے مگر۔“ وہ کچھ لمحے

کے لیے رکھیں۔“ لڑکا بھی تو ارم سے بہت بڑا ہے۔ ستائیس، اٹھائیس تو ماں اپنے منہ سے کہہ رہی ہے۔“

”اگر لڑکا بڑا ہے تو عقل بھی تو بڑی ہوگی، ویسے بھی بڑی عمر کا مرد زیادہ بہتر رہتا ہے اور پھر جیسی وہ لالہ لالی ہے وہ سنبھال لے گا۔ بس تم فکر نہ کرو، دعا کیا کرو اللہ بہتر کرے گا۔“

ابا کے بہتر بہتر کی رٹ نے اماں کے تفکرات مٹا دیے اور واقعی وہ سال بعد بیاہ کر انیت کے گھر کی رونق بن گئی۔ دلہن بنی وہ اس قدر خوش تھی جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ لگ گئی ہو۔ ظاہر ہے اب اماں کی روک ٹوک سے جان چھوٹی، نئے فیشن کے کپڑے، جوتے، نرم گداز بستر، نئے ڈھیر سارے زیور اور پھر اب اپنی مرضی سے سونا جاکنا۔ اپنی مرضی سے آئے جائے گی، نہ کتابیں چائنی پڑیں گی۔ بس اپنا گھر اپنا کمرہ اپنی مرضی۔ وہ کیا بات ہے۔

شادی کے شروع دن تو بہت اچھے گزرے تھے۔ ہر روز ڈھیروں میک اپ، تعویذ کے، نت نئے کپڑے، پس کے روزانہ ہی کسی کے ہاں دعوت ہوتی۔ وی آئی پی پروٹوکول ملنے پر وہ اندر تک خوش ہو جاتی۔

ایک شام انیت کے کسی رشتے دار کے ہاں دعوت تھی۔ اس نے خوب میک اپ کر کے بالوں کی اوچی سی پونی بنالی۔ وہ کچھ دیر تو دیکھتا رہا پھر قدرے ناگواری سے بولا۔

”اسے ذرا کم کرو۔“ اس کا اشارہ میک اپ کی طرف تھا۔ جو اس نے مرے دل سے اسٹنچ پھیر پھیر کر ہانکا کیا۔

”اور یہ بھی کھولو۔“ اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے انگلی سے اس کی پونی ہلائی تھی۔ غالباً ”پونی ہٹا کر وہ اس کے ساتھ اور بھی چھوٹی لگ رہی تھی۔ بہر حال اس نے بات مان لی۔

وہ دونوں بائیک پر تھے ابھی رشتے دار نے گھر سے خالصے فاصلے پر ہی تھے۔ جب اس کی نظر سامنے سے آتی گول گپوں کی ریڑھی پر گئی۔ اس کے منہ میں بھر

گیا۔ "ایق! مجھے گول گپے کھانے ہیں۔" اس نے لجاجت سے کہتے ہوئے اس کی کمرہ لائی۔

"ہم کھانے پر ہی جا رہے ہیں۔"

"میں وہ بھی کھاؤں گی۔" وہ جھٹ سے بولی اور "پلیز۔ پلیز نائیک روکیں۔" شروع ہو گئی۔

"تمہارا دلغ ٹھیک ہے۔ اتنا میک اپ تھوہ کر، سڑک پر کھڑے ہو کر گول گپے کھاؤں تمہیں۔ گھر لے آؤں گا۔" اس کے لہجے کی تیزی بھی اسے سمجھ نہیں آئی۔

"میں نے یہاں کھانے ہیں پلیز۔" وہ اپنے سابقہ انداز میں اسے جھولے دے رہی تھی تو اس نے زور سے جھڑک دیا۔

"ارم۔ شرافت سے بیٹھو۔" اس نے ارم کی ٹھیک ٹھاک کلاس لے لی۔ "میرے ساتھ اگر کہیں آنا جانا ہو تو انسان بن کے، تیز کے ساتھ جایا کرو، سنبھلیں۔" کھسکی ہو کر ہنسی رہی۔ واپسی پر اس نے امی کی طرف جانے کی فرمائش کی، جو وہ سہولت سے ٹال گیا۔

"میں بھی کچھ دن پہلے تو گئی تھیں، پھر کسی دن چلیں گے۔"

"چھا چلیں سامنے والی گلی میں، میری سہیلی کا گھر ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ادھر چلتے ہیں۔" اس کی بے جا فرمائشوں پر وہ لڑج ہو گیا۔

"یار! اب تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ بھول جاؤ سہیلیوں کو اور اماں کو، میاں ہے اسے نامزد۔"

وہ اپنا سامنے لے کر رہ گئی۔ کوشش تو وہ بھربور کرتی، مگر کہیں نہ کہیں گڑبڑ ہو جاتی۔ کبھی کپڑے پر لیس کرنا بھول جاتی، کبھی جوتے، جرابیں سنبھالنا بھول جاتی۔ وہ صبح جلدی اٹھنے کا عادی تھا اور وہ دیر سے سونے کی وجہ سے اٹھ نہ پاتی۔ وہ اسے جھنجھوڑ، جھنجھوڑ کر اٹھاتا تو وہ آنکھیں ملتی گرتی پڑتی اٹھتی۔

"صبح ہو بھی گئی، ابھی تو سوئے تھے۔" وہ جھالی روکتے ہوئے جھول رہی تھی۔

"خدا کے لیے مجھے ناشتا دے دو، بھلے پھر سارا دن"

سوئی رہنا۔" اس نے توبہ سے بال رنڈ کر گیا تو لیہ اس کے منہ پر اچھالا۔ نمی کے احساس سے اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔

"اٹھو۔" اس نے ارم کی نرم کلائی پکڑ کر کھینچی۔ "اور کتنا آرام کرو گی، ناشتا لے بھی آؤ۔"

وہ منہ میں بد بدائی۔ اس کے بعد برتنوں کا ڈھیر، پھر صفائی والی کے ساتھ کھپائی، پھر بھائی کے ساتھ دوپہر کا کھانا تیار کروانا، پھر برتن، پھر چائے، پھر برتن اور اگر مشین لگلی میرا تو بینڈ ہی بج جائے گا۔ پھر رات کا کھانا اور پھر برتن اف۔ ناشتے کے نام سے ہی دن بھر کی تھکا دینے والی روٹین اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔

"کیا ہوا، جاؤ واش روم، پھر ناشتا بھی بنانا ہے۔" احمقوں کی طرح اپنی طرف گھورتی ارم کو اس نے پکڑ کر جھنجھوڑا لیا۔

"چھا۔" اس کی آواز ڈوب کر ابھری تھی۔ آلیٹ اور بریڈ کی سوندھی خوشبو سے سچی ٹرے، جس میں چائے، دووہ، بسکٹ، کباب، کی طرح کے لوازمات تھے، لا کر اینق کے سامنے رکھی۔ ٹکھری سی، صاف ستھری کم عمر بیوی سامنے بیٹھی خاصی دلکش لگ رہی تھی مگر اس کی دلکشی نوالہ منہ میں رکھتے ہی غائب ہو گئی۔

"یہ کیا۔ اتنا آئل۔"

"وہ۔" وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ "امی نے کہا تھا، آپ فریڈ سلاکس لیتے ہیں۔"

"یہ تو نہیں کہا ہو گا آئل سے کھاتے ہیں۔ تم میں خود عقل ہے یا نہیں۔" اس نے بچا نوالہ اس کے سامنے ہی نہ دیا۔

"ابھی تک ناشتا بنانا نہیں آیا، جانے آئے گا بھی یا نہیں بے وقوف!" وہ بڑبڑاتا ہوا بسکٹ کے ساتھ چائے چڑھا کر ادھر اس ناشتا کر کے چلا گیا۔ وہ کچھ لمبا اس کی باتوں کے زیر اثر رہی۔ پھر "ہونہ" کر کے خود کھانے لگ گئی۔

ایسا اس کے ساتھ اکثر ہی ہوتا تھا۔ آج تو تلپتے ہوئے تیل زیادہ ہو گیا تھا۔ کبھی آلیٹ میں ٹمک مرچ کا تناسب بگڑ جاتا تو کبھی چائے ٹھنڈی اینڈل لاتی۔ اگر قسمت سے ناشتا اچھا ہو جاتا تو کسروہ پر کے کھانے میں نکل جاتی۔ اپنی طرف سے اچھا اور بہترین کرنے کی کوشش میں ایسا ضرور ہوتا کہ اینق کا مسور انداز، تنخی میں بدلتا اور وہ ایسے ڈپٹا گھورتا ہر نکل جاتا۔ ابھی چند دن پہلے کی بات تھی۔ وہ ہنڈیا کا سارا پھیلاؤ سمیٹ کر کچن سے باہر نکل رہی تھی۔ جھالی صاحبہ نے بہت پیار سے کہا۔

"ارم! پلیز آنا گوندھ دینا، میں بازار سے ابھی لیس لے کر آئی۔" وہ چادر لپیٹ کر باہر نکل رہی تھیں۔ جب آواز دے کر اسے یاد دہانی بھی کر دائی۔

"ذرا حساب سے گوندھنا۔" رات کو بھی اسی نے گوندھا تھا۔ دس افراد کے لیے اتنا آنا گوندھا کہ بمشکل سات، آٹھ روٹیاں بنی تھیں۔ اینق تو اسے گھورتا رہ گیا تھا۔ کیونکہ اسے کھانے کے لیے بہت دیر انتظار کرنا پڑا تھا۔ اب وہ بل بل کر آنا گوندھتے ہوئے بھائی کی رات والی ہنسی یاد کر رہی تھی۔ سب کو خوش ہو کر بتا رہی تھیں۔

"اینق کی کجوس بیگم نے آنا گوندھا تھا بھی۔"

"چلو آج تو نہیں مذاق بنائیں گی میرا اور اینق کا۔"

اس نے آنا گوندھا اور کمرے میں آکر پھیلاؤ سمیٹنے لگی تھی۔ چھٹی کا دن تھا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز کوئی مووی دیکھ رہا تھا۔ اس کے کمرے میں آتے ہی اپنے قریب بیٹھنے کی فرمائش کر ڈالی۔

"میں بھی آتی ہوں ذرا الماری ٹھیک کر لوں۔" وہ کہہ کر کپڑوں کی الماری کھولنے لگی۔

"بعد میں کرتی رہنا ٹھیک۔ ابھی میں باہر چلا جاؤں گا۔ ایک تو مجھے دیکھ کر ہی تمہیں سارے کام یاد آجاتے ہیں۔" اس کے نروٹھے پن پر وہ الماری کا پٹ بند کر کے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"جی کیا کہنا ہے۔"

"کچھ نہیں کہنا۔" وہ اسی کے انداز میں چبا کر بولا۔

"جاؤ کرو اپنے کام۔" اس کے بے گانے انداز پر وہ ریموٹ بیڈ پر اچھال کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ ہلکی دستک دے کر اس کی سانس نے دروازہ کھول کر جھانکا۔

"یہ آتا کس نے گوندھا ہے۔" اینق کی نظریاں سے ہٹ کر اس کی فخریہ صورت پر گئی۔ وہ بھی اچھا گوندھنے پر تعریف ہو گی۔

"میں نے۔" اس کی سوچ کا فخر لہجے میں در آیا۔

"کیوں؟ کسی بارات نے آنا ہے، جو اتنا ڈھیر گوندھ دیا۔" آواز سے زیادہ ان کی آنکھیں شعلہ بار۔

"میں۔ وہ بے چاری ایک تخت ہی گھبرا گئی۔

"وہ۔ امی بھابھی نے کہا تھا حساب سے گوندھنا۔"

"ہاں تو حساب سے کہا ہو گا نا۔ بے حساب نہیں کہا ہو گا۔" وہ کھڑک سے دروازہ بند کر کے جیسے آئیں ویسے چلی گئیں۔

"کوئی کام عقل سے نہ کرنا، ہمیشہ سب کے سامنے شرمندہ ہی کروانا، احمق کہیں کی۔" وہ اس کی تیز چلتی سانسوں کی پروا کیے بغیر نائیک کی چابی اٹھا کر وائٹ پیتا باہر نکل گیا۔ کتنے آنسو تھے جو اس کی آنکھوں میں مرجوں کی صورت، چھٹنے لگے۔ وہ کرنے کے انداز میں بیڈ پر بیٹھی تھی۔ نظری دی اسکرین پر جا ٹھہری، جہاں اس کی پسندیدہ مووی لگی تھی۔ اس نے کلائی سے آنکھیں رگڑیں اور ناخن کاٹتے ہوئے مووی دیکھنے لگی تھی۔ یقیناً وہ چند لمحے والی بات بھول چکی تھی۔



شام کا وقت تھا۔ ملے گھرے بادلوں کے بیچ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس کی بڑی نند بچوں سمیت رہنے آئی ہوئی تھی۔ وہ اس کے بچوں کو باؤنگ کروانے کے بہانے چھت پر لے آئی۔ آج کل ویسے ہی بچے اسے بہت اچھے لگتے تھے۔

"کاش! تیز بارش آجائے۔" اس نے آسمان پر بادلوں کو ملنے دیکھ کر سوچا تھا۔

"کاش! اینق بھی آجائیں۔ پروہ نہ ہی آئیں تو اچھا"

ہے۔" دماغ نے خواہش کی فوراً ہی تردید کر دی۔
 "آتے ہی مجھے کہیں گے، اوپر کیا بے وقوفوں کی طرح۔ دیکھ رہی ہو۔ میں کیا بے وقوف لگتی ہوں؟"
 اس نے اپنے گالوں کو انگلی اور انگوٹھے میں بھیج کر سوچا۔ آسمان کو اس کی بے ضرر خواہش اچھی لگی اور چند بوندیں اترنے لگیں اور ساتھ ہی ساس کی تیز پکار بھی وہ دل مسوس کر نیچے چلی گئی۔
 "جی۔" اس نے قریب جا کر پوچھا۔
 "کچن میں دیکھو، کیا ہو رہا ہے، اکیلی اسما لگی ہوئی ہے۔" لور تم بیٹھے میں کسٹرو بٹالو۔" وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتی جانے لگی تو انہوں نے ایک بار پھر تصدیق کی۔

"آتا ہے بنانا یا وہ بھی نہیں آتا۔"
 وہ ان کے انداز کو خاطر میں لائے بغیر خوشی خوشی سر ہلانے لگی۔ "جی جی تو آتا ہے۔"
 خواہ دل کتنا ہی موسم میں اٹکا ہوا تھا۔ مگر وہ دل جان سے بولی تھی اور اس نے اتنا غلط بھی نہیں کہا تھا۔ کسٹرو، نوڈلز، چائے، سینڈویچ، پکوڑے یہ سب چیزیں وہ اچھی بناتی تھی۔ اس نے کچن میں آکر دودھ کی دیکھی جو لمبے پر چڑھائی، باول میں کسٹرو پاؤڈر گھولنا شروع کیا۔ وہ آمیزہ اس میں ڈالنے والی تھی کہ باجی اپنے بیٹے کے لیے پانی لینے کچن میں آگئیں۔ وہ اسے اسٹرابری فلیور حل کرتے دیکھ کر مسکرائیں۔
 "انینق کو کسٹرو بہت پسند ہے۔ کلر فل ڈش ہے نا۔" وہ بھی باجی کی تائید مسکرا کر کرنے لگی اور یقیناً انینق کی پسند من کر بات دل میں گد گدائی تھی۔
 "چلو موسم تو اچھا ہے، وہ بھی خوش ہو جائیں گے۔" وہ پانی گلاس میں ڈال کر سیدھی کھڑی ہوئیں۔
 "میں تو اس کے لیے اسٹرابری اور بنانا اکٹھے بناتی تھی۔" وہ بچے کی پکار پر مڑتے مڑتے "جیلی بھی بنالیا" کا مشورہ دے گئیں۔ جیلی تو وہ پہلے ہی بنا چکی تھی۔
 اب بنانا فلیور کا ڈبا ڈھونڈنا تھا۔ اس نے کینبٹس چھاننے شروع کیے۔ ڈبا نکالا اور پہلے سے حل شدہ آمیزے میں پانچ چھ چمچے بھر کے ملائے اور پکتے دودھ

میں ڈال کر چمچ ہلانے لگی۔ وہ تو ابیل آنے سے پہلے ہی تیار ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے ڈوٹے میں انڈیل کر سیٹ کیا۔ رنگ اسے قدرے عجیب لگا مگر میاں کی پسند تھی۔ وہ کھل گئی۔ قدرے ٹھنڈا ہونے پر اور کج جیلی کے ٹکڑے کاٹ کر بہت پیار سے اس پر سجائے اور فریق میں رکھ دیا۔
 باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ برآمدے کے پردے پھڑپھڑاتے ہوئے چند بوندیں بھی کھانے پر چھڑک دیتے۔ وہ کھانے کے دوران بار بار صحن میں بننے والے دیکھ رہی تھی اور فارینہ کو یاد کر رہی تھی۔ کھانا کھا چکے تھے۔ ساس نے اسے کسٹرو یاد دلایا۔ وہ "جی اچھا" کہہ کر بالائیکال لائی اور درمیان میں رکھ دیا۔ پیالہ دیکھتے ہی جیسٹھ نے ناک چڑھائی۔
 "یہ کیا ہے؟"
 "بھائی جان، کسٹرو ہے۔" وہ مسکرائی تھی۔
 "اس کے رنگ کو کیا ہوا؟" باجی نے حیرت سے پوچھا۔
 "وہ بنانا بھی کس کیا تھا نا، آپ نے ہی کہا تھا کہ اکٹھے ہی۔"
 اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی باجی ہنس پڑیں۔ "لیکن میں نے اکٹھے کس کرنے کا تو نہیں کہا تھا۔ خیر چھوڑو یہ نئی ڈش بن گئی۔"
 "فریقہ کی" باجی کے بات بدل کر کسٹرو انینق کی طرف بڑھانے پر وہ "فریقہ کی" چبا کر کہہ گیا۔
 "یہ کیا؟" جب جے حلوے کی طرح دھپ سے ایک ٹکڑا پلیٹ میں آگرا تو اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ اس نے کلر فل کرنے کے لیے اسٹریچر ایک کے چند ٹکڑے بھی درمیان میں لگائے تھے جنہوں نے پہلے سے ہی سخت کسٹرو کی بچی نمی بھی جذب کر لی تھی اور کسٹرو کو ڈھیلے کی شکل دے دی۔
 "یہ کسٹرو ہے یا کسٹرو کا حلوہ۔" وہ براؤنش سے ٹکڑے جس پر ٹیل جیسی جیلی رکھی تھی دیکھ کر اندر تک کھس گیا۔ اس نے پلیٹ ہاتھ سے برے سر کائی۔
 "اگر ایسے ہی نقصان کرتی رہیں تو سال کے اندر

میں سڑک پر آجاؤں گا۔ گھر میں اتنے افراد موجود ہیں، جب خود عقل نہیں ہے تو دوسروں سے لے لیا کرو۔" نہیں شان تھکتی تمہاری۔" وہ غصے میں گھورنے کے ساتھ ساتھ ڈانٹ رہا تھا۔
 "کوئی کام ڈھنگ سے نہ کرنے کی لگتا ہے، قسم کھا کر آئی ہو۔" وہ سب کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اسے صلواتیں سن کر کمرے میں جا چکا تھا۔ غالباً اسے اپنی گھبرائیں اور بھابھی کے سامنے۔ سبکی محسوس ہوئی تھی۔ دل میں تو وہ اکثر ہی اس کے کام اور بہن بھابھی کے کاموں کو موازنہ کرتا رہتا تھا۔ زبان سے اب شروع کیا تھا۔ یادوں کی تیز گرج چمک ارم کو اپنے اندر محسوس ہوئی تھی۔ اتنے لوگوں میں وہ بمشکل اپنے آنسو روک پاتی تھی۔



زندگی کا چلن یوں ہی قائم تھا۔ وہ کاموں میں مہارت حاصل کر کے اس کا دل جیتنا چاہتی تھی۔ مگر کاموں کا پھیلاؤ تھا جو دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ پہلے ہی سال اس کی گود میں رنجہ آگئی۔ اس کی پیدائش کے تکلیف دہ مراحل پھر چھوٹی سی بچی کے نہ ختم ہونے والے کام، گھر گرجہستی کی مصروفیت اور پھر میاں کی فرمائشیں اور تقاضے وہ بالکل الجھ کر رہ جاتی۔ اسے شکایت کا موقع نہ دینے اور دل جیتنے کی دوزخ دھوپ میں کبھی ارم کی کلائی جل جاتی۔ کبھی انگلیاں کٹ جاتیں۔ کبھی کسی چیز سے ٹکرا کر جوت کھالتی اور کبھی تو اس کی "جلدی جلدی" کی پکار میک اپ کرتے ہوئے مسکارہ پلکوں کے بجائے آبرو میں سجارتا۔ ان حرکتوں پر ہونے والی عزت افزائی نے مسکراتے چہرے کا بھولہن احساس کمتری اور گھبراہٹ میں بدل دیا تھا۔ ہاں البتہ ایک بات تھی کہ وہ ڈانٹ ڈپٹ کے بعد کام سیتے سے کرنے لگی تھی۔ گھر کے سارے کام بھابھی اور ساس کے مشورے سے خاموشی سے کرتی رہتی، کام کچھ ٹھیک ہوتے، کچھ غلط ہوتے، کبھی ساس اچھی خاصی سنا دیتیں، تو کبھی جیٹھانی اپنے تجزیے کرتیں تو

لحے دل میں اتر جاتے۔ ایسے میں اگر رنجہ "بھال بھال" کر کے روتی تو اس کا جی چاہتا اس کے گلے میں گیند پھنسا دے یا منہ پر اسکاچ ٹیپ لگا دے۔ آج کل اس آفت کی پڑیا نے نیا نمیا چلنا سیکھا تھا۔ مچھلی کی طرح پانی پر لپکتی اور سارے کپڑے بھگو لیتی۔
 اس نے کچھ دیر پہلے ہی اس کا منہ ہاتھ دھوا کر صاف ستھرے کپڑے پہنا کر بیڈ سے اٹارا اور اپنے قریب ہی کارپٹ پر کھڑا کیا تھا اور خود کمرے کی سیٹنگ میں لگ گئی۔ بی وی چل رہا تھا۔ بیڈ شیٹ جھاڑتے ہوئے اس کی نظریں بار بار اسکرین پر جا رہی تھیں۔ شارجہ کپ لگا ہوا تھا۔ پاکستان اور بھارت کا میچ تھا۔ بھارت کی باری کے بعد کھانے کا وقفہ آگیا تھا۔ اس نے صبح ہی صبح اپنے سارے کام بھگتائے۔ ساس نے واشنگ مشین لگوائی، اس نے بھابھی کے ساتھ مل کر جلدی، جلدی کپڑوں کا بکھیرا سیمینٹ۔ دوپہر کا کھانا وقت سے پہلے تیار کیا۔ برتن دھوئے اور پھر رنجہ کو سلائے کے خیال سے پاس کھڑا ہی کیا، تاکہ اس کا بستر سیٹ کر دے۔ مگر وہ آبی حلقو جانے کب چلتی ہوئی ساس کے ہاتھ روم میں کھس گئی۔ ارم بیڈ شیٹ جھٹکنے والے انداز میں پکڑے بی وی دیکھ رہی تھی۔ سعید انور اور عامر سہیل اوہننگ کے لیے ملے گھماتے میدان میں آ رہے تھے۔ اس کا جوہر ساس کی کرخت آواز نے توڑا۔

"ہر وقت کمرے میں تھسی آرام فرماتی رہنا، اتنی لمبی رات ہوتی ہے۔ اس میں دل نہیں بھرتا۔"
 "آرام ہے؟" اس کا دماغ کھوم گیا۔ ساس اور بھابھی کہتی ہیں، رات میں آرام کیا کرو، انینق کہتے ہیں سارا دن ہوتا ہے تمہارے پاس آرام کرنے کے کیسے رات میں میرے لیے وقت نہیں نکال سکتیں۔ اوپر سے دن رات رنجہ۔ جانے آرام کہاں تھا؟ اسی آرام کو ڈھونڈنے میکے جاتی تھی کہ وہاں جا کر کئی دن رہوں گی، مسلسل سوؤں گی، مگر وہاں جاتے ہی ایک دو دن ای بازار پسند کی شاپنگ کروانے لے جاتیں اور باقی دو تین دن کوٹنگ میں طاق کرنے

سرالیوں سے نپٹنے، شوہر کی کمزوری کو پکڑنے کے حربے سکھاتیں۔ البتہ وہاں جا کر رجبہ سے جان بچھوٹ جاتی تھی۔ فارینہ اس کے کام بھاگ بھاگ کر بڑے شوق سے کرتی تھی۔ اسے میکے آئے چار پانچ دن گزرتے تو میاں صاحب ٹپک پڑتے۔ دل نہ لگنے کا رجبہ بہانہ اچھا بھی اور آرام دہ راہ جاتا۔ اس وقت ساس اسی آرام کے طعنے دیتیں گیلی رجبہ کو اٹھائے کمرے میں لے آئیں۔

”ذرا دھیان نہیں رکھا جاتا ایک بچی کا اگر بالٹی میں الٹ جاتی تو کیا ہوتا۔“ عامر سہیل نے ایسا زور کا شارٹ لگایا۔ گیند اچھلتی کودتی بانڈری تک گئی۔ پورا شارچہ اسٹیڈیم میں ٹاپنے لگا۔ اس نے ذرا کی ذرا نگاہ اسکرین پر ڈالی اور پھر گیلی رجبہ پر اس کا جی چاہا اس سمندر کی خلقت کو سمندر میں ہی ڈبو آئے، تاکہ خوب تیر کر اپنا جی خوش کر لے۔

”جانے کون مائیں ہیں جنہیں اپنے بچے اچھے لگتے ہوں گے۔ میرا تو جی چاہ رہا ہے۔ اسے صندوق میں بند کر دوں۔“ وہ دل میں کڑھتے ہوئے اس کے کپڑے خوب کھینچ کھینچ کر اتار رہی تھی اور بچی کان بیل گروں کھینچنے سے خوب چیخ رہی تھی۔ اس کے چلانے پر ساس نے پھر آواز دی۔

”کیوں رو رہی ہے یہ، اسے کچھ کھلا پلا کر سلاؤ۔“

غینہ آ رہی ہوگی بچی کو۔ اس نے اسے گود میں بھر کر زور سے دوچا اور بڑبڑاتے ہوئے فیڈ کروانے لگی۔ زیادہ غصہ اسے یکسوئی سے میچ نہ دیکھنے پر آ رہا تھا اور نکل رجبہ کی کمر پر رہا تھا۔ ایسا تب ہوتا تھا جب اینق سامنے نہ ہوتا۔ اب بھی اس نے اتنی زور زور سے اسے تھپکایا کہ بچی نہ چاہتے ہوئے بھی سو گئی۔ ارم نے کچھ سکون کا سانس لیا تھا۔

ہدف پورا کرنے کے لیے پاکستانی ٹیم فل فام میں تھی۔ جہاں رنر تیزی سے بن رہے تھے وہاں وکٹیں بھی دھڑا دھڑا کر رہی تھیں۔ صرف چند اور زکا۔ کم باقی تھا اور میچ ڈرامیک لائن پر کھڑا تھا۔ اینق کو گھر آئے

خاصی دیر ہو گئی تھی۔ وہ آج میچ دیکھنے کے لیے جلدی کھرا گیا تھا۔ سارے گھر والے ساس کے کمرے میں بیٹھے محویت سے میچ دیکھ رہے تھے۔ وہ رجبہ کو گود میں لیے دل ہی دل میں سب سے بڑھ رہی تھی۔ وہ گھنٹہ سو کر باپ کی آواز آتے ہی اٹھ گئی تھی اور اب کبھی ماں کی ناک میں انگلی دیتی، کبھی آنکھوں میں۔ وہ بار بار اس کی انگلی دلوچ کر اسے گھورتی، مگر وہ مسکرانے لگ جاتی۔ بھابھی کو میچ سے دلچسپی نہیں تھی اور ان کے بچوں کا ہوم ورک بھی رہتا تھا۔ وہ بچوں کو لے کر اٹھیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ساس نماز پڑھنے کے لیے اٹھیں تو اسے بھی حکم صادر کر گئیں۔ ”ارم! یہ سارے دن کا تھکا ہوا آیا ہے، کھانا دے دو اسے۔“ ماں کا حکم اس کے اندر تک گزرا وہاٹ گھول گیا تھا۔ اس نے حمایتی نگاہوں سے اینق کو دیکھا۔ یقیناً وہ اس کی محویت دیکھتے ہوئے ضرور میچ دیکھنے کی حمایت کرے گا اور ویسے بھی کچھ دیر پہلے ہی اسے چائے پلائی تھی۔ مگر وہ تو لگتا تھا جنت کی گھٹی ہے۔

”ہال۔ ہال۔“ اس نے اقرار کرتے ہوئے گردن ہلائی اور اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے ہی ہاتھ رجبہ کو پکڑنے کے لیے بڑھا دیے۔ ارم نے رجبہ کو اس کی گود میں پٹخا۔ جس پر وہ گھور کر رہ گیا اور پھر اس کے مڑنے پر ہانک لگائی۔

”اس کا فیڈر بھی دے جانا۔“

اس کا جی چاہا وہ وہ دیکھی سمیت اس کے منہ پر مارے یا زور زور سے روئے۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں میں دھند لایانی آ گیا تھا۔ مگر اینق نے اس کی خاطر آواز ضرور اونچی کر دی تھی، تاکہ وہ بچن میں ہی کسٹری سنتی رہے۔

روٹی بٹیتے ہوئے اس کا سارا دھیان معین خان کی بیٹنگ پر تھا۔ کیونکہ سارا اگیم اسی کے شارٹس پر منحصر تھا۔ اس کے اندر بھی روایتی حریف کے خون نے جوش مارا تھا۔ اس نے بھر پور شارٹ لگائی تھی۔ روٹی تو بے پروا لٹے ہوئے اسے لگا جیسے وہ اس کی گیند دھکیل کر بانڈری پار کروا رہی ہو۔ بانڈری تو جانے پار ہوئی تھی یا

نہیں، مگر اس کی ساری کلائی تو بے رر رکھی گئی تھی۔ اس کی دلخراش چیخ پر اینق دوڑتا ہوا آیا تھا۔

”یہ کیا ہوا؟ کیا سوتے ہوئے بنا رہی تھیں۔“ وہ اس کی کلائی پکڑے پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ”یہ جو بھیجا ہے نا اس میں، کبھی اسے بھی استعمال کر لیا کرو۔“ اس کے دو سرے ہاتھ کی انگلیاں اس کی کن پٹی پر دباؤ دے رہی تھیں۔ ایک شدید تکلیف کو پر سے میاں سے بے عزتی اس کی آنکھیں بھاری اور جڑے جھنے لگے۔

”دو سال ہو گئے شادی کو مگر مجال ہے، کوئی کام ڈھنگ سے کیا ہوا، جانے کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہو، جب شادی کے قابل نہیں تھیں تو پتا نہیں تھا ماں باپ کو، میرے سر پر ضرور لا داتا تھا۔“ اک ندی تھی جو آنکھ کنارے تیزی سے اٹھنے لگی۔

”انتہا کام نہیں ہوتا جتنا سر پہ۔“ اس کی نگاہ کلائی سے ہٹ کر اس کے سرخ گالوں پر پھسلنے پانی پر گئی۔ آنکھیں تو بھاری ہونے کی وجہ سے کھل نہیں رہی تھیں۔ غصہ تو اسے بہت آ رہا تھا، مگر اس کے آنسو دیکھ کر وہ زور سے ہنس پڑا۔

”اب بچوں کی طرح رو کیوں رہی ہو، میں نے تھوڑی جلائی ہے، خود ہی آنکھیں بند کر کے پکا رہی تھیں احمق۔“ اس نے کیبنٹ میں رکھی برن آنٹنمنٹ نکالی اور اس کی کلائی پر مل دی۔ جلد اچھی خاصی جل گئی تھی۔

”درد کچھ کم ہوا۔“ اس کے ہنستے ہوئے پوچھنے پر ارم نے گردن ”ہاں“ میں ہلا دی۔

”یہ اتنی بڑی کھوڑی ہلا دیتی ہو جو بالکل خالی ہے، ذرا سی زبان نہیں ہلا سکتیں۔“ اس کے آنسو اور تیز ہو گئے۔

”جاؤ، جا کر کمرے میں بیٹھو، امی دے دیں گی مجھے کھانا اور ہاں۔ جیت گیا ہے پاکستان۔“ اس کی بھاری پلکیں اٹھیں اور تکلیف کی جگہ حیرت اور مسرت پھیل گئی تھی۔ درد کچھ کم ہوا تھا یا تو میاں کے ہاتھ سے مرزم لگتا تھا اس لیے یا پاکستان کے جیتنے کی خوشی تھی۔

فی الحال وہ ہر بات بھولی گئی تھی۔ مگر وقت کے ساتھ وہ جملہ اس کے دماغ میں گروش کرنے لگا۔ ”جب شادی کے قابل نہیں تھیں۔ تو ماں باپ کو پتا نہیں تھا، میرے سر پر ضرور لا داتا تھا۔“

”تو کیا میں اس کے سر پہ لا دی گئی ہوں، وہ مجھ سے تنگ آ گیا ہے، وہ مکمل مرد ہے مکمل مکمل بیوی چاہیے تھی، جو اس کا خیال رکھے، تاکہ کم عمر لڑکی جس کا اسے خیال رکھنا پڑے، میں اپنی حماقتوں اپنی خواہشوں کی وجہ سے اپنے ماں باپ کی بے عزتی کرواؤں گی۔“

اسے اپنی حماقتوں پر رونا آنے لگا۔ شروع شروع میں جب کام جھنجٹ لگنے لگتے تو تھک جاتی اور اپنی ماں کے پاس جا کر اکثر روتی، شکوے، شکایتیں کرتی تو الماس بیگم اسے سمجھاتے، پچھارتے، خود رونے لگ جاتیں۔ فارینہ نے بھی سمجھایا۔

”پلیز تم امی! بابا کو کچھ مت بتا کرو۔ تمہارے جانے کے بعد وہ دونوں بہت پریشان رہتے ہیں، ان کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔“

وہ ماں باپ کی طبیعت خرابی سے ڈر گئی تھی اور واقعی اس نے کچھ نہ بتانے کی قسم کھالی۔ کم از کم وہ اپنے وجود سے انہیں تکلیف نہیں پہنچائے گی، اپنے آنسو اپنے اندر ہی رکھے گی اور جب جب اینق کے منہ سے ماں باپ کے لاوے کی بات سنی تو عہد کیا تھا کہ اب وہ مکمل دھیان سے کام کرے گی۔ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ اپنے ماں باپ کو باتیں نہیں سنوائے گی۔ وہ اپنی ہر مرضی، خواہش، موسم، میچ، ڈرامے سب اس کے تابع کرنی چلی گئی۔ ڈیل ڈول تو شادی کے بعد قدرے بھاری ہو گیا تھا۔ اب شکل سے معصومیت کی جگہ سکھڑپا بھلکنے لگا۔ البتہ وہ خود ان سب میں کہیں نہیں تھی۔ شاید اس کی اپنی ذات تو کہیں کھو گئی تھی۔ وقت، عمر کے ساتھ اس میں اچھی خاصی میچوہلی آ گئی تھی۔ مٹلا اور عفان ڈھائی ڈھائی برس کے فرق سے آگے پیچھے اس کی گود میں آگئے تھے۔ مگر اب اسے کام کا پھیلاؤ، پھیلاؤ نہیں لگتا تھا۔

وہ ایک گھریلو عورت کی طرح کام میں لگی رہتی۔ پھر بھی وہ کبھی کبھی اسے بے وقوف، اسحق کا طعنہ ضرور دے دیتا، جس پر وہ صرف ایک تھکی نگاہ اس پر ڈالتی، پھر مسکرا کر گردن جھٹکتی اور اپنے کام میں لگ جاتی۔

وقت اپنی نیل منڈیر پر چڑھا تا رہا۔ دنیا کی روایت کی طرح رشتے گھر تقسیم ہو گئے تھے سب اپنے اپنے گھروں میں رہنے لگے۔ اس کی معصوم سی رنجہ سترہ سال کی ہو گئی۔ وہ نہ صرف شکل و صورت میں بلکہ لالہ بی بی اور شرارتوں میں ماں کی مکمل کاپی تھی۔ شاید لاپرواہی عمر کا تقاضا تھا۔ باجی کا بیٹا سول انجینئرنگ کے بعد جاب کے سلسلے میں کینیڈا گیا تھا اور تقریباً چھ برس بعد واپس پاکستان آ رہا تھا۔ باجی کی خواہش تھی کہ اسے شادی کے بندھن میں باندھ کر ہی بھیجا جائے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے انیق اور ارم سے رنجہ کا رشتہ مانگا تھا۔ انیق کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا مگر ارم نے ہمت کر کے سوچنے کا وقت مانگ لیا تھا۔

”تمہارا داموغ تو ٹھیک ہے، باجی کا اکلوتا بیٹا ہے اتنا بڑا گھریلو، بڑھا لکھا اور کیا چاہیے تمہیں۔ ہماری رنجہ عیش کرے گی۔“ وہ کمرے میں آتے ہی اس کی عقل پر ماتم کرنے لگا تھا۔

”اگر گھر بڑا ہے تو عمر میں بھی تو بہت بڑا ہے۔“ وہ دودھ کا گلاس اس کے قریب رکھتے ہوئے خود بھی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”ہماری رنجہ ابھی بہت چھوٹی ہے، شادی کے تقاضے نہیں سمجھ سکتی۔ آپ باجی کو انکار کریں۔“

”دو چار سال بعد بھی تو بیاہنا ہے، تو ابھی کیا حرج ہے، کفران نعمت مت کرو۔ قسمت بار بار دروازے سے نہیں کھٹکتی، مگر تم میں نہ عقل ہے اور نہ ساری زندگی آتی ہے۔“ انیق نے دودھ کا گلاس پکڑتے ہوئے جس انداز میں کہا۔ اس پر وہ طیش میں آ گئی۔ غم و غصے سے اس کی آواز بھی بھر آ گئی۔

”اسی لیے کہہ رہی ہوں۔“ اس نے وانت جھاکر

بولتے ہوئے تیزی سے کبل کھولا اور لیٹنے کی تیاری کرنے لگی۔

”اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ میری بیٹی کم عمری کی وجہ سے ساری زندگی کم عقلی کے کمرے میں نہ کھڑی رہے۔ جیسے میں کھڑی ہوں آج تک۔“ وہ اپنے آنسو جڑوں میں دبا کر فوراً ہی کبل تان کر سوئی بن گئی۔ وہ بھی چند لمحے اس کی پشت کو گھورتا رہا۔ پھر لیٹا تو نیند نے آلیا۔ کمرے میں صرف اس کے خزانے تھے یا پھر نیند کا خمار، مگر وہ ساری رات جاگتی رہی۔ اس کی وہ بیٹی جس کی شرارتوں پر وہ خوب پٹائی کرتی تھی۔ اب اس کے سینے پر سوار تھی وہ کسی صورت اسے جلتے، مٹتے اپنے آنسو پیتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

ایشیا کپ مچ کی تقریب کب کی ختم ہو گئی تھی۔ رنجہ ایک ہاتھ میں موبائل پر مسیج ٹائپ کرتی۔ دوسرے ہاتھ میں ایم بی تھری لیے کمرے سے نکل گئی۔ مگر ارم کرسی پر مہنتی نکائے ایک ٹک اسے لاپرواہی سے لاؤنج میں عفتان سے چاکلیٹ چھین کر کھاتے اور پھر ضلوع کے چپکے سے چسکی کاٹ کر انجان بنی کتب کے صفحے پلٹتے دیکھ رہی تھی۔ وہ صفحے پلٹتے ہوئے ایم بی تھری کی لاپرواہی پر سردھن رہی تھی۔

”باجی رانی ہوں آنکھوں کا پانی ہوں۔“

”میں ان آنکھوں کی روشنی، ان کی چمک اتنی جلدی بجھنے نہیں دوں گی۔“

اس نے تہہ کیا اور کمراسیٹنے لگی۔ وہ آفس سے آیا۔ ہاتھ منہ دھو کر کپڑے بدلے۔ بچوں کے ساتھ کھانا کھا کر لاؤنج میں بیٹھے اپ ڈیٹ دیکھ رہا تھا۔ وہ چائے بنا کر لے آئی۔

”آپ نے باجی سے بات کی۔“

”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ اس نے چائے کی چسکی بھر کر کپ پرچ میں رکھ دیا۔

”آپ کو اس کی معصومیت پر بالکل ترس نہیں آتا۔“

”میں باپ ہوں اس کا عقل ہے مجھ میں۔ اس کے حق میں بہتر فیصلہ ہی کروں گا۔“ وہ چند لمحے تواسے بے فکری سے چھینل بدلتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر یاسیت سے بولی تھی۔

”آپ چاہتے ہیں کہ وہ عون کے برابر ہونے کے لیے ساری زندگی بچوں کے بل کھڑی رہے۔“ لمبی سانس بھرتے ہوئے چند لمحے بعد بولی۔ ”اپنی اور اس کی عمروں کا فاصلہ نائے کائے“ وہ خود تو بالکل بٹ جائے گی، ختم ہو جائے گی، لیکن یہ فاصلہ مستقل رہے گا۔ انیق! مرد کو پہلے دن ہی پرفیکٹ بیوی چاہیے ہوتی ہے اس نے لمبی آہ بھری۔

”کم از کم آج کے مرد میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ بیوی کی لاپرواہی، کم عمری پر پردہ ڈال دے، درگزر کر دے۔“ وہ چائے کا کپ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں نے آپ سے کبھی شکوہ نہیں کیا، کسی فرمائش کے لیے ضد نہیں کی، آپ سے ڈر کر دل میں ہی اپنی خواہشیں دہاتی رہی، مگر میں اپنی بیٹی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی۔ میں اس کی شادی کم از کم چار پانچ سال تک نہیں سوچوں گی۔“ اس کے جملوں سے انیق کی پیشانی لکیوں سے بھر گئی اور بھونپیں اچکا کر اسے غصے سے گھورا۔

”آپ بھلے جو مرضی کریں، اب میں کسی سے نہیں ڈروں گی اس کے لیے بولوں گی، احتجاج کروں گی، میں اس کے اڑان سیکھنے سے پہلے پر نہیں کاٹوں گی۔ میں باجی سے خود بات کر لوں گی۔“

وہ آخری جملہ مضبوط لمحے میں کہہ کر مڑی۔ رنجہ، عفتان کا موبائل چھین کر بھاگتی ہوئی لاؤنج میں آ رہی تھی، کسی چیز میں الجھ کر دھڑام سے گر گئی اور موبائل بھی دور گر گیا۔

”ہائے! بیبا میں مر گئی، اوئی ماما۔ ہائے۔“ وہ اپنا پاؤں پکڑے چلا رہی تھی۔ اس کے آنسو ایسے گر رہے تھے جیسے چوٹ کے خطر ہی تھے انیق صوفے سے اٹھ کر اس کے قریب ہی بچوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کا پاؤں دیکھنے لگا۔

”باجی۔“ وہ کہنی سے آنسو رگڑ کر سامنے وانت نکالتے عفتان کی طرف اشارہ کرنے لگی۔

”باجی۔ اس بد تمیز نے بد عادی ہے، کمینہ بھوکا اپنے موبائل کے لیے مرا جا رہا تھا، ہائے! بہت درد ہو رہا ہے، بیبا! ماریں اسے دیکھیں، دیکھیں کیسے ہنس رہا ہے۔“

اس نے ایک نظر عفتان کو دیکھا اور پھر رنجہ کی برستی آنکھوں کو۔ وہ جانتا تھا کہ اسے اتنی تکلیف نہیں ہو رہی، جتنا وہ شور مچا رہی ہے۔ وہ اپنی تکلیف پر بچپن سے۔ ایسے ہی بلباتی تھی، جب تک سامنے والے کو ڈانٹ نہ پڑ جائے۔ شاید اس میں ابھی تک بچپنا تھا۔ اس نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ ایک گونج تھی جو ہتھوڑے کی طرح لگی تھی۔

”جب شادی کے قابل نہیں تھیں۔ ماں باپ کو پتا نہیں تھا۔ میرے سر پر ضرور لا دنا تھا۔“

اس کی ابھی پھولی ہوئی پونی پر بوسہ دیتے ہوئے اس کی اپنی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ ارم کی تکلیف پر وہ یا تو اسے ڈانٹتا تھا یا پھر زور سے ہنس پڑتا تھا، مگر بیٹی کی تکلیف کے احساس سے ہی آنکھیں بھر گئیں۔ ہاں اللہ ارم نے آگے بڑھ کر اسے پیار نہیں کیا تھا۔ بلکہ اطمینان بھری سانس لی۔ موبائل اٹھایا اور مسکرا کر عفتان کو دے دیا۔



سمیرا احمد گلزار

امردہ کی پیدائش کے وقت اتفاق طور پر رونما ہونے والے چند ناگوار اور نقصان دہ واقعات کے سبب وہ اپنے خاندان میں "منخوس" مشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے بابا اماں دادی اور بیوی بہن بھائی دانیہ، حماد اور علی اسے اکثر جہنم جلی، منخوس، کالی نظر اور کالی زبان کہتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی مستقبل بھی ان ہی افواہوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی نحوست کے صبح شام قصے سن کر امردہ خود ترسی کا شکار ہو کر رہتی رہتی ہے۔

پورے گھر میں صرف دادا ہی اس کی دل جوئی کرتے ہیں اور گھر والوں کی باتوں کو لغو قرار دیتے ہوئے امردہ کو بھی ان پر کان دھرنے سے منع کرتے ہیں۔ امردہ کی اپنے دادا سے خوب ہمتی ہے۔ وہ سارا دن ان کے ساتھ پنجاب لا بیرری میں گزارتی ہے۔ جہاں وہ لا بیرری تھے دادا اسے سمجھاتے ہیں کہ تم پڑھائی پڑھائی دو اور اسکالرشپ لے کر باہر ملک چلی جاؤ۔ امردہ اپنے باقی بہن بھائیوں کی طرح پڑھائی میں کمزور ہے مگر دادا کی بات پر وہ ٹاپ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے مگر پھر بھی بہت اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتی۔ اسی دوران اس کی شادی کا سلسلہ چلتا ہے مگر پندرہ روز قبل دو لہما کی جوان بہن کے بیوہ ہو جانے پر اس کی شادی رہ جاتی ہے اور اس کی نحوست پر بھید لگ جاتا ہے۔ امردہ دل برداشتہ ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد امردہ کی زندگی مزید تنہا ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف پیرولن ملک کانج دیونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکالرشپ فارم بھرتی ہے مگر ہر جگہ سے انکار ہوتا رہتا ہے۔ بالا خرما چھٹر پونیورسٹی سے اسے اسکالرشپ مل جاتا ہے جو اس یونیورسٹی کی طلبہ سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے دیتی ہے جس کی رو سے امردہ کو تیس فیصد ادا کرنا ہوتا ہے باقی ستر فیصد کی ادائیگی ان کی طرف سے ہوگی۔ اس کے علاوہ وہ دن کی میزبانی کے

مکمل ناول



بعد امرجہ کو اپنی رہائش اور اخراجات کا خود بندوبست کرنا ہو گا۔ یہ سب باتیں اسے برطانیہ پہنچنے کے بعد دلائم بتاتا ہے۔ وادو جی امرجہ کے لیے پیسے اکٹھے کر کے اسے برطانیہ بھجوا دیتے ہیں۔ باقی اسے خود اپنے بل بوتے پر کرنا ہو گا۔ عذرا، شرلی بیٹی لو اور لیلی کول سے اس کی ابتدائی ملاقات ہوتی ہے۔

امرجہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک کافی شاپ میں جاب کرنے لگتی ہے اور لیڈی مہر کے گھر اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ لیڈی مہر بے اولاد خاتون ہیں۔ انہوں نے اپنے ششل کا کافی ہاسٹل نما گھر میں مختلف بچوں کو اولاد کی طرح رکھا ہے۔ ان ہی میں ایک عالیان مارگریٹ ہوتا ہے۔ وہیں سادھنا ویرا اور این اون سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جاب کے دوران وہ ڈیرک کے ساتھ مل کر ڈاکو منترز فلم بنانے لگتی ہے۔

اسی دوران امرجہ کے پایاجن کی اعظم مارکیٹ میں قالین کی دکان ہوتی ہے، آگ لگ جاتی ہے جس سے ان کا بیس پچیس لاکھ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ انہیں انیک ہو جاتا ہے۔ امرجہ انہیں سلی دیتی ہے اور ڈاکو منترز فلم سے ملنے والے پیسے ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ لیڈی مہر بھی اسے ایک چیک دیتی ہیں۔ امرجہ وہ رقم بھی پاکستان بھجوا دیتی ہے۔ امرجہ کے والد بہت خوش ہوتے ہیں۔ امرجہ اپنی کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے جب عالیان مارگریٹ کسی اسپائیڈر مین کی طرح اس کی کھڑکی میں جھانکتا ہے۔ امرجہ کی چیخ نکل جاتی ہے۔

عالیان بتاتا ہے یہ اس کا گھر ہے وہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا، تھوڑی دیر بعد گھر میں آوازیں گونجنے لگیں تو سادھنا نے بتایا کہ لیڈی مہر کا بیٹا آیا ہے۔ وہ لیڈی مہر کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ لیڈی مہر کے بید پر بیٹھا انہیں ایک کھلا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لیڈی مہر نے ایک بار بتایا تھا کہ ان کا بیٹا بھی اس کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور بہت قابل ہے۔

امرجہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا نام عالیان تھا اور اس کی ماں کا نام مارگریٹ۔ اسے عجیب سا لگا نا جاننا؟ دوسرے دن لیڈی مہر کی سالگرہ تھی، بچوں نے بڑے اہتمام سے منائی۔ انہوں نے امرجہ کو عالیان کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اسے ایک ادارے سے لیا تھا اور بڑی تن دی تھی اس کی تربیت کی ہے۔ امرجہ کو افسوس ہوا کہ اس کی اماں نے کبھی بیٹوں کی تربیت پر توجہ نہیں دی تھی۔ ویرا کا ساتھ امرجہ کو احساس دلایا تھا کہ عورت بھی بہادر ہو سکتی ہے۔ عالیان کی توجہ نے امرجہ کو ایک عجیب احساس سے دوچار کر دیا وہ لا شعوری طور پر عالیان سے متاثر ہو رہی تھی۔

تیسری قسط

اور مشرقی لڑکیوں کے لیے یہ موت جلد نازل ہوتی ہے۔ وہ برف سے اٹی زمین پر چل رہی ہے لیکن ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ وہ زمین میں دھنس رہی ہے۔ دل احساسات کا اکھاڑا ہے اور دماغ اس اکھاڑے کا شیر۔ یہ شیر دھاڑتا ہے تو دل جل کر۔ بجھ کر۔ ٹھنڈا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ مشرق کے اکھاڑوں میں یہ شیر مگر نگر پایا جاتا ہے۔ مشرق سنیا سی بھی ہے اور سامری بھی۔ مشرق میں پریت بھی ہیں اور یا تیل بھی۔

کہا جاتا ہے کہ شادی ایک ایسا مقدس فریضہ ہے جس کی لوائی کے دوران آپ فرشتوں سے "ابدی محبت" کی دعاؤں کے تحائف وصول پاتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شادی خوش نصیب لوگ کرتے ہیں۔

کچھ یہ بھی کہ کائنات میں حقیقی جشن کالجہ دودلوں کے مقدس ملن کالجہ ہوتا ہے۔

اور جائز ہونے کی بڑی اہمیت ہے۔ اور اجازت نامے کا بلند رتبہ ہے۔ بلند بہت بلند۔

اور پاک کتابیں، حکایتیں بتاتی ہیں کہ کائنات کی اشرف المخلوق کی اولین شادی عرش خدا پر انجام پائی اور بعد ازاں ہونے والی ہر شادی عرش خدا پر انجام پائی شادی کا ہی رتبہ پائی ہے۔

نکاح۔ سب سے پاک اور پسندیدہ روایت۔ نکاح۔ دودلوں کی فضیلت۔

اور داستانیں یہ بھی کہتی ہیں کہ تبت کے برفیلے پہاڑوں میں روپوش ایک مشک باری، اپنی بہترین پوشاک میں طویل مسافت طے کرتی اس مشک مشک بندھن میں بندھنے والوں پر مشک بید (بید کے خوشبو دار پھول) برسا کر جاتی ہے۔ جاتے جاتے وہ تحفے کے طور پر دودلہا دلہن کی مسکراہٹیں اپنی منہی میں قید کر کے لے جاتی ہے۔

اور شادی عہد قدیم کا وہ عہد نامہ بھی ہے جس کا دور "عہد جدید" میں بھی عزت و احترام اور محبت سے کیا جاتا ہے۔

مورگن کرسمس کی رات کو آچکی تھی۔ ماما مہر نے اس کی شادی کے لیے ٹھیک ٹھاک تیاریاں کی تھیں۔ کیبیرن میں مورگن نے شادی کے بعد رہنے کے لیے جوش کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا گھر لیا تھا۔ جس کی سجاوٹ کے لیے ماما مہر نے پیسے مورگن اور جوش کو دیے، جو دونوں نے بہت مشکل سے قبول کیے۔

مورگن نے شادی کے لباس، زیورات، شادی کے دن اور آئینہ کاری کے سب انتظامات ماما مہر کی پسند سے کیے تھے۔ حتیٰ کہ اس نے شادی کی انگوٹھی بھی ماما مہر کی پسند کی تھی۔

ماما مہر کے سامنے ان کی "میں" ختم ہو جاتی تھی اور ماما مہر بھی ان کی آنکھوں میں پڑھ لیتی تھیں کہ ان کے بچے کیا چاہتے ہیں، یہ ماں اور اولاد کا وہ رشتہ تھا جس کی مثال نہیں ملتی تھی۔

اپنی شادی کی تیاری سے زیادہ مورگن کو ماما مہر کے کام کرنے میں دلچسپی تھی۔ سارا لڑ جانے سے زیادہ اسے یہ فکر تھی کہ ماما مہر نے میڈیکل چیک اپ کے لیے جانا ہے۔ جوش فون کرتا رہتا تھا اور وہ اسے چند سیکنڈ بات کر کے ڈانٹ دیا کرتی تھی۔

"مجھے ڈسٹرب نہ کرو، ماما کے ساتھ بات کر رہی ہوں۔" کیمرج کی ہزاروں داستانیں وہ ماما کو سنایا کرتی اور دونوں کے قدموں سے ششل کا گونجا کرتا۔

مورگن نے سادھنا اور امرجہ کو Mates Brides (شہر بالیاں) بننے کے لیے کہا۔ امرجہ جس نے پاکستان میں اپنی نحوست کی داستانوں کی وجہ سے شادیوں میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ مورگن کی شادی کے لیے اتنی پرجوش تھی جیسے اس کی اپنی شادی ہو۔

لیڈی مہر نے شہر بالیوں کے لیے سنہری رنگ کو پسند کیا تھا۔ سادھنا کی سنہری ساڑھی بنوا دی گئی تھی۔ شیارلٹ اور مورگن کی چند مسہیلیاں جن کی آمد متوقع تھی اور امرجہ کے لیے انگریزی طرز کی ٹخنوں تک لمبی فرائیں۔

فراک کا اوپری حصہ قدرے چست تھا جو نیچے آتے آتے لمبے بناتے گھیر وار ہوتا چلا جاتا تھا۔ ذرا سی حرکت سے ان لمبوں میں تلاطم پیدا ہو جاتا جو بہت بھلا لگتا تھا۔ سنہری موتیوں سے فراک کی پشت کو سجایا گیا تھا اور لمبوں میں اسے ٹانگا لگایا تھا کہ جنبش بردہ لمبوں کے ساتھ جھلمل کرتے گپ چھپ ہونے لگتے تھے۔

امرجہ کے لیے دوپٹے کی جگہ سنہری اسکارف نما کپڑا تھا جسے کندھوں کے پیچھے سے لاکر بامیں شانے پر آگے لہرے دے کر سنہری بروج لگا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ کام فراک کی ڈیزائنروں نے کیا تھا اور کیا کمال کیا تھا کہ امرجہ دوپٹے کے اس انداز پر حیران رہ گئی۔ دوپٹے کی کمی بھی

پوری ہو گئی اور فیشن بھی ہو گیا۔
فراک بلاشبہ بہت مہنگی تھی اور امرجہ سے ایک پونڈ بھی نہیں لیا گیا تھا۔ لیڈی مہر کی لاڈلی بیٹی کی شادی تھی۔ بانی جن بچوں نے شادیاں کی تھیں انہوں نے رجسٹر میں ج کی تھی۔ یہ پہلی شادی تھی جو لیڈی مہر کی خواہش پر اتنے اہتمام سے ہو رہی تھی اگر مورگن کے بس میں ہوتا تو شاید وہ ایک پونڈ بھی اپنی شادی پر خرچ نہ کرتی۔ جب شادی کے ہال میں دلہن کے کمرے میں ماما مرنے مورگن کو دلہن بنے دیکھا تو وہ بے اختیار رونے لگیں۔ وہ مورگن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی رہیں۔ اسے دعائیں دیتی رہیں۔ اس کی نظر اتار لی رہیں۔ اور مورگن اپنی گھیر دار سفید پوشاک کو کارپٹ پر پھیلائے ماما مرنے کے قدموں میں بیٹھی ان کے آنسو اپنے ہاتھ میں پکڑے نشو سے صاف کرتی رہی۔ اس سے زیادہ مقدس منظر اور کون سا ہو سکتا تھا بھلا۔؟

گلابی پھولوں کا دستہ پکڑے کونے میں کھڑی امرجہ اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اپنی آئندہ زندگی میں وہ اس خاتون مرنے سے زیادہ عظیم ہستی سے نہیں مل سکتی نہ ہی وہ خود ان جیسی عظیم ہو سکتی ہے۔ جس نے ہر قوموں کے بچوں سے والہانہ پیار کیا۔ انہیں بالائے انہیں اپنا بنایا۔ انہیں یقین دلایا کہ وہ ان کے نہ ہو کر بھی ان ہی کے ہیں۔ وہ ان کی حقیقی ماں بے شک نہیں ہیں لیکن حقیقی ماں سے کسی صورت کم بھی نہیں ہیں۔

یہ سب کرتے خاتون مرنے بلاشبہ دور تھے پائے ہیں۔ ایک عظیم ماں ہونے کے اور ایک عظیم انسان ہونے کے۔ انہوں نے ان سب کے لیے خوشیوں کے سالن اکٹھے کیے۔ کامیابی کے بھی۔ ان کے لیے محبت کو کبھی تفریق نہیں کیا۔ وہ انہیں جمع کر کے دیتی رہیں۔ انہیں ضرب ہو کر ملتی رہی۔ کائنات میں یہ خصوصیت صرف محبت ہی اپنے نام رکھتی ہے۔ یہ دینے سے اور زیادہ ملتی ہے۔ یہ ایک

آئے یا جائے ان کی بلا سے۔ اور وہ کیا جانے وقت کس "گوہ نور" کا نام ہے۔
اور یہ خوش قسمتی بھی صرف عورت کے نصیب میں لکھی گئی ہے کہ دلہن بنے اسے کسی شہزادی اور ملکہ سے کم نہیں سمجھا جاتا۔
عورتوں کو اپنی کم مائیگی کے رونے رونے چھوڑ دینے چاہئیں۔ وہ ماں بنتی ہیں تو وہ سب رشتوں سے الگ اونچے مقام پر کھڑی تصور کر لی جاتی ہیں۔ ایک کم عقل بھی سمجھ جاتا ہے کہ "عورت ماں" بن جائے تو پھر کوئی اور اس کی برابری نہیں کر سکتا۔

بلند وبالا چھت اور قد آدم پھولوں سے سچی کھڑکیوں سے گھرے قدیم برطانوی طرز تعمیر کے چرچ نما ہال کے سرخ قالین پر سفید رنگ کی سنڈریلا فرائیں پہنے اور سر پر گلابی رتن باندھے دو انگریز بچیاں اپنی پھولوں کی نوکریوں میں سے پھولوں کی پتیاں نکال نکال کر دلہن مورگن کے آگے چلتے ہوئے پھینک رہی تھیں۔

دلہن نے ہال کے کھلے پھانک سے اندر قدم رکھا۔ سب کی گردنیں پیچھے اس کی طرف مڑیں۔ ٹھیک اسی وقت ہال کے اندر پارڈی سے ذرا ہٹ کر بیٹھے سولہ رکنی وائلن گروپ نے اپنے ساز سنبھالے اور نرمی سے انہیں چھیڑا۔ وہ اس دھن کو بجانے کی تیاری کرنے لگے جو فرشتوں کی دعاؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔

ٹھیک اسی وقت۔ عین اسی وقت کوئی تیزی سے بھاگتے کالے سوٹ پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹالی باندھتے دلہن کے پیچھے تین ادھر اور ادھر قطار کی صورت چلنے کی تیاری کرتی سبہ بایوں کے پیچھے آیا۔ امرجہ دائیں طرف شارلٹ کے پیچھے آخر میں تھی۔

شہرے پائیوں سے نکلی۔ ایک امرجہ۔ عربی شہزادے کے گھوڑے سے اترے۔ ایک نالیان۔
وائلن کے دھیمے سراسی وقت دو لہا دلہن سے بچے

ہال میں بٹھرے۔
عالیان کی آمد کی ایسی خوشی۔
کیا انٹری تھی عالیان کی۔ وہ سرگیت ساتھ لایا تھا۔
آہٹ پر امرجہ نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ جلدی جلدی اپنی ٹالی کو باندھنے کی کوشش کر رہا تھا شاید اس نے زندگی میں پہلی بار سوٹ اور ٹالی پہنی تھی۔ ٹالی کو وہ ایسے باندھ رہا تھا جیسے گلے میں پھندے کو فٹ کر رہا ہو۔

اسے تو ایک ہفتے بعد آتا تھا، ایک ہفتہ پہلے کیسے آ گیا تھا۔ امرجہ کے پیچھے چلتے وہ اپنی ٹالی کے ساتھ مصروف تھا۔ شاید اسے بھی خود کو ہر صورت دو لہا کی طرح خوب صورت دکھانا تھا۔ اس کے بال سلیقے سے جتے تھے۔

"کما جاتا ہے کہ شادی کے دن کوئی مرد اور کوئی عورت دو لہا دلہن سے زیادہ خوب صورت نہیں لگ سکتے۔ اور میرا یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی لڑکا لڑکی دو لہا دلہن سے زیادہ خوب صورت لگنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے معاملے میں شدید گڑبڑ ہوتی ہے۔ اس کی شادی

خلع عیسیٰ میں



فلاخو جبین

قیمت - 400/- روپے

مکتبہ انیس کاہنہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
32735021 فون نمبر
37، اردو بازار، کراچی

نہیں بھی ہوتی اور وہ اپنی شادی جیسا خوش ہوتا ہے۔
ہنسنے کی بات نہیں بھی ہوتی اور وہ ہنس رہا ہوتا ہے۔
شدید گڑبڑ کا معاملہ ہوتا ہے بلاشبہ۔ ”مجھے بتایا جائے کہ
دلہن کون ہے؟ کیا صرف سفید لباس والی؟“

امرحہ کے عین پیچھے چلتے موتوں سے گندھے
بالوں سے ذرا پیچھے ذرا قریب ہو کر سرگوشی میں پوچھا۔
امرحہ نے اس کی بات پر توجہ نہ دی۔ وہ سفید پھولوں سے
سجے ہال کو دیکھ رہی تھی اور بے حد اونچی چھت سے
جھولتے کئی میٹر چوڑے اور لمبے فانوس کو جس کی
روشنی نے سارے ہال کو تھوڑا سا روشنی دیا تھا۔ وائلن تھے
قمقمے تھے پھول تھے، قمقمے تھے، دو لہا دلہن تھے
عالیان اور امرحہ تھے اور اس تقریب کو کیا چاہیے تھا؟

لیڈی مہر کے سب بچے اپنے اپنے بچوں بیویوں اور
کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ موجود تھے۔ باقی جوش
کے گھر والے، رشتے دار اور دوست تھے۔ کافی زیادہ
لوگ تھے سب دو اطراف نشستوں پر براجمان تھے۔

امرحہ کے پیچھے سے گھوم کر ماما مہر کے ہاتھ کو چوم کر
عالیان جلدی سے جا کر دو لہا کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس
نے جوش سے ہاتھ ملایا۔ اپنا تعارف کروایا اور جوش
کے شہر بلا کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔

دلہن پادری کے سامنے اور دو لہا کے سامنے آکر
کھڑی ہو گئی۔ سب کھڑے ہو گئے۔ تعظیم میں پھر
شادی کی رسم شروع ہو گئی۔

اجازت نامہ دیا جانے لگا۔
اجازت نامہ دہرایا جانے لگا۔
شہر بالیاں دلہن سے پیچھے ہٹ کر قطار میں کھڑی
ہو گئیں۔ وہ سب دو لہا اور دلہن کو دیکھ رہی تھیں۔

امرحہ واجد آج بہت خوش تھی۔ یہ پہلی تقریب
تھی جس میں وہ روئے بنا شریک تھی۔ ڈرے بنائے۔
اسے کونے میں جھینپ کر بیٹھنے کی جلدی تھی نہ
ضرورت۔ اس کے لیے وقت بدل چکا تھا۔ وہ
پھولوں کو تھامے، گردن اٹھائے، مسکراہٹ سجائے
خوب صورت لگ سکتی تھی۔ خوش ہو سکتی تھی۔

وہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ خوش تو وہ بلاشبہ
بہت تھی۔

مشک بار پری آچکی تھی اور مشک بید بر ساری تھی
شاید وہ تھوڑی سی اور مہیاں ہو گئی ہو اور اس نے
دلہن کی طرح ہی خوب صورت لگنے والی امرحہ پر بھی
کچھ مشک بید برمائے ہوں۔

اگر اس نے یہ کام نہیں کیا تھا تو یہ کام عالیاں کر رہا
تھا۔ اس کی بھوری آنکھیں سنہری ہوتی جا رہی
تھیں۔ امرحہ اس سے ذرا فاصلے پر سامنے کھڑی
تھی۔ امرحہ کو نہیں معلوم تھا کہ وہ دو لہا کے پیچھے کہیں
کھڑا ہے نہ ہی اس نے معلوم کرنا چاہا اور عالیاں کو یہ
معلوم نہیں تھا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی ہال میں موجود

ہے۔
”دو لہا۔ دلہن۔ اچھا۔ اور دوسرے لوگ
کیا واقعی یہ ہال میں موجود ہیں۔ ایسا ہو گا۔ میرا
نہیں خیال۔“

قدیم اور پر شکوہ چراغ نمائشی سو گلدستوں سے سجے
وسیع ہال کے جھلک کرتے فانوس کے عین نیچے نیچے
سرخ قالین پر کھڑا گرانٹ پریناں کے سر کی طرف
جھک رہا تھا۔ اس بار وہ ”Gloxinia“ کو اس کے
نفاست سے گندھے سنہری موتی جڑے بالوں میں لگا
رہا تھا پھر اس نے پریناں کے ہاتھوں کو تھام لیا اور دلہن
کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا۔ ”تم میرے لیے بیٹھ
اس پہلے دن کی دلہن کی طرح خوب صورت اور خاص
ہو گی۔“

”اس بار تمہیں اس عہد نامے کو سب کے سامنے
دہرائنا ہو گا۔“ پریناں نے ادا سے کہا۔
”میں عالیاں کے ساتھ اس عہد نامے کو دہرائے
کے لیے تیار ہوں۔“

”میں امرحہ کی طرح انتظار کرنے کے لیے تیار
ہوں۔“ پریناں نے بالوں میں لگے ”Gloxinia“ کو
محبت سے چھو کر کہا۔ ساتھ ہی وہ مسکرائی۔ وہ
مسکرا سکتی تھی اس کے ہاتھ گرانٹ نے تھام رکھے

تھے۔
عالیاں مسکرایا۔ وہ مسکرا سکتا تھا۔ اس کی
آنکھوں نے سنہرے رنگ کو تھام رکھا تھا۔ گلابی
پھولوں کے گل دستے میں مسکراہٹ اٹکی تھی۔
جھنسل کرتی موتی جڑی لہروں میں اس کا دل لک چھپ
گپ چھپ ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا
کہ وہ کیا کرے۔ بھاگ کر جائے اور وائلن کو اپنی
ٹھوڑی تلے لے کر دھندلے کر ڈالے یا۔ چھت
کے ساتھ جھولتے فانوس کے ساتھ جھول جائے اور
اعلان کرنا پھرے۔ یا کئی سو پھولوں کے گل دستوں کو
اپنی بانہوں میں بھر کر سنہری پوشاک کے قدموں تلے
ڈھیر کر دے۔

اور یہ بھی کم تھا۔ یہ سب بھی کم تھا۔
سب کم ہی ہوتا ہے۔ سب کم ہی لگتا ہے۔
محبت اس عروج کا جذبہ ہے کہ سب ادائیگیاں تولد
باشہ ہی لگتی ہیں۔

یونیورسٹی پھر سے آباد ہو چکی تھی۔ سترہ جنوری
سے امتحانات شروع تھے۔ سب دن رات پڑھنے میں
مصروف ہو چکے تھے۔ اس کے سب دوست اس کے
لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آئے تھے۔ وہ خوش تھی کہ
سب نے اسے یاد رکھا تھا لیکن وہ کسی کو بھی یہ بتانہ سکی
کہ اس نے سب کو کتنا یاد کیا تھا۔ ان کے جانے کے
بعد اس کا کیا حال ہوا تھا۔

”میں واپس آچکا ہوں۔“
”مجھے نظر آ رہا ہے۔“ مورگن کی شادی کے بعد
یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔
”تو چلیے پھر؟“ وہ سویڈن کلاپی بی کر پہلے سے زیادہ
خوب صورت ہو کر آیا تھا۔

”کہاں؟“
”ہوم کمنگ ڈرنک۔ کے لیے۔“ (گھر واپسی کی
دعوت کے لیے)
جو جا چکے تھے انہوں نے جو مچھڑ میں رہ چکے تھے

سے ہوم کمنگ (Coming) ڈرنک پی تھی۔
کھانے پینے کا اچھا انداز تھا۔
”میں کسی ایسی ڈرنک کو نہیں جانتی۔“ وہ صاف مکر
گئی جبکہ وہ برالین اون کو پلا چکی تھی۔
”نہیں جانتیں تو میں بتا دیتا ہوں ٹوٹی ولسن کہتا ہے

”This is Manchester we do
things differently here“
(یہ مانچسٹر ہے ہمیں انفرادیت کا جذبہ ہے)
تو جب ہم گھر واپس آتے ہیں تو اسے بھی مختلف
انداز سے ٹریٹ کرتے ہیں۔ تمہا پچھڑ میں ہو، ہمیں یہ
کرنا پڑے گا۔ صرف دو پونڈ کی کاک ٹیل۔ اور
بس۔“ وہ جان چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

وہ اسے دو پونڈ کی کاک ٹیل کے لیے قریبی کیفے میں
لے آئی جہاں اور بھی بہت سے اسٹوڈنٹس دو پونڈ کی
کاک ٹیل پی رہے تھے۔
”نئے سال کے لیے کیا کیا عہد و بیان کیے ہیں تم
نے؟“

”سستی نہ کرنا اور وقت پر نوٹس بنانا۔ دوسرے
سمسٹرز میں 80٪ رزلٹ لانا۔“ عزم سے کہہ کر وہ
مسکرائے لگی۔
وہ ہنسنے لگا لیکن امرحہ نے تو کوئی لطیفہ نہیں سنایا
تھا۔

”اب تم نے کیوں؟“
”کیونکہ تحقیق کہتی ہے کہ ساٹھ فیصد سے زیادہ
لوگ سال کے پہلے ہی ہفتے خود سے کیے عہد کو بھلا
دیتے ہیں اور باقی کے چالیس فیصد سے زیادہ افراد یہ کام
چھ ماہ کے اندر کر گزرتے ہیں۔“

”میں ان ساٹھ فیصد میں سے ہوں نہ ہی چالیس
فیصد میں سے۔“ اس نے عزم سے کہا۔
”مجھے فخر ہے تم پر۔“ اس نے اسے چڑایا۔ دو پونڈ
کی ڈرنک وہ آہستہ آہستہ پی رہا تھا کہ وہ ختم نہ ہو
جائے۔

”تم دیکھ لینا میں شان دار کامیابی حاصل کروں
یا نہیں؟“

گی۔ ”میں ضرور دیکھنا چاہوں گا۔“ سوئیڈن کا پانی اسے بری طرح سے اس آیا تھا۔
”تم مجھے چنچل رہے ہو۔“
”میں تمہیں چنچل رہا ہوں۔“ نیبل پر مکار کر اس نے کہا۔
”اگر میں جیت گئی۔“؟“ امرجہ نے انگلی اٹھا کر کہا۔

”مشکل ہے۔“
”اگر میں جیت گئی ہوں۔ پھر؟“
”ناممکن ہے۔“ دونوں شانے ناں میں ہلائے۔
امرجہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ”پاکستان میں ایسے موقع پر کہا جاتا تھا تمہارے منہ میں خاک۔“ وہ یہ بڑبڑا کر رہ گئی۔
”تو جو تم کوئی میں وہ کروں گا۔ وہ گلے میں پھندا ڈال کر چھت سے لٹک جانا ہی کیوں نہ ہو۔“ وہ اتنا تالافت سمجھتا تھا امرجہ کو۔
”ٹھیک ہے پھر ڈیڑھ سال بعد ملتے ہیں۔ اسی میز پر تیار رہنا پھندا ڈالنے کے لیے۔“
”مطلب تم ڈیڑھ سال تک مجھ سے ملو گی نہیں۔ میں چنچل واپس لیتا ہوں۔“
”اف! مطلب اس معاملے کو ہم ڈیڑھ سال بعد دیکھیں گے۔“
”ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرانے لگا۔ چڑانے والی مسکراہٹ۔

”یہ انگریز خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ سمجھتے ہیں سب یہی کر سکتے ہیں۔ ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ سب کر سکتے ہیں ہم۔“ خیر امرجہ دیکھ لے گی اس انگریز کو اب۔
امتحانات میں ایک ہفتہ تھا اور سب جنوری کے پہلے ہفتے ہی واپس آچکے تھے اور جنوری کی برف باری میں ایران کا محسن رسولی اور مصر کا موسیٰ فٹ بال کھیلنا چاہتے تھے۔ امتحان تو پھر آجائیں گے بلکہ سال میں دوبار۔ لیکن ایسی غضب کی سوسالہ ریکارڈ توڑتی برف باری شاید پھر نہ آئے۔ ایرانی اور مصری یقیناً

سوئے میں بھی خود کو فٹ بال کھیلنے پاتے ہوں گے اور اپنی زندگی کے خاص دن ”شادی“ پر بھی فٹ بال کھیلنے کے بلاوے کو رد نہیں کر سکتے ہوں گے۔
محسن رسولی نے دو ٹیمیں جمع کر لی تھیں، میچ کے لیے برف سے اٹے گراؤنڈ میں رات کو میچ تھا۔
برف کا ڈھیر اور اس پر فٹ بال میچ۔ واہ۔۔۔
”تم بھی میرے ساتھ کھیلو گی؟“ ویرا نے کہا۔
امرجہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

”کیا مصیبت آگئی ہے تمہاری جان پر؟“ ویرا نے گھونسا مار اس کی کمر پر۔
”میں نے بھی موبائل پر فٹ بال ٹیم نہیں کھیلی۔ تم مجھے برف پر خو غوار کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلنے کو کہہ رہی ہو۔ یعنی میری موت برف پر واقع ہوئی ہے۔“
”کون سا کھیل کھیلتی ہو تم؟“ ویرا ایک اور گھونسا مارنے کے لیے تیار ہوئی۔

”لڈو۔ دادا کے ساتھ۔ بابا، کبھی کبھی کرکٹ۔ وہ بھی اگر کوئی بچہ گیند کرائے آہستہ سے تو میں بلا چلا لیتی ہوں۔“ ٹیس بال سے ہارڈ بال سے بالکل نہیں۔
”تو تم لڑکیاں فارغ وقت میں کرتی کیا ہو پاکستان میں؟“ سائیکل تم نہیں چلاتیں، دوڑ لگانے کے لیے تمہیں کہا تو تم نے انکار کر دیا تھا۔ کوئی ٹیم بھی نہیں آتی تمہیں۔ کھانے کے علاوہ کچھ کرنا آتا ہے؟“
”ہاں نا۔۔۔ چغلیاں کرنا اور بات بات پر لڑنا۔“
امرجہ نے اردو میں کہا اور ہنسنے لگی۔

تو امتحان چھ دن بعد شروع تھے اور وہ میچ کھیلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ لڑکیوں میں ایک ویرا بھی اور ایک لاء ڈیو پیارٹمنٹ کی وکٹوریہ۔ وکٹوریہ کارل کی ٹیم میں تھی اور ویرا محسن رسولی کی ٹیم میں۔ جس طرح کی بمبار کھلاڑی ویرا بھی اسے دونوں ٹیمیں شامل کرنے کے لیے تیار تھیں لیکن ویرا نے چالاک کی اس نے محسن رسولی کی ٹیم میں شمولیت کی۔ محسن رسولی یونیورسٹی میں اپنے فٹ بال کے لیے ہی تو مشہور تھا اس کے امکانات روشن تھے میچ جیتنے کے۔ اور وہی

ہوا، محسن رسولی کی ٹیم میچ جیت گئی۔ تین دو سے۔ سو دو سو کے قریب اسٹوڈنٹس آئے تھے میچ دیکھنے، دستاویز بننے، مفلر لپٹے، کافی پیتے، منہ سے بھاپ اڑاتے۔ ہر گول پر گراؤنڈ کو سربراٹھانے والے۔
امرجہ کو بھی بڑھنا تھا لیکن وہ ویرا کے لیے آگئی تھی۔ اور اچھا ہی کیا آگئی ورنہ برف کے ڈھیر پر فٹ بال کے ساتھ بمباری کرنی ویرا کو کیسے دیکھتی۔ امرجہ کا حلق بیٹھ گیا تھا چلا چلا کر۔ اس نے کسی قدر حسرت سے ویرا کو دیکھا، وہ برف کے ڈھیر پر فٹ بال کے ساتھ ایسے بھاگ رہی تھی جیسے لاونچ میں کاربٹ بر بھاگ رہی ہو، اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے کہ وہ برف میں خود کو دفن کر لے گی ہمارے گی نہیں۔ کارل نے پہلا گول کیا تھا اور ویرا نے اسے ایسے دیکھا تھا جیسے اس کی گردن دیوچ لے گئی۔ اور اس نے گردن دیوچ لی تھی، اس نے یکے بعد دیگرے دو گول کیے تھے۔ مخالف ٹیم کی کمر توڑ ڈالی تھی۔ وہ پریشمیں آئے اور بمشکل مزید ایک گول کر کے ہار گئے۔

”ویرا۔۔۔ ویرا!“ اسٹوڈنٹس نے گراؤنڈ سربراٹھا لیا۔ ویرا نے ڈیوڈ دیکھم کی بے نیازی اور میس کی چھپی رستی لیے اسٹوڈنٹس کو دیکھا، ہاتھ لہرایا۔ اور اپنی دائیں آنکھ کے کنارے کو رگڑ کر کارل کو دیکھ کر آنکھ ماری۔ کارل کو تو آگ ہی لگ گئی۔ اس کی شکل دیکھنے لائق تھی۔ ٹیم غصے میں آکر بھڑک چکی تھی اور شاید ویرا یہی چاہتی تھی۔ وہ بھڑک بھڑک کر برف پر گرتے جاتے تھے۔ محسن رسولی کی ٹیم فٹ بال لیے لیے اڑی جاتی تھی۔ ویرا برف کی پیداوار تھی اسے برف پر ہرانا مشکل تھا۔ یہ اس کی بے عزتی ہوتی۔ اور اس نے روس کی برف کی عزت رکھ کر۔۔۔ وہ لوگ میچ جیت گئے۔

امرجہ کو بڑی خوشی ہوئی ویرا کے جیتنے کی نہیں کارل کے ہارنے کی۔ وہ سب لوگ گراؤنڈ کے گرد گھیرا بنائے کھڑے دونوں ٹیموں کے میچ دیکھ رہے تھے میچ ختم ہوا تو سب کو پھر سے پڑھائی یاد آگئی اور سب جلدی جلدی کھسنے لگے۔ اب امرجہ نیٹ کے

پاس کھڑی منہ کھولے ہنس رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا ویرا کو کندھوں پر اٹھالے۔ ورنہ کارل کو ہی اٹھا کر پھینک دے۔ اور نہیں تو پیٹ پکڑ کر برف پر لوٹ پوٹ ہوتے ہنستے۔ کچھ میچ اس نے دادا کو بھی دکھایا تھا اور وہ بھی ویرا اور اچلا کر لاہور میں بیٹھے ویرا کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

”تمہیں بڑی ہنسی آرہی ہے۔“ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا، کافی سنجیدہ لگ رہا تھا جیسے ہار کے بعد لوگ لگا کرتے ہیں۔
”ہاں آرہی ہے۔“ امرجہ نے منہ کھول کر ایک اور قہقہہ لگایا۔ برا کیا۔

آنکھوں کو چند ہیا کر کارل نے اسے تازا۔ جیسے کہا ”اچھا تم۔۔۔ تم ٹھیک ہے پھر۔“
وہ چند قدم آگے چلا اس کے ہاتھ میں فٹ بال تھا اور پھر وہ ایک دم سے پلٹا۔ امرجہ ویرا کی طرف جانے ہی لگی تھی۔ اس کا دھیان کارل کی طرف نہیں تھا، کارل نے پلٹ کر پوری قوت سے اس کے سر پر فٹ بال کی لگ لگائی۔ امرجہ توازن قائم نہ رکھ سکی اور گر گئی۔ جیسے ہی وہ گری، کارل نے تیزی سے اس کے سر پر جی سرخ اونٹنی ٹوپی کو کھینچ کر اس کی ناک تک گھسیٹ دیا۔ جی ناک تک۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ امرجہ چلائی۔ یہ بھی برا کیا امرجہ نے۔ کارل نے مٹھی بھر برف اس کے چلائے منہ میں ٹھونس دی۔ امرجہ نے ہاتھ سے برف منہ سے نکالی۔ کارل نے تیزی سے اپنے گلے میں سے اونٹنی مفلر کو نکال کر اس کی گرہ بنا کر اس کے دونوں ہاتھوں میں ڈالی اور گرہ کس دی۔ وہ جواٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور لڑھک گئی۔

”یہ کیا؟ ٹوپی ناک تک۔۔۔ برف منہ میں۔۔۔ ہاتھ بندھے ہوئے۔۔۔ میچ۔۔۔ اب کارل نے کسی مشین کی طرح اس پر برف اچھالنی شروع کر دی۔ امرجہ منہ سے بمشکل برف اگل سکی۔ اس کے دانت ٹھنڈ سے ٹوٹ جانے کے قریب تھے اور کارل منحوس اسے برف کے ڈھیر میں دفن کر رہا تھا۔ وہ کھلے عام منہ کھول کر

ہنس رہی تھی۔ اب ظاہر ہے ہارے ہوئے لوگوں کو ایسی ہنسی بڑی بھی لگ سکتی ہے۔

”ویرا!“ امرجہ بمشکل چلائی۔ ویرا اذرا اور محسن رسولی کے ساتھ میچ کی صورت حال پر غور کر رہی تھی۔ امرجہ کی طرف اس کی پشت تھی۔ کارل کسی کرین کی طرح اس پر برف اچھالتا ہی جا رہا تھا اور اس نے امرجہ کو برف کے ڈھیر میں دفن کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے امرجہ برف میں۔ یہ دن بھی دیکھنا تھا امرجہ نے۔

”ویرا!“ اس کی آنکھوں پر ٹوپی تھی۔ اسے نظری نہیں آ رہا تھا کہ ویرا کہاں ہے۔ برف کا ایک ڈھیر اس کے منہ پر آ کر گر کر لہو اور چلاؤ۔ کاش واوی کا کماچ ہوتا وہ واقعی منحوس ہوتی اور کارل کے ہاتھ ٹوٹ جاتے اس کے ساتھ یہ سب کرتے۔

”کارل!“ ویرا کی دھواڑ سنائی دی۔ اس نے بڑھ کر امرجہ کے سر پر سے ٹوپی اٹھائی اور امرجہ نے دیکھا کہ ویرا نے ایک بے حد ناکام کوشش کی اپنی ہنسی کے فوارے کو روکنے کی۔

وہ گردن تک برف میں دھنس چکی تھی ناک سرخ ہو چکی تھی۔ ہونٹ نیلے اور غصے سے وہ نیلی، پیلی، لال سب ہو رہی تھی۔

جیسے ہی ویرا نے ٹوپی اٹھائی۔ کارل اور ویرا دونوں کے منہ سے ہنسی کے فوارے نکلے۔

”داوا! آپ ٹھیک کہتے ہیں مجھے امرجہ نہیں ویرا ہونا چاہیے۔“ امرجہ نے دل میں سوچا جب ویرا اسے برف سے نکال کر کھڑا کر چکی تو کارل نے امرجہ کی طرف اشارہ کیا۔

”میچ ہو جائے۔ تم اور میں۔“ کیا بات کی تھی کارل نے۔ وہ بھی امرجہ سے۔

”اسے فٹ بال نہیں آتا۔ مجھ سے بات کرو۔“

”تم پرے رہو۔“ Ginger Ball۔

مجھے اس The Lost Duck سے بات کرنے۔

”وہ۔“

”The Lost Duck“ وہ جب کارل کی شکل دیکھنے لگی غصے میں اتلا لال پیلا ہونے کے باوجود وہ اس

کے خلاف کچھ نہ کر سکی۔ میچ۔ افسوس۔

”میں پچیس فٹ کے فاصلے سے ہم ایک دوسرے کے سر پر فٹ بال کی لگ لگائیں گے۔ وقت دس منٹ ہو۔ پلوٹو سر پر لگا بال ایک گول ہو گا۔“

”پلوٹو۔ ایک اور نام۔“ پلوٹو خاموش کھڑا اندازہ لگا رہا تھا کہ کیا وہ یہ کر سکتی ہے، نہیں وہ یہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اندازہ لگایا جا چکا تھا۔

”چلو اسے اور آسان کر لیتے ہیں۔ فاصلہ پندرہ فٹ۔ وقت دس منٹ۔“

”نہیں۔“ امرجہ نے انکار کر کے جان چھڑائی۔

”فاصلہ دس فٹ۔“ وہ آج ہر صورت اس کے سر پر لگ لگنا چاہتا تھا۔

”نہیں۔“ امرجہ نے ایسے کہا جیسے شاہ ایران اسے اپنا تخت پیش کرتے ہوں کہ آج سے آپ اسے سنبھالیں اور وہ کہتی ہو ”نہیں بھی۔ بس نہیں کہہ دیا نا۔ بس نہیں۔“

”نہیں۔“ کارل نے واضح دانت پر دانت جمائے اور غصے کو چھپا کر اس کی طرف دیکھا کہ وہ یہ بھی نہیں کر سکتی جو پانچ سال کے بچے بھی کر کے جیت سکتے ہیں۔ کارل کو بس موقع چاہیے تھا اس کا سر پھوڑنے کا اسے برف کی مار مارنے کا۔

”چلو دس قدم۔ ہارنے والے کو برف میں گردن تک صبح تک دھنسنے رہنا ہو گا۔“ Ginger Ball نے امرجہ کو آنکھ ماری کہ کھیل لو۔ برپاگل تھی کیا وہ ابھی شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کی حیثیت نہیں ہوئی تھی اس کی۔

”امرجہ کے لیے میں کھیلتی ہوں۔“ ویرا نے ہاتھ اٹھایا۔

”تمہارے لیے کھیل بدل جائے گا۔ بیس فٹ کا فاصلہ رکھ کر بھاگتے ہوئے ہاتھ سے ہمیں سر پر بال ماری ہوگی۔ وقت دس منٹ۔“

”ٹھیک ہے!“ شاہ ایران کا تخت ویرانے قبول کیا۔ اسٹاپ وایج امرجہ کو دے کر ان کا کھیل شروع ہو گیا۔

بیس فٹ کا فاصلہ رکھ کر فٹ بال کو درمیان میں رکھ دیا گیا۔ فٹ بال پر پہلے کارل چھٹا ویرا بھاگی لیکن کارل نے پھرتی سے اس کے سر پر بال دے ماری۔ بال ویرا کے ہاتھ آگئی۔ اس نے کارل کا نشانہ لیا لیکن کارل نے دے گیا۔ بال کارل کے ہاتھ آگئی، ویرا کو بال کو اپنے سر پر لگنے سے بچانا بھی تھا اور بال کو اپنے قابو میں بھی کرنا تھا۔ برف پر پھسلے گرتے، بال پر جھپٹنے مقابلہ نویں سنٹ میں پانچ چار تھا۔ کارل پانچ۔ ویرا چار۔ دسویں سنٹ میں کارل نے ویرا کے سر پر ایک اور گول کر دیا۔ ویرا بری طرح سے برف پر گری۔

”آخری سنٹ!“ امرجہ چلائی۔ وہ بھاگنے کی تیاری کر رہی تھی۔ آخری سنٹ میں ویرا زیادہ سے زیادہ ایک ہی گول کر سکتی تھی نا۔ گراؤنڈ میں چند ایک اسٹوڈنٹس ہی موجود تھے جو ویرا اور کارل کی مستیاں دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا وہ مذاق میں کوئی کھیل کھیل رہے ہیں۔

”آخری پندرہ سیکنڈز۔“ امرجہ پھر زور سے چلائی۔ وہ بھاگتے بھاگتے ویرا کے قریب جا چکی تھی۔ کارل ان سے دور تھا۔ بال ویرا کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کارل کے سر پر دے ماری لیکن کارل پھرتی گیا۔ اور وہ بال پر جھپٹا۔ وہ پھرتی سے جھک کر بال اٹھا ہی رہا تھا کہ ویرا پھولے ہوئے سانس کے ساتھ چلائی۔

”امرجہ۔ بھاگ۔“ کہتے وہ خود بھی برفانی چھتے کی طرح گیٹ کی طرف بھاگی۔ امرجہ بھاگنے کی تیاری تو کر رہی رہی تھی پر ویرا کے کہتے ہی اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

”بھاگ امرجہ!“ ویرا پھر چلائی۔ کارل ان کے پیچھے جنگی تیندوے کی طرح چلکا۔

امرجہ نے اپنی لاہور میں کھائی خوراکیں زندہ کیں اور پورا زور لگا کر بھاگی۔ ویرا نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنی رفتار کے ساتھ بھاگنے لگی۔ لیکن کہاں ویرا کہاں امرجہ۔ امرجہ برفانی چیتا تھوڑی ہی تھی۔

جتنی مرضی صحت بخش غذا میں کھائی ہوں۔ ان

کا استعمال تو کبھی نہیں کیا گیا تھا نا۔ بھاگی تو کبھی نہیں تھی۔ ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ ایسے برف ملی تھی نہ کارل نامی بلا۔ جو ان کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

ویرا کے ساتھ بھاگتے امرجہ منہ کے بل گرتے گرتے کئی بار پڑی۔ امرجہ گر جاتی کارل (موت) اسے پیچھے سے آتی تو بہت سی براہوتا۔

کارل کہیں پیچھے برف پر پھسل کر گر گیا تھا ورنہ وہ ان سے دس قدم پیچھے نہ ہوتا۔ ویرا اپنی سائیکل پر جھپٹی اور اسے چلایا۔ امرجہ چلتی سائیکل پر بیٹھی۔ ویرا نے ہی اسے چلتی سائیکل پر بیٹھا اور آڑنا کھایا تھا اس کا ماننا تھا۔ ایمرجنسی میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کام آتی ہیں۔

ایمرجنسی ”کارل“ میں یہ بات کافی کام آ رہی تھی۔

ویرا نے اپنی رولر کو سڑک دنیا کی تیز رفتار ترین چلابانی ٹرین بنا ڈالا جو چلتی ہے تو لگتا ہے اڑ رہی ہے۔ رولر کو سڑک بھی اڑ رہی تھی۔

”ویرا!“ کارل کی آواز ان کے پیچھے آئی۔ پھولے سانس کے ساتھ وہ چلایا۔

”کون ویرا؟“ ویرا چلائی اور یہ جاہ جا۔

جب وہ کارل کی پیچ سے دور ہو گئی تو رولر کو سڑک رفتار آہستہ کی گئی۔ ہنس ہنس کر ان کا برا حال تھا۔ برف سے ڈھکے چھپے ہاتھ میں ان کی ہنسی کے قہقہے جل بھج رہے تھے۔ امرجہ شاید ہی اپنی زندگی میں کبھی اتنا ہنسی ہوگی۔ اس کا پیٹ پھٹنے کے قریب تھا۔

”تم ہار کیسے گئیں؟“ امرجہ نے اس کی ٹمر میں چٹکی بھری یعنی میرے لیے کھیلتے ہی ہار گئیں یو ”Ball“

”Ginger“

”کبھی انسان ہار بھی تو جاتا ہے، ہے نا۔ ویسے اگر میں جیت جاتی تو کارل نے بھاگ جانا تھا۔ ہم اس جن کو برف میں دھنسا سکتے تھے بھلا۔“

”میری دادی کا ماننا ہے میں منحوس ہوں۔ میری وجہ سے سارے کام خراب ہو جاتے ہیں۔ آگ

لگ جاتی ہے۔ تباہی بربادی ایسا سب ہو جاتا ہے۔

”اچھا؟ تم تو بڑے کام کی ہو پھر۔ تم وائٹ ہاؤس کے سامنے ایک گھر کیوں نہیں لے لیتیں۔ روس کے تھوڑے حساب کتاب باقی ہیں امریکہ کے ساتھ۔ تم وہ حساب کتاب کیوں برابر نہیں کروا دیتیں ہمارے۔؟ اگر تم واقعی ویسی ہی ہو تو جی تم ہمارے بہت کام کی ہو۔ ہمارا حساب چکا چکو تو روس آنا۔ گارڈ آف آنر دیا جائے گا تمہیں۔“

”گارڈ آف آنر! امرجہ بنتے بنتے بے حال ہو گئی۔ اس کی نخوت کو گارڈ آف آنر۔ کمال ہو گیا۔“

”یہ میری زندگی کا بہترین وقت ہے ویرا۔ تم ہو میں ہوں برف ہے، مچھڑ ہے اور تمہاری سائیکل ہے۔ میرے لیے اتنے خزانے تھے زندگی کے پاس۔“

”سب سے بڑا خزانہ کارل۔ ہا ہا ہا! ہنستے ہنستے ویرا سائیکل گرا بیٹھی دونوں سڑک پر گر گئیں۔ انہیں ہلکی سی چوٹ بھی آئی لیکن اس چوٹ کی پرواہ کسے تھی وہ دونوں تو سڑک پر گری سائیکل کے پاس ہنسنے میں مصروف تھیں۔“

”اس کا نام لیتے ہی ہم گر گئے اف اصل میں منحوس تو کارل ہے۔“

امرجہ کو بڑی خوشی ہوئی کارل کو منحوس ثابت کر کے اس نے جیسے اپنے منحوس ہونے کا بدلہ کارل سے لے لیا اور ساری روشن خیالی کے باوجود وہ دوا کی طرح پورا زور لگا کر کارل کو ”منحوس“ ثابت کرنے کے لیے تیار تھی۔ بلکہ اس کام کے لیے پارٹ ٹائم کرنے کے لیے بھی تیار تھی۔ ساری یونیورسٹی امرجہ کے خاندان کی طرح جب اسے منحوس منحوس کہا کرے گی تو امرجہ کے اندر ٹھنڈک ہی ٹھنڈک پھیل جائے گی۔ آہ۔ کاش یہ دن دیکھنا امرجہ کے نصیب میں ہو۔ کاش یہ دن جلد ہی آجائے۔ بلکہ آنے ہی والا ہو۔

”کارل دی منحوس مارا۔“

میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ آج تو میرا پہلا پیر ہے۔ گھڑی اور کھڑکی دونوں کی طرف دیکھا وہ گوش شام کے پانچ بج گئے۔ خدایا۔ میرا تو پہلا پیر تھا۔ میں تو رات بھر پڑھتا رہا تھا۔ پھر کیا ہوا۔ پھر کیا ہوا آخر۔ یعنی میرا پیر گیا۔ یعنی اب یونیورسٹی کا ڈین بھی مجھے مل ہونے سے نہیں بچا سکے گا۔ میں اتنا وقت سوٹا کیسے رہ گیا؟

کیا میں ساری رات پارٹی کرتا رہا۔ سارا دن سوٹا رہا۔ نہیں میں تو علی کا منزمین تھا۔ نہیں شاید میں تو لا بیرری میں تھا۔ وہ گوش میں کہاں تھا۔ آخر کوئی مجھے بتائے گا کہ میں کہاں تھا۔

میں نچلے فلور پر واقع شاہ ویز کے کمرے کی طرف بھاگا۔ اس کا دروازہ دھڑ دھڑا رہا۔

”شاہ ویز! میں کل رات کہاں تھا بڑی جلدی بتا۔“

اف شاہ ویز بھی سو رہا تھا۔ میری طرح اس کا امتحان بھی گیا۔ وہ بھی فیل۔

”مجھے کیا پتا تم کل رات کہاں تھے۔ سونے دو مجھے۔“ شاہ ویز اندر سے ہی چلایا۔

”تمہارا بھی پیر گیا یادے کر آئے ہو؟“ میں اس کے کمرے کے بند دروازے کے پار چلایا۔

”پیر۔ وہ تو صبح ہے۔ اب دفعتاً ہو جاؤ۔“

”صبح تو گزر گئی۔ شام کے پانچ بج رہے ہیں۔“

”تم ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں کیوں نہیں لگاتے صبح کے پانچ بجے ہیں شام کے نہیں۔“

”اوہ اچھا۔ صبح میں۔ آہ گوش میری توجان ہی نکل گئی تھی۔“

یہ کیل تھا، ایگز امز کے بے جا دباؤ کا شکار بے جا اسٹوڈنٹ۔ یعنی مچھڑ یونیورسٹی میں اس دیو کا زندگی ہو چکا تھا جسے ”ایگز امز“ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ پینڈ نہیں کیا جاتا۔ تو ایگز امز کے دنوں کی ایک کیل ہی ایسی کاپی نہیں ہے اور بھی مختلف کاپیاں ہیں۔

”میں نے آپ کو کیس دیکھا ہے؟“ اپنے فیشن اور لمبائیت کے لیے مشہور لنڈا۔

”تم چار پانچ مہینے پہلے لا بیرری آئی ہو گی۔“

”ہاں آئی تو تھی۔ ایک میگزین چاہیے تھا۔ پر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”سارا سمسٹر چھوڑ کر صرف امتحانات کے دنوں میں لا بیرری آنے والے مجھ سے ہی کہتے ہیں ”آپ کو کیس دیکھا ہے۔“ دوسرے سمسٹر کے امتحانات میں آکر بھی تم ہی کہو گی۔ میں تھک جاتا ہوں بار بار اس سوال کا جواب دے دے کر اس لیے ابھی سے جتا رہا ہوں میں لا بیرری میں ہوں اور میں لا بیرری میں دیکھا اور پایا جاتا ہوں۔“

”آپ کا ”کلن“ زبان، داغ، خاص کر بالوں میں سے طوطے کیسے اڑتے ہیں کبھی دیکھا ہے۔“

”نہیں۔ مچھڑ یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس سے امتحانات کے دنوں میں ملیں۔“

”آئی لو یونی میوزیم۔“ ایما۔ عام دن۔

”میوزیم۔ یونی میں میوزیم ہے؟“ ایما۔

امتحانات کے دن۔

”اوہ۔ ٹیکسٹر کو کیا ضرورت تھی اتنا کچھ لکھنے کی۔ ایک آدھ ڈرامہ کافی نہیں تھا۔“ جو نا تھن 40%

بمقابل لینے والوں میں سے۔

”کون ٹیکسٹر؟“ ڈنشل مچھڑ کے ہر کلب اور بار کے بارے میں جاننے والوں اور 40% کے خواب دیکھنے والوں میں سے۔

”میرے چچا۔“ جو نا تھن غصے میں۔

”تمہارے چچا ڈرامے لکھتے ہیں۔؟ کس تھیٹر میں لگتے ہیں ان کے ڈرامے۔“ دو فکٹس مل جائیں گی؟

ایک اور۔

”تم ڈبہ کیوں کھا رہے ہو؟“ لوک ہاؤس ہال میٹ

”میں تو پرا کھا رہا ہوں۔“ بے حد لائق فائق ملباسا پلا سا اسٹوڈنٹ کرس۔

”تم پرا۔ ڈبہ سمیت کیوں کھا رہے ہو؟“

”نہیں! میں تو صرف پرا کھا رہا ہوں۔ یہ دیکھو۔“

”اوہ۔ میری پلیٹ میں یہ ڈبہ کہاں سے آگیا۔؟“

گول گول چشمہ ملفوف آنکھیں باہر کو۔

”تمہارے منہ میں بھی ڈبہ کا کچھ حصہ ہے۔“

اور خدا کے لیے کرس اس کھڑکی کو بند کر لو تم اوک ہاؤس کے وہ واحد اسٹوڈنٹ ہو گے جو اتنی ٹھنڈ میں کھڑکی کھول کر پڑھ رہا ہے۔“

”کھڑکی۔۔۔ اوہ۔۔۔ تو یہ کھڑکی ہے۔ میں بھی سوچ رہا تھا، میرے سارے کپڑے کہاں گئے۔ اور میرے جوتے بھی۔“

لا بیرری کی طرف جاتے ہوئے۔

”ہائے۔ جینا کیسی ہو؟“ مائیکل کیمسٹری اسٹوڈنٹ

”میں ماریا ہوں۔“ بائیو اسٹوڈنٹ۔

”جینا ماریہ نا۔؟“ ہارنہ مانتے ہوئے سر کھجاتے ہوئے۔

”ماریہ ایڈم! دونوں ہونٹوں کو بگاڑتے ہوئے۔“

”ہاں ہاں وہی جو مک لارین P13 (پیش قیمت کار) میں آئی ہے۔“

”میری تیسری نسل میں سے شاید کوئی مک لارین خرید کر اسے ہاتھ لگا سکے، میں ایسی جرات فی الحال نہیں کر سکی، میری حیثیت فری بس سے آنے والی ہے۔ اور تم؟“

”میں۔۔۔؟“ سر کھجاتے ہوئے ہی۔

”ہاں تم۔“

”مطلب۔ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں پڑھنے لا بیرری جا رہا ہوں سارا۔“

”ماریہ۔ مطلب تم کون ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

سر کھجانے کی باری اب ماریہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔

”میں اچھا بائے۔ میں لیٹ ہو رہا ہوں سوزین۔“ چلا جاتا ہے۔

”میں کون ہوں۔ کیا نام ہے میرا؟“ جاتے ہوئے۔

”تمہیں تو لا بیرری جانا تھا نا؟“ ماریہ پیچھے سے

چلاتی ہے۔
 ”تم یونیورسٹی سے باہر کی سمت جا رہے ہو۔“
 ”تو تعلیمی دور میں کم سے کم دس بار ہم یہ ضرور سوچتے پائے جاتے ہیں کہ امتحانات میں فیل ہونا اتنا آسان اور پاس ہونا اتنا مشکل کیوں ہے؟ اسی فیصد پر ہے اسی ایک لیکچر باب سوال پر کیوں مشتمل ہوتے ہیں جو آپ مس کر چکے ہوتے ہیں۔؟“
 ”فیل ہونے کی بڑی وجہ کیا ہے؟“
 ”میرا خیال ہے یہ امتحانات ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

”Night before exams is like a night before christmas, you can't sleep and yet hope for a miracle“

اسٹوڈنٹس اپنے تعلیمی دور میں معجزات پر بہت یقین رکھتے ہیں اور ان کے رونما ہونے کی بھی دعائیں کرتے ہیں۔ دوسرا اور تیسرا باب پڑھنے کے بعد وہ یہ دعا کرتے سوجاتے ہیں کہ چوتھے پانچویں اور چھٹے باب میں سے کوئی سوال نہ آئے۔ اور سارا پرچہ دوسرے اور تیسرے باب پر مبنی ہو۔ چلو فرض کیا اگر چھٹے باب سے کچھ آئی گیا تو اسی فیصد دوسرے اور تیسرے ابواب سے جو آئے گا وہ پاس کروادے گا۔ چلو پچاس فیصد ہی سہی۔۔۔ چلو چالیس ہی سہی اچھا چلو تیس ہی سہی۔۔۔ بس بہت ہے معجزاتی دعائیں۔۔۔

امتحانات کے دوران سب سے زیادہ اسٹوڈنٹس خوش فہم ہوتے ہیں۔ امتحانات کے بعد سب سے زیادہ دنیا بھر میں دعائیں اسٹوڈنٹس کرتے ہیں۔

سب سے زیادہ خون امتحان نامی بلا چوستی ہے اور کوئی پھانسی حقیقی موت رزلٹ کے دن سب سے زیادہ کھائی دیتی ہے۔

جی ہاں۔۔۔ سچ ہے یہ۔۔۔
 امتحان گاہ کے آخری پانچ منٹ میں ہر اسٹوڈنٹ مافوق الفطرت طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ وہ ساری

کتاب لکھ ڈالنا چاہتا ہے۔ لیکن وقت ہی نہیں ملتا۔ اور ایک بڑی دردناک حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ یاد بھی آخری منٹوں میں آتا ہے امتحانات ایک لمحے کے لیے۔
 ”میں نے سارا مسٹر ٹھیک سے کیوں نہ پڑھا؟“
 ایک سوال، محاسبہ اور پچھتاوا جو امتحانات کے ختم ہوتے ہی اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔ ویسے اسے مرنے جانا چاہیے، ہمیشہ کے لیے۔ ایویں ذہن میں کلبلا کر احساس زیاں جاگتا ہے۔
 ”مجھے تھوڑی سی دیر کے لیے سو جانا چاہیے۔۔۔ میں پچھلے پچیس منٹ منٹ سے بڑھ رہا ہوں۔ آخر نیند پر بھی میرا حق ہے۔“ ایک خواہش جس پر فوری عمل کیا جاتا ہے۔

تو سب اسٹوڈنٹس اس سوال کا جواب جاننے سے قاصر ہیں کہ امتحانات میں اتنی نیند کہاں سے آجاتی ہے۔ بھوک اتنی کیوں لگنے لگتی ہے۔ ٹی وی، میسجنگ، یوٹیوب، نیوٹر پہلے سے زیادہ دلچسپ کیوں لگتے ہیں۔ کتابوں کی پہچان مشکل کیوں ہو جاتی ہے۔

ویسے امتحانات سے پہلے پوسٹ ایگزامینرز پلان کر لی گئی تھیں۔ جیسے کرشمے آنے سے پہلے کرشمے کے بعد دی اور لی جانے والی پارٹیشن پلان کی گئی تھیں۔ کون کون آئے گا، پانی کہاں ہوگی، کیا کیا ہنگامہ بپا کرنا ہوگا۔ امتحانات کے ختم ہونے کی خوشی میں نہیں بلکہ امتحانات سے جان چھوٹ جانے کی خوشی میں۔ آس پاس کے سب ہی بارز، کلبیس، ریسٹورنٹس اس انتظار میں تھے کہ جلدی سے امتحانات شروع ہو کر ختم ہوں اور بے چارے اسٹوڈنٹس کچھ پارٹی شائلی مرنے شہرے کریں۔ بے چارے اسٹوڈنٹس۔
 تو یونیورسٹی میں کچھ اس قدر پڑھنے والے اسٹوڈنٹس بھی تھے۔
 ”یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے۔ شاید تم میں سے جب۔۔۔“ ٹانگ سیٹھرتی جولی۔
 ”ہاں شاید۔۔۔ کئی دنوں سے میں ٹھیک سے منہ نہیں دھو سکا۔ کپڑے بھی۔۔۔ دانت برش کرنے کا تو

پاکل وقت نہیں ملا۔ ایگزامینز ہیں نا۔“ پیلے دانت نکال کر مسکرا کر کہا جانے والا تاریخی جملہ۔۔۔ جی ہاں تاریخی ہی۔
 ”تمہاری شکل مارشل سے ملتی جلتی ہے۔“
 ”میں مارشل ہی ہوں۔ پڑھ پڑھ کر ایسا ہو گیا ہوں۔“

”اوہ shurup (شٹ اپ کی جدید شکل) اس حالت میں گھر نہ چلے جانا۔ اپنی ڈی این اے رپورٹ بھی دکھائی تو بھی گھر والے گھر میں گھنے نہیں دیں گے۔“

”آخر تم تیز تیز کیوں نہیں چل رہے۔ ہم یونیورسٹی سے لیٹ ہو رہے ہیں۔“
 ”مجھ پر بہت بوجھ ہے گراہم!“
 ”پر تمہارے ہاتھ تو خالی ہیں۔۔۔“

”میرے سر پر۔۔۔“
 ”تم نے تو آج ٹوپی بھی نہیں پہنی۔“
 ”میرے ذہن پر یار۔۔۔! پڑھائی کا بہت بوجھ ہے۔ میں نے کچھ غیر ضروری کتابیں بھی پڑھ ڈالیں۔“

”تمہیں یاد ہے نا تمہیں 100% میں سے مارکس لینے ہیں 1000% میں سے نہیں۔۔۔“
 ”ہاں پھر بھی۔۔۔ پھر بھی میں نے سوچا شاید۔۔۔ شاید۔“

یہ صرف کچھ جھلکیاں ہیں امتحانات کے دنوں کی۔ اور ظاہر ہے اسٹوڈنٹ دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتا ہو۔ کم و بیش ایک سی حالت سے گزرتا ہے۔ ایک جیسے احساسات کا مالک ہوتا ہے کیونکہ وہ بے چارہ اسٹوڈنٹ ہوتا ہے نا۔ بے چارہ۔

یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس کی ایک خاص تعداد Modafinil اسٹڈی ڈوز بھی لیتی ہے۔ جسے کھا کر اسٹوڈنٹس کے بقول وہ بنا تھکے اور بنا سوئے کئی گھنٹے آرام سے پڑھ سکتے ہیں۔ بہت سے اسٹوڈنٹس دوائیں، ٹونک بھی لیتے ہیں۔ دیواروں پر نوٹس چپکاتے ہیں پڑھنے سے متعلق اکثر اسٹوڈنٹس کے کمرے کی دیواریں ان نوٹس سے بھری ہوتی ہیں پھر

کہیں جا کر ان کے 40% مارکس آتے ہیں۔ Unicorn ہر اسٹوڈنٹ کے ٹیبل پر رکھا نظر آنے لگتا ہے۔ ایگزامینز سے متعلق اقوال دیواروں پر چپکا دیے جاتے ہیں آئینے میں اپنی ہی شکل دیکھ کر ڈرا جانا ہے۔ اور رات کو جتنی منی سی نیند میں بھی کتابیں آکر ڈراتی ہیں۔

تو وہ وقت آچکا تھا جو نیندیں تو بلاشبہ بھگائے گا ہی، ساتھ نائیاں، داویاں اور پھوپھیاں بھی یاد کروا کر جائے گا یہ وہی دن ہوتے ہیں نا جب لگنے لگتا ہے کہ ایگزامین سیزن زندگی سے کبھی جائے گا بھی۔ زندگی کبھی معمول پر بھی تھی۔ رات کو اپنی مرضی سے سونے والی، صبح آرام سے اٹھنے والی۔ پس ہانکنے والی اور آدھ گھوم پھر کر مستیاں کرنے والی۔ آکسفورڈ روڈ اور اس سے غسک دوسری سڑکوں پر چل قدمی کرنے والی۔ اف کبھی اتنے فاسٹ رہے ہیں ہم۔۔۔ پرنٹ ورک میں بڑی بڑی میزوں پر اسنو کرکھیلنے والے، اوک ہاؤس کے گراؤنڈ میں آگ جلا کر اس کے گرد رات رات بھر بیٹھے رہنے والے۔ اتنے فاسٹ۔ کیا یہ سب ہو نا رہا ہے۔ سچ؟

پروفیسرز اسٹوڈنٹس کو دیکھ کر زیر لب مسکرا دیتے، جیسے کہتے ہوں، اب چڑھے گا اصل فلو۔ لائبریری اسٹاف جن بھوت بن جائے کہ اصل امتحان تو اسٹوڈنٹس ان کا لینے والے تھے۔ جو نہیں بھی موجود ہو گا وہ بھی مانگا جائے گا۔

لائبریری اور لرننگ کامنز (پڑھنے کی جگہ) رات دن کھلے تھے اور کچھ ایسا ساں پیدا کر رہے تھے جیسے وہاں عام انسان نہ ہوں، کسی سیارے سے اتری مشینی مخلوق ہو جو نہ کھاتی ہے نہ سوتی ہے بس پڑھتی ہی رہتی ہے۔ اگر ساری مائچسٹری کو ایک دلہن مان لیا جائے تو۔

”Commanrs alan gilbert tearing“

المعروف علی لرننگ کامنز اس دلہن کے ماتھے کا جھومر قرار پائے۔ چار اطراف شیشے سے سجی، شیشے سے بنی اور بلڈنگ کے اندر بیٹھے آپ باہر کی دنیا سے لا

تعلق نہیں رہتے۔ کسی ارب پتی کے ذاتی گھر کی طرح بے حد نفیس اور صاف ستھرا۔ فائو اشار ہوٹل کی طرح چمکتی دھمکتی گھر کے ماحول سے کہیں بڑھ کر آرام دہ اور پرسکون۔ نرم گرم علی کامنر۔

اسٹوڈنٹس اپنی مرضی سے اپنی تعلیم کے مطابق کامن روم کا انتخاب کر سکتے تھے۔ ہال میں بھی پڑھا جا سکتا ہے جہاں کئی دوسرے اسٹوڈنٹس پڑھنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ گروپ میں بھی الگ سے گروپ روز میں بھی۔۔۔ دو دو چار چار کے گروپ میں بھی۔ یہاں ہر طرح کی سہولت موجود ہے، چارنگ، ایل سی ڈی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، وائٹ بورڈ وغیرہ وغیرہ۔

پورے لرننگ کامن کی ڈیراننگ اور سجاوٹ ایسی ہے کہ گمان ہوتا ہے پڑھنے نہیں آئے۔ تفریح کے لیے کسی ہوٹل میں آئے ہیں۔ ساتھ ہی کیفے ہے۔ اسٹوڈنٹس لرننگ کامن میں آجائیں تو انہیں کسی دوسری ضرورت کے لیے باہر نہیں جانا پڑتا وہاں سب کچھ مہیا کر دیا گیا ہے۔

”تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے؟“ عالیان ہاتھ میں دو عدد کافی مک لیے اس کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ وہ اوپن ہال میں اکیلی بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ اسے ضرورت پڑتی تھی تو وہ اپنی کسی کلاس فیلو سے مدد لینے چلی جاتی تھی۔

”تم برنس کے اسٹوڈنٹ ہو اور میں انگلش لٹریچر کی۔۔۔ تم میری مدد کیسے کر سکتے ہو۔“ جی ایگز امر کے دنوں میں اسٹوڈنٹس چرچے بھی ہو جاتے ہیں۔

”جانتا ہوں۔۔۔ لیکن تمہارے سبجیکٹ میں ایک اسکول کا بچہ بھی تمہاری مدد کر سکتا ہے۔“ عالیان جیسے اسٹوڈنٹس کامن روم البتہ عروج پر ہوتا ہے۔

”تو وہ بچے اسکول کیوں جا رہے ہیں۔ یہاں آکر ماسٹرز کیوں نہیں کر لیتے؟“

عالیان نے قہقہے کو بلند ہونے سے روکا۔ کیا جواب دیا تھا امرحہ نے۔

”ان سب باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟“

امرحہ نے ہونٹ سکیڑے۔

”سیدھا اور صاف مطلب ہے، یہ بہت سہل سبجیکٹ ہے۔“

”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“ مزاج بگڑنے لگا تھا امرحہ کو نیند کی ضرورت تھی۔

”تمہیں بتا رہا ہوں۔“ عالیان بھرپور نیند لے کر آیا تھا جسم کر بیٹھ گیا۔

”تم طنز کر رہے ہو۔“

”حقیقت کو تمہاری زبان میں طنز کیا جاتا ہے؟“ اس نے ذرا آگے ہو کر اس کے سامنے رکھی کتاب کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو امرحہ نے فوراً کتاب کو چھین لیا۔

”اف۔ اتنی بد تمیزی۔“ اس نے ایسے طنز کیا جیسے اس نے برا مان لیا ہے پھر بھی وہ مزید پھیل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”کافی پی لو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ ہنسی دبانے کے لیے اس نے ہونٹ کا کوتا دانتوں میں لیا۔

”کس نے کہا تھا میرے لیے کافی لانا کو؟“ اسٹوڈنٹس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ٹوٹ لینے والی یہ کہہ رہی تھی۔ ٹھیک ہے آخر کار ہر انسان بدل ہی جاتا ہے۔

امرحہ کو یہ بات بری لگی تھی کہ اس نے اس کے مضمون کو لے کر ایسا کہا۔ دنیا میں ہر انسان نیوٹن اسٹیفن یا عبدالسلام نہیں بن سکتا، ذہانت کا معیار مشکل مضمون پڑھنا ہی نہیں۔ اگر ہر لڑکی مادام کیوری جیسی نہیں بنتی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کندہ بنے۔ یا صفر ہے۔

وہ لاء پڑھ کر مارگریٹ تھیچر آئرن لیڈی بن سکتی ہے۔ ایم اے اردو کر کے بانو قدسیہ بن سکتی ہے۔ معمولی سمجھے جانے والے مضامین کو پڑھ کر بھی وہ کیا نہیں کر سکتی۔

”مجھے الہام ہوا تھا۔“ وہ اس کے دے دے غصیلے انداز پر زیر لب مسکرا رہی تھی۔

باہر برف باری شروع ہو چکی تھی۔ دونوں قد آدم

لیٹی کھڑی کے پاس بیٹھے تھے۔

”برف باری ہو رہی ہے امرحہ! دیکھو۔“ اس کا ہنسنے کا لہجہ اس کا غصہ کم کرنا تھا۔ لیکن اگلی بات کر کے اس نے غلطی کی۔

”تم تو شاید پہلی بار دیکھ رہی ہو گی؟ اس نے کھڑکی سے باہر آسمان سے اترتے روئی کے گالوں سے برف کے گولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

امرحہ کا غصہ یک دم بڑھ گیا ”کیوں میں کیوں پہلی بار دیکھ رہی ہوں گی؟“

”ہمارے پاکستان میں سب ہے۔ سب۔“ اس نے ایسے شانے لہرائے جیسے کہتی ہو یو انگریز۔ او shurup

”برف باری بھی؟“ وہ ٹھوڑی کھجائے لگا پھر اس نے ہاتھ ٹھوڑی تلے ہی نکالیا۔ کرسمس ٹائٹل لارڈ میز اپنی پسندیدہ فلم دیکھتے ہوئے اپنے قہقہے کا گلا دبائے ہوئے۔

”یونیورسٹی کی یادداشتیں ڈاٹ کام۔“

”ہاں بالکل۔“ شانے پھر اچکائے۔

سندری امرحہ مزے سے سچ کا گلا دباتے ہوئے لارڈ میز کو کم عقل سمجھتے ہوئے کسی انداز میں ایسی لمبی چھوڑتے ہوئے ایک جھوٹ سوکھانیاں ڈاٹ کام۔

”لاہور میں برف باری ہوتی ہے امرحہ۔ اچھا۔ کب کب؟“

”جب جب یہاں ہوتی ہے۔“ امرحہ کے انداز کی نظر اتاری جانی چاہیے تھی۔

”اچھا۔ اور کیا گیا ہوتا ہے لاہور میں۔؟“

لارڈ میز نے ریموٹ پھینک دیا ہے، انہیں صرف یہی فلم دیکھنی ہے۔

”سب۔ سب۔ جو یہاں بھی نہیں ہے سب ہے وہاں۔۔۔ جی ہاں۔ پھول، پودے، اسکول، کالج، یونیورسٹیاں، عجائب گھر، بڑے بڑے بازار، شاپنگ سنٹر، ہوٹلز، سپر جنرل اسٹورز، ٹرین، موٹروے، بڑی بڑی سڑکیں، سب ہے ہمارے پاس۔ تم نے کیا سمجھ رکھا ہے نہیں۔؟“

وہ اتنی دلچسپی اور محویت سے اسے دیکھ رہا تھا جیسے چھوٹے بڑے سب ٹام اینڈ جری دیکھتے ہیں۔ اس کے بدل انداز۔

”تم نے کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں؟“ انداز کچھ ایسا تھا جیسے عدالت میں جج کا ہوتا ہے۔

”جتاؤ جوزف تم نے قتل کیوں کیا۔ کیوں کیا۔۔۔ جواب دو۔۔۔ ٹھہرو۔ سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔۔۔ الیکٹرک چیر تمہارا مقدر ہے۔ ہاں تمہارا مقدر۔“

”لاہور میں سب نہیں ہے امرحہ! سب کچھ تو بائیسٹر میں ہے۔“ مسکراہٹوں میں سب سے پیاری مسکراہٹ سجا کر عالیان نے کہا۔

”ہاں تم تو یہی کہو گے۔“ سندری امرحہ نے بروں میں سب سے بری طرح منہ بنا کر کہا۔

”میں۔۔۔ ہاں میں ہی تو یہ کہوں گا۔۔۔ لاہور خالی ہو چکا ہے۔ اس کے پاس سب نہیں ہے۔ تم تو یہاں بیٹھی ہو۔ اس کے پاس سب کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا سب تو بائیسٹر میں آچکا ہے۔“

کھڑکی کے باہر گرتے برف کے گالوں نے اتنی پیاری بات پر تالیاں بجائیں۔ وہ سفید سے نیلے پیلے ہرے ہو گئے۔ اور امرحہ خاموش ہو گئی اور کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”دیکھو۔“ اس نے اپنا موبائل امرحہ کے آگے کیا جہاں لاہور کے موسم کی ساٹھ سالہ تاریخ موجود تھی۔

”لاہور میں برف باری نہیں ہوتی۔“ کہہ کر اس نے بلند قہقہہ لگایا۔ اس بار اس نے آواز دھیمی رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اوھر اوھر بیٹھے اسٹوڈنٹس نے اس کی طرف دیکھا کہ اتنے دباؤ میں بھی کون ایسے دل سے ہنس رہا ہے۔ عالیان۔۔۔ اور کون۔۔۔

”ہوتی ہے۔“ وہ اپنی بات پر قائم رہی۔

”سندری امرحہ۔۔۔ سچ سچ۔۔۔ لاہور کی چٹنگیں اور گپوں کی نہ ختم ہونے والی ڈوریں۔“ لاہور کی تاریخ اور رنگیلے لوگوں سے اکساب۔

عالیان نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔
”اور یہ سب؟“ اس نے موبائل پر نظر آنے والے کالم کی طرف اشارہ کیا جو لاہور کے موسم کے بارے میں تھا۔

”یہ غلط ہے۔ کسی جھوٹے انسان نے لکھا ہے۔“ اس بار امجد نے شانے اور گردن ایک ساتھ اچکائے اور اتنے یقین اور سنجیدگی سے کہا کہ عالیان کا جی چاہا کہ کہہ دے کہ ہاں ساری دنیا جھوٹی ہے غلط ہے۔ صرف تم سچی ہو۔ مجھے صرف تمہاری بات پر یقین ہے۔ لیڈی مہر کی طرح ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر وہ اپنی مزید مسکراہٹ دبا کر اسے دیکھتا رہا۔

دونوں کے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی۔
سندری امجد ایسے ہی جھوٹ بولتی جا میں اور لارڈ میز ایسے ہی سنتے جائیں۔ وہاں کچھ ایسا ماحول تھا۔

علی رنگ کے اوپن ہال میں۔ کھڑکی کے پاس۔
”اگر میں لاہور جا کر رہوں اور برف باری نہ ہو تو تم مجھے کہو گی کہ اس سال ہی نہیں ہوئی۔ اگر میں اگلے سال تک کے لیے لاہور میں رک جاؤں تو تم کہو گی کہ موسم میں خطرناک حد تک تبدیلی آ چکی ہے۔ اور اگر میں آس پاس کے لوگوں سے تصدیق کے لیے پوچھنا شروع کر دوں تو تم کہو گی کہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ تمہاری بے عزتی کروانا چاہتے ہیں۔“ اپنی ساری ہمت مجتمع کر کے اپنی ہنسی کو اندر ہی روک کر وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پایا۔

”تو تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو کہ سب کچھ تمہارے پاس ہی ہے؟“

وہ ہنسا ”تم دو شہروں کے سرسری جائزے میں بھی حاسد ہو امجد۔ میں نے یہ کب کہا کہ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ کیا تم پہلی بار برف باری دیکھ رہی ہو۔ بس تم برا مان گئیں۔“

”میں بہت یاد دیکھ چکی ہوں۔ بس۔“ امجد باز آنے والی نہیں تھی۔

”ٹھیک ہے پر کہاں؟“

”فلموں میں۔ لی وی پر۔“ میگزینز میں۔“ اس

نے روانی سے کہا۔
عالیان نے سر کو اٹھایا۔ علی رنگ کی چھت کو دیکھا اور اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ ہال میں موجود ذرا زیادہ فاصلے پر موجود اسٹوڈنٹس بھی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگے اور قریب کی نشستوں پر ذرا دیر کو اوٹھنے والے اسٹوڈنٹس ڈر کر ’جھرجھری بھر کر چونک کر آس پاس دیکھنے لگے۔“

”عالیان!“ ڈر کر اٹھ جانے والی میٹھن نے اسے گھورا۔
عالیان نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ امجد خاموشی سے کتاب پڑھنے لگی کہ وہ چلا جائے لیکن اپنی ہنسی قابو میں کرنے کے بعد وہ اس کی ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا اور اسے سرسری دیکھنے لگا۔ وہ کتاب کا ایک صفحہ الٹا اور اسے دیکھتا۔ پھر اسے دیکھا اور جلدی سے صفحہ الٹ دیا۔ وہ غیر ارادی طور پر اس کے مزاج کو بگاڑ چکا تھا۔

”تمہاری آنکھیں۔“

”میری آنکھیں کیا۔“ امجد کو یقین تھا اب اس کی آنکھوں کو نشانہ بنائے گا۔ کالی۔ گہری۔

”مجھے بھوری آنکھیں پسند نہیں۔“ اس نے جلدی سے اسے ٹوک دیا۔

”میں نے تم سے اپنی آنکھوں کے بارے میں تو نہیں پوچھا۔“

”تم میری آنکھوں کو برا کہتے میں نے پہلے ہی کہہ دیا۔“ کیا حکمت عملی اپنائی تھی امجد نے۔ واہ۔

”میں نے تمہیں برا کہا؟“

”کہہ سکتے تھے۔ امکانات تھے۔“ کافی ذہین تھی امجد ویسے۔ باوام کھاتی رہی تھی نا۔

”جب کہا ہی نہیں تو۔۔۔؟“

”کہہ دیتے تو۔۔۔؟“

”میں تو بس اتنا کہنے لگا تھا کہ تمہاری آنکھیں بہت گہری ہیں۔ جب تمہیں پہلی بار روتے ہوئے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ بہت آنسو بہا چکی ہیں بہت روتی رہی ہیں۔“

نوٹس لکھتے امجد کے ہاتھ رک گئے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اسے اس سے خوف محسوس ہوا۔ وہ اس کے بارے میں اور کس کس بات کا ایسے ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا چکا تھا۔ اس کی نحوست کا بھی۔ کیا اس کا بھی کہ لاہور میں وہ کتنی غیر اہم رہی ہے۔ گھر کا خاندان کا حصہ ہو کر بھی حصہ نہیں سمجھی گئی۔ اس پر کیسے کیسے طنز کیے جاتے رہے ہیں۔ اس کا ایسے کیسے مذاق اڑایا جاتا رہا ہے۔

وہ امجد جو رات کے اس وقت بارہ بجے کے قریب مکمل اعتماد سے علی رنگ کا من میں بیٹھی بڑھ رہی ہے، واہ کے کمرے میں خوف سے چھپ جا رہی تھی کہ گھر میں آنے والے مہمان اسے دیکھ نہ لیں۔ اگر وہ کسی قریب میں چلی ہی جاتی تو کوئی ایسی جگہ تلاش کر لی جہاں کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ وہ اپنے ہم عمروں کو باتیں کرتے، قہقہے لگاتے، اچھل کود کرتے دیکھتی لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلتی۔ ان کے پاس جانے کی ہمت نہ کرتی تھی۔

”کیوں روتی رہی ہو تم؟“

”میں کبھی نہیں روتی۔“ کس قدر خوفناک سوال پوچھ لیا تھا عالیان نے۔ وہ اس سوال کا جواب کبھی نہیں دے گی۔

”یہ جھوٹ ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں کبھی نہیں روتی۔“ کہانا۔

”جو کبھی نہیں روتا وہ انسان نہیں ہوتا۔ تم انسان نہیں ہو کیا؟“

”تم انسان ہو۔ تم روتے ہو؟“

”ہاں! رویا ہوں، بہت رویا ہوں۔“ خاموشی کے بوجھل وقفے کے بعد وہ بولا۔ اس کی آواز اداس ہو گئی۔

”پہلی بار اتنا اداس نظر آیا۔“

”کیوں؟“ امجد کو اپنی غلطی کا فوری احساس ہوا۔

خاموشی سے وہ جیسے سر جھکا کر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

”دیکھا برا لگتاں۔۔۔ اپنے رونے کی وجہ کوئی بھی بتانا پسند نہیں کرتا۔“

”میں چھ سال کا تھا جب رات بھر اپنے ہاتھ کو اپنی

ماما کے ہاتھ میں دیر ان کے سرہانے بیٹھا رہا تھا۔ صبح ان کا ہاتھ سرد ہو چکا تھا اور سخت بھی۔ اور جب لوگوں نے میرے ہاتھ کو ان کے ہاتھ سے نکالنے کی کوشش کی تب میں رونے لگا۔ اور بعد میں بھی اس منظر کو یاد کر کے روتا رہا۔ یہ میرے اب تک کے رونے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔“

امجد کو اپنے رویے پر شرمندگی ہوئی۔ ”آئی ایم سوری۔“

وہ اٹھا اور چلا گیا۔ اس کی چال بتا رہی تھی کہ وہ خود کو کس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ امجد نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا اپنے بارے میں اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ کافی خود غرض ہوتی جا رہی تھی۔ غالباً ”ٹھیک کہہ گیا تھا کہ جو روتا نہیں وہ تو انسان ہی نہیں ہے۔ اور سب انسان روتے ہیں۔“

کبھی نہ کبھی۔ کسی نہ کسی وجہ کو لے کر۔

لیڈی مہر اپنے بچوں کے بارے میں صرف اس محبت کا ذکر کرتی تھیں جو ان سب کے درمیان تھی۔ وہ کبھی یہ نہیں بتاتی تھیں کہ کون کیا، کیوں اور کیسے ہے۔

وہ اس کا ڈز سینٹر تک کیسے پہنچا۔ اس کا ماضی کیا ہے۔ وہ کہا کرتیں ”ان کے بچوں کا ماضی کتنا بھی بھیا تک رہا ہو، ان کا حال پر غور ہے اور مستقبل شان دار۔ وہ ان کے بچے تھے اور وہ ان کی تکلیفوں کو ان کے

سوا کسی اور کے ساتھ زیر بحث نہیں لاتی تھیں۔

کبھی مورگن، شارلٹ، ڈینس یا کوئی اور ان کے پاس پریشان صورت لیے آتا تو گھنٹوں گھر بند کیے اپنے اس بچے یا بچی کو لیے جانے کو کون سی باتیں کرتی رہتیں۔

امجد سمجھ سکتی تھی کہ آپ کتنے بھی مضبوط اور بہادر بننے کی کوشش کریں۔ ماضی سامنے آ کر تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی پر دو انہ سا ضرور کر دیتا ہے۔ آپ اپنے حواس کھونے لگتے ہیں۔ عالیان کے بارے میں اگر امجد نے کچھ جانتا چاہا تو انہوں نے صرف اتنا

کہا۔

”وہ میرا بہت بہادر بیٹا ہے اور اپنی ماں مار گریٹ سے مثالی محبت کرتا ہے۔“

بس اس سے آگے انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ایک سمجھ دار خاتون تھیں۔ انہیں معلوم تھا کس کے بارے میں کتنی بات کرنی ہے اور اپنے بچوں کے لیے تو وہ بہت سمجھ دار تھیں۔

امرد اپنے رونے کو لے کر بیٹھی تھی اور سمجھتی تھی۔ اس سے زیادہ دکھ کسی کو ملے ہی نہیں۔ اس سے زیادہ زیادتی زندگی نے کسی کے ساتھ کی ہی نہیں۔ قدرت نے سب عم کے ہاڑ اسی پر توڑ ڈالے ہیں۔ کسی خوشی کا حق دار اسے ٹھہرایا ہی نہیں گیا۔ ایک امرد ہی گیا۔ ہم سب یہی سوچتے اور اسی سوچ پر یقین رکھتے ہیں۔

انسان نے سب سے زیادہ علم جو خود کو سکھایا ہے وہ ناشکر گزاری اور شکوہ سرائی ہی تو ہے۔

سرسبز مانچسٹر برف سے اٹ چکی تھی۔ برف پر دی نظر آتی تھی، پہلی بار برف کے ایسے ڈھیروں کو دیکھنے والوں کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان ڈھیروں پر پھسکیں، گولے بنا بنا ایک دوسرے کو ماریں۔ اور بہت سے اسٹوڈنٹس وقت نکال کر ایسا کر بھی لیتے تھے۔ مانچسٹر سفید پری کا راج تھا اور گرم خطوں سے تعلق رکھنے والے اس سفید پری پر فدا ہوئے جا رہے تھے جبکہ ٹھنڈے خطوں کے باشندے ایسے موسم سے بہت چڑتے ہیں۔ وہ ہمارے دلدادہ ہوتے ہیں کم نہیں منہ سے بھاپ نکالتے اس موسم سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اتنے ڈھیر سارے گرم کپڑے پہننے سے انہیں کوفت ہوتی ہے۔ پاکستانیوں کی تو خیر جان ہوتی ہے سردیوں میں۔ اور وہ سردیوں کے مختصر دورانیے کو ایسے مناتے ہیں جیسے مغربی کرسمس کی چھٹیوں کو۔ دستانے، ٹوپی چڑھانے، کانوں کے گرد مفلر لپیٹنے، گرم کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے۔ سرخ ناگ لیے۔ دھند کو اپنے اندر اتارتے دھند کو چیرتے چلتے امرد یونیورسٹی میں آتے ہی مہووت سی ہو جاتی۔ دھند یونیورسٹی کی عمارتوں سے ہوتی زمین پر اتر رہی

ہوتی۔ وہ تھوڑی دیر کو کھڑی کی کھڑی رہ جاتی۔ ”کیا یہ کسی خواب کا منظر ہے۔ یا خواب ہی ہے؟“

اسٹوڈنٹس تیزی سے آ جا رہے ہوتے۔ ٹیلے، پیلے، سرمئی، کالے، سفید کوٹوں والے، ٹوپیوں والے، منہ سے بھاپ نکالتے۔ ہاتھوں کو رگڑتے یا جیبوں میں دیے کتنے پیارے مناظر تھے۔ ٹھنڈ تھی۔ برف تھی۔ دھند تھی۔ اور آزادی تھی۔

دوست تھے۔ ہلا گلا تھا۔ اور کوئی دکھ نہ تھا۔ دو دن بعد امرد تھوڑا سا وقت نکال سکی عالیان کے پاس جانے کے لیے، علی رنگ کا من کے گروپ اسٹڈی روم کے شیشے کے دروازے کے بارہ اسے نظر آ گیا۔ کم سے کم گیارہ اور اسٹوڈنٹس بیٹھے تھے اور وہ وائٹ بورڈ کے پاس کھڑا لیکچر سارے رہا تھا۔ پین سے وہ وائٹ پر کوئی سوال حل کر رہا تھا۔ امرد نے اس کے لیے کافی لی تھی اب اتنے اسٹوڈنٹس میں وہ ایک مک کافی تو نہیں دے سکتی تھی، اس لیے پلٹ آئی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی جب عالیان تقریباً اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا۔

”یہ میرے لیے لائی ہو۔“ اس نے مک پکڑ کر گھونٹ بھرا۔

”ہاں!“ وہ مک ہاتھ میں لے چکا تھا۔ کافی پی رہا تھا اور پوچھ رہا تھا امرد نے اسے داؤ دی۔

”مفت!“ وہ سیڑھیاں اترنے لگا اس کے ہال کی طرف بڑھنے لگا۔

”ظاہر ہے مفت۔ یہ ٹوٹ نہیں ہے۔“

”اوہ شکر کہ یہ ٹوٹ نہیں ہے۔ ویسے ہی میرے سر پر دس بارہ ٹوٹیں ہیں۔ چار تو کارل کی ہیں۔ اور وہ میری جان کو آیا ہوا ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آئی ہوں؟“

”دونوں سے انتظار کر رہا تھا تمہارا۔“ چلتے چلتے اس نے گردن موڑ کر کہا۔

”پر میں نے کب کہا تھا۔ میں آؤں گی؟“

”آنا چاہیے تھا۔“

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ امرد کو نیچے جانا تھا اسے تو نہیں نا۔

”میں تمہارے ساتھ۔“

”میرے ساتھ کیوں آ رہے ہو۔ تم بڑا بولبلکہ شاید تم کوئی لیکچر دے رہے تھے۔“

”میں بریک لینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا۔“

”میں تو صرف معذرت کرنے آئی تھی تم سے۔“

دونوں سینکڑوں فلور پر آ کر رک چکے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ کرو۔“

امرد اس کامنہ دیکھنے لگی۔

”کرو بھی۔ میں سن رہا ہوں۔“ کافی کی چسکی لے کر اس نے کہا۔

”معذرت کرنے آئی تھی۔ جب یہ کہہ دیا تو مطلب معذرت کر لی۔ اور کیا۔“

”آں۔ اچھا۔ اب آگے۔“

”آگے کیا؟“ امرد کو پھر سے غصہ آنے لگا۔

”تم اتنے پیارے سرد مانچسٹر میں رہ کر اتنی جلدی گرم کیوں ہو جاتی ہو؟“ عالیان مسکرایا یعنی امرد سے ناراض ہونا وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے غصے کو وہ پھول کی پتی کی مانند چھو کر اڑا رہا تھا۔

”اچھا چلو، ایگز امز کے بعد ملتے ہیں۔ مشکل ہے لیکن میں کر لوں گا۔ ورنہ میرا تعلیمی ریکارڈ خراب ہو جائے گا۔“

”مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”مجھے خود بھی میری باتیں سمجھ نہیں آتیں۔“

”اچھا تم جاؤ۔“

”کیسے انسان ہو تم، کسے جانے کے لیے کہہ رہے ہو۔“ کارل کی آواز ان کے قریب، لیکن پیچھے سے آئی اور اس نے بڑھ کر عالیان کی گردن دیوچ جلی۔

امرد تو فوراً وہاں سے غائب ہو گئی وہ امتحانات کے دنوں میں اس سے کوئی لڑائی مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اگلی رات کو وہ خود امرد کے پاس آیا۔

کچھ فاصلے پر بیٹھی لیزا پڑھتے پڑھتے لڑھک کر سو چکی تھی اور صوفے اور کارپٹ کے درمیان جھولتی

کافی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ پہلے تو اسے دیکھ دیکھ کر امرد اپنی ہنسی روکتی رہی پھر اس کے پاس آئی اسے دھکیل کر کارپٹ پر کیا تاکہ وہ ٹھیک سے کارپٹ پر ہی سو جائے۔ سامنے اس کا لیپ ٹاپ کھلا رکھا تھا۔ اکثر ایسی چیزیں غائب کر لیے جاتے۔ کے واقعات ہو جاتے تھے۔ امرد نے اس کی چیزیں سینٹیں اور بیگ کو اس کے سر کے پیچھے رکھا۔ ابھی لیپ ٹاپ پر اس نے ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ اس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس نے گردن موڑی تو کارل کھڑا تھا۔

”امرد The Lost Duck علی رنگ کا من میں سوئے ہوئے اسٹوڈنٹس کی چیزیں چراتے ہوئے۔ اپنی نوعیت کا چالیسواں واقعہ۔“ فون ہاتھ میں لیے وہ مسکرا رہا تھا۔ ”یہ گرما گرم خبر کچھ ہی دیر میں The Tab Manchester (اسٹوڈنٹس ویب سائٹ) میں آجائے گی۔“

امرد کا جی چاہا کہ لیزا کی ٹھنڈی ہو چکی کافی اس پر انڈیل دے، پر وہ باز رہی۔ وہ اپنی آنکھوں کی چنگاریاں دبائے اسے گھور رہی تھی اور کارل کو یہ نظر آ رہا تھا کہ اسے گھورا جا رہا ہے۔ وہ ہاتھ باندھ کر ایسے کھڑا ہو گیا جیسے سوو سوپا رازی اس کی تصویریں کھینچ رہے ہوں۔

”تمہیں غصہ آ رہا ہے؟۔ ہاں تمہیں تو غصہ آ رہا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”میں عالیان سے کہتی ہوں۔“ امرد کو آگ ہی لگ گئی۔

وہ ہنسا ”عالیان میرا باپ نہیں ہے ویسے ہوتا تو بھی وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا یہ دھمکی چلنے والی نہیں تھی کہ میں تمہاری اماں سے تمہارے ابا سے تمہاری شکایت کروں گی یا ذرا روک میں ابھی اپنے بھائی کو لے کر آئی وہ تمہاری عقل ٹھکانے لگائے گا۔

”کچھ ہی دیر میں تم یونی میں مشہور ہو جاؤ گی پھر ہر کوئی تم سے اپنی چوری شدہ چیزوں کا مطالبہ کرے گا

وہ بھی جن کی کبھی ایک پن بھی چوری نہیں ہوتی ہو گی۔ تم سوچ سکتی ہو میرا کیا مطلب ہے۔“ اف وہ پھر مسکرایا۔ گند اچھ۔

امرحہ کارل کو وہیں چھوڑ کر ویرا کے پاس آئی۔ وہ اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ گروپ اسٹڈی کر رہی تھی۔ ویرا کو ساری بات بتائی۔ ویرا ہنسنے لگی۔

”تم فکر نہ کرو۔ وہ تمہیں ڈرا رہا ہے۔ ویسے میں The Tab کے ایڈیٹر کو جانتی ہوں۔ بات کر لیتی ہوں اس سے۔ تم فکر نہ کرو۔“

ویرا نے قہقہہ لگایا ”ویسے ایسا کر کے دیکھتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ چور کیسا محسوس کرتے ہیں۔“

ویرا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگی ”ایسی باتیں کرتی تم بڑی پیاری لگتی ہو۔ اگر اگلے جنم نام کی کوئی چیز سے تو مجھے امرحہ بنا ہے۔ یگ لیڈی آف پاکستان۔“

ویرا نے وہیں کھڑے کھڑے ایڈیٹر سے بات کی کچھ دیر بعد ویرا نے ایم ایم ایس جو ایڈیٹر نے اسے بھیجا تھا۔ امرحہ کو دکھایا۔ وہ امرحہ کی تصویر تھی۔

”جادو سے پنا تاز کر کے اسٹوڈنٹس کی چیزیں چھپا دینے والی فریشر امرحہ (The Lost Duck) اپنی نوعیت کا چالیسواں واقعہ، یونیورسٹی انتظامیہ سے تحقیقات کی گزارش کی جاتی ہے۔“

وہ تمہیں چور نہیں جادو گر ثابت کر رہا ہے۔ تم دیکھتیں کل تک تمہارے پاس اسٹوڈنٹس کی لائن لگ جاتی پنا تازم کے لیے۔“ ہنسنے ہنسنے ویرا بے حال ہو گئی۔ امرحہ بھی ہنسنے لگی۔

”یہاں بڑی مانگ ہے پنا تازم کی۔ تم تو مزے سے

ہزاروں پونڈ کمالتیں۔ آج کل تو پروفیسرز کو پنا تاز کرنے کے لیے کہا جاتا۔ ہا ہا۔ منہ مائے پونڈ ملے تمہیں امتحانات کے دنوں میں۔“

لیکن یقیناً کارل کو اپنی تیاری سے زیادہ امرحہ کی فکر تھی کہ وہ بے چاری یہ نہ سوچتی ہو کہ اسے کوئی تنگ نہیں کر رہا۔ آخر اس کے ساتھ یہ غیروں والا سلوک کیوں؟ تو وہ اس کے ساتھ اپنی جیسا سلوک کرنے اگلی رات علی لرننگ میں موجود تھا۔

علی لرننگ میں امتحانات کے دوران پڑھنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو پورا سمسٹر آپ کو نظر نہیں آتے وہ نظر آتے آتے آپ کے دست بن جاتے ہیں۔ پورا مہینہ علی لرننگ کاسن میں ”ہاؤس فل شو“ ہوتے۔ جو راتوں کو اپنے بستروں پر سوتے ہیں وہ یہاں لوگھتے اور پڑھتے پائے جاسکتے ہیں۔ رات رات بھران کی شکلیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ علی کاسن، لائبریری، کیفے چوبیس گھنٹے کھلے رہتے تھے۔ تو کارل اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ امرحہ نے اس کے اٹھنے کا انتظار کیا اور مکمل توجہ سے پڑھنے کی کوشش کی، لیکن بے کار۔ کبھی نوٹس اس کے ہاتھ سے گر جاتے، کبھی پن اور پھر لپ ٹاپ بھی گر گیا۔

اف اب وہ اتنا سامان سمیٹ کر دوسری جگہ جائے۔ اب تو اسے فلور پر ہی بیٹھنا پڑے گا کیونکہ سب جگہیں پُر تھیں۔ اور اسے یقین تھا وہ جہاں بھی جائے گی۔ کارل اس کے سامنے آکر ایسے ہی بیٹھ جائے گا۔

کارل خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے دماغ میں کچھ چل رہا ہے اور جو چل رہا ہے وہ ایسا کچھ اچھا ہرگز نہیں ہے۔ کارل کے دماغ میں ایک ایسی ہیٹری فکس تھی جو کبھی ڈاؤن نہیں ہوتی تھی۔ سب امتحانات کے مارے ہوئے تھے اور وہ الٹی سیدھی حرکتوں میں غلطیاں تھا۔ پھر بھی ہر سال وہ اسکا لرشپ لے لیتا تھا۔ اگر وہ ایسی حرکتیں نہ کرے اور صرف پڑھے تو یقیناً وہ یونی کاؤن بن جائے۔ سارے کتابیں نوٹس کاغذ لپ

ٹاپ، پن وغیرہ کو اپنی بانہوں میں عارضی طور پر سمیٹ کر وہ بمشکل اٹھی اور نئی جگہ کی تلاش کرنے لگی۔

وہ چند قدم ہی چلی ہو گی کہ اس کے ہاتھ پر بجلی گری۔ جی بجلی۔ آسمانی نہیں۔ زمینی۔ کارل نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پن کو اس کے ہاتھ پر لگایا تھا ایک دم سے پیچھے سے آکر۔ اور اس کے ہاتھوں میں پکڑی سب چیزیں زمین بوس ہو چکی تھیں۔ لپ ٹاپ بھی ”ٹھٹھ“ کر کے گرا تھا۔ اب اللہ ہی جانتا تھا وہ چلے گیا ستے داموں کے گا بھی نہیں۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ؟“ امرحہ چلائی۔

”کیا ہوا؟“ اف کارل کی معصومیت۔

”تم نے کیا لگایا ہے میرے ہاتھ پر؟“

”میرے ہاتھ تو خالی ہیں۔ صرف یہ ایک پن ہے میری ہاتھ میں۔ میں پڑھ پڑھ کر تھک چکا تھا سو چام سے باتیں شائیں کر لوں۔“

”اس پن میں کچھ تھا۔ ضرور کچھ تھا۔“ امرحہ قسم کھا سکتی تھی اس میں کرنٹ تھا۔

”تمہیں میرے اس پن پر شک ہے؟“ اس نے پن لہرایا۔ ”دیکھو یہ صرف ایک پن ہے۔ اس سے لکھا جاتا ہے۔ لکھنا سمجھتی ہونا۔ ایسے۔ ایسے لکھتے ہیں۔“

امرحہ نیچے بیٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی وہ بھی نیچے بیٹھ کر اس کی چیزیں سمیٹنے لگا اور ایک بار پھر امرحہ کے ہاتھ پر کرنٹ کا ایک جھٹکا لگا۔ امرحہ نے چیخ ماری ”کارل نے دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔“ ٹھٹھ ہے ٹھٹھ ہے۔ نہیں کرتا تمہاری مدد میں۔ تم تو جینگلوں کی طرح چلا رہی ہو۔ میں یونیورسٹی انتظامیہ سے بات کرتا ہوں آخر وہ یونیورسٹی میں خلائی مخلوق کو داخل کیوں دیتے ہیں۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے نا۔ اس طرح تو تم لوگ ہمیں پاگل کر دو گے، آخر ہم کیوں پاگل ہوں تمہارے لیے۔“

امرحہ نے لپ ٹاپ اٹھا لیا۔ ”اگر تم یہاں سے نہیں گئے تو میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔“

”اس طرح تمہارا لپ ٹاپ بھی ٹوٹ جائے گا۔“

جہاں تک میرا خیال ہے ابھی تک میرے سر سے زیادہ تمہیں لپ ٹاپ عزیز ہو گا۔“

”تم اس کی جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟“ عالیان نے آکر ایک زوردار گھونسا اس کی کمر میں جڑا۔ اور اس کے ہاتھ سے پن جھپٹ لیا۔

کارل نے قہقہہ لگایا ”میں تو یہاں سے گزر رہا تھا امرحہ نے ہی مجھے روکا کہ آؤ باتیں کرتے ہیں۔ باتیں شائیں۔“

عالیان نے امرحہ کی سب چیزیں سمیٹیں اور اس کے ہاتھ میں کارل کا پن دیا۔

”اس پن کا استعمال میں تمہیں سکھا دوں گا۔ اگلی بار یہ تمہارے پاس آئے تو اسی پن سے اسے کرنٹ دینا۔“

امرحہ نے تھک کی طرح پن کو قبول کیا۔ اور اپنی کلاس فیلو کی ٹیبل پر چلی گئی۔

کارل کا قہقہہ اس کے پیچھے گونجتا رہا۔ کارل انسانی طے میں ایک غیر انسانی مخلوق۔ بلاشبہ۔

پن میں ایک ہیوی ہٹری فکس تھی جو پن کے کپ کو بائیں طرف حرکت دینے پر کام کرتی اور پن کی کب سے ہلکا سا کرنٹ نکلتا۔ جو معمول کے اوقات میں کافی زوردار لگتا۔ عام استعمال میں وہ پن ایک عام لکھنے والا پن تھا۔ صرف اس کا مالک ہی اس کا استعمال جانتا تھا۔ اور اس کا مالک کارل تھا۔

یہ پن کبھی کارل کا ٹریڈ مارک تھا۔ اب تو کارل کے لیے پرانا ہو چکا تھا۔ لیکن امرحہ کے لیے بہر حال نیا ہی تھا۔ امرحہ کے لیے ہی اس نے نکالا تھا۔ وہ اس پن کا استعمال، یونی میں، اسٹوڈنٹس سے بھرے کوریڈورز، لان، کلاسز، گراؤنڈ، لائبریری، سب ویز، بس، ہوٹل، بارز، کلب، کیفے ہر جگہ کیا کرتا، خریداری کے دوران بھی، سڑک پر چلتے رش والی جگہ پر بھی۔

کئی بار کلاس میں اس نے پروفیسرز کو بھی یہ جھٹکے دیے تھے۔ جس دن اس کا یہ موڈ ہوا وہ پہلی رو میں

بیٹھ جاتا اور بلاوجہ لیکچر کے دوران یہ ظاہر کرنا کہ اسے لیکچر میں فلاں فلاں پوائنٹ سمجھ میں نہیں آ رہے۔
 پروفیسر چلنے اس کے قریب آجاتے۔
 کارل دونوں ہاتھوں کو کھڑا ہو کر لہراتا اور ایسے لہراتا جیسے اسے بات کے دوران ہاتھ چلانے کی عادت ہے۔
 بہت سے لوگوں کو یہ عادت ہوتی ہے۔ خیر ہاتھ چلاتے چلاتے پین پروفیسر کی ٹھوڑی گردن کان کی لو اور کبھی ناک سے ٹکرا جاتا۔ ایسا ہو ہی جاتا ہے اس میں کوئی جبرانی کی بات نہیں۔ خیر۔ تو اور بے چارے پروفیسر۔ بھری کلاس میں چلا اٹھتے۔ ڈر کر۔ خواص بانٹہ سے ہو جاتے ایک دم سے اچھل پڑتے۔ بے چارے پروفیسر صاحب۔
 ایسے موقعوں پر کلاس کے لیے اپنے قہقہوں کا گلا دہانا مشکل ہو جاتا۔ عالیان کہیں قریب ہی ہوتا تو اس کی کمر پر چٹکی بھرتا۔
 ”کسی کی جان جائے گی تیرے اس چھوٹے موٹے کرٹ کے گولے سے۔“
 ”گئی تو نہیں نا۔ ویسے بھی سائنس کہتی ہے کہ ایک عام انسان کے جسم میں اچھے خاصے ویلج کے کرٹ کو سنبھالنے کی طاقت ہوتی ہے۔“
 ”سائنس کہتی ہے یا کارل کہتا ہے۔“
 ”کارل کسی سائنس سے کم ہے کیا۔؟“ آنکھ مار کر۔
 تو یہ ہے کارل۔ انسانی حلیے میں غیر انسانی مخلوق۔
 ویلکم ویک پر اس نے فریشر کا کافی بھرتہ بنایا تھا۔ تو سارا سال ویلکم ویک کا انتظار کرتا تھا فریشر میں تو اس کی جان ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنے سارے پرانے اوزار نکال لیا کرتا تھا۔
 اکثر سینئر فریشر کو گائیڈ کرتے ہوئے کانڈ پر یہ بھی لکھ دیتے ”اور کارل سے بچ کر۔“
 Have a safe welcome week
 کارل ویلکم ویک کے پانچ دن نئے انداز اپناتا۔
 ماکہ پہلے دن ملنے والے اسے دوسرے دن پہچان نہ

سکیں۔ دوسرے دن ملنے والے اس کے ہاتھوں تیسرے دن بھی الون سکیں۔ وہ واڑھی اور بال بڑھالیتا۔
 دوسرے دن کو الیتا تیسرے دن ہرے رنگ کی لوگ چوتھے دن گنجا۔ ساتھ کان ناک، ٹھوڑی اور بھنوں میں بالیاں۔ پانچویں دن لمبے بال۔ کارل۔
 ”Ask me“
 جس نے اسٹوڈنٹ کارڈ بنوانے جانا ہے اسے وہ بڑے آرام سے یونی سے باہر کسی بھی دوسری عمارت میں بھیج دیتا۔
 کئی بے چارے معصوم ایشیائی جو ڈرے ڈرے سے تھے اور اپنی ماما اور پاپا کے ساتھ یونیورسٹی کے گیٹ تک آئے تھے ان کو اس نے ہاتھ روم میں لاک کر دیا۔
 جی اس کے پاس اوزار تھے وہ دروازے کے ہینڈل میں ایک باریک سلاخ اڑا کر اسے جام کر دیتا تھا۔ ہو گیا لاک۔ اب یہ اندروالے کی طاقت پر ہے کہ وہ کس زور سے ہینڈل کے ساتھ زور آزمائی کرتا ہے اور کتنی جلدی باہر آتا ہے۔
 اور ایسے کام وہ بہت احتیاط سے کرتا۔ اسے بھی یونی میں رہنا تھا۔
 چند لڑکیوں کو اس نے سائنس لیب میں بند کر دیا تھا۔ امرحد کی قسمت اچھی تھی کہ ویلکم ویک پر اس کا ٹکراؤ کارل سے نہیں ہوا تھا۔ ورنہ تو اس کی سائنس لیب میں ہی موت واقع ہو جاتی۔
 اور فریشر ویک پر ایک فریشر امرحد لیب سے مرہ نکلتی۔ اور مائچسٹر میں اپنی آمد کے چوتھے دن تابوت میں بند ہو کر پاکستان واپس جاتی۔ اور دادا یہ معلوم نہ کر سکتے کہ پاکستان میں تو سب اس بے چاری کی پیچھے بڑے رہتے تھے مائچسٹر میں کون اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔
 ہر فریشر رو کر سکیپ پر اپنے گھر والوں کو ہری وگ منجے سر، لمبے بالوں والے Ask me کا قصہ سنا رہا ہوتا۔
 فریشر کے آتے ہی یونی میں کارل۔ کارل ہوری ہوتی۔

اسٹوڈنٹ یونین کے صدر اور باقی لوگ اسے خبیثگی سے محتاط رہنے کے لیے کہتے تو وہ بڑی معصومیت سے کہتا۔
 ”پتا نہیں آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا میں نے کسی کی جان لے لی ہے۔ یا میں مکر ہوں۔“
 یعنی وہ جان لے گا تو ہی کوئی چھوٹا موٹا جرم مانا جائے گا۔



چینی کہتے ہیں۔
 ”اگر میں ایک سرسبز شاخ سے اپنے دل کو سجاؤں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک خوش گلو پرندہ اس پر آکر نہ بیٹھے۔“
 اور ان کا کہنا ہے کہ
 ”محبت کرنے سے پہلے احترام کرنا سیکھیں۔“ اور یہ بھی کہ۔
 ”ایک بوڑھے کا عشق میں مبتلا ہو جانا خزاں میں پھول کھلنے کے مترادف ہے۔“
 اور خزاں میں محبت کا پھول ہی کھلنے کی جرات کرتا ہے۔ بدھانے سب جانوروں سے کہا کہ نئے سال پر مجھ سے آکر ملو۔ صرف بارہ جانور بدھانے ملتے آئے اور بدھانے ان بارہ کے نام ایک ایک سال کر دیا تیل، مرغ، خرگوش، بکری، چیتا، خنزیر، سانپ، ڈریگن، چوہا، گھوڑا، بندر اور کتے کے چینی سالانہ کیلنڈر ان جانوروں کے ناموں سے ترتیب پاتے ہیں اور چینی اپنے سال کے آغاز سے پہلے پورے جوش و خروش سے اپنے گھروں کو صاف کر کے سجاتے ہیں، نئے کپڑے خاص طور پر سرخ لباس بنواتے ہیں۔ سرخ کانڈوں اور سرخ پارچہ جات پر لکھی روایتی نظمیں سے گھر کے دروازوں، دیواروں اور ایسی ہی دوسری جگہوں کو سجاتے ہیں۔
 نئے سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ پرانا وقت بیت چکا ہے۔
 پرانے وقت کو الوداع کہا جائے گا۔ نئے وقت

کے لیے جشن تیار ہے۔ بڑے بوڑھے بچوں کو سرخ لفافوں میں ملفوف ”گلی منی“ (خوش قسمتی کے سکے) دیتے ہیں۔ چینی روایات کہتی ہیں کہ سرخ رنگ آگ کی علامت ہے جو ان کے سیانوں کے بقول بد قسمتی اور بدی کو دور کرتی ہے۔ قدیم وقتوں میں لمبے بانسوں کو جلا یا جاتا تھا تاکہ بدی اور بلائیں آگ کو دیکھ کر بھاگ جائیں، شر کو آگ سے دفنانا کیا جاتا تھا۔
 بدی اور بلائیں۔ دنیا کی ہر قوم انہیں دفنان کرنے کا چارہ کرتی ہے غیر اور اچھی قسمت۔ دنیا کی ہر قوم اس کے حصول کے لیے تک و دو کرتی ہے۔ چینی نیا سال۔ خاندان کے ملاپ کا تہوار۔
 پہلے چاند کی پندرہ کو سرخ چینی ساختہ لالٹینوں کا تہوار منایا جاتا ہے۔ لالٹینیں جن پر ’پھول‘ پودے، برندے، ’برجی جانور‘، تاریخ اور روایتی قدیم تاریخی شخصیات کندہ ہوتی ہیں سے عبادت گاہوں کو سجایا جاتا ہے اور ہاتھوں میں لے کر شام کو چاند کی روشنی میں پریڈ مارچ کیا جاتا ہے، چینی سال۔ بہار کا آغاز۔ دعاؤں کے ساتھ۔ خوشیوں کو لیے۔ بدی کو دور کرتے۔ روایات کو زندہ رکھتے۔
 سرخ سرخ۔ روشن روشن۔ منظم اور پر خوش سال کے آغاز پر اپنی میزوں کو Dumpling (روایتی چینی کھانا) سے سجاتے ہوئے۔ دعائیں دیتے ہوئے۔ چاولوں کے جاروں کو بھرتے ہوئے کہ نئے سال پر چینی چاول کے جار کا خالی رہ جانا بد قسمتی کی علامت سمجھتے ہیں۔
 چینی کبھی دوسری اقوام کی مذہبی، روایتی، علاقائی تقریبات کو تحارت سے نہیں دیکھتے۔ اور اپنے لیے وہ دوسری اقوام سے بھی یہی توقع کرتے ہیں۔
 انہیں ابتدائی اسباق میں ہر خاص و عام کے احترام کا سبق پہلے دیا جاتا ہے، اسی لیے یہ ہر ایک کے سامنے تعظیم سے جھکتے نظر آتے ہیں، گور انہوں نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ احترام کرنا جانتے ہیں۔
 مائچسٹر میں اس سال کی ڈریگن پریڈ (نئے سال کی پریڈ) کے لیے تیاریاں عروج پر تھیں۔ پریڈ اکتیس

جنوری نئے سال کے پہلے دن تھی یہ سال گھوڑے کا سال تھا پچھلا سال سانپ کا سال تھا۔ امرجہ کی چینی کلاس فیلو جی سن (Jee sun) نے سب کلاس فیلوز کو رجسٹریشن کروانے کے لیے کہا تھا۔ وہ امرجہ کے پاس بھی آئی تھی۔

”میں تو جانتی بھی نہیں کہ یہ سب کیا ہوتا ہے میرے لیے تو کھڑے ہو کر دیکھ لینا ہی بہت بڑی دریافت ہوگی کہاں اس میں شرکت کرنا۔“

”پریڈ میں جاؤ گی تو سب جان جاؤ گی۔ تمہیں زندگی میں کھڑے ہو کر پریڈ دیکھنے کے تو کئی بار مواقع مل جائیں گے شرکت کرنے کے نہیں۔ اس سال تو نوے ہزار سے زیادہ لوگ شرکت کریں گے۔“ وہ ہنسنے لگی ”نہیں! میں نے یہ سب کبھی نہیں کیا۔“

”جو کیا نہیں وہ کرو گی بھی نہیں۔ چینی پاکستانی کو ”ناں“ نہیں کہتے ایک پاکستانی چینی کو ”ناں“ کیسے کہہ سکتا ہے۔ غیر چینی لوگ پریڈ میں شرکت کرتے ہیں تو ہمیں اچھا لگتا ہے ہمیں یقین ہوتا ہے کہ نئے سال کا آغاز ہم نے سب اقوام کی دعاؤں اور محبت سے کیا ہے۔ ہم دونوں تو ایشیائی خطے کے دو اہم دوست بھی ہیں اور ہمسائے بھی۔ قطار میں تین غیر ملکی کھڑے ہوں تو ہم پہلے پاکستانی کے آگے Bow کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔“

امرجہ متاثر ہو گئی۔ جی سن ٹھیک کہہ رہی تھی امرجہ کبھی بھی کسی بھی طرح کی مدد کے لیے جی سن کے پاس جاتی وہ فوراً اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔ ابتدائی تعارف میں اس نے امرجہ کو گلے سے لگایا تھا اور دوبار اس کے آگے جھکی تھی۔ اس نے اسے بتایا کہ اس کے دادا تجارتی غرض سے ایک بار پاکستان گئے تھے اور پہاڑی علاقے میں خوفناک حادثے کا شکار ہو گئے تھے سردیوں کے دن تھے اتفاق سے دو پٹھان پہاڑی بچوں نے انہیں دیکھ لیا اور ایک بچہ کئی گھنٹے ان کے ساتھ برف میں ان کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو سہارا دینے اور انہیں بے ہوش ہونے سے

بچانے کی سعی کرتا رہا تاکہ وہ کومہ میں نہ چلے جائیں۔ کئی گھنٹے بعد دو سرابچہ مدد لاسکا اور پہاڑی لوگوں سے مل کر چھ مہینے تک ان کی تہہ رتداری کی۔ میرے دادا ہر سال نئے سال کی دعاؤں میں ان سب پہاڑی پٹھانوں کو یاد رکھتے ہیں اور ان کے لیے خوشحالی اور خوش قسمتی کی دعائیں کرتے ہیں۔ وہ امرجہ کو پٹھان سمجھتی تھی اس کے نزدیک سب پاکستانی پٹھان ہی تھے۔ امرجہ کو خوشی تھی کہ پہاڑی پٹھانوں نے اسے ماچسٹر اور اتنی بڑی بونی میں معتبر کر دیا ہے۔

کسی بھی قوم کے ایک فرد کی گئی نیکی بلاشبہ ساری قوم کا سرخسر سے بلند کر دیتی ہے۔ ”مجھے ہنسی آئے گی۔“ امرجہ کو ابھی بھی تامل تھا۔ ”تو ہنستی رہتا، بلکہ چھلانگیں لگاتا۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ روتے ہو روتے لوگوں کا وہاں کیا کام۔“

ویسے تم کس جانور کا لباس پہننا پسند کرو گی؟ میں انتظام کروں گی۔ چاہو تو کوئی ماسک نہ پہنتا۔ تم ڈریگن کا لباس بھی پہن سکتی ہو لیکن اس کے لیے تمہیں مسلسل حرکت میں رہنا ہوگا، تم ٹھک جاؤ گی، میں روایتی چینی لباس کمونو پہنوں گی اور میرے ہاتھ میں بڑا سا چینی پنکھا ہو گا میرا میک اپ بہت گہرا ہو گا۔ چاہو تو تم میرے ساتھ یہ بن سکتی ہو۔ یا تم Percussion (دو بڑی گول دھانی ہلیٹوں پر مشتمل ساز، دونوں ہلیٹوں کو آپس میں ٹکرایا جاتا ہے) بجا سکتی ہو۔ یا ڈرم۔ لیکن تمہیں ڈرم بجانے کی پریکٹس نہیں ہو گی۔

”نہیں میں کمونو نہیں پہن سکتی۔ گہرا میک اپ تو ہرگز نہیں۔“

”اگر تم شرمارہی ہو تو میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ڈریگن کا لباس پہن لو۔ اسے پہن کر قطعاً یہ معلوم نہیں ہو گا کہ تم کون ہو لڑکی یا لڑکا۔ تمہاری مخصوص مشرقی جھجک بھی قائم رہے گی۔ بھلے سے ماسک کے اندر شرماتی گھبراتی رہنا۔ ہستی۔ قہقہے لگاتی رہنا۔“ امرجہ دل کھول کر ہنسی ”ٹھیک ہے۔ میں ڈریگن بن جاتی ہوں۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں یہ تمہاری زندگی کا یادگار لمحہ ہو گا۔ تم پر قسمت مہربان ہو گی۔“ امرجہ اور زیادہ مسکرانے لگی۔ ”انتظار رہے گا پھر اس لمحے کا۔“

چینی نئے سال کی رات میں سب مل کر چائنا ٹاؤن گئے۔ چائنا ٹاؤن کسی بھی ملک یا شہر میں آباد چینوں کے علاقے کو کہا جاتا ہے جہاں سب چینی ایک مخصوص علاقے میں بڑی تعداد میں رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ چائنا ٹاؤن کی حدود کے آغاز پر سرخ نیلے سبز روایتی چینی رنگوں سے سجی بنی چینی طرز تعمیر کا بڑا بھانگ آتا ہے۔ جس کے دونوں اطراف جانوروں کے بڑے بڑے مجسمے رکھ دیے گئے تھے۔ سب سے بڑا مجسمہ گھوڑے کا تھا۔ ایک بہت بڑے ڈریگن کو بانوں کی مدد سے اونچائی پر ٹانگ دیا گیا تھا۔ جا بجا چینی اسٹالز لگے تھے جن پر چین کی روایتی چیزوں کی بھرمار تھی، ماچسٹر کے درختوں کی شاخیں تو پہلے سے ہی سرخ گول چینی ساختہ لالٹینوں سے سجادی گئی تھیں۔

این، ویرا اور وہ مزے سے مفت چینی کھانے کھاتے رہے۔ تمام اسٹالز پر یا کھانے بہت کم قیمت پر دستیاب تھے یا مفت بنائے جا رہے تھے۔ امرجہ ایک چینی تحفہ بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ ایک عدد چینی شادی شدہ جوڑا اپنی شادی کی سلور جوبلی پر تحائف تقسیم کر رہا تھا اور ماچسٹر بونی کے اسٹوڈنٹس کا وہاں اتنا رش تھا کہ لگتا تھا سب اسٹوڈنٹس آئندہ زندگی اس ایک تحفے پر گزارنے والے ہیں۔

تحفے میں ایک عدد روایتی سرخ پارچہ تھا جس پر چینی زبان میں نظم لکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں پہننے کا چینی طرز کا کنگن تھا اور دو سرخ رتن تھے۔ امرجہ کو دو عدد سرخ رتنوں کی سمجھ نہیں آئی۔ جب ان میاں بیوی کے اسٹال پر رش ذرا کم ہو گیا اور ان کے سب تحائف تقسیم ہو گئے تو امرجہ ان سے پوچھنے لگی۔

”ایک تمہارے لیے اور ایک تمہارے شوہر کے

لیے، جب مجھے انہوں نے۔“ چینی خاتون نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا ”ہر روز کیا تھا تو یہ اتنے غریب تھے کہ ان کے پاس کوئی انگوٹھی نہیں تھی تو انہوں نے ایک اسکول جاتی بچی کے بالوں میں سے رتن کھول کر میری انگلی میں باندھ دیا کہ مجھے کوئی انگوٹھی والا نہ لے آئے۔“

دونوں میاں بیوی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ امرجہ دیکھ سکتی تھی کہ دونوں نے کس محبت سے اپنی زندگی گزاری ہو گی۔

سرخ رتن امرجہ کی آنکھوں میں بس گئے۔ آنکھوں کے پاس لاکر وہ انہیں دیکھنے لگی۔ اسے ایک دم سے ڈر لگنے لگا کہ یہ رتن کہیں کھونہ جائیں۔ اس نے انہیں اپنے کراس بیگ کی محفوظ جیب میں رکھا۔

پھر ہاتھ کو کراس بیگ پر مضبوطی سے ٹکا لیا اسے لگنے لگا کہ سارے چوروں کی نظر اس کے ان دو عدد رتن پر ہی لگی ہو گی۔

سرخ نظمیں پارچہ دیرانے اپنے بال کھول کر سر پر باندھ لیا۔ اور کنگن این اون نے پہن لیا۔ امرجہ نے یہ دو چیزیں انہیں خوشی سے دے دی تھیں۔

”لاؤ وہ رتن بھی میری کلائی پر باندھ دو۔ ایک تم باندھ لو۔“ امرجہ نے ویرا کو نہیں بتایا تھا کہ رتن کے ساتھ کیا کہانی منسلک ہے۔ امرجہ کی جیسے جان ہی نکل گئی۔

”وہ میں پاکستان لے کر جانا چاہتی ہوں۔“

”رتن؟“ ویرا حیران ہوئی۔

امرجہ نے سر ہلایا۔

”میں پہن کر تمہیں واپس کر دوں گی۔ اس پر جو ستارے لگے ہیں مجھے وہ اچھے لگے ہیں۔“

”میں نے ابھی رتن نہیں باندھا۔ میں انہیں ان چھوڑ کر کھنا چاہتی ہوں۔“ امرجہ نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”بعض معاملات میں تم بہت عجیب ہو امرجہ!“

”مجھے لگتا ہے میں پوری کی پوری ہی عجیب

جیسا کہ اس نے دیر کو دیکھا تو اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ وہ دیر ہے۔ یقیناً اس کے ڈریگن کو دیکھ کر بھی نہیں بوجھا جاسکتا تھا کہ اس کے اندر امرجہ ہے۔ سڑکوں سے ست روی سے گزرتے چائنا ٹاؤن کی طرف جاتے مختلف جگہوں پر ان پر چوکور رنگ برنگی جھنڈیاں برسائی گئیں۔ جنہیں مشین کے ذریعے فضا میں چھوڑا جاتا اور فضا کی میٹر بندی تک ایسے رنگ برنگی ہو جاتی جیسے تیلیوں کے قافلے ان پر ٹوٹ پڑے ہوں۔

امرجہ نے اب کھل کر مسکراتا شروع کر دیا تھا وہ ڈریگن بنی ہاتھ ہلا ہلا کر بچوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اسے مڑا آ رہا تھا۔ اسے سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جہاں جہاں ان پر رنگ برنگی جھنڈیاں برسائی گئی تھیں وہاں وہاں امرجہ کو لگا تھا یہ سب اس کے لیے کیا جا رہا ہے۔

لاہور میں چھپ چھپ کر رونے والی لڑکی کے لیے ایک منحوس ماں لیے گئے انسان کے لیے۔ امرجہ افسوس کر رہی تھی کہ وہ کیوں روتی رہی تھی۔ زندگی میں آپ نے لوگوں، نئی خوشیوں، نئے جشمنوں سے روشناس ہوتے ہیں تو ماضی کے دکھ بے معنی اور چھوٹے لگنے لگتے ہیں۔ اپنی بے وقوفی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا ٹاؤن کی طرف سے ہے۔ زندگی میں دکھ اور سکھ دونوں ہوتے ہیں۔ بس انہیں کشید کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان سے جو لوگ، تعلیم، روزگار کے سلسلے میں یورپ آتے ہیں وہ یہ ضرور سوچتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کو ایسا پر رونق اور فعال کیوں نہ بنایا۔ شاہی ہو کر جانے والی خواتین یہ ضرور سوچتی ہیں کہ اف کیانی وی دیکھ دیکھ خریداری کر کر کے اپنی زندگی برباد کرتے رہے پاکستان میں۔ تو دنیا ماحول آپ کو نئے اسباق ضرور پڑھاتا ہے۔ کچھ اچھے کچھ بُرے۔ کچھ آپ کی مرضی سے۔ کچھ زبردستی۔

اسباق سے گھبراتا نہیں چاہیے۔ یہ کتنے بھی تلخ ہوں حکیم لقمان کی حکمت لیے ہوتے ہیں۔ بلا معاوضہ حکمت دے کر جاتے ہیں۔

تو اب رنگ تھے۔ جشن تھا۔ لوگ تھے۔ اور قہقہے تھے، موسم نم نم تھا۔ جنوری کا آخری دن تھا اور چینوں کے لیے سال کا پہلا دن۔ اس بات کی علامت کہ جہاں کچھ ختم ہو رہا ہوتا ہے ٹھیک وہیں سے کچھ اور شروع ہو رہا ہوتا ہے۔

نظام قدرت اس جنم مرگ۔ مرگ جنم کا نام ہے۔

شام گہری ہو چکی تھی۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے سے چل رہے تھے، لیکن جھکنے نے آج ان سے دوستی کر لی تھی وہ پھولوں سے لدی دور سے ہی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ وہ چائنا ٹاؤن کے قریب پہنچ رہے تھے۔ دور سے پریڈ کے استقبال کے لیے بجائے جانے والے ڈرموں اور دوسرے سازوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

”امرجہ!“ ڈرموں کی پر زور تھاپ اور دھاتی پلیٹوں کی گونج میں یہ نام اس کے قریب بیٹھے سر سلطیت لیے گونجا۔ اس کے قریب ہی ایک اور ڈریگن کھڑا تھا۔ وہ قد میں اس سے اونچا تھا۔ ڈریگن نے ماسک اتارا۔ اور مسکرایا۔ وہ عالیان تھا۔

ایک لڑکی ہے امرجہ۔ شہر روشن۔ شہر قلم کار۔ شہر بے مثال لاہور سے۔ ایک لڑکا ہے عالیان۔ شہر جمال۔ شہر افکار۔ شہر لا زوال مانچسٹر سے۔

نئے سال کے پہلے دن۔ ہمارے پہلے دن۔ شہر بے مثال۔ شہر لا زوال کے پاس ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ اور ایک محبت ہے

جہاں بے مثال۔ جہاں لا زوال۔

جہاں جاوداں۔ جاوداں سے۔

امرجہ کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی پریڈ میں شامل ہے۔ اتنے ہزاروں لوگوں میں وہ چاہتی تھی تو معلوم نہیں کر سکتی تھی۔ اسے صرف اپنے کلاس فیلوز کا ہی معلوم تھا۔ عالیان کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جیسے وہ آخری وقت میں کسی طرح سے ڈریگن کا لباس حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا اور افراتفری میں پریڈ میں شامل ہوا اور اسے تلاش کرتا رہا ہے۔

”دادو مجھے۔ میں نے تمہیں اتنے سارے جانوروں اور ماسکوں میں سے پہچان لیا۔“

”دادو دیتی ہوں تمہیں۔“ اتنے سارے ہزاروں لوگوں میں سے جو اپنی شکل اور وضع قطع چھپائے ہوئے تھے کسی ایک کو ڈھونڈ نکالنا قابلِ داد تھا۔ وہ ڈھائی سو کے قریب تو صرف امرجہ جیسے ڈریگن ہی تھے۔

”کتنی زبردست پریڈ ہے نا یہ امرجہ۔“ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ڈریگن کا سر اتار کر اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا تاکہ اس کی آواز آسانی سے سنی جاسکے۔ امرجہ کو وہ معمول سے زیادہ خوش لگا۔

”امرجہ! مجھے ایسے جشن، ایسے تہوار، جب سب خوش ہوں، گارے ہوں، مسکرا رہے ہوں بہت اچھے لگتے ہیں۔“ اس نے سڑک کے کنارے کھڑے پریڈ کو دلچسپی، شوق، جوش و خوشی سے دیکھتے ایک چھوٹے بچے کے گل پر نرمی سے چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اسی بچے کے ساتھ کھڑے دوسرے بچے کے بالوں میں محبت اور لگاؤ سے ہاتھ پھیرا۔

اس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ غیر معمولی پر جوش اور خوش ہے۔

”تمہیں بھی پسند ہے یہ سب؟“ اس نے اس کے سر کے پاس سر جھکا کر کہا۔

”ہاں! مسکرائیں گے اچھی نہیں لگتیں؟“ امرجہ کو چلا کر بتاتا پڑا۔ عالیان نے کان کو اس کے ماسک

کے قریب جھکا دیا۔ اس نے ایسا خوشی سے کیا۔ امرجہ شہزاد بنی اسے ہزاروں راتوں پر محیط الف لیلیٰ سنائی تو شاید وہ خوشی سے سر کو ایسے ہی جھکائے رکھتا۔ سر نہ اٹھاتا۔

”ہاں! لیکن کبھی کبھی تو ان سب کے ساتھ بھی مسکرائیں اچھی نہیں لگتیں۔“ اس نے اس پاس کے سارے ماحول کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ تو کچھ ہو جانے سے سب اچھا اچھا لگتا ہے۔“ ایک بچہ جو اپنے باپ کے کندھوں پر سوار تھا اور تالیاں بجا رہا تھا کہ اس کے گل پر نرمی سے چٹکی بھر کر کہا۔ بچہ کھلکھلا اٹھا اور اپنے باپ کے بالوں کو شرارت سے مٹھیوں میں جکڑ لیا۔

امرجہ نے ماسک اتار دیا۔ اس سے ٹھیک سے عالیان کی آواز نہیں سنی جا رہی تھی۔

”کیا ہونے سے اچھا لگتا ہے؟“ امرجہ اس کی بات ٹھیک سے سن نہیں سکی تھی۔ جھوم کے شور کی وجہ سے اسے چلا کر پوچھنا پڑا۔

عالیان نے ذرا رگ کر اس کی طرف دیکھا۔ رک گیا۔ روک دیا گیا۔ شاید وہ فیصلہ کر رہا تھا۔

”محبت کے ہو جانے سے۔“ اس نے بلاوجہ ہی چلا کر کہا جبکہ امرجہ اپنا ماسک اتار چکی تھی چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یقیناً وہ ڈریگن پریڈ میں شامل ایک ایک انسان کو بھی سنا سنا چاہ رہا تھا۔ سڑک کے اطراف میں کھڑے، مردوں، عورتوں، بڑے، بوڑھوں اور بچوں کو بھی۔ سارے مانچسٹر کو ساری دنیا کو اس کے ہونٹوں سے نکلے الفاظ کی گونج یقیناً چائنا ٹاؤن کی محراب کے پاس تیس چالیس بڑے بڑے ڈرموں کو اپنے سامنے رکھے سرخ لباسوں میں لمبوس پہلی پٹیاں سر پر باندھے چینوں تک بھی گئی ہوگی۔ انہوں نے لفظ ”محبت“ کی گونج کو پا کر۔ اسے اپنے اندر اتار کر پھر پور جوش سے۔ عقیدہ، احترام سے۔ دونوں ہاتھوں میں پٹری ڈرم اسٹکس کو سر سے اوپر اٹھا کر سرخ ڈرموں کی پہلی زمین پر دے مارا۔ محبت کے ساز کی پہلی گونج گونجی۔

مشرق نے مغرب میں آکر میلہ سجا دیا۔
استقبال کا آغاز ہوا۔ خوش آمدید۔ ہمارے کو گلے
لگانے کے لیے ہم بے تاب ہیں۔ ہمارے آمد آمد ہے
خزاں کو رخصت ہو جانا چاہیے۔
اولفظ محبت سے ابتدا کریں۔ آؤ اس کی انتہا
کریں۔ رجوم (شباب ثاقب) کا ایک طویل قافلہ
رقص کنال گہری ہو چکی شام میں رک (ابر) بادل کی سیاہ
دھاری سے ہوتا ہوا عالیان اور امرجہ کے سامنے سے
گزر رہا۔
وہ ایک (مہبوت) ابابیل تھی وہ جہاں کی تہاں
کھڑی تھی۔
”میرا دل چاہتا ہے میری شادی ایسے ہی ہو۔“ اس
کی بھوری آنکھوں میں کئی خوش کن چمک دار رنگوں
کی دھاریاں تلاطم مچانے لگیں۔
”جانوروں کی طرح۔“ امرجہ نے دوبارہ غلطی
نہیں کی عالیان کی طرف دیکھنے کی نہیں۔ ”وہ ہنس۔
”ایسے پریڈ کی صورت۔ اتنے ہی لوگوں اور ایسے
ہی سازوں کے ساتھ۔“
وہ برطانیہ کا شہری تھا۔ تو یہ خواہش کیوں نہ رکھتا
کہ اس کی شادی بھی شاہی شادی جیسی ہو۔ پریڈ کی
صورت بارات جائے۔ بھی میں بٹھائے اور اپنی
دلہن کو واپس لائے۔ اور اس پاس کھڑا ہجوم ان پر
مسکراہٹوں اور دعاؤں کے ساتھ پھولوں کی بارش کر
دے۔
وہ اور اس کی دلہن ہاتھ ہلا کر سب کی مسکراہٹوں
کا جواب دیتے ہوں۔ دنیا بھر میں شاہی خاندان کی
شاہیاں دیکھنے والے زندگی میں کم سے کم ایک پار یہ
خواب ضرور دیکھتے ہیں کہ ان کی شادی بھی پرنس
چارلس پرنس ولیم کی طرح ہو۔ وہ تو پھر برطانیہ کا
شہری تھا۔ اس نے یہ خواب کم سے کم سو بار تو ضرور ہی
دیکھا ہو گا۔
”اچھا خواب۔ دیکھ لیتا چاہیے۔“
”اگلے سال چینی نئے سال پر تم اپنی یہ حسرت پوری
کر لیتا۔“

امرجہ نے اسے اچھا مشورہ دیا تھا۔ ہاں یہ اچھا
مشورہ ہی تھا بے شک۔ رجوم کا ایک اور قافلہ اس
بار صرف عالیان کی آنکھوں کے آگے سے گزرا اور
اس بار وہ ان بھوری آنکھوں میں ہی ٹھہر گیا۔ وہ ایک
لحظے کے لیے سوچ کا شکار ہو میں پھر انہوں نے
جھٹ قافلہ رجوم کی بائیں اپنے ہاتھوں میں تھام لیں
فیصلہ ہو چکا تھا۔
وہ امرجہ کو ساری روٹیاں اپنے اندر سموئے دیکھ
رہا تھا۔
ایران میں زریور جھیل کا کنارہ ہے۔
ایک خسرو کمالی ہے۔ ایک اس کا رباب ہے۔
اور اس کے ہونٹوں پر امیر خسرو کی رباعی کی صورت
ہے۔
از آمدت اگر خبری دانستم
(اگر تیرے آنے کی خبر مجھے ملے)
پیش قدمت کو چہ را گل می کشتم
(میں تیرے قدموں سے پہلے گلی میں پھول
بچھاؤں)
گل می کشتم گل گلاب می کشتم
(پھول بچھاؤں گل گلاب کے پھول بچھاؤں)
خاک قدمت پدی دم وارداستم
(تیرے قدموں کی خاک پر اپنا آپ وار دوں)
یارم۔ یارم۔ یارم۔
(میرے دوست میرے یار۔ میرے محبوب)
جھیل کی لہریں رقص کرنے لگی ہیں وہ خسرو کمالی
اور اس کے رباب پر فدا ہیں وہ اس کے ہونٹوں سے
نکتے گیت پر شمار ہو ہو جاتی ہیں۔ پرندے خسرو کمالی
کے سر پر گول گول گھومتے جاتے ہیں۔ وہ اس گیت پر
قربان ہو ہو جاتے ہیں۔
خسرو کمالی پیشانی پر گلابی رومال باندھے اس کنارے
کی طرف دیکھتا جاتا ہے جہاں سے زہرہ آفتدی کو آنا
ہے۔
وہ آئے گی ضرور آئے گی اس کا رباب دعا گو ہے۔

اس کالیت سرسبز وجود ہے
پیانہ بدہ۔ پیانہ بدہ
(جام دے۔ جام دے)
پیانہ بدہ کہ خمار استم
(ایسا جام دے کہ مجھے خمار آجائے)
من عاشق چشم مست یار استم
(میں یار کی مست آنکھوں کا عاشق ہوں)
من عاشق چشم مست یار استم
(میں یار کی مست آنکھوں کا عاشق ہوں)
بدہ بدہ
(دے۔ دے)
بدہ بدہ
(دے۔ دے)
وقت نے اپنے لبوں پر پریت بھری مسکراہٹ
سجائی۔
رقص کنال لہروں نے خسرو کمالی کے سروں کو چوما۔
ہو آنے رک جانا ضروری جانا۔ خسرو کمالی کے
لیے۔ اس کی زہرہ آفتدی کے لیے۔
گل می کشتم گل گلاب می کشتم
یارم۔ یارم۔
خاک قدمت پدی دم وارداستم
یارم۔ یارم۔
پروالوں نے کوک دی۔
زریور جھیل نے پانی کی بوندوں کو تاروں کی مانند
جگمگایا۔
رباب نے مناجات میں سوز و درد پیدا کیا۔
اور خسرو کمالی نے آواز کو نرمی سے بلند۔ بلند اور
بلند کیا۔
”یارم۔ یارم۔ یارم۔“ صدائیں ملک تک جا
پہنچیں زہرہ آفتدی کا دیا گلابی رومال جھوم جھوم لہرایا۔
”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔ ہم اگلے سال اسی
دن شادی کر لیں گے۔“ ہاتھ میں پکڑا ڈریگن مارک
امرجہ کے ہاتھ سے پھل کر گر گیا جسے اٹھانے کے

لیے وہ قطعاً نہیں جھگی۔ اسے اٹھانے کے لیے وہ
پہلے سے ہی جھک چکا تھا۔
”ہم۔“ رنگ ریز نے سارے رنگ اس پر
اچھال دیے خاص کر نیلا لیکن پھر بھی وہ بے رنگ ہی
کھڑی رہی۔ وہ سفید دھرتی میں کسی جسے من پسند
رنگوں سے رنگ دیا جاتا۔
”اس نے کہا ہم۔“ کشمیر کی کلی افق نے دھاتی
پلیٹیں بجاتے ہوئے فرزام کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔
”ہاں میں نے سنا۔ اس نے کہا ہم۔“ فرزام نے
ڈرم بجاتے ہوئے کہا۔
”اور وہ اس کے آگے مارک اٹھانے کے بہانے
جھک بھی گیا۔“ افق شرارت سے مسکرائی۔
رنگ برنگی جھنڈیوں کی بوچھاڑ فضا میں چھوڑی
گئی۔
خوش آمدیدی کا شور بلند ہوا۔
دھاتی پلیٹیں ایک ساتھ کئی سو ہاتھوں میں
گو بجیں۔
ڈرموں پر سازندوں نے گول گول محوم کرانت مچا
دی۔
چینی رقصاؤں نے سرخ لباسوں میں خود کو فضا میں
اچھالا اور چینی رقص کی ابتدا کی۔
اس نے کہا ”ہم“ گلاب تو اب تباہ ہو گئی۔
ہجوم نے پر جوش نعرے لگائے۔ ہمارے آمد کے
جشن کو انہوں نے یادگار بنا دیا تھا۔ فضا مشکبار ہو چکی
تھی تہمت سے مشکبار پری یہاں بھی آچکی تھی۔
فرزام اور افق کے بلاوے پر۔ امرجہ اور عالیان کے
لیے۔ اس کے پیروں میں گرے مارک کو اٹھا کر وہ
اسے واپس دے رہا تھا۔ پریڈ آگے جا رہی تھی۔ وہ
دونوں ایک ہی جگہ کھڑے تھے۔
”تم نے سنا امرجہ! میں نے کیا کہا؟“ اتنی پیاری
بات پر اس کے لیے ایک مسکراہٹ تو بنتی تھی۔ وہ
مسکراہٹ اسے نہیں دی گئی تھی۔
”مجھ سے شادی کرو گی امرجہ؟“ لیکن اس سے

فرق نہیں پڑتا۔ میں تو تم سے ہی شادی کروں گا۔ تم سوچنے کے لیے وقت لے سکتی ہو لیکن اس سے بھی فرق نہیں پڑے گا۔ میں سارا ماچسٹر اکٹھا کر ڈالوں گا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر جب تم سارے ماچسٹر کو کھڑا دیکھو گی تو تمہیں ”ہاں“ کا بورڈ اٹھا کر سب کو دکھانا ہی پڑے گا۔“

وہ اپنی رو میں بول رہا تھا۔ وہ عالیان تھا ”ہاں“ کے بل بورڈ پر اس کا حق تھا کیونکہ وہ سارے ماچسٹر کو اکٹھا کر لانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

”میں۔۔۔ میری منگنی ہو چکی ہے۔۔۔ پاکستان میں میری واپسی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ میری شادی ہونی۔۔۔ ایک ایک کروہ اتنا ہی کہہ سکی رجوم کے سب قاتلوں نے اپنی باگیں عالیان کے ہاتھوں سے چھڑوا لیں۔“

”خسرو کمالی کے رباب کی تان ٹوٹی۔۔۔ اس کی مناجات سہم گئیں۔“

”رتن دپ سے بھی رتھ اڑان بھرتی منہ کے بل پاتال کی طرف لپکی۔“

”تالین بانف کے حقیقی پارچے میں آگ بھڑکی۔“ سڑک کے کنارے پریدہ بھتی خاتون کے گود کے نیچے نے چلا کر رونا شروع کر دیا۔ چینیوں کا ماننا ہے کہ سال کے پہلے دن بچوں کا رونا ختم ہوتا ہے۔

چینی عورت سہم سی گئی اور اس نے شہود سے بچے کو چپ کروانا شروع کر دیا۔ لیکن بچہ اور۔۔۔ اور رونے لگا۔ وہ روتا ہی جا رہا تھا۔ یہ کیا۔ یہ کیسے۔۔۔ ابھی تو وہ قلعاریاں مار رہا تھا۔ اس نے تالی بھی بجائی ہوگی۔ بھانت بھانت کے جانوروں کو دیکھ کر وہ کیسے محفوظ ہوا ہو گا۔ چینی رقصاؤں کی طرح وہ بھی ناچنا چاہتا ہو گا۔ اس نے اپنی ماں سے ڈرم بجانے کی فرمائش بھی کی ہوگی۔

پھر یہ سب کر کے بھی۔۔۔ اب وہ رونے لگا۔ وہ کیوں رونے لگا؟ اور ایک گیت تھا۔ خسرو کمالی کا۔

عالیان مار کر ٹکا۔ لفظ لفظ ترانہ۔ لفظ لفظ مرثیہ۔ اور ایک ساز برباب تھا۔

زربو جھیل کنارے بچتا ہوا۔ ڈریکین پریدہ میں گونجتا ہوا۔

پھر جھیل کے پینڈے میں گونگا پڑا ہوا۔ ”امرہ!“ بھوری آنکھیں سیاہ پڑنے لگیں۔ اس نے امرہ کو ایسے دیکھا جیسے وہ اسے کوئی دھوکا دے رہی ہو اور وہ جانچ رہا ہو کہ اسے دھوکا کیوں دیا جا رہا ہے۔

”تم۔۔۔ یہ سب کیا؟“ اسے سمجھ نہیں آئی کہ سوال کو کن الفاظ سے ترتیب دے کہ من پسند جواب پا سکے۔ بھلا ایسا بھی ہوتا ہے کبھی؟

”ہمارے یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ تم نے ایسا کیسے سوچ لیا۔ ہم تو دوست ہیں۔ لیکن پلیز تم دوبارہ ایسا کچھ نہ کہنا۔“ جلدی سے کہہ کر اس نے ماسک پہن لیا اور پریدہ کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔

اور پھر ساری پریدہ آگے بڑھنے لگی۔ ساری دنیا۔ ساری کائنات۔ صرف ایک وجود کھڑا تھا۔ ساکت تھا۔ پتھر کا ہو چکا تھا۔

وہ عالیان مار کر ٹکا کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ جو سارے ماچسٹر کو اکٹھا کر کے اس کی کھڑکی تک لے جانے والا تھا وہ سارے ماچسٹر میں اب خود کو ڈھونڈ ڈھونڈ اکٹھا کرتا پھرے گا۔

چینی ماں روتے بچے کو چپ کروانے میں ناکام ہو چکی تھی۔ اس کی شکل گہرے سایوں کی زد میں تھی۔ وہ اپنے عقیدوں پر پختہ یقین رکھنے والی لگتی تھی۔ اور اسی لیے پریدہ میں اس کی ساری دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ اور وہ زیر لب دعا میں کر رہی تھی کہ نئے سال میں نحوست اور بلا میں اس سے دور رہیں۔ لیکن بچہ چپ ہی نہیں ہو رہا تھا۔

پریدہ چائنا ٹاؤن کی محراب کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ ڈرموں کی تھاپ اب کان کے پردے پھاڑ رہی

تھی۔

عالیان کا دم گھٹ رہا تھا پھر بھی اس نے ڈریکین ماسک پہن لیا۔

اور پہلے آہستہ روی سے پھر تیزی سے پریدہ کو پیٹھ دیکھا کر بھاگنے لگا، عجیب انسان تھا وہ دو قدم پر محراب تھی اور وہ وہاں تک نہ جاسکا اور الٹی طرف بھاگنے لگا۔ اس کا ڈریکین ماسک بہت بدہیت لگنے لگا تھا اس بدہیت کو دیکھ کر ڈر قطعاً نہیں لگ رہا تھا اس دل مٹھی میں آیا لگتا تھا۔

امرہ چینی ساختہ محراب کے پار ہو گئی اور پھر اس نے ہمت کر کے گردن موڑ کر دیکھا۔ کوئی بہت بے دردی سے پریدہ کو چیرتا بھاگ رہا تھا جیسے اس کے آس پاس آگ بھڑکتی ہو۔ نہیں جیسے اس کے اندر آگ لگی

اس ڈریکین نے خود کو پریدہ سے الگ کیا۔ اور لوگوں کے ہجوم میں خود کو گم کرتے۔ اپنے ماسک کے اندر ہی خود کو بلک بلک کر رونے دیا۔

امرہ نے خود کو لوگوں کی بھیڑ میں گم کر دیا۔ وہ ابھی ماسک اتارنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔

دو لوگ خود کو بھیڑ میں گم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بھیڑ سے نکلنے کی بھی۔ الگ ہو جانے کی بھی اور مل جانے کی بھی۔ ایک وقت میں اتنی خواہشیں۔ ماچسٹر کی کشادہ سڑکوں پر پھیلی۔ ہزاروں لوگوں سے الٹی ڈریکین پریدہ ماسک جلوس کی صورت اختیار کر گئی۔

کیونکہ کیونکہ ایک ماں کی گود میں بچہ حلق پھاڑ کر رو رہا تھا اور ماں کی ساری کوشش اسے چپ کروانے میں ناکام ہو چکی تھی۔ نئے سال کی آمد اس کے لیے نیک شگون نہیں لائی تھی۔ کیا اب سارا سال اسے رونا پڑے گا؟

خیر اور بھلائی اس سے دور رہے گی۔ بلا میں اور شر اس پر حملہ آور ہوں گے۔ کیا خوش قسمتی پر اس کا کوئی

حق نہ ہوگا۔

اور کیا۔ اور کیا۔ اس کا دل خون کے آنسو روئے گا۔

خسرو کمالی نے رباب کو زربور میں پھینکا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس طرف زہرہ آفتدی کی جگہ ایک شیر کھڑا تھا۔

وہ جانتا تھا اس شیر کا نظر آنا ختم ہے۔ ختم ہے۔

چینی پریدہ کے اس اور اس کنارے بھی ایک شیر اپنا منہ صاف کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ شکار کر چکا تھا۔ وہ مشرقی اکھاڑوں کا ٹکڑا ٹکڑا جانے والا شیر ہے۔

بانو قدسیہ کہتی ہیں ”محبت مرگ سے پہلے جنم کا نام ہے۔“

اور مجھے ایسا لگتا ہے ”محبت جنم سے پہلے مرگ کا نام بھی ہے۔“

یہ پہلے آپ کو مار ڈالتی ہے پھر جی میں آئے تو جنم دے دیتی ہے۔ یہ پہلے انگارہ بنتی ہے۔ جی میں آئے تو۔ تو گلزار۔

یہ ”م“ کا پرچار کرتی ماہی۔ ماہی۔ محبت ہے۔ یہ ”م“ سے بھیٹ لیتی۔ محبت۔ مرگ۔ مرگ ہے۔

یہ محال۔

یہ محرق (جلادینے والی)۔

اور یہ محشر ہے۔

محبت ”م“ سے۔ یہ امر سے پہلے ”مرن“ ہے۔ محبت مطوق (قید کی گئی)۔

محبت مضطر۔

اور یہ محبت مشرک بھی ہے۔

وہ پاکستان ہی رہ چکی ہوتی اور اس پر ایسا برا وقت نہ

آیا ہوتا۔ کاش پاکستان میں سب اس کے لیے ٹھیک ہوتا۔ اسے اپنے ماحول سے نکل بھاگنے کی تمنا نہ ہوتی،

اسے یہاں آنے کی چاہ نہ ہوتی۔ وہ شخص جو اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں اندر باہر ہر طرف تھا۔ جو ہر طرف سے اسے اپنی طرف آتا نظر آتا تھا۔ وہ شخص اسے ساری زندگی نہ ملا ہوتا۔

لیکن وقت کی کمان میں اس کی اپنی مرضی کے تیر ہوتے ہیں اور وہ انہیں اپنی مرضی سے تاک کر چھوڑتا ہے۔ وہ ایک آنکھ میچے۔ سانس گم کیے۔ نشانہ باندھے بیٹھتا ہے۔ اپنے من پسند وقت۔ یہ چھوڑا۔ اور شکار چیت۔

اب اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ خاموش رہے اور سب سے دور بھی۔ تعلیم مکمل کرے۔ اور گھر جائے۔ اور یہی سب ہونا تھا۔ اسی اور خاموشی کو لیے چند دن گزر گئے۔ اور بقول بانو قدسیہ ”مسکراہٹ سمیت وہ غائب ہونے کا فن جانتا تھا۔“

عالیان فن کار اسے ان چند دنوں میں کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے اسے ڈھونڈنا نہیں چاہا تھا۔ پھر بھی۔ وہ غائب ہونے کا فن سیکھ چکا تھا۔ ”تم بہت اداس رہتی ہو؟“ ویرا پوچھ رہی تھی وہ سونے کی تیاری کرنے ہی والی تھی بس۔ وہ کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔ سونے کے لیے اٹھ ہی نہیں رہی تھی۔

”نہیں! میں ٹھیک ہوں۔“
”میں نے کب کہا تم ٹھیک نہیں ہو۔ ریڈ میں“
عالیان آیا تھا تمہارے پاس۔ شاید اس نے کچھ کہا تھا تم سے۔ ”ویرا اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔“
”کیا کچھ گاؤ؟“ امرجہ نے کتاب جو سامنے رکھی تھی اور پچھلے کئی گھنٹوں سے رکھی تھی کو پڑھنے کی کوشش کی۔

”کچھ بھی کہہ سکتا ہے وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ بعد میں میں نے اسے بہت اداس ہو کر جاتے دیکھا۔“
ویرا واقعی موساد کی خفیہ ایجنٹ تھی اتنے رش میں بھی اس نے یہ سب نوٹ کر لیا تھا۔

امرجہ ویرا کو دیکھنے لگی۔

”تم خاموش کیوں ہو امرجہ؟“

”اس نے کہا وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”اوہ۔ اور تم نے کیا کہا؟“ ویرا مسکرائی۔

”میں نے؟“ سوال تھا یا اقرار۔

”ہاں ظاہر ہے تم نے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے مجھے لگا۔ وہ تمہارا اچھا دوست بننا چاہتا ہے لیکن اسے کچھ اور ہی بننا تھا۔“ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”میری منگنی پاکستان میں ہو چکی ہے۔ میرے جاتے ہی میری شادی ہو جائے گی۔“

”تمہاری منگنی۔ تمہاری منگنی ہو چکی ہے؟“

”نہیں۔“ امرجہ نے اداسی سے کہا۔

”تو تم نے جھوٹ بولا عالیان سے۔ تم نے ایسا کیوں کیا امرجہ؟“

”جو مجھے مناسب لگا میں نے کہہ دیا۔ بس۔“

”بس؟“ ویرا حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم عالیان کے لیے ایسے بات کر رہی ہو۔“

”کیسے بات کر رہی ہوں؟“

”اپنا انداز دیکھو امرجہ۔ اتنی بڑی یونیورسٹی میں وہ تمہارے پاس آتا ہے باتیں کرنے کے لیے۔ عالیان۔

اپنا انداز دیکھو۔ جانتی ہو کون ہے عالیان۔ پروفیسرز کے بعد یونی کی آنکھ کا تارا ہے۔ جس طرح

جنگ یونیورسٹی کمپس کے پاس کھڑا ہو کر تمہارا انتظار کرتا ہے کبھی دیکھا ہے؟“

”میں نے اسے کبھی نہیں کہا انتظار کرنے کے لیے۔“

”ایک صبح صبح بائے کہنے کے لیے وہ ہم سے دس پندرہ منٹ پہلے وہاں کھڑا ہوتا ہے۔“

”میں اسے ایسا کرنے کے لیے نہیں کہتی۔“

”تم کم عقل ہو۔“

”میں کم عقل ہوں۔“

”تم نا سمجھ ہو بہت۔“

”میں بہت نا سمجھ ہوں۔“

”شٹ اپ۔ تم نے اپنی منگنی کا جھوٹ کیوں بولا؟“

”تم تو سیدھے سیدھے عالیان کی بے عزتی کر رہی ہو۔“

”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنی آسانی سے تم مذاق اڑا رہی ہو۔“ امرجہ نے بے بسی سے ویرا کو دیکھا۔

”میری مرضی۔“
ویرا نے نقوی دیر اس کی طرف دیکھا۔ ایک شخص تمہیں پر بوز کر رہا ہے امرجہ! اور تم نے مناسب الفاظ میں اسے ٹال دیا۔“ ویرا تالی ہار کر طنز نہی۔

امرجہ کے جیسے کسی نے گل پر پھٹوڑے مارا۔ ”تم صاف انکار کر دیتیں اسے۔ ایسے بہانے اس کی انسٹلٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ اس

روی ویرا کو سمجھانا بہت مشکل تھا۔ ”بہت عجیب ہو تم۔ بہت زیادہ۔ اتنے ذہین انسان کو کیسے تم نے جھوٹ بول کر انکار کر دیا۔“

ویرا تو عالیان کی ذہانت کی فین تھی۔ ویرا نے ایک بار اور تالی بجائی۔

”ٹینگ لیڈی آف پاکستان۔ دی گرٹ لیڈی۔“

”ہونہ۔“
امرجہ کا منہ سرخ ہو گیا وہ روپنے کو ہو گئی۔

”کیسے نہ کرتی میں انکار۔ پتا نہیں کون ہے وہ۔ عیسائی، مسلمان یا یہودی۔ مارگرٹ اس کی ماں کا نام ہے تو باپ کا کیا ہو گا۔“

امرجہ تیز آواز میں چلا اٹھی اسے ویرا کے انداز سے تکلیف پہنچی تھی۔

ویرا خاموش ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ ”اتنی معمولی سی وجہ کے لیے؟“

”معمولی وجہ نہیں ہے یہ ویرا۔ نہیں ہے یہ سب معمولی۔ اس کے باپ کا خاندان کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ وہ کون ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتا ہو گا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے؟“ ویرا کی آواز تیز ہو گئی۔

”یورپ کے آزاد معاشرے کی دین۔ غیر مذہبی۔ غیر اخلاقی اقدام کی پیداوار۔ معمولی باتیں نہیں ہیں یہ سب۔ میرے خاندان کے لیے طمانچے جیسی باتیں ہوں گی یہ سب۔“

”طمانچہ!“ ویرا استہزائیہ نہی ”خاندان۔ واؤ۔“

”گڈ۔۔۔ پھر مسئلہ کیا ہے؟“ امرجہ پھر سے خاموش ہو گئی۔

”اوہ۔۔۔ اچھا وہ اکیلا ہے۔ اس کے باپ کا پتا نہیں، وہ ناجائز ہو سکتا ہے اس لیے۔ واؤ۔ اس کے

ناجائز ہونے سے مسئلہ ہے۔ اگر وہ ناجائز نہ ہوا امرحہ
... تو؟
"تو بھی نہیں۔ نہیں وہ مجھے نہیں پسند۔ میں
نے انکار کر دیا۔" امرحہ کو یہ جواب سب سے زیادہ
مناسب لگا۔

"شاید تم اسے پسند کرنے لگو؟"
"میں اسے پسند نہیں کر سکتی۔ وہ میرا اچھا دوست
ہے۔ جیسے تم ہو۔"

"شاید تم اسے پسند کرنے لگو۔" ویرا سنجیدگی اور
سختی سے اپنی بات دہرا رہی تھی یا شاید تم اسے پسند
بھی کرتی ہو لیکن اپنے خاندان کے لیے۔ اپنے
معاشرے اپنی روایات کے لیے۔"

"میں اسے کیوں پسند کروں گی۔ کیوں کروں گی۔
کون سی خبیث ہے اس میں؟ اگر وہ قاتل ہے تو یونی میں
ہزاروں اور بھی ہیں۔ مجھے اسے ہاں کہنے کے لیے
مجبور نہیں کیا جاسکتا۔"

"تم مجھے مطمئن کرو امرحہ۔ مجھے اس سب کی
سمجھ نہیں آرہی۔" ویرا جم کر کھڑی ہو گئی۔

"شاید تمہارا خیال ہے کہ اگر وہ مسلمان ہے بھی تو
تم جتنا اچھا انسان نہیں ہے۔ وہ تمہاری طرح عبادت
نہیں کرتا ہو گا۔ تمہاری طرح حلال فوڈ کا استعمال
نہیں کرتا ہو گا۔ اسے بنیادی مذہبی تعلیمات کے
بارے میں نہیں معلوم ہو گا۔ اور اگر وہ تمہارے
خاندان کے پاس جاتا ہی ہے تمہارا ہاتھ مانگنے تو اسے
ان سب باتوں کی وجہ سے روکیا جاسکتا ہے۔ ہے نا
امرحہ۔؟"

امرحہ خاموش رہی۔

"جواب دو امرحہ۔"

"ہاں! امرحہ چلا اٹھی۔" تم ٹھیک کہہ رہی ہو
۔ اتنا آسان نہیں ہے یہ سب۔ بہت مشکل ہے یہ
سب۔"

"تم لوگ یورپ میں رہنے والوں کے بارے میں
یہی سب سوچتے ہو نہیں جانتی ہوں۔ تمہیں لگتا ہے
اقدار صرف تمہارے مشرقی ملکوں میں ہی ہیں۔"

روایات اور مذہب کی پاسداری بھی۔" ویرا اب
باقاعدہ اسے ذلیل کر رہی تھی۔
"اور کیا بچ نہیں ہے یہ۔ کیا نام ہے عالیان کے
فادر کا۔ اس کا سر نیم مار گریٹ کیوں ہے؟"
"تم اس سے پوچھ لو۔"

"میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اور تم
جاؤ۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم عالیان کی اتنی بڑی
حمایتی ہو۔" امرحہ بھڑک اٹھی۔

"اگر تم غور کرو تو میں تم دونوں کی حمایت کر رہی
ہوں۔ لیکن تم لوگ بہت نا سمجھ ہوتے ہو۔"
"ہم کون؟" امرحہ کی تیوری چڑھ گئی۔

"تمہارے ملک پر طنز نہیں کر رہی امرحہ۔ تم
لوگ یعنی تم جیسے کم عقل لوگ۔ سطحی لوگ۔ روایات
معاشرے کے علم بردار۔"

"بس بہت ہو گئی اب جاؤ۔ میں نے جو کرنا تھا کر
لیا۔"

ویرا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اور چلی گئی۔

کھڑکی میں کھڑی وہ اندھیری رات کے گہرے
اندھیروں کو دیکھتی رہی ویرا اسے اس نے جان چھڑائی
تھی اب خود سے کیسے چھڑائے گی۔ دنیا بھر سے چھپ
کر بیٹھا جاسکتا ہے ایک اپنے آپ سے چھپ کر رہنے
کی جگہ نہیں ملتی۔ دنیا بھر سے کیا کچھ نہیں کہہ دیا
جاتا ایک اپنے آپ سے کہنے کے لیے ہی کوئی لفظ
نہیں ملتا۔

تو کیا محبت جہنم سے پہلے مرگ نہیں۔؟

ہفتے کی رات ہے۔ اور یہ ہارٹ راک کیفے کا
ڈانس فلور ہے۔ ڈی جے اپنے میوزک کے ساتھ
تجربات کرنے سے پہلے ایک خاص ڈسک کو پلے کرنا
چاہ رہا ہے۔ یہ ڈسک اسے ہارٹینڈر کارل نے دی
ہے۔ کیفے میں یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کی بھرمار ہے۔
خاص کر بزنس اسکول کے اسٹوڈنٹس کی۔ ڈانس فلور
پر ڈانس شروع ہوا ہی جاتا ہے کارل کاک ٹیل بنا رہا

ہے۔ عالیان ابھی ابھی اس کے سامنے رکھی اونچی
کرسی پر نیم دلی سے آکر بیٹھا ہے۔ اسے کارل نے
کچن سے بلایا ہے ڈی جے نے ڈسک پلے کر دی ہے۔
"تمہاری منتہی ہو چکی ہے؟"
"نہیں۔"

"تم نے جھوٹ بولا عالیان سے۔؟"
"جو مجھے مناسب لگا میں نے کہہ دیا۔ کیسے نہ انکار
کرتی پتا نہیں کون ہے۔ وہ مار گریٹ اس کی ماں کا نام
ہے تو باپ کا کیا ہو گا۔ آئزک۔ واؤ۔"

"اتنی معمولی سی وجہ کے لیے۔؟"
"معمولی وجہ نہیں ہے یہ۔ میں اسے پسند نہیں
کرتی۔ کون سی خوبی ہے۔ اس میں۔ مجھے اسے ہاں
کہنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔"

"شاید تمہارا خیال ہے کہ وہ مسلمان ہے بھی تو تم
جتنا اچھا مسلمان نہیں ہے۔"

"ہاں! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ کیا نام ہے عالیان
کے؟" فادر کا۔ اس کا سر نیم مار گریٹ کیوں ہے۔"
"وہ ناجائز نہ ہو سکتا ہے اس لیے بھی؟"

"ہاں! ہاں۔"

"تمہاری طرح، حلال فوڈ کا استعمال نہیں کرتا ہو گا
اس لیے بھی۔؟"
"ہاں!۔"

وہاں موجود ایک ایک اسٹوڈنٹ عالیان مار گریٹ
کی طرف گردن موڑے دیکھ رہا تھا۔ کارل نے ایک
آنکھ دبائی اور منہ بنا کر بھڑیے کی آواز نکالی لیکن
عالیان نہ وہاں موجود یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کو دیکھ رہا
تھا نہ ہی کارل کو۔ وہ اپنے جوتوں کی نوک کو گھور رہا تھا۔
اسے آج معلوم ہوا تھا۔ ایک دم سے کیسے کرسی پر
بیٹھے بیٹھے آپ جوتے کی نوک تلے آجاتے ہیں۔

اس کے منہ پر کبھی کسی نے تھپڑ نہیں مارا تھا اس
کے سرخ ہوتے منہ پر آج پھپھو کی بوچھاڑ کر دی گئی
تھی۔

کاک ٹیل بناتے کارل کے ہاتھ رک گئے۔ عالیان
کارڈ عمل اس کی توقع کے برخلاف تھا۔ اس نے اٹھ

کر اسے گھونسا نہیں مارا تھا۔ وہ مسلسل اپنے جوتوں کی
نوک کو دیکھ رہا تھا۔
اس کھیل کے وہ بچے دشمن تھے۔ ویسے وہ دوست
تھے؟

"عالیان۔! کارل نے اسے آواز دی۔
عالیان نے جوتے کی نوک سے نظریں اٹھا کر اسے
دیکھا۔

"شکریہ کارل۔ میں تمہارا یہ احسان تا عمر نہیں
بھولوں گا۔" وہ اٹھا اور قدم گھسنے لگا۔
"وہ ناجائز ہو سکتا ہے اس کیسے بھی۔"

"ہاں!۔"

"نہیں وہ مجھے نہیں پسند۔ کیا نام ہے عالیان کے
فادر کا۔"

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ لیکن پھر بھی وہ
بہرا نہیں ہوا۔ محبت کی زبان اسی وقت تو بولتی ہے،
جب اس کے گونگا ہو جانے کی دعا کی جاتی ہے۔ اور
محبت کے کلن اسی وقت تو سب سننے لگتے ہیں جب ان
کے سرے ہو جانے کی بد دعا کی جاتی ہے۔

اور یہ محرق ہے۔ محبت۔
کیا نام ہے عالیان کے فادر کا۔؟ کیا نام ہے۔ فادر
۔ اس کا سر نیم مار گریٹ کیوں ہے؟ فادر۔ فادر۔
خستیں لالہ صبح بہارم، پیاپے سوزم از دماغ کہ

دارم
(صبح بہار کا پہلا لالے کا پھول ہوں جو عشق
کے دماغ سے منسلک تڑپ رہا ہوں)

محبت جگا جوت ہے جسے ٹھٹھی میں کر کے آنکھوں
کے سامنے رکھ لیتا آسان نہیں۔ آنکھیں نہیں
چند حیا میں قسمت چند حیا جاتی ہے۔ وہ اتنی جلدی
کہاں مہربان ہوتی ہے۔

انسان سب سے زیادہ خواب محبت کے دکھتا ہے۔
انسان پر سب سے زیادہ خواب محبت کے بھاری
پڑتے ہیں۔

انسان کسی بھی مزاج یا نسل سے تعلق رکھتا ہو،
محبت کی اتنی سمجھ بوجھ ضرور رکھتا ہے کہ دعا کے لیے

باقاعدہ ہاتھ اٹھائے نہ اٹھائے اندر ہی اندر اتنی آرزو ضرور کرتا ہے کہ کائنات میں چھپا کر رکھی گئی ساری محبت اس کی جھولی میں ڈال دی جائے۔ کسے نہ کہے پر اتنا ضرور سوچتا ہے کہ محبت کو وہ کچھ بھی کر کے چرائی لائے۔

ساری محبت چرائی لینے کا خواب عالیاں مارگریٹ نے بھی دیکھا تھا۔ اور یہ خواب اس پر بہت بھاری گزرا تھا۔ کیونکہ محبت وہ شجر ممنوع بھی تو ہے جو جھولی پھیلو اگر مست مست ناچ نچواتی ہے اور پھر بھی دہن کھول کر در شہوار کے درشن نہیں کرواتی۔

جھولی پھیلانے رقص یا رقص کے رقص اپنے پیر جلا بیٹھے ہیں تب بھی نہیں۔ بس نہیں۔

وہ اپنا تن من بھسم کر ڈالتے ہیں تب بھی۔ نہیں۔ وہ خود کو گھسیٹ رہا ہے۔ جس برف نے ماچسٹر کو اپنی ہتھیلیوں میں لے رکھا تھا وہ اسے گرتا دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اسے دیکھنا تھا کہ چلتے چلتے کیسے گرا سا جاتا ہے۔

برف میں ایک قلندری خاصیت بہت کمال کی ہے۔ یہ گرتی ہے تو شور نہیں مچاتی۔ گر کر پھل کر ختم ہو جاتی ہے تو بھی واہلا نہیں کرتی۔ برف اپنے سینے پر رزتے گر کر جاتے اس کے قدموں میں یہ خاصیت محفل کرونا چاہتی تھی۔

ماچسٹر کی اتنے سالوں دیکھی بھالی سردی میں اب عالیاں کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کی ناک بے حد سرخ ہو چکی تھی۔ اور آنکھیں بھی سردی سے نہیں صدمے سے۔ اس کی بھوری بچوں سی چمک لیے آنکھیں بھر آئی تھیں۔ انسان تھا نا۔ رونا تو بنتا تھا۔

محبت کا سنرا خواب جو دیکھ لیا تھا۔ خواب کے ٹوٹ جانے پر ٹوٹا تو بنتا تھا۔ آسمان کے سارے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر ماچسٹر کی شاہراہوں پر بکھر رہے تھے۔ کائناتی محبت پر۔ کائنات کا ٹوٹ پھوٹ جانا تو بنتا ہے۔

سڑک پر چلتے وہ ایک بند گلی کے کنارے رک گیا۔ جس کے اندر ایک بڑا کوڑا دان رکھا تھا۔ وہ اندھیرے

میں کوڑے دان کے پیچھے جا کر دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنی پہلی محبت یاد آ رہی تھی۔

”مارگریٹ جوزف۔ اس کی ماں جو اس کی بھوری آنکھوں کو اپنی نیلی آنکھوں سے گھنوں دیکھا کرتی تھی۔ اور جیسے خاموشی کی زبان سے کہتی جاتی ”مجھے کیا معلوم تھا یہ آنکھیں مجھے ایسے لے ڈوبیں گی۔ لیکن میں خوش ہوں کہ یہ مجھے لے ڈوبیں۔ میں شکر گزار ہوں کہ مجھے یہ آنکھیں عطا کی گئیں۔ میں ان میں اپنی صورت دیکھ سکتی ہوں۔ میں کیسے نہ شکر گزار ہوں۔“ اس کی آنکھیں اس کے لبنانی باپ جیسی تھیں۔ وہ مارگریٹ کے مرہ ہوئے وجود میں جان ڈال دینے والی آنکھیں تھیں۔ وہ انہیں گھنوں کیوں نہ دیکھا کرتی۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک کمرے کے نسبتاً گندے سے فلیٹ میں رہتا تھا جس کے ایک کونے میں بچن تھا اور دوسرے کونے میں واش روم۔ بیڈ کمرے کے دروازے کے عین سامنے تھا۔ ایک کھڑکی تھی جس کے آگے ایک کرسی دھری رہتی تھی۔ اس کرسی پر کھڑے ہو کر عالیاں کھڑکی سے سر نکا کر اپنی ماں کی راہ دیکھا کرتا تھا۔ مارگریٹ کے انتظار میں اس نے اپنی آنکھوں کو بہت تھکا یا تھا۔

کمرے میں بچن اور واش روم کی بو ہمہ وقت رہتی رہتی تھی لیکن یہ فلیٹ اس وقت تک اٹھتا جب مارگریٹ آکر اسے اپنی باتوں میں بھریتی۔ مارگریٹ جو ایک ہسپتال میں صفائی پر مامور تھی اس کے جسم سے کئی طرح کے کیمیکل کی بو آتی۔ مگر یہ بو عالیاں کے لیے دنیا کی بہترین خوشبوؤں سے بڑھ کر تھی۔

مارگریٹ جوزف مسکراتے کی کوشش کیا کرتی تھی لیکن وہ ایک بری اداکارہ تھی۔ اس نے زندگی کو زندہ دلان ہمت جوان مودی سے گزارنے کے کچھ اقوال رٹ رکھے تھے۔ وہ انہیں ہر روز دہراتی اور مسکراتے کی بھدی اداکاری کرتی اپنے کام پر چلی جاتی۔ مسکرا کر گھر کا دروازہ بند کرتی۔ گھولتی۔ روز کی اداکاری۔ زندگی اقوال پر کامیاب ضرور کی جاسکتی ہے خوش طالع

نہیں۔ ایسی زندگی کو سیاہی سے تو پچایا جاسکتا ہے لیکن ست رنگی نہیں رنگا جاسکتا۔ یہ دھنک جلی تو ہو سکتی ہے دھنک ڈھلی نہیں۔

یہ اس زمزمے کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو دل کے کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتی ہے۔ ایسی زندگی زندگی تو نہیں ہوتی۔ کیونکہ وجود میں دھرا لو کھڑا جیت ہو جاتا ہے۔ یہ لو کھڑا جو دل ہے۔ اور جس دھوکے باز بزدل کا کوئی علاج نہیں۔ یہ غداری کرتا ہے۔ اور اس غداری پر اسے موت کی سزا ملتی ہے۔ تو مارگریٹ اقوال پر زندگی گزارنے کی کوشش کرتی رہی اور لحاف میں منہ دے کر روتی رہی۔ اس نے زندگی کی ایک فاش غلطی کر ڈالی تھی۔ اس نے ایک مسلمان سے محبت کر لی تھی۔ ایک ایسا لبنانی مسلمان جو وہاں کام کے لیے آیا تھا۔ پونڈز کے لیے۔ محبت کے لیے نہیں۔ وہ اس روایت کا پاس دار تھا کہ سفر کے دوران گاڑی کے نئے اور انوکھے اسٹیشنوں پر رک جانے کو دل پر نہیں لینا چاہیے۔ سفر میں اسٹیشن تو آتے ہی رہتے ہیں۔ تو کیا سفر کو ہی روک دیا جائے۔ وہ سمجھ دار تھا۔ اس نے سفر کو نہیں روکا۔

نہلی آنکھوں پر چروں سے تو دنیا بھری پڑی ہے۔ کس چیز کی کمی ہے اس جہان میں۔ پھر ایک انسان کے لیے زندگی جاہ کر لینا کہاں کی روایت ہے۔ اگر ہے بھی تو ہم نہیں مانتے ان روایات کو۔ سب قصے کہانیاں ہیں۔

اس کی چھ سالہ زندگی اپنی ماں کی دہلی سسکیاں سننے گزری۔ وہ سمجھتی تھی وہ سو رہا ہے۔ پر ایسی آہوں کے سائے تلے سو جانا گناہ کے مترادف ہوتا۔ وہ دن بھر کام کرتی۔ رات بھر روتی۔ ایسی حالت میں وہ زیادہ دیر تک زندہ کیسے رہتی۔ کیونکر زندہ رہتی۔ جو انسان بچن میں کام کرتا۔ بیڈ پر لیٹا کھڑکی میں کھڑا دروازے پر نظریں رکھے خود کو پھرالے۔ وہ زندہ رہ کر زندہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ ایسے انسان کو تو جلد مرجانا چاہیے۔ جس کا لو کھڑا دل خون بنانے کے بجائے۔

خون اگلنے لگے، ایسے لو کھڑے کے مالک کو جلد ہی مر جانا چاہیے۔

جس چمکی تکلیف وہ یاد کو عالیاں مارگریٹ کو اپنے دماغ میں زندہ رکھتا تھا وہ کچھ یوں تھی کہ کمرے کی واحد کھڑکی کے آگے رکھی کرسی پر کھڑا وہ نیچے جھانک کر اپنی ماں کو تلاش رہا تھا۔ نیچے ایک مصروف سڑک تھی جس پر چھوٹی چھوٹی کئی دوکانیں اور اسٹورز واقع تھے۔ مارگریٹ تھکی تھکی اس سڑک پر چلتی اسے نظر آ گئی۔ وہ اندر آئی اور بیڈ پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر چل کر اس کے پاس آئی اور وہی اپنی اداکارانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا جبکہ خود وہ کرسی کے پاس گھنوں کے بل بیٹھ گئی۔ ”تم بہادر ہو نا۔“ مارگریٹ نے ایک اچھی مسکراہٹ سجا کر پوچھا۔

جب عالیاں تھوڑا بڑا ہوا تو اس نے کئی سالوں تک خود کو ہڑا کر اٹھتے اور کہتے سنا۔ ”نہیں! میں بہادر نہیں ہوں۔“

دو تہا لوگ جب ایک دوسرے سے یہ پوچھنے کی جرات کرتے ہیں تو حقیقتاً ”وہ یہ کہنا چاہ رہے ہوتے ہیں کہ“ اب تیار ہو جاؤ۔ تم بہادر ہو یا نہیں۔ تمہیں بہادری دکھانی ہوگی، تلخ حقیقتیں تمہاری رسیلی زندگی میں گھلنے کے لیے تیار ہیں۔ کیا تم بھی تیار ہو؟

اپنی بھوری آنکھوں سے وہ مارگریٹ کو دیکھنے لگا۔ ہاں کی نائاں۔

”ماما کیا کے پاس جا رہی ہیں۔“ مارگریٹ نے اس کے گل پر پیار کیا اور کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھا۔ وہ ایک بری اداکارہ تھی۔ زیادہ دیر تک مسکرا نہ سکی۔ پھر بہت دیر کے بعد وہ وہاں سے ہٹی اور ایک چھوٹے سے بیگ میں اس کے کپڑے رکھنے لگی۔ ایک دوسرے سفری بیگ میں اس نے اپنی ایک جینز اور دو شرٹس رکھیں۔ دونوں بیگ اٹھا کر اور اس کا ہاتھ تھام کر وہ اسے اپنی دوست کے پاس لے آئی اور اس کے گل چوم کر چلی گئی۔

مارگریٹ چلی گئی۔ اور کتنی ہی صدیوں بعد واپس آئی۔ اتنی صدیوں بعد کہ عالیاں نے جان لیا کہ اس کی ماں سوتے جاگتے کام کرتے خاموش بیٹھے سسکتی کیوں رہتی تھی اور مسکرانے میں وہ اتنی بری اداکارہ کیوں تھی اور یہ بھی کہ اس کی نظریں کن ویرانوں میں بھٹکا کرتی تھیں اور اس کے وجود سے آپس کیسے اور کیونکر نکلا کرتی تھیں۔ جب وہ آئی تو وہ سوسن آئی کے گھر کے پچھواڑے میں ایک طرف بیٹھا کھیلنے بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان بچوں نے کئی بار اسے کھلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ اپنی ماں پر ہی گیا تھا۔ وہ ایک برا کھلاڑی تھا۔ وہ کھیل کو کھیل نہیں سکتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے جیسے اسے خبر ہی ہو گئی کہ اس کی ماں کیسے اس کے قریب ہے۔ وہ گھر کے اندر آیا۔ دور سے ہی اس نے مارگریٹ جوزف کی ہچکیوں کو سن لیا۔ وہ ساری اداکاری کو بالائے طاق رکھ کر رو رہی تھی۔

”ہاں! وہ مجھے نظر آ گیا تھا۔ وہ مجھے مل گیا تھا۔ تین ہفتے میں اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈتی رہی۔ اس کے دوست نے کہا تھا۔ مجھے چند ماہ بھی رکنا پڑے تو میں وہیں رکوں۔ وہ وہیں ملے گا۔ اور وہ مل گیا۔ اور اس نے اس نے جیسے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ قیمتی کپڑے پنے سڑک پر چل رہا تھا، مجھے ان دیکھا کر کے وہ تیزی سے وہاں سے غائب ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے بھاگی۔ لیکن اتنی جلدی نجانے وہ کہاں گم ہو گیا تھا۔ سڑک پر ادھر ادھر بھاگتے میں چلا رہی تھی۔ اور سوسن! پھر بھاگتے بھاگتے میں نے خود کو گرا لیا۔ کہ شاید کسی کونے میں خود کو چھپا کر مجھے دیکھتے وہ مجھ پر ترس کھا کر ہی آجائے۔ میں گری ہی رہی اور روتی ہی رہی لیکن وہ نہیں آیا۔ نہیں آیا وہ۔ اگلے دن وہ میرے ہو مل آیا۔ دیکھو کتنا آسان تھا اس کے لیے مجھے ڈنمارک میں ڈھونڈ لینا۔ اور میں اتنے سالوں میں اسے دنیا بھر میں نہ ڈھونڈ سکی۔ میں بہت ناکارہ بہت بے کار ہوں نا سوسن! جانتی ہو میرے دو گھنٹے رونے کے بعد اور یہ بتانے کے بعد کہ پچھلے چار سالوں میں میں نے کیسے کیسے اس سے رابطہ کرنے کی

کوشش کی۔ کس کس شخص کے پاس اس کا پوچھنے کے لیے گئی۔ خدا کے آگے کیسے کیسے گزر گرائی اور اسے یاد کر کے کیسے کیسے روتی رہی اس نے کیا کیا۔ اس نے جیب سے ایک کانڈ نکالا اور کہا۔ ”یہ تمہاری طلاق کے کانڈ ہیں۔ میں نے اپنے مذہبی اسکالر سے اس کی تصدیق کروالی ہے۔ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہوگی، لیکن مجھے ہے۔ تم سخطا کر دو۔“ پھر اس نے ایک لفافہ میرے آگے کیا اور کہا۔ ”یہ لو پیے اور واپس جاؤ۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا لعنتی کافر عورت!“ اسے بے طرح حیا د کرنے پر وہ مجھے طلاق دے رہا تھا۔

اس کے لیے میں خدا کے آگے کیسے کیسے گزر گرائی۔ یہ سن کر وہ مجھے لعنتی کہہ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اس پر اللہ کا غضب نازل ہوا تھا۔ جو اس نے ایک کافر عورت سے شادی کر لی۔ وہ تعلق ایک لعنت تھا۔ میں سوسن اس نے کہا میں ایک لعنت ہوں۔ میں اللہ نے تو مجھے بھی بنایا ہے اور اسے بھی۔ کیا اللہ لعنتیں بناتا ہے۔ کیا اللہ ایسا نا انصاف ہے کہ ایک کو اس جیسا انسان بناتا ہے اور ایک کو مجھ جیسا۔ اس نے کہا میں ایک کافر عورت ہوں۔ وہ کافر کسے کہتا تھا۔ خدا کو نہ ماننے والے کو۔ خدا کو چھوڑ دینے والے کو۔ اور ایک انسان کو چھوڑ دینے والے کو۔ ایک انسان کو نہ ماننے والے کو کیا کہتا ہے وہ۔ میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے مجھے گالیاں دیں۔ میرے مرے ہوئے والدین پر الزام لگایا۔ کہ میں حرام کی پیداوار ہوں۔ میں سر پایا حرام ہوں۔ میری رگوں میں ناجائز اور گندا خون ہے۔ میں اور میرے آباؤ اجداد شراب پیٹے رہے ہیں اور میرے والدین کو شادی کی کیا ضرورت رہی ہوگی۔ میں ایک گندے غلیظ مغربی معاشرے کی پیداوار، کتنے کتنے گل کھلا چکی ہوں گی، وہ گالیاں دیتا رہا اور مجھے بتاتا رہا کہ میں کیا کیا ہوں۔ وہ مجھے بتاتا رہا کہ مجھے چھوڑ آنے کی اصل وجوہات کیا تھیں، وہ میرا کافر

ہوتا تھا۔ غیر مذہب ہوتا تھا۔ پھر اس نے میرے خدا کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ مجھے بتانے لگا کہ اصل کس کانڈ مذہب سچا ہے۔ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے کہ میں ڈنمارک کی حکومت کو اپنے اور اس کے تعلق کو لے کر درمیان میں نہ لاؤں یا برطانیہ کو وہ مجھ پر یہ ثابت کرنے لگا کہ اپنی بات میں وہ کس قدر سچا ہے۔ وہ ایک سچے مذہب کو ماننے والا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر اس کانڈ مذہب اتنا ہی سچا ہے اچھا ہے تو اس کی وہ کس تعلیم کے تحت میرے ساتھ برا کر رہا ہے سوسن مذہب کس کا سچا ہے اس کے لیے تو آپ کو خود کو سچا ہونا پڑتا ہے نا۔ پہلے تو خود کو مکمل کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ مذہب۔ کون سا مذہب ہے جو یہ سب کرنے کی تعلیم دیتا تھا جو وہ میرے ساتھ کر رہا تھا۔ ”وہ سوسن کے ہاتھ پکڑ کر اس سے سوال کرنے لگی۔

”اس نے کہا وہ بھٹک گیا تھا۔ وہ میرے جال میں آ گیا تھا۔ میں نے اپنی خوب صورتی کا استعمال کیا۔ بھٹک تو میں گئی تھی۔ چھٹھن تو میں گئی تھی اس کی محبت کے جال میں۔ میں کتنی خوب صورت ہوں۔ اس کا احساس تو اس نے مجھے دلایا تھا۔ وہ تو کہا کرتا تھا اللہ اپنے شاہکاروں میں مجھے بھی شمار کرتا ہو گا۔ اور وہ کہا کرتا تھا۔ اللہ کی مہربانی اس نے زمین والوں کے نصیب میں اس شاہکار کی رونمائی کی۔ مجھے شاہکار تو اس نے بنایا تھا۔ پھر اس نے مجھے لعنت کیوں بنا ڈالا۔ سوسن! میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ کوئی لعنت کے طوق کے ساتھ کیسے زندہ رہ سکتا ہے جبکہ اسے پہلے ”شاہکار“ کے رتبے پر فائز کر دیا گیا ہو۔

میرا تو سب چلا گیا نا۔ اس کا کیا گیا۔ وہ تو قیمتی لباس میں پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت میرے سامنے کھڑا تھا۔ جھکی ہوئی تو میں بھی اس کے آگے گزر گرائی رہی تھی۔ بھلا بتاؤ سوسن! جو نفع میں رہتے ہیں وہ میری طرح جھک کر گزر گراتے ہیں۔ ایسے خوار ہوتے ہیں۔ خسارے میں کون رہا سوسن۔ وہ میرے ہاتھ پیر کاٹ ڈالتا۔ اس نے میرا دل میری روح کاٹ ڈالی۔ وہ اتنا ظالم ہو گا کاش! مجھے

معلوم ہوتا۔ میں اس سے ایسی محبت کرنے لگوں گی کاش مجھے یہ بھی معلوم ہوتا۔ اور کاش وہ کھویا ہی رہتا۔ میں ساری عمر اسے ڈھونڈتی ہی رہتی۔ میری آنکھیں اس کے انتظار میں تھک کر مر رہی ہو جاتیں لیکن ایسے ذیل نہ ہوتیں۔ اس کی زبان سے نکلا ہر میرے کان میں نہ ٹکا ہوتا۔ سوسن! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ہاتھ کی پشت کو ہونٹوں سے لگانے والا جب ان ہی ہونٹوں سے تھوکتا ہے تو کرب کا کیسا لاوا وجود میں پھٹتا ہے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں۔“

مارگریٹ نے اپنے وجود کو اپنے ہاتھوں میں لپیٹنا چاہا۔ وہ ایسے تڑپ رہی تھی جیسے اس پر بوند بوند تیزاب پڑا جا رہا ہو اور اس کے پاس نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

دیوار کی اوٹ میں کھڑے اس بچے نے اس تیزاب کی بو اپنے ناک میں گھسنے محسوس کی۔

”میں اس بھری دنیا میں جا کر کسے بتاؤں کہ اس نے مارگریٹ نامی شاہکار کی پر وہ کشائی کیسے کی۔ کاش میں اسے کبھی نہ ڈھونڈ پاتی۔ میں نے اسے ڈھونڈ نکالنے کا گناہ کیوں کیا۔ میں نے گناہ ہی کیا۔ اگر اسے یہ سب کہنا ہی تھا تو وہ مجھے برطانیہ میں ہی کہہ کر چلا جاتا۔ وہ کانڈ جو وہ اپنے مذہبی اسکالر سے تصدیق کروا لایا تھا، مجھے وہیں دے کر چلا جاتا لیکن اس کو مجھے خوار کرنا تھا، اسے میں پہلے لعنت کیوں نہیں لگی۔ اسے مجھ جیسی کافر عورت کے سر پر منڈلا نا خدائی تہ پہلے دکھائی کیوں نہیں دیا۔ ملک بدلتے ہی اسے اتنی عقل آگئی۔ ایک امیر بیوہ کے ساتھ شادی کرنے کے بعد اسے میری اوقات یاد آگئی؟

مجھے سب کہا کرتے تھے یہ علی دس شادیاں کر لیں تو پلٹ کر کسی ایک کی طرف بھی نہیں دیکھتے۔ پر میں نے کسی کا اعتبار نہیں کیا۔ میں نے اس کا اعتبار کیا جس نے مجھے دھتکار دیا۔ اس نے تو مجھ سے بوندز کے لیے گرین کارڈ کے لیے بھی شادی نہیں کی تھی۔ اس نے تو مجھے زندہ درگور کرنے کے لیے سب کیا تھا۔ برطانیہ میں شادی کرنے والا ڈنمارک میں مجھے طلاق

دے رہا تھا۔ مجھے میری میرے والدین کی میرے مذہب کی غلاظت کے بارے میں بتا رہا تھا اس نے ایک بار بھی میری آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کے سیلاب کو نہ دیکھا۔ اسے یہ پرواہ بھی نہیں تھی کہ میں اس کے قدموں میں گر کر جاتی ہوں۔ میں کیسے اس کے بغیر کرب میں مبتلا رہی جان کر بھی اس نے ہمدردی سے بھی میری طرف نہ دیکھا۔ میں نے اسے اس کے بیٹے کے بارے میں بتایا تو اس نے اس بات کو۔ اس بات کو ایسے سنا سون! جیسے میں اسے۔ میں اسے اپنے کسی بوائے فرینڈ کے بچے کے بارے میں بتا رہی ہوں۔

وہ ایک طلاق کا دکھ لے کر نہیں بیٹھی تھی۔ اسے اس طلاق کے ساتھ کئی اور تازیانے مارے گئے تھے اور غلاظت کا ڈھیر ثابت کر دیا گیا تھا۔ محبت کا پیادہ زمین بوس ہوا۔ تپسیا تمام ہوئی۔ کیونکہ محبت وہ پھٹکار زدہ کنیا کماری بھی ہے جو کراتی ہے اور جوگ محبت کے شراب کی مستحق باقی ہے۔

وہ خاموشی سے اپنی ماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ مارگریٹ نے آنسو پونچھ لیے۔ کتنی بد صورت ہو گئی تھی وہ اتنے سے دنوں میں۔ اس کے کپڑے گندے اور بدبودار تھے۔ اس کے وجود سے ایسی بساند اٹھتی تھی جیسے کچا گوشت دھیمی آنچ پر جل رہا ہو۔ مارگریٹ کے پیٹ کے ساتھ لگے اس کا دم گھٹنے لگا۔ امرجل کی دھارا زہر آب تھی۔

زہر زہاب (ہمہ وقت جاری رہنے والا زہریلا چشمہ) نے اپنا دھن اس کے وجود میں کھول دیا تھا۔ اس میں سے بساند کیوں نہ آتی۔

اور پھر اس دن کے بعد سے اس نے اسے یہ کہنا چھوڑ دیا

کرسمس کی ان چھٹیوں میں ہم ہلز جائیں گے۔
”سچ۔؟“
”ہاں! اس تمہارے پیلا آجائیں۔“
”وہ کب آئیں گے؟“

”شاید ابھی۔ آج رات۔۔۔ ورنہ کل صبح۔۔۔“
”انہیں خط لکھے میں فون بھی کیے ہیں۔“
”وہ گندے ہیں۔۔۔ وہ نہیں آتے۔“
”وہ اچھے ہیں۔۔۔ وہ آجائیں گے۔“
وہ اتنا اچھا تھا کہ ایک بار بھی نہیں آیا تھا اس نے اپنی اولاد کو بھی دیکھنے کی چاہ نہ کی۔ اس کو ہوتا ہی نہیں تھا کہ اس کے بیٹے کی آنکھیں اس جیسی ہیں۔ کچھ بڑے اس جیسے نقوش۔ کتنی بھنویں۔ کتنی پلکیں۔ سفید رنگت میں مبہم گندی رنگت کی جھلک۔ مغرب میں عرب کھلتا ہوا۔

عرب پر مغرب چھاتا ہوا۔ وہ ایسا تھا۔ جس کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کے باپ نے خود کو دنیا میں چھپا لیا تھا۔ اور مارگریٹ آخر تک یہ جان نہ سکی کہ جو گم ہو جاتے ہیں ڈھونڈا نہیں جاتا ہے۔ جو خود کو چھپا لیں انہیں ڈھونڈ نکالنا تیز لیل ہے۔۔۔ تیز لیل۔ گناہ عظیم۔۔۔ ایسے گناہوں سے خود کو بچانا چاہیے۔

تو ایسے چھپ چکے مرد کی واپسی کی فتنے کھائیاں اب بس ہوئی تھیں۔ دروازے پر لگی نگاہیں بند ہوئیں۔ اب وہ مارگریٹ نامی عورت صبح اٹھتی اپنی آنکھوں کی سرخی کو میک اپ کی تہ میں چھپاتی۔ پھر بھی بدہیت ہی لگتی۔ دو گھونٹ کافی پچکیوں کی مانند حلق سے اتار دی۔ جلتے کچے گوشت کی بو کی تہوں میں مدفون اداکارانہ مسکراہٹ کو نکالتی اور اسے اسکول کے لیے تیار کر کے اس کا ہاتھ پکڑ کے سڑک پر لیے چلتی جیسے اپنا ہی تابوت اٹھائے اپنی قبر کی طرف جاری ہو۔

اپنی ماں کے زیر سایہ وہ بھی ایسے ہی چلا کرتا جیسے قبرستان جا رہا ہو۔ دو انسان خود کو تابوت میں لٹائے۔ خاموشی سے۔۔۔ طے شدگی سے۔۔۔ دو انسان اپنے ہی پیروں پر چل کر اپنی اپنی قبر کی طرف کیسے چلایا کرتے ہیں۔ مارگریٹ اور اس کے بیٹے کو دیکھ کر جانا جاسکتا تھا۔

پھر وہ اسے اسکول سے گھراتی اسے ایک سینڈویچ

بنا کر دیتی گھر کو لاک کر کے چلی جاتی اور رات کو آتی۔ اس وقت تک وہ کھڑکی میں کھڑا اس کا انتظار کرتا رہتا۔ سینڈویچ ویسے کا ویسا ہی رکھا ہوتا۔ کھانا بھوک لگنے پر کھایا جاتا ہے اور اس کی بھوک مارگریٹ کی صورت دیکھتے ہی مرجاتی۔ وہ دعا کرتا نہیں جانتا تھا اس لیے صرف سوچا کرتا تھا کہ کاش اس کی ماں سے ایسی گندی بدبو نہ آیا کرے۔ کاش۔۔۔ وہ اس بو سے چھٹکارا پالے۔

اس کے باپ کی واپسی کے قصے جو وہ اسے سنایا کرتی تھی۔ اب بند ہو چکے تھے لیکن پرانی تصویروں کو دیکھنا اس نے بند نہیں کیا تھا وہ ایک تصویر کو جس میں وہ جھیل کے پانی میں پیر ڈبوئے بیٹھا تھا اور گردن موڑے مسکرا رہا تھا اور جھلک کرتی آنکھوں کو لیے عرب کا شہزادہ لگ رہا تھا اس کے چہرے کے ساتھ لگا کر دیکھا کرتی اور دیر تک دیکھا کرتی۔

”ہاں! تم میرے جیسے ہو“ وہ خوش ہوتی اور گہرے سايوں میں گھر جاتی پتا نہیں وہ کس کس بات پر خوش ہو سکتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے وہ یہی سب کر کے کما کرتی۔ دیکھو تو۔۔۔ تم تو بالکل اپنے پایا جیسے ہو۔“ پھر وہ اپنی نم آنکھیں صاف کرتی۔ ”تمہارے پیلا تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے“ تم ان جیسے ہو میں خوش ہوں اس پر۔

”ہاں! تم میرے جیسے ہو“ کا عمل وہ ہر رات کیا کرتی جیسے اسے ہر دن یہ ڈر ہو کہ کہیں وہ اس تصویر جیسا تو نہیں ہو رہا۔ اس شخص جیسا ہی۔

اسے اپنی زندگی کا آخری مرد اپنی زندگی کے پہلے مرد جیسا نہیں چاہیے تھا اب۔

”تم مجھے چھوڑ دو تو نہیں جاؤ گے نا۔“ وہ اس سے پوچھتی نہیں تھی بس بڑبڑاتی تھی اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ چھوڑ جانا کسے کہتے ہیں۔ وہ ہاں کرتا ناں۔

جن دنوں اس کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی تھی ان دنوں وہ رات رات بھر بڑبڑاتی رہتی، اس کی بڑبڑاہٹ عجیب ہوتی جیسے ہچکیاں لیتی ہو۔ مدفن

ہچکیاں۔۔۔
”اگر میرے بس میں ہو تو میں تمہاری دائیں آنکھ کی کمان کے کنارے پر بنے اس تل کو اپنی مٹھی میں لے لوں۔ اور اسے کہیں چھپا دوں۔ ہاں چلو اپنے دل میں۔ ماکہ جب تم ہنسو تو کوئی اور اس تل کے رقص پر فدا نہ ہو جائے۔ میں کسی اور کو تم پر فدا ہوتے کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ میں مر جاؤں گی۔“

”کل میں فرش صاف کرتے پھسل گئی۔ میری ناک سے خون بہنے لگا۔ میں رونے لگی“ تم ہوتے تو اپنی آستین سے میرا خون صاف کرتے اور مجھے بانہوں میں بھر کر کہتے ”مارگریٹ دی سپر وومن۔ سپر وومن بھی روتی ہے کبھی۔ اور تمہاری نیلی آنکھوں میں ایک ہی چیز بھٹی نہیں لگتی“ ”آنسو“ تم وہ کام کیوں کرتی ہو مارگریٹ جو مجھے اچھے نہیں لگتے تم ”آہ“ کیوں کرتی ہو۔ اگر تمہیں کسی وجہ سے رونائی ہو اکرے تو تم خود کو کہیں چھپا لیا کرو۔ پھر اپنی روتی صورت کو میک اپ سے چھپا لیا کرو۔ مجھے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم روتی رہی ہو۔“

”میں روتی رہی ہوں۔“ مارگریٹ صبح تک یہی ایک فقرہ بڑبڑاتی رہتی۔ اس نے تھوک کر جلا دی گئی محبت کی پوشاک میں خود سے ہی پیوند کاری کر لی تھی۔ وہ ایک ایسی جذامی بڑھیا بن گئی جس کے زخم ہی اس کی دوا تھے۔ اسے کسی دید کے پاس جانے کی حاجت نہ تھی۔

کوئی ایسی محبت کو طوق زدہ زنجیر پا کرے جو گدھنی بوٹی بوٹی نوچتی ہے۔ ایسے مردار خوار کو کوئی رحم والا مردار کرے۔ کوئی رحم کرے۔

اور جب جب وہ بہت زیادہ بڑبڑانے لگتی اور اس کے کانوں میں مزید سکت نہ رہتی سننے کی تو وہ اپنے کانپے ہاتھ سے ہولے سے مارگریٹ کے جسم کو چھوتا اور وہ جھنجھری لے کر بڑبڑانا بند کر دیتی۔ اور ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے وجود میں سمیٹ لیتی۔ نہیں اپنے بیٹے کو نہیں۔ عرب کے گم ہو چکے اپنے شہزادے کو۔ جس کی محبت کو مار کر بھی وہ نہیں مار پار ہی تھی۔ اور جو

خود کو زندگی کے کنارے پر گھسیٹ لائی تھی اور موت کی طرف ہاتھ ہلاتی تھی۔

اور کون کہتا ہے کہ موت سیاہ شب خون ہے۔ موت نے قطعاً "مارگریٹ" کی زندگی پر شب خون مارنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ یہ کام تو خود مارگریٹ کر رہی تھی وہ خود سے شہتیاں کھینچ کر چکی تھی۔ ذرا سی پیش ملتے ہی وہ جل کر بھسم کیسے نہ ہو جاتی۔ ایسی حالت میں اسے کون بچا سکتا تھا۔ کوئی معجزہ ہی۔ اور وہ کوئی نبی پیغمبر تو نہ تھی وہ تو صمغ گزیدہ تھی اور معجزے ایسے لوگوں پر اتنے مہربان نہیں ہوتے۔

ایک رات وہ مر گئی۔ اس رات اس نے اپنی زندگی کے آخری مرو کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ کو بار بار اپنے ہونٹوں سے لگا لگا کر اپنے گالوں پر اتنی آنکھوں سے لگاتی۔

اس کی زندگی کے اس آخری مرو کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ انسان بڑا حساس واقع ہوا ہے۔ موت کی آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نو مہینے زندگی نمویاتی ہے تو ایسا دوا دلا چاتی آتی ہے۔ موت تو سالوں۔ سالوں اور سالوں ہی نمویاتی ہے۔ اپنی آمد پر کس اہتمام کا دوا دلا نہیں چاتی ہوگی۔ وہ رو رہا تھا۔ دوا دلیے پر اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

اپنی طرف سے مارگریٹ اپنے ماں باپ اپنے گھر اپنے بچپن اپنے اسکول کی باتیں کر رہی تھی اسے سنا رہی تھی لیکن دراصل وہ اسے ہر دوسری بات کے بعد اس پہلے شخص کے قصے سنانے لگتی تھی جو اس کی پانلمتی موجود نہ تھا سہانے۔ جو اس کے آخری وقت میں آنے والا تھا نہ ہی جنازے میں۔

مارگریٹ کو کوئی خواہش نہ تھی اس شخص کو خدا کے حضور مورد الزام ٹھہرانے کی۔ وہ وہاں بھی یہی کرنے والی تھی۔ وہ اللہ سے اسے مانگنے والی تھی۔ وہ رحم دل خاتون تھی وہ جو اس کے لیے اللہ سے رحم مانگنے والی تھی۔

"تو بچنے کے بعد وہ ہمیشہ کب کو اوندھا کر دیا کرتا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ مجھے اس کی یہ عادت

بہت پسند تھی۔"

ہاں واقعی مارگریٹ کو اس کی یہ عادت پسند تھی اس کی کافی کاک کا خالی ہوتے ہی اوندھا ہو جاتا۔ بڑے ہوتے ہوئے اس نے کئی اوندھے کپ پاؤں کی ٹھوکر سے توڑ ڈالے۔ اوندھے کپ دیکھ کر وہ پاگل سا ہو جاتا۔ اس کا بس نہ چلتا کہ کیسے وہ اس دنیا کو اس بھٹی میں جلا ڈالے جو اس کے ماں کے اندر بھڑکتی رہی تھی۔

"تمہاری آنکھ کی کمان کے کنارے بھی تل ہو۔ تمہارے دنیا میں آتے ہی میں نے سب سے پہلے اس تل کو ڈھونڈا۔ میں نے نو مہینے اس ایک تل کے لیے دعا میں کی تھیں۔" اور آخری بات جو کر کے وہ خاموش ہو گئی وہ بس اتنی سی تھی۔

"بس اب تم میرے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں سے لگا لو۔"

اس نے اس ہاتھ کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ لگائے رکھا۔ لیکن وہ اس کا بیٹا تھا اس کا محبوب نہیں۔ صرف چھ مہینے سال کی جوان بوڑھی ہو چکی۔ نیلی آنکھوں اور بھیگی گلابی رنگت والی مارگریٹ کو اس نے تابوت میں آنکھیں موندے سوتے دیکھا۔ اور تابوت کے کنارے وہ دیوانوں کی طرح رویا۔

عالیان مارگریٹ۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کس سے سب سے زیادہ نفرت کرنی ہے۔ اپنے باپ سے۔

آئی سو سن نے اسے اور کڈ سینٹر میں داخل کروا دیا تھا جو ایک پرائیویٹ ادارہ تھا اور بے سارا بچوں کی دیکھ بھال میں ایوارڈ یافتہ تھا۔ کچھ عرصے بعد اسے چلایا گیا کہ ایک خاتون نے اسے گود لے لیا ہے اور وہ ان کے گھر ان سے ملنے جا سکتا ہے۔ اسے ایک رات اس خاتون کے گھر چھوڑ دیا گیا۔

وہ خاتون ماما مر تھیں۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی اس کی دونوں ہتھیلیوں کو ہونٹوں سے لگا لیا اور اپنی

آنکھوں پر رکھ لیا۔

"مارگریٹ۔!" انہوں نے ہولے سے سرگوشی کی۔

وہ ان کی گود میں رات بھر بیٹھا رہا اور وہیں سو گیا۔ یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی۔

وہ اپنی اب تک کی زندگی میں دوسری بار محبت کر رہا تھا۔ اور پھر سے ایک عورت سے۔ ایک سے بدلتی ہوئی تھی۔ دوسری سے مجھڑاتی۔ کسی آسانی فحیفے کی طرح جس کے اترتے ہی بس آنکھوں سے لگا لیا جاتا ہے۔ سینے میں اتار لیا جاتا ہے۔ مقدس محبت۔ جس کی پرستش کرنے پر دل مائل رہتا ہے۔

ماما مر سے جدائی اسے شاق گزرتی۔ وہ ان کے ساتھ رہنا چاہتا تھا اور ان کے لیے رویا کرتا تھا۔ وہ ایک نئی عورت سے مل رہا تھا جس کی آنکھیں گہرے پانیوں میں ڈوبی نہیں رہتی تھیں۔ جن میں آس تھی نہ انتظار۔ اور یہ خاتون بڑبڑایا بھی نہیں کرتی تھیں۔ رویا کرتی تھیں نہ ہی اس کی ٹھوڑی کو اٹھا کر اس کی آنکھوں کو گھنٹوں تکا کرتی تھیں۔ اور ان کے سینے سے لگے اسے انسانی گوشت کے جلنے کی بو بھی نہیں آیا کرتی تھی۔ کیسی خاتون تھیں وہ بالکل مارگریٹ جیسی نہیں تھیں۔ جس رات وہ ان کے سینے سے لگ کر سوتا ساری رات جاگ کر انتظار کرتا کہ وہ کوئی سسکی بھریں گی۔ کسی کو پکاریں گی۔ لیکن ایسا کبھی نہ ہوتا۔

ہاں وہ بہت محبت سے اپنے شوہر۔ اپنے والدین کا ذکر کیا کرتیں۔ یا اسے کہانیاں سنایا کرتیں جن میں پریاں ہوتیں۔ ان کے کھیل تماشے، شرارتیں ہوتیں لیکن کوئی اختتام نہ ہوتا۔ نہ دکھ نہ آہ۔ نہ رونا نہ رلانا۔

وہ قصہ گو نہیں تھیں۔ کیونکہ وہ "محبت گو" تھیں۔

وہ کہانی نہ بن سکتیں کیونکہ وہ انسان "بنے" میں مصروف رہتیں۔ وہ کہانیاں نہیں۔ انہیں تو تانے کو سونا بنانا تھا۔

"سونا۔"

وہ اس سے کہانی سننے کی فرمائش کرتیں۔ بہت دیر بعد وہ کہانی کی پہلی اور آخری سطر بیان کر پاتا۔

"ایک۔ ایک پری تھی۔" پھر وہ خاموش ہو جاتا۔ دونوں خاموش ہو جاتے۔ کہانی کئی سالوں تک ایسے ہی اختتام پذیر ہوتی رہی۔ ماما مر نے بہت نہیں باری۔ انہیں معلوم تھا۔ انہیں انتظار تھا۔ کہانی آگے ضرور بڑھے گی۔ اور وہ محبت ہی کیا جو اختتام پر صابر ہو جائے۔ کہانی ایک دن آگے بڑھ گئی۔ کئی سال لگے لیکن ایسا ہو گیا۔

"ایک پری تھی۔ وہ جنگل میں پھول لینے نکلی اور دو دموں والے ایک بندر کو دیکھ کر ڈر گئی اور جلدی سے ایک درخت کے پیچھے چھپ گئی۔ درخت نے اس سے کہا کہ وہ پانی میں چھلانگ لگا دے ورنہ بندر اس کے سارے بال کھا جائے گا۔ بندر اس کے سنہری بال نہ کھا جائے اس ڈر سے اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ لیکن یہ کیا ماما۔ مچھلیوں نے اس کے سنہری بال کھالے۔ وہ باہر نکلی تو سب درخت۔ سارے پھول۔ سارے بندر۔ سارے ہی بندر۔ ہا ہا ہا کرنے لگے۔ ایسے منہ کھول کر ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا کرتے رہے۔"

ماما مر کی طرح کہانی کہیں سے بھی شروع ہوئے ہا ہا ہا ہی ختم ہونا چاہیے ہر صورت۔ بیٹے عالیان نے یہ کر آخر کار سیکھ ہی لیا تھا۔ اس رات ماں بیٹا نشست گاہ میں دیر تک لوٹ پوٹ ہوتے رہے۔ تو عالیان میں زندگی آخر کار نمویانے لگی تھی۔ اور یہ محبت کا ہی کمال ہے۔ وہ مردے کو زندہ کر ڈالتی ہے۔ زوال کو کمال۔ کمال کو کمال۔

ماما مر میں اس کی جان آچکی تھی اور اس کے لیے بہت تکلیف نہ ہوتا ان سے دور ان کے بغیر رہنا۔ ان ہی دنوں اس نے جانا کہ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ جو ہمیں چاہیے ہوتا ہے وہی ہم سے دور ضرور ہوتا ہے۔ جسے ہمیں پسند کر لینے کو جی چاہے اس کے لیے دل مٹھی میں ضرور آ جاتا۔

پندرہ سال کا ہو جانے کے بعد اسے وہ چیزیں دی گئیں جو اس کی ماں کی تھیں۔ جسے آنٹی سوسن نے سینٹر کے حوالے کیا تھا۔ اس نے وہ تصویر جسے وہ اس کے گال کے ساتھ لگا کر گھنٹوں دکھا کرتی تھیں، سب سے پہلے پھاڑ کر پھینک دی۔ وہ خط جو غلط پتوں کی وجہ سے واپس آ چکے تھے، انہیں بھی وہ پھاڑ ڈالتا اگر وہ مارگریٹ کے ہاتھوں سے نہ لکھے گئے ہوتے۔ کچھ وہ خطوط بھی تھے جو مارگریٹ کی موت کے بعد واپس آئے تھے، یعنی اپنی موت سے پہلے بھی وہ اسے خط لکھتی رہی تھی۔ اس نے کبھی ان خطوط کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سوائے ایک بار کے۔

”آج سے چار سال پہلے جب تم اپنے گھر والوں سے ملنے کا کہہ کر مائچسٹر سے جا رہے تھے تو مجھے لگتا تھا میں تمہیں مائچسٹر میں آخری بار دیکھ رہی ہوں۔ یہ ایسا وہم تھا کہ کچن میں کام کرتے میں اپنا ہاتھ جلا بیٹھی۔ ڈاکٹر کے پاس میں تمہاری دی رنگ بھول بیٹھی۔ اس رنگ کو ڈاکٹر کے کوڑا دان میں بہت مشکل سے تلاش کر پائی۔ کوڑے دان میں اگلے دن اس رنگ کے ملنے نے مجھے اگل سا کر دیا تھا۔“

وہ فون کبھی نہ آیا۔ خط واپس آتے رہے۔ جس کی آنکھ کی کمان کے کنارے مل تھا اسے ڈھونڈنے مارگریٹ کا بے لگائی نکلتی رہی یہاں تک کہ زندگی کی آخری سانسیں لینے لگی۔ اور پھر موت نے اسے اپنی سانسیں عطا کر دیں، اپنے سارے وہ ہموں کے ساتھ وہ پوشیدہ ہو گئی۔

وہ اس شخص کا جائز بیٹا تھا یا ناجائز۔ اسے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسکول میں اس کے نام کے آگے ولید البشر لگتا تھا جو بڑا ہونے پر اس نے بدل لیا۔ وہ کسی ولید البشر کو نہیں جانتا تھا۔ اگر دنیا میں کوئی ولید البشر تھا تو وہ اس کا باپ نہیں تھا۔ ایک بھیڑیا تھا جس نے اس کی ماں کو چیر پھاڑ ڈالا اور اسے لعنت قرار دیا۔ اس عورت کو اس نے لعنت قرار دیا، جس نے اس کے بعد دوستی کے نام پر بھی کسی مرد سے بات نہ کی۔ اگر وہ ایک لعنت ہی ہوتی تو پھول دار

کپڑے پہنے، خود کو سجائے بنائے اب تک زندہ ہوتی۔ وہ اب تک بڑی شان سے زندہ ہوتی۔ اس کے لحاف اس کے منہ سے نکلنے والے خون کے چھینٹوں سے سرخ نہ ہوئے ہوتے۔ اس کی راتیں سک کر نہ گزرتیں۔ اس کے دن آنکھوں کی نمی چھپاتے نہ گزرتے۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے اقوال یاد نہ کرنے پڑتے۔ اور ہر روز اسے خود کو بہادر بنا کر زندگی کے سامنے نہ کھڑا کرنا پڑتا۔

وہ اسے لیے لیے خط نہ لکھتی۔ پاگل ہوئی اسے ڈھونڈتی نہ پھرتی۔ بے وفا اور لعنتی عورتیں اتنے وبال پالتی ہیں بھلا۔ اور کیا ایسی عورتیں اتنی جلدی مرجاتی ہیں۔ اور کیا اتنی ہی آسانی سے وہ موت کو خوش آمدید کہتی ہیں۔

پہلے وہ سوچا کرتا تھا کہ وہ اس شخص کو ڈھونڈ کر مار ڈالے گا۔ لیکن ماما مر کہا کرتی تھیں کہ اپنے دل و دماغ کو خاموش رکھو۔ سارے وبال یہیں سے پھونٹے ہیں۔

ولید البشر کا خیال آتے ہی وہ اپنے دل و دماغ کو خاموش کر دیتا۔ شروع شروع میں مشکل تھا۔ لیکن اس نے کر لیا۔ ماما مر ٹھیک کہتی تھیں اسے وبال پالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں مارگریٹ اور مہر موجود تھیں۔ اور اسے ان ہی کے سہارے زندگی مکمل کرنی تھی۔

وہ خاموش وقت تھا۔ بریلی ٹھنڈ میں مائچسٹر کی ایک ہندو گلی کے کنارے وہ خود کو دنیا سے چھپا کر کھڑا تھا۔ ”مارگریٹ اس کی ماں کا نام ہو گا تو باپ کا کیا ہو گا۔ معمولی وجہ نہیں ہے یہ۔ نہیں ہے معمولی۔ اس کے باپ کا خاندان کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ وہ کون ہے وہ خود بھی نہیں جانتا ہو گا۔ یورپ کے آزاد معاشرے کی دین۔ غیر مذہبی۔ غیر اخلاقی اقدام کی پروان۔ میرے خاندان کے لیے طمانچے جیسے بائیں

ہوں گی یہ سب۔“
عالیان نے جھمر جھری لی۔ اسے بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ جس دیوار کے سارے وہ کھڑا تھا وہ گیلی تھی اور اس میں سے بو آتی تھی۔ نہیں وہ غلط تھا۔ وہ بو تو اس کے اندر سے آرہی تھی۔ انسانی گوشت کے جلنے کی۔

ہاں! اب اسے ٹھیک ٹھیک معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی نیلی دھنسی ہوئی آنکھوں والی ماں نے کیا محسوس کیا تھا جب اس شخص نے جس سے وہ دیوانوں کی طرح محبت کرتی تھی اسے لعنت قرار دیا تھا۔

اچھا تو کیا اس کا سانس بھی ایسے حلق میں اڑکا ہو گا کہ سینے پر ہتھوڑے مارنے کو جی چاہتا ہو گا؟ زمین دھسان (دلہا) ہے۔ آکاش اندھیا ر کا سیواک ہے۔

دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑ۔ لاکھوں کروڑوں تاریکی غبار سے اپنے پٹ واہوئے۔ زندگی اندھیا ر کی چاکر ہوئی۔ اور لورو خنیاں گل ہوئیں۔ اب بس گل ہوئیں۔

اس شخص کے دل کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مارگریٹ کے بیٹے سے بھی بدلہ لیا تھا۔ اسے بھی چیر پھاڑ ڈالا تھا۔ اسی کی ذات کو لے کر اس پر سوال اٹھتے تھے۔ اس شخص کی شناخت سے اس کی شناخت ہونی تھی۔ جس شخص کے نام کو وہ اپنی زبان سے ادا نہیں کرتا تھا۔ اس شخص کے نام کو اپنے نام کے ساتھ لگانے پر اسے تسلیم کیا جائے گا۔ اگر ایسا ہی تھا تو اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ اسے کوئی پہچان۔ کوئی محبت نہیں چاہیے۔ اسے امجد واجد اب نہیں چاہیے۔

اس کی ماں پر غیر اخلاقی اقدام کی انگلی اٹھانے والی۔ امجد واجد۔

درد کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی۔ آخر اس نے اس لڑکی کو کیوں پسند کیا۔

اس کی بد قسمتی اسے اس اسٹوڈنٹ پارٹی میں لے گئی۔ اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس فضول سے مذاق

میں شرکت کرنے کا جو فریڈر (سے آنے والوں) کے ساتھ کیے جاتے تھے۔ خاص کر امجد کے ساتھ کیے جانے والے مذاق میں تو اسے بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ جب جب وہ لڑکی اسے ملی تھی اس کا مزاج ہی بگاڑا تھا اس نے۔

وہ ایک طرف اندھیرے میں کاک ٹیل لیے بیٹھ گیا اور سارا تماشائی بننے لگا۔ اور جب وہ رورو کر اردو میں چلانے لگی تو اسے برا لگا۔ اور جب گھنٹوں میں سر دے کر وہ باقاعدہ رونے لگی تو۔ تو۔

مارگریٹ کچن میں اس کے لیے کچھ پکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور کھڑکی سے اندر۔ کچن کی طرف سے آتی آوازیں سن رہا تھا۔ جب ان آوازوں کو سنتے سنتے وہ خود رونے جیسا ہو گیا تو کچن کی طرف آیا۔

”ماما!“ اس نے روتی ہوئی مارگریٹ کو بلانے کی جرات کی۔ کچھ دیر بعد وہ چھری پھینک کر اس کی طرف پلٹی۔ اس کی انگلی سے خون نکل رہا تھا۔

”میرا ہاتھ کٹ گیا ہے۔ مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔“

اگر وہ براڈوے میں کام کرتی تو سارے براڈوے کو لے ڈوبتی۔ اتنے سے بچے کو الونیا نے میں وہ ناکام تھی، انگلی کاٹ کر رونے کی وجہ بتا رہی تھی۔

اس نے انگلی سے خون کو ہٹے دیا۔ اور روتی رہی، ”مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ بہت درد۔“ اور وہ خاموش کھڑا انگلی کو نہیں ان آنکھوں کو دیکھ رہا تھا جن سے خون ابل رہا تھا اور وہ خون فرش پر نہیں اس کے دل پر گر رہا تھا۔

امجد واجد سک رہی تھی اور جب اس نے سیاہ مشرقی آنکھوں میں جھانکا تو اسے معلوم ہوا کہ مارگریٹ کی طرح لحاف میں منہ دے کر وہ بھی بہت روتی رہی ہیں۔ ان پر بھی کرب کے بہت سے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔ وہ ان آنکھوں میں جکڑ گیا۔

مارگریٹ کو پھر سے کسی نے رلا دیا۔ اب وہ یہ نہیں ہونے دے گا۔

وہ رات اس نے جاگ کر گزاری۔ مشرقی افق پر دو نیندھرے تھے وہ ان میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ بھوری آنکھوں میں جو دھندلے پڑے تھے وہ جل اٹھے تھے۔

وہ تین سین کی شاگرد رہی ہوگی۔ اس نے اس کے اندر چرغاں کر دیا تھا۔

وہ حیات کا دانہ تھی۔ وہ اسے زندہ کر رہی تھی۔ وہ مشرقی ساحل تھی۔ بس میں کر لینا وہ سیکھ چکی تھی۔

اور وہ ہنسنے لگی تھی وہ اس کے زخم مندمل کرنے آئی تھی۔ اسے لڑکیوں میں اتنی دلچسپی تھی جس سے کارل کو چڑھ سکے وہ کارل کی ہر گول فریڈ کو لے اڑتا۔ کارل کے ساتھ یہ سب چلتا رہتا تھا۔ پھر اس نے ایک ایسی لڑکی میں دلچسپی کیوں لی جس نے اتنی حقارت سے وہی سارے الفاظ اس کے منہ پر دے مارے تھے جو کبھی ڈنمارک میں اس کی ماں کے منہ پر مارے گئے تھے۔ وہ خود اپنے باپ کے لیے بھی اتنا ہی حقیر تھا۔ جتنا اب امرجہ واجد کے لیے۔

اس نے استہزائیہ ہنس کر سوچا۔ ”ایک ہی نسل کے دو انسانوں کا ایک جیسا نصیب۔ دونوں کو محبت ہوئی۔ دونوں کو بدلے میں دھتکار ملی۔ دونوں کو لعنت قرار دے دیا گیا۔“

دو انسانوں کے نصیب میں اتنی مماثلت۔ وہ واقعی بہت بد نصیب تھا۔ اس کا ٹوٹ کر رہنا تھا۔

امرجہ واجد کو اس کی ماں سے زیادہ اس کے باپ کی فکر تھی جس کی غلیظ تصویر کو اس نے پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ وہ انگلی اٹھا رہی تھی کہ وہ کون تھا۔ وہ عالیاں مار کر سٹ تھا۔ اور اسے کیا ہونا چاہیے تھا۔ اگر عالیاں نام اسے اس کی ماں نے نہ دیا ہوتا تو وہ یہ بھی بدل لیتا۔

اسٹوڈنٹ پارٹی کے بعد اس نے خود کو اسے دیکھتے پایا۔ وہ اس کے ڈیڑھ ٹائم تک جاتا۔ وہ اپنے لیے دوپٹے کو سنبھالتی یونیورسٹی کے درو دیوار کو ایسے دیکھتی جیسے کسی نئے جہان آپکی ہو۔ وہ اپنے آپ میں

سکراتی رہتی۔ خاص کر تب جب اس کے قریب سے کوئی عجیب و غریب لباس یا ہینڈ اسٹائل والا اسٹوڈنٹ گزرنا اسٹوڈنٹ پارٹی کے بعد اس نے دیکھا کہ ہنسی کو دبائے، زبردستی کا منہ پھلائے وہ سب کی معذرت سن رہی ہے جیسے ان پر اس نے ”سٹو“ کر دیا تھا لیکن یہ اس کی انسان دوستی کی مثال ہے کہ وہ ایسا نہیں کر رہی، ڈیرک جیسے ہاتھ باندھے سزا کے انتظار میں کھڑا تھا اور وہ اعصاب مانے کسی خونخوار بادشاہ کی اکلوتی بیٹی ایسے ظاہر کر رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ ”بس۔ اب تمہیں بھوکے پیروں کے آگے ضرور ڈالا جائے گا۔“

وہ اکثر آکسفورڈ روڈ پر اس کے پیچھے جاتا۔ اس کا دوپٹہ اس کے لیے ایک مسئلہ تھا۔ اسے اتنے بڑے بڑے دوپٹے لینے کا شوق بھی تھا اور انہیں سنبھالنا بھی نہیں آتا تھا۔ شاید وہ سارے ماچسٹر کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ صرف وہ اکیلے ہے ”مشرق کی پہچان“ جی ہاں۔ وہ اکیلے۔

ایک دن جب وہ آکسفورڈ روڈ پر اس کے پیچھے پیچھے آیا تو اس کا دوپٹا اس کے پیچھے والے کے پاؤں میں الجھ گیا۔ پیچھے والا معذرت کر کے آگے بڑھ گیا۔ اور وہ دوپٹے کے کنارے اور اس کنارے کو پیرتے دہانے والے کو گھورتی رہی۔ کچھ آگے جا کر اتفاقاً وہ بے چارہ الجھ کر گر گیا۔ اور وہ جو پیچھے کھڑی اسے گھور رہی تھی، منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے اس لڑکے کو کہہ رہی ہو۔

”اب آیا مزہ۔ اگلی بار دھیان سے چلنا۔ یو ایڈیٹ۔“

اور اسی دوپٹے کو لے کر اگلا منظر کچھ یوں تھا کہ ایک ہندوستانی لڑکے نے زمین بوس ہوتے اس کے دوپٹے کو پیچھے سے اٹھا کر اسے دیا اور ساتھ کوئی استہزائیہ یا طنزیہ جملہ کہا اور ہنسنے لگا۔ اور پھر ایک دم سے اس کی ہنسی ختم ہو گئی۔ امرجہ واجد ہاتھ لہرا کر اسے کچھ کہہ رہی تھی۔

”ہندوستان، پاکستان کی تاریخی ناجاتی کا ایک چھوٹا

سامنظر۔“

بات شاید دوپٹے سے ہوتی، اسلام اور دہلی تک جا پہنچی تھی۔

اور اس سے اگلا منظر کچھ ایسے تھا کہ یونی کے بلوغ میں لگے ایک۔۔۔ پورے کے ساتھ اس کا دوپٹہ انک گیا وہ ذرا آگے چلی گئی، دوپٹے کے کھنچاؤ سے اسے پیچھے پلٹنا پڑا اور ایسا کرتے وہ اپنے پیچھے آنے والی لڑکی سے ٹکرائی۔ ٹکرائی۔ ٹکرائی۔ اس پجاری کی عینک گرتے ہی ٹوٹ گئی جو اس نے کچھ دیر کے لیے سر پر لگائی ہوگی۔ ظاہر ہے وہ بے چاری صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی، اگر امرجہ واجد ہوتی تو دھڑاڑیں مار مار کر روئی۔ اسٹوڈنٹس کی ہمہ وقت کی خالی جیبوں پر ایسے نقصانات کسی ہائیڈروجن بم کی طرح پھٹتے ہیں اور وہ تو پھر اس کا نظر کا چشمہ تھا کتابوں سے زیادہ اہم و ضروری۔ عالیاں کو اس سے بات کرنے سے زیادہ اس کے پیچھے پیچھے رہنا دلچسپ اور حیرت انگیز لگتا تھا۔

ایک دن اس کے کلاس فیلوز نے اسے پروفیسر ڈل کے آفس بھیج دیا۔ پروفیسر ڈل صرف what ہی ایسے پوچھا کرتے جیسے کہہ رہے ہوں۔ ”کیا۔ یعنی کہ کیا۔ ہیں۔ کیا؟ اب بولونا۔ بولتے نہیں۔“

ایسے what کو سن کر سامنے پیش ہونے والا کتنا ہی ضروری کام کو لے کر آیا ہوتا ہی سوچتا کہ ”آخر کیا ضرورت تھی اتنے معمولی سے کام کے لیے پروفیسر کو تنگ کرنے کی۔“

وہ دونوں ہاتھوں کو میز پر رکھتے اور منہ پر جانے جیسی سنجیدگی لیے ایسے دیکھتے جیسے کہتے ہوں۔

”تمہاری یہ جرات کہ تم یہاں تک آئے۔ لاؤ دکھاؤ کیا مسئلہ ہے۔ آئے ہیں بڑے پڑھنے۔ نیوٹن بنے۔ باتوں سے فرصت تمہیں اور آجاتے ہیں۔ پروفیسر کو تنگ کرنے ہیں۔“

اور پھر وہ اس پیش ہونے والے نیوٹن سے وہ سوال کرتے کہ اس بے چارے بے چاری کو رندھے گئے کے ساتھ معذرت کر کے اٹھنا پڑتا۔

”مالا لال! اپنی پشت پر یہ سرگوشی بھی سننا پڑتی۔ رندھے گئے کے ساتھ اور مالا لال کا لقب لے کر جب وہ پروفیسر ڈل کے آفس سے باہر آئی تو اسے بھیجنے والے اس کے کلاس فیلوز کو ریڈور میں لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ انہوں نے نجانے کون کون سے جھوٹ بچ کر اسے بھیجا ہو گا اور یہ بات اسے آفس سے باہر آنے کے بعد معلوم ہو گئی تھی۔ وہ خاموش کھڑی ان کے قہقہے سنتی رہی۔ پھر خود بھی ہنسنے لگی۔ اس بار اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل انہیں دے مارنے کی حرکت نہیں کی تھی۔

وہ ماچسٹر کے رنگ میں رنگ رہی تھی۔ پہلے کی نسبت وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ عالیاں کو لگنے لگا تھا کہ وہ کسی وینڈر لینڈ میں آ گیا ہے۔ یعنی صرف ایک لڑکی کے ماچسٹر میں آ جانے سے سارا ماچسٹری وینڈر لینڈ میں بدل چکا تھا۔ وہ اب تک اپنی ماں کو یاد کر کے سو رہا تھا۔ اور کئی کروٹیں بدلنے کے بعد اسے نیند آتی تھی۔ اب وہ اسے سوچتا۔ مسکراتا۔ اور سو بھی جاتا۔ اور کبھی سوچتے سوچتے لحاف کو جھٹک کر اٹھ کر بیٹھ جاتا اور قہقہے لگاتا۔ اچھا تو وہ بھی پری تھی۔ جس کی کہانی کہیں سے بھی شروع ہو اختتام پا رہا ہو تا ہے۔ وہ اپنی کلاس فیلوز سے پوچھنے لگا۔

”Rotatouille دیکھی ہے۔ وہی چوہے والی؟“

”ہاں۔ کون سی؟“

”جس میں چوہا کھانا پکاتا ہے۔“

”اچھا۔ سو سوٹ۔ وقت ملتے ہی ضرور دیکھوں گی۔“

”ہاں! وہ کتنا کیوٹ لگتا ہے نا وہ کھانا پکاتے۔ لو اٹ۔“

کوئی بھی اس کی طرح آخ نہ کرتا۔ ناک نہ چڑھاتا۔ ہاں ٹھیک تھا۔ ٹھیک تھا کہ وہ مشرق سے آیا ہیڈ تھا۔ جسے وہ کھول رہا تھا۔ ان کا ایک انگریز دوست کسی انوکھی بات پر اکثر ہلکا کر بوڑھے جرنیلوں کی طرح تاسف سے کہا کرتا۔

”تم نے مشرق کے گھاٹ کا پانی پی لیا ہے۔“
تمہاری سمجھ اب سمجھ سے بالاتر ہو چکی ہے۔“
امردہ سے ملنے کے بعد اب اسے لاہور جانا تھا۔ وہ
دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا وہاں سب اس جیسے ہیں۔ کیا سب
لڑکیاں ایسے ہی دوپٹوں میں الجھتی ہیں۔ بری بات پر
ناک چڑھا کر ”آخ“ کرتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر
آنکھیں نم کر لیتی ہیں۔
جب وہ فارغ ہو تا وہ ”لاہور نامہ“ پڑھتا رہتا۔ یعنی
اپنے فارغ اوقات کار میں وہ ”لاہور“ میں رہتا۔ وہ اتنا
لاہور میں رہنے لگا کہ صبح آنکھ کھلتے ہی اسے خود کو یاد
کروانا پڑتا کہ وہ St-Anselm Hall میں ہے
کینٹ یا مال میں نہیں۔ وہ روزپاکستانی اخبار بھی ضرور
پڑھتا کہ لاہور میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ لاہور میں کچھ بدل
تو نہیں گیا۔ اس نے لوڈ شیڈنگ کے بارے میں اتنا
پڑھا کہ اس نے امردہ سے پوچھ ہی لیا۔
”کیا واقعی پاکستان بجلی کو لے کر اتنے بڑے کرائسز
سے گزر رہا ہے۔“
اس کا رنگ فق سا ہو گیا۔ ”نہیں۔۔۔ پر تم کیوں
پوچھ رہے ہو۔۔۔؟“
”نہیں۔“ وہ اس کے نہیں پر دنگ تھا۔ ہر روز وہ
بجلی کو لے کر خبریں پڑھتا تھا۔
”ایسے ہی۔۔۔ وہ میرا ہاسٹل فیلو بتا رہا تھا۔“ اس نے
بہانا بنایا۔
”کیا بتا رہا تھا۔۔۔ کوئی پاکستانی ہے یا ہندوستانی۔“
اس نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔
عالیان کے لیے یہ حیران کن منظر تھا۔ ”یہی کہ
وہاں بجلی کا مسئلہ۔“
”وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے بجلی کا۔۔۔ سب ٹھیک
ہے۔۔۔ جیسے یہاں سب ٹھیک ہے۔۔۔ کیوں ہو گا وہاں
کوئی مسئلہ؟“ اسے یقیناً اس ہاسٹل فیلو پر غصہ آ رہا
تھا۔ عالیان دنگ اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اپنے ملک کی
عزت کو لے کر وہ اتنی حساس تھی کہ ایک غیر ملکی کے
سامنے کسی بھی اندرونی مسئلے کو لے کر بات ہی نہیں
کرنا چاہتی تھی، یعنی یہ ان کے گھر کا معاملہ تھا، غیر ملکی

دور رہے اس سے۔
”میں نے خبریں سنی ہیں بی بی سی پر۔ احتجاج دیکھ
ہیں۔“
”کبھی کبھار بجلی کا چھوٹا بڑا مسئلہ ہو جاتا ہے تو بس
تھوڑے سے لوگ احتجاج کر لیتے ہیں۔ بس ایسے ہی۔“
امردہ ایک باکمال پاکستانی تھی سات سالوں کی
خون کے آنسو رلانے والی لوڈ شیڈنگ کو وہ چھوٹا بڑا بھی
کبھار کا مسئلہ کہہ رہی تھی۔
”کبھی کبھار کے مسئلے ر لوگ ایسے احتجاج کرتے
ہیں۔ انہوں نے حکومتی آفس کو آگ لگا دی تھی۔“
”تم نے کوئی غلط خبر دیکھی ہے۔ ایسا نہیں ہو گا۔“
آگ کیوں لگائے گا بھلا کوئی۔۔۔ سب ٹھیک رہتا ہے
لاہور میں۔ پاکستان میں۔ بہت پیارا ملک ہے ہمارا
۔ ہمیں وہاں کوئی مسئلہ کوئی مشکل نہیں ہے۔“
ہاں یقیناً ”بہت پیارا ملک ہو گا۔ جس ملک کی
رہنے والی اس کی کسی خامی کو زیر بحث نہیں لارہی،
جس کے خلاف وہ ایک بات نہیں سننا چاہتی، وہ ملک
کتنا پیارا ہو گا۔ وہ امردہ سے زیادہ پیارا ہو گا۔
عالیان کو اس کی یہ حساسیت اتنی اچھی لگی کہ اس
نے پاکستان کو لے کر وہ خبریں ہی پڑھنی بند کر دیں جن
میں کسی مسئلے کی نشاندہی ہوتی۔ لاہور میں سب
ٹھیک ہے۔ جیسے ماچسٹر میں سب ٹھیک ہے۔
تو امردہ کا لاہور اس کا ہو گیا تھا۔ جیسے عالیان کا
ماچسٹر امردہ کا ہو چکا تھا۔ ایسے ہی فاصلے کم ہو جاتے ہیں۔
محبت ہی میں ہم اپنی ساری قیمتی چیزیں ہتھیلی پر رکھ
کر پیش کر دیتے ہیں کہ لو یہ آج سے تمہاری ہو میں۔
کارل سے امردہ کو چھپائے رکھنا کسی مہم کو سر
کرنے کے برابر تھا۔ بظاہر کارل ایسے ظاہر کیا کرتا جیسے
وہ بالکل انجان ہے اور اس کے پاس تو اتنا وقت ہے ہی
نہیں کہ عالیان کی نگرانی میں ضائع کرنا پھرے۔ لیکن
حقیقت میں وہ ان لوگوں میں سے تھا جو جو میں گھسنے کو
جو میں دن بنا لیتے ہیں۔

ایک رات جب دونوں سڑک پر شرط لگا کر دوڑ
رہے تھے اور کارل جیت چکا تھا تو اس نے پھولے
ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔
”تم آج کل مسلسل مجھ سے ہار رہے ہو۔“
”ایک دوڑ میں ہر اکرم مجھے لوڑ نہیں کہہ سکتے۔“
وہ ہنسا ”ایک دوڑ میں۔ کم آن عالیان۔ اس ہفتے
میں۔ تیسری بار ہے۔“
”میری صحت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ میں فٹ
نہیں ہوں۔“
وہ اور ہنسا ”تم ہار رہے ہو۔ مطلب تم کہیں اور
جیت رہے ہو۔ مجھ سے ہار کو تم اہمیت نہیں دیتے
۔ میرے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے۔ میں نے تم سے کہا
کہ مارٹن کو اسٹور روم میں لا کر تارے تو تم نے کہا کہ
وہ بے چارہ ڈر جائے گا۔ اس سے پہلے تو تمہیں کبھی
کسی کے ڈرنے کی پروا نہیں ہوئی تھی۔“
”اگر وہ انتظامیہ سے ہماری شکایت کر دیتا۔۔۔؟“
کارل منہ کھولے اسے دیکھتا رہا۔ ”اس سے پہلے
ہم ڈیوڈ کے ساتھ یہ کر چکے ہیں اور اسے تو ہم نے
کوڑے دان میں کیا تھا۔ اور بے چارہ بے ہوش ہو گیا
تھا۔ تم اب بدل رہے ہو۔ میں تمہیں اکیلا بدلنے
نہیں دوں گا۔“ گھونسا دکھا کر کہا۔
”میں اب بڑا ہو رہا ہوں۔“
”نہیں۔ بڑے ہونے کی نشانیاں نہیں ہیں یہ۔۔۔
مجھے تشویش ہے۔ بلکہ خوف ہے میں اپنا بہترین
دشمن کھودوں گا۔ یونو! سرکارل کہتے ہیں دوست ہونہ
ہو دشمن ضرور ہو اور تم جانتے ہو پوری یونیورسٹی میں
میری فکر کے صرف تم ہو۔“ کارل نے انگلی اٹھا کر کہا۔
”تم انتظار کر لو۔ فریئرز میں بہت سے چھینے
تمہاری فکر کے آچکے ہوں گے۔ جتنی چاہے فکریں
انہیں مار لیتا۔“
”میرا خیال ہے وہ بل آچکا ہے۔“ سرکارل نے
پرسوج سر ملایا۔
عالیان زیر لب ہنسا۔ ”امردہ۔ بل۔ ہا ہا۔“

امردہ کے نام پر ہی وہ ایسے مسکرایا کرتا تھا۔ وہ
اس کے ساتھ برقیے کیسے نہیں مسکرایا کرے گا۔
ہر بار ایک نئی مسکراہٹ۔ اک نئی ادا۔
پرانی امردہ کی جگہ ایک نئی امردہ۔ نئی امردہ کی
جگہ نئی پھر سے پرانی امردہ۔
رات کے آخری پہرہ اپنے کمرے میں آیا۔
کمرے میں کارل موجود تھا اسے کمرے میں آنے
کے لیے۔ کسی کے بھی کمرے میں جانے کے لیے چابی
کی ضرورت نہیں پڑا کرتی تھی۔ جس حساب سے وہ
جاسوسی، ایکشن فلمیں دیکھتا اور ٹائل پڑھتا تھا اب
تک جیمز بانڈ نہیں بن چکا تھا تو یہ اس کی کسر نفسی
تھی۔
”میرے کمرے سے جاؤ کارل!“ اس نے اپنا بورچا
کوٹ اتار کر پھینکا۔
”تم کہاں تھے؟“
”تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“
”تمہیں کیا ہوا ہے؟“
”تمہارا شکریہ میں ادا کر چکا ہوں۔ اب تم جاؤ۔“
”شکریہ۔۔۔ یہ لفظ پہلے کب ہم دونوں نے استعمال
کیا ہے؟ ذرا بتاؤ۔ وہ لڑکی تمہیں پسند نہیں کرتی۔
بات ختم۔“
”ہاں بات ختم۔ اب جاؤ۔“
”نہیں۔ تم ٹھیک سے بات ختم کرو۔“ کارل نے
اس کی شرٹ کا گریبان پکڑ لیا۔
”میں بات ختم کر چکا ہوں کارل۔ تم سے بھی اور
اس سے بھی۔“ اس نے اپنا گریبان آزاد کروایا۔
”اس سے کرنا تو بنتا ہے۔ اس نے تمہاری بے
عزت کی۔ لیکن تم؟“
”میں سب سے ختم کر رہا ہوں۔“ وہ چلایا۔
”کتنی لڑکیوں کے ساتھ تم نے میرے بریک اپ
کرائے۔ میں نے کبھی ایسے ری ایکٹ نہیں کیا۔
چند ایک کے ساتھ تو میں سنجیدہ تھا۔ تم بہت برے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹمائڈ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ٹمائیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور ایچے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، ہارمل کوالٹی، کمپیوٹر کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کھلاڑی بننے جا رہے ہیں۔
ہاں! میں بہت برا کھلاڑی ہوں۔ بدترین انسان ہوں میں۔ اس نے کارل کو ہلکا سا دھکا دے کر خود سے دور کیا۔ تم جاؤ اب۔
تم یہ سب نہیں کر سکتے۔ ایسے خود کو نہیں بدل سکتے۔ کارل چلایا۔ ہم دونوں نے بہت وقت ساتھ گزارا ہے۔ میرا حق ہے تم پر۔
عالیان نے اپنے منہ کو اس سے چھپانے کی کوشش کی۔
جاؤ کارل۔ خدا کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔
کئی لمحے اسے دیکھتا رہا پھر وہ چلا گیا۔

عالیان St-Anselm Hall کے کمرے کی کھڑکی سے برف پر گرتے اندھیرے کو دیکھنے لگا۔ ایک گھر جو اسے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک گھر۔ ایک خاندان۔ کارل اور وہ چپکے چپکے اس کے خواب دیکھتے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو وہ یہی بتاتے کہ انہیں بزنس ٹائیکون بننا ہے۔ اور ایک دوسرے سے چھپا کر وہ ہوم ڈیکور کے رسالے دیکھتے رہتے۔ کارل جو اپنی لڑکیاں بدل چکا تھا، صرف اس لیے کہ وہ جان چکا تھا کہ وہ گھر نہیں بنا سکتیں اور جب ان لڑکیوں سے اس کا چھٹکارہ حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا تو جیسے وہ خود عالیان کو دعوت دیتا کہ خدا کے لیے میرا بریک اپ کروادو۔

ایک گھر۔ ایک خاندان۔ مل کر ایک ہو جانا۔ اس کی اہمیت وہی سمجھ سکتا ہے جو ان سے محروم رہا ہو۔ عالیان نے تو پھر بھی چند سال اپنی ماں کے ساتھ گزارے تھے کارل نے تو ہوش ہی کنڈر سینٹر میں سنبھالا تھا۔ اس کے والدین ٹرین کے حادثے میں مر چکے تھے سو تیلے نانا اور نانی نے اسے اس کنڈر سینٹر کے حوالے کر دیا تھا۔

ایک بار اس نے امرجہ سے پوچھا۔
تمہارے وہاں گھر کیسے بنتے ہیں؟

”مطلب تعمیرات؟“
”نہیں۔ مطلب کیا خواہش رکھی جاتی ہے ایک گھر کو لے کر کہ وہ ایسا ہو؟“
”اچھا یہ۔ اگر کوئی اللہ دین کا چر اغ پوچھ رہا ہے کہ گھر کیسا ہو تو سعودی شہزادے طلال کے محل جیسا یا پام شٹی میں میڈونا کے گھر جیسا۔“
وہ ہنسا۔ ”اللہ دین نہیں ایک عام انسان پوچھ رہا ہے۔ مجھے جیسا عام۔“
”اچھا! اس کا منہ لٹک گیا۔ اللہ دین کا خواب چکنا چور ہوا۔ اب اسے شہزادے طلال جیسا محل کون بنا کر دے گا۔ عالیان زیر لب ہنسا۔
”اگر میں بزنس ٹائیکون بن گیا تو اسے ایک محل بنا دوں گا۔ اور میں نے اپنے پیسے کا کرنا ہی کیا ہے لیکن اگر میں اس کے لیے اللہ دین نہ بن سکتا تو؟“
”ایک بڑا سا باغ ہو جس میں کئی سو پھول کھلے ہوں۔ اس باغ میں گھر کی بڑی بڑی کھڑکیاں کھلتی ہوں۔ پیچھے بھی کئی سو پھولوں والا ایک باغ ہو ایک چھوٹی سی آبشار کے ساتھ اور اس میں بھی بڑی بڑی کھڑکیاں کھلتی ہوں گھر کی۔ یہ ماسٹر پیڈروم ہو اور لائبریری۔ گھر کی چھت بہت اونچی ہوئی چاہیے۔ یعنی اتنی کہ چھ فٹ لمبا فانوس لگا ہو تو سر اٹھا کر دیکھنے پر وہ دور۔ بہت دور لگے۔“
”یہ ایک عام آدمی کا گھر ہی ہے نا امرجہ! ۴۱ سے نوکنا پڑا۔“

وہ رک کر سوچنے لگی اور خاموش ہو گئی۔ یعنی خفا ہو گئی۔ مطلب ایک سیدھا سا جواب اس سے حاصل کرنا مشکل تھا۔ کہیں وہ اتنی ذہین تھی کہ فوراً ”جواب گھر لیتی تھی۔“
”نہیں کوئی ایٹو نہیں ہے میس کا۔ کس نے کہا۔ موبائل چھین لیے جاتے ہیں جھوٹ۔ یہ مغربی اخبارات نا۔ یہاں تو تم لوگ انگلی اٹھاتے ڈرتے ہو نا کہ پولیس کو نہ بلوائے۔ ہم لوگ وہاں سیدھا سیدھا تھپڑ مار دیتے ہیں۔ تھپڑ اور کوئی پولیس نہیں آتی۔“
اور کچھ معاملات میں وہ ایسی تھی جیسے اونٹے بونٹے

لوگ ہوا کرتے ہیں اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ کس قدر بونے ہیں اور ہاں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کا یہ بونگاہن کسی کو بہت اچھا لگتا ہے اتنا کہ اپنے چہرے پر ہنس مہنس کے ساتھ کہیں ہاتھ لگتے۔ سڑک پر چل قدمی کرتے۔ اپنے بیڈ کی چادروں کو یونانی طرز پر جسم پر باندھے ایک کندھا عریاں رکھے۔ یونانی ہی تیز میوزک پر کوریڈور میں تھمکے لگاتے اور اپنے دیگر بندر لنگور کے کرتب کرتے کوئی اسے ہی سوچتے اسی کے لیے زیر لب ہنستا ہے۔ کوئی گھنٹہ راتوں میں لحاف پھینک کر اٹھ بیٹھتا ہے وہ خود کو تلاش کرتا ہے۔

عالیان۔ ہاں عالیان۔ کہاں گیا وہ بے چارہ۔ ساتھ کے کمروں میں جب کوئی پا جامہ پارٹی 'or Die Do (کرو یا مرو) یا اسٹوڈنٹس کا Opera چل رہا ہوتا تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کسی اور کو محسوس کر رہا ہوتا۔ کارل اسے گھسیٹ کر لے جانے کی کوششیں کرتا۔

”تم میاؤں میاؤں ملی بنتے جا رہے ہو۔ چلو شیر بنو اور ذرا دھاڑ کر دکھاؤ۔“ وہی فارغ اوقات میں کی جانے والی ان کی کبھی ایکشن، کبھی مسٹری، کبھی ہار اور کبھی مزاحیہ موڈز جیسی حرکتیں اور شرارتیں لیکن اب اس سب میں اس کا خاص دل نہیں لگتا تھا۔ وہ کر تویٹا تھا لیکن بس خود کو برانا والا عالیان ثابت کرنے کے لیے۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ کوئی اس کے دل کا بھید نہ پا جائے۔

بھید جو بھوری آنکھوں نے کالی آنکھوں سے کشید کیا تھا۔ بھید جو محبت میں ملفوف دل پر کھلتا ہے۔ صرف محبت میں ملفوف دل پر۔

اسے یہ چونکا سا دینے والی لڑکی اس قدر اچھی لگی کہ اس کی کوئی بات اسے بری نہیں لگتی۔ اس کی کسی بات پر اسے غصہ نہیں آتا۔ اس کی کسی بات پر وہ بھڑکتا نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے وہ پری تھی جو دودھوں والے بندر سے خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ سارا ماچسٹری اس

کے لیے دودھوں والا بندر تھا۔ وہ حیران ہو ہو کر ڈر ڈر جاتی۔ اس کا خیال تھا دنیا میں سب سے اہم محبت ہوتی ہے۔ امرجہ نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اور کیا کیا کچھ اہم ہوتا ہے۔

عالیان کھڑکی میں کھڑا تھا اور آج پہلی بار امرجہ کے بارے میں سوچتے ہوئے زیر لب مسکرا نہیں رہا تھا۔ اسے رات گزرنے کا غم نہیں تھا کہ اگر رات گزر گئی تو وہ کس وقت امرجہ کو سوچے گا۔

باہر فروری برف کی صورت برس رہا تھا۔ فروری جسے جدید دنیا نے سرخ۔ سرخ۔ سرخ۔ رنگ ڈالا ہے یہ فروری آج اس سرخ۔ پر سفیدے کی صورت کرے اس کا گلابا رہا تھا۔

بیر کو وہ یونیورسٹی آئی تو جو پہلا شخص اس کے پاس آیا وہ کارل تھا۔ چمڑے کی جیکٹ میں دونوں ہاتھ ڈالے بیٹا ٹوپی اور منظر کے وہ بہت غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

”تم یونیورسٹی سے خود جاؤ گی یا میں تمہیں نکلاؤں؟“ یہ بات کہتے وہ انتہا کا سنجیدہ تھا۔ وہ جواب دیے بغیر آگے بڑھی ہی تھی کہ اس کے کراس بیگ کے اسٹریپ میں اس نے پین کو اڑس کر اسے بری طرح سے پیچھے کھینچا۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ۔“ وہ ابھی بھی خاموشی سے اسے گھور رہا تھا۔ ”میں تمہاری شکایت کر دوں گی۔“ وہ دن میں یونیورسٹی سے باہر ہو گئے۔

”تمہیں دو سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے دنیا سے باہر ہونے میں۔ اگر عالیان واپس نہ آیا تو۔“ امرجہ نے چونک کر کارل کو غور سے دیکھا۔ ”کیا مطلب۔؟“

”میں نے کہا اگر عالیان واپس نہ آیا تو۔“ خنقی سے وہ اسے دھمکا رہا تھا۔ ”عالیان کہاں ہے؟“

”تم بتاؤ۔ عالیان کہاں ہے؟“ اناس نے پوچھا۔ اس انداز میں پوچھا کہ امرجہ ڈر گئی۔

”تم خود کو سمجھتی کیا ہو۔ عالیان کے مقابلے میں تم ہو کیا۔ تم جیسی لڑکی جو ایک ڈگری لینا بہاڑ سر کرنے کے برابر سمجھتی ہے وہ آخر خود کو سمجھتی کیا ہے۔ کس دنیا سے آئی ہو تم جانتی ہو نا۔ یا میں تمہیں یاد دلاؤں کہ تمہاری حقیقت کیا ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ امرجہ بری طرح سے ڈر گئی۔

”کہنا نہیں بتانا۔ عالیان کا کوئی خاندان نہیں ہے۔ وہ ایک ناجائز بچہ ہے اور وہ تمہاری طرح اچھا مسلمان نہیں ہے۔ ایک تم ہی ہو اچھی والی مسلم نہ۔ اس کی ماں ایک بری عورت تھی اور باپ۔ ہونہ۔“

امرجہ یکدم سانس لینا بھول گئی۔ یونیورسٹی کی محراب موسمِ بقی کی لوکی طرح تھر تھرانے لگی۔ ”یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟“ امرجہ کی جان مٹھی میں آگئی۔

”بتایا۔ ہونہ۔ میں نے خود سنا ہے۔ ان فیکٹ آف یونیورسٹی نے سنا ہے۔ وہ سب جو تمہاری سوچ ہے۔ جو حقیقت میں تم ہو۔ ویسے تم لوگ بہت بڑھے لکھے بنتے ہو۔ ماچسٹری جیسی یونیورسٹی میں پڑھنے آتے ہو۔ خود کو تعلیم یافتہ کہلاتے ہو اور اندر سے وہی گھسی پٹی گھنٹیا سوچ رکھتے ہو جاہل لوگ۔ ہونہ۔“

”مجھے بتاؤ کارل! تم کس سننے کی بات کر رہے ہو۔“ تھر تھراتی محراب گرنے کو تھی۔ وہ گر جائے گی۔ نظر آ رہا تھا وہ گر جائے گی۔

”جو تم نے عالیان کے لیے ویرا سے کہا وہ سب ریکارڈنگ ہے میرے پاس۔ سنو گی۔“

محراب دھڑام سے زمین بوس ہوئی۔ افسوس۔ اس محراب کے عین نیچے ہی امرجہ کھڑی تھی۔ امرجہ کو پر شور بجھکڑنے آلیا۔ اس کی نظر دھندلا گئی۔ اسے کارل ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہیں۔ اسے تو دنیا میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بس اتنی سی دیر لگتی ہے اندھا ہونے میں۔ اتنی سی دیر میں رو خنیاں گل ہو جاتی ہیں۔ ”وہ سب کیا؟“ وہ بخشش پوچھ سکی۔

”جو جو تم نے ویرا سے کہا تھا وہ سب۔ امرجہ۔ دی مینڈکی۔ اب عالیان کو ڈھونڈ کر تم لاؤ گی۔ ورنہ اپنا سلمان باندھ کر رکھنا۔ ٹرسٹ می! بلکہ الزبتھ بھی تمہیں برطانیہ میں نہیں رکھ سکے گی۔“

پین سے اس کے کراس بیگ کے اسٹریپ کو پوری شدت سے کھینچ کر وہ چلا گیا۔ وہ چلا گیا اور کیا کہہ گیا۔ امرجہ نے نہیں سنا تھا۔ وہ اسے نہیں سن رہی تھی۔ وہ اسے کیسے سن سکتی تھی۔ وہ تو۔

پھر سے ایک تیز سٹی کی آواز۔ چمک چمک۔ جیسے زنگ آلود زنی انجن کی ریل سڑائے موت کے قیدی کا چچھا کرتی اپنے اندر جلاد بھائے بھاگی چلی جاتی ہو۔ کتنی جلدی ہے۔ جلاد کو قیدی کا سرتن سے جدا کرنے کی۔ وہ اس حالت میں آگئی جس میں کسی خونخوار درندے کے لیے لگائے گئے ہڈی توڑ لوہے کے وزنی شکنجے میں انسانی پیر آجاتا ہے۔

اف۔ موت بھی اور تکلیف بھی۔ آہ۔ وہ لیاک ایپٹل تھی۔ اس پر ”آہ“ فرض نہ تھی۔ وہ بزنس اسکول کی طرف بھاگی۔ عالیان کو ڈھونڈنا چاہا۔ وہ نہیں ملا۔ اس کے چند دوستوں سے پوچھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا۔ اس کا فون بند تھا۔ وہ تو کہا کرتا تھا وہ خود کو مار ڈالے گا مگلا س نہیں چھوڑے گا۔ مرجائے گا پر۔ تو کیا اس نے خود کو مار ڈالا تھا؟

تو کیا وہ مر چکا تھا۔ کیا واقعی۔ عالیان مار گریٹ مر چکا تھا۔ چند دن پہلے بچوں کے گالوں پر چٹکی بھرنے والا۔ اس سے بھی پہلے اس کے لیے کراسنگ پر قلابازیاں لگانے والا۔ اور۔ بھوری آنکھوں والا لارڈ میر۔ مر چکا تھا۔ اتنی جلدی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)





صدف ریحان گیلانی

دو گونہ صدف ریحان گیلانی

ناولٹ

نظامانی ہاؤس کا گیسٹ ویسای سنہرا اور چمکتا دکھتا تھا۔
دونوں اطراف اونچے لمبے سرو کے درخت ہوا سے
دامیں پائیں ہلکورے لیتے اپنی ہی دھن میں تھے۔ ہار
سنگھار کی بیل اک جانب کو خوب پھیلی ہوئی تھی اور
اس کے گلابی اور سفید پھول دور تک یوں بکھرے تھے
جیسے آنے والوں کا استقبال کر رہے ہوں۔ ڈھلتی شام
جس کے فسوں پر کئی پرندوں کی مسلسل چکار ضرب لگا
رہی تھی۔ جبکہ گیسٹ پار گمری چپ چھائی ہوئی تھی اس
وقت۔ وہ حیران ہوا۔
نظامانی ہاؤس کالان تو اس وقت خوب آوازوں سے
بھرا ہوتا ہے۔ آج کیا ہوا اور وہ خاص اسی وقت یہاں
کیوں آیا تھا۔ عارب سے بھی ایسا کوئی ضروری کام نہ
تھا۔
وہ سر جھٹکا کر مسکرایا۔ اب دل اتنا بھی نادان نہ تھا
کہ یہ بات نہ سمجھتا۔
کیا کوئی چہرہ یوں بھی حواسوں پر چھا جاتا ہے کہ پھر ہر
منظر پر اسی کی چھاب محسوس ہونے لگے۔ ہر نظارہ اسی
کارنگ چرایا ہوا لگے صبح کی سپیدی اور شام کی سرخی
میں اسی کے پیراہن کی جھلک ہو۔ پہلے اسے یہ سب
تشبیہات افسانوی لگتی تھیں مگر جب سے صحن دل پر

نئے موسم اترے تھے۔ تب سے ہر استعارہ حقیقت لگنے لگا تھا۔ وہ اسی سرور سی کیفیت میں گھرا ہوا تھا۔ اتر آیا اور اداوی نظر گیت کی چوڑی جالی کے پار ڈالی۔ سرخ روش پر چمکتی دکتی پراڈو کھڑی تھی۔ اس سے آگے عارب کی نسان۔ دامن طرف نیٹ کے آس پاس کوئی نہ تھا۔ اس کی روشن آنکھیں باند پڑ گئیں۔ دل یک لخت بجھ سا گیا۔ اکثر وہ یہیں نظر آتی تھی عارب یا مول کے ساتھ پریکٹس کرتے ہوئے۔ بہترین بندہ مشق کھیلتی تھی۔ جمال ہے جو کوئی اس سے جیت جائے اور وہ بھی ہار گیا تھا بن کھیلے ہی نہ دلوں کا کھیل بھی کتنا عجیب ہوتا ہے نا ہارنے والے کو بھی پتا نہیں جیتنے والا بھی بے خبر۔

وہ مایوس سا پلٹنے ہی لگا تھا کہ اندرونی حصے کا داخلی دروازہ کھلا اور خوب نئی نکور چمکتی فٹ بال کوکک لگاتی پرہ باہر آئی۔ فٹ بال کھجور کے نوکیلے پتوں سے ٹکرا کر واپس سبز گھاس پر جاگری۔ پرہہ بائیں جانب آم کے گھنے درختوں تلے گئی جہاں کین کی کرسیوں میں سے ایک پر سفید بے داغ لباس میں کوئی بیٹھا تھا۔ پیروں میں قیمتی مردانہ لیدر کے چپل اخبار چرے کے آگے۔

”اوہ۔“ اس نے اب غور کیا تھا۔ وہ شاید عارب کے بابا تھے یا پھر اس کے تایا سائیں۔ اسے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا ”نظامانی ہاؤس“ آتے جاتے اور وہ تاحال ان دونوں ہستیتوں سے نہیں مل پایا تھا۔ عارب کے بابا تو گوتھ میں اپنی آبائی زمینوں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے اور تایا سائیں کی کراچی میں دو گلاس فیکٹریاں تھیں۔ وہ زیادہ تر وہیں ہوتے تھے۔ کبھی کبھار حیدر آباد آتے سو وہ اندازہ نہ کر پایا۔ پرہہ ان کے گلے کا ہار بن گئی۔ انہوں نے بھی اخبار رکھ کر اس کے گرد بازو پھیلا دیے۔ وہ اس سے کچھ کہہ رہے تھے اور وہ ان کے سینے میں سر گھسائے جا رہی تھی۔ شاید کوئی فرمائش کر رہی تھی اور اگلے ہی پل دونوں ہنس رہے تھے۔ انہوں نے لاڈلی پرہہ کی پیشانی چوم لی۔ جواباً اس نے بھی ان کے چہرے

پر پیار کیا اور پھر سے اپنی فٹ بال کی جانب دوڑ گئی اس کی زوردار کک سے گیند اڑتی ہوئی گیت کے پار اس کے سر سے کوئی دوانچ کے فاصلے پر سڑک پر جاگری۔ وہ بے اختیار ہی نیچے ہوا تھا اگر جو یہ ذرا ساسی نیچے ہوتی تو اف۔ اسے جھڑکھری سی آگئی۔ اگلے پل وہ اچھلتی پھندتی دور جاتی بال کے پیچھے دوڑ پڑا۔

”تھینک یو سوچ ادا شاہو!“ وہ فٹ بال لے کر واپس آیا تو پرہہ گیت سے باہر کھڑی تھی۔ جھٹ اپنی گیند پکڑی۔ دو سنہری پونیوں کے درمیان اس کا گلابی سا چہرہ دمک رہا تھا۔

”آپ کب آئے۔“

”ابھی۔ جب آپ نے بال کوکک لگائی۔“ اس نے پرہہ کے سر پر پیار بھری چپت رسید کی۔ یہ بھی سی گر گیا عارب کے تایا سائیں کی سب سے چھوٹی بیٹی

تھی جس سے کچھ ہی عرصہ میں اس کی بھی خوب دوستی ہو چکی تھی۔

”شکر ہے آپ نے پکڑ لی ورنہ میری اتنی پیاری بال کا کسی گاڑی کے نیچے چوم رہی نکل جاتا۔ آپ کو پتا ہے بابا جان یہ میرے لیے دینی سے لائے ہیں۔“

”ارے واہ آپ کی تو موج ہو گئی۔ اچھا یہ بتاؤ عارب کہاں ہے اور باقی سب“ آج تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔ اس کی بے قرار نظروں نے ایک بار پھر لان کا جائزہ لیا تھا۔ جہاں ہر سو خزاں چھائی لگ رہی تھی۔

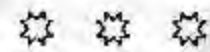
”سب اندر ہیں ادا عارب بھی۔ آپ آئیں ناں میں آپ کو بابا سے ملواؤں۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

”پرہہ۔“ معا“ اس کے بابا کی آواز آئی۔ وہ اسے بلا رہے تھے۔

”آئی بابا۔ میں ادا عارب کو بتاتی ہوں۔“ پرہہ نے پہلے آواز کا جواب دیا پھر اس سے کہتی اندر دوڑ گئی۔ اور اندر بابا نے اس سے فٹ بال پکڑ لی تھی۔ اب وہ اسے کک لگا رہے تھے۔ اک پیار بھرا نظارہ اک باپ کی

بہت سوہنٹی کے ساتھ بچہ بن گئے۔ اس کی خوشی میں خوش انتہائی باوقار سے اس کے بابا کھیل رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ پرہہ تالیاں پیٹ رہی تھی۔ وہ اپنی خوشی میں گمن عارب تک جانا فراموش کر گئی۔

اسے بھی بھول گیا۔ وہ پرہہ کے بابا کو دیکھ رہا تھا۔ شفقت لٹاتے چاہت پھجھور کرتے وہ کتنے اچھے لگ رہے تھے۔ یکدم اس کا دل ہر بات سے اچاٹ ہو گیا۔ ہمیشہ سے ایسا کوئی بھی منظر اس کی روح پر بھاری بوجھ بن کر گرتا تھا۔ ساری حسرتیں آنکھوں کے سامنے لہرائے لگتیں۔ اک کونے میں دی پڑی تمام محرومیاں پھر سے جاگ اٹھیں۔ لذت سی لذت۔ اس کی پلکوں پر مرچیں سی چھینے لگیں۔ وہ تیزی سے پلٹا۔ بانیٹ کو زوردار کک لگائی۔ اگلے پل وہ ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔



صبح سویرے کی مخصوص گھاگھی ہر گھر کی طرح

یہاں بھی جاگ اٹھی تھی۔ ٹھٹ مائی کی لٹکاریں، بچوں کی پکاریں اسے اپنے کمرے تک سنائی دے رہی تھیں اور اسی ہنگامہ آرائی کی وجہ سے ہر روز وہ اپنے کمرے میں ہی ناشتا کر لیا کرتا یا پھر بچوں کے جانے کے بعد چھوٹے سے ڈائننگ ہال میں۔

آج پہلا لیکچر ہی سراطر کا تھا اور وہ وقت کے بے انتہا پابند تھے۔ شاگردوں کی ذرا سی غلطی پر وہ سب ہی کو جھاڑ کر رکھ دیا کرتے۔ سو وہ جی کرنا کر کے اٹھ آیا۔ فرحین نہایت احسن طریقے سے ناشتا بنانے میں مگن تھیں۔ برسوں گزر گئے تھے انہیں یہ ذمہ داری اپنے سر لیے مجال ہے جو کوئی اپنی منزل پر دیر سے پہنچنے کی شکایت کر جائے۔ لپک جھپک وہ سب کی فرمائش پوری کئے جاتیں۔ چپ چاپ سر جھکائے ہاتھ چلتے جاتے ارد گرد کیا ہو رہا ہے وہ توجہ نہ دیتیں اب بھی پوری تندہی سے مصروف عمل تھیں۔ اس کی آمد پر چونک کر سر اٹھایا۔ وہ کف کے مٹن بند کرتا تیزی سے آ رہا تھا

بے اختیار وہ پریشان ہوئیں۔ اس وقت کی ہنگامہ خیزی سے اسے کتنی چڑ ہے وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

”تم کیوں چلے آئے۔ دس منٹ ٹھہراؤ تمہارا ناشتا کمرے میں ہی لے آتی ہوں۔“

”دس منٹ تک تو لیٹ ہو جاؤں گا جو بھی ہے آپ مجھے نہیں دے دیں۔“ وہ تو بے پر پر اٹھا ڈال رہی تھی۔ شاہ داؤد نے خود ہی اسٹینڈ سے پلیٹ اٹھائی، سالن ڈالا

”ہاٹ پاٹ سے پراٹھا کھینٹا اور کھڑے کھڑے کھانے لگا۔ آرام سے بیٹھ کر کھاؤ۔ ایسی بھی کیا جلدی؟“ فرحین نے چائے مگ میں انڈیلی ساتھ ٹوکا بھی۔ وہ بنا جواب دیے اپنے کام میں مصروف رہا۔

تب ہی مائی اندر آئیں۔ اسے دیکھ کر حیران ہوئیں اور عادت سے مجبور بولے بنا بھی نہ رہ سکیں۔

”ارے تم آج بڑی جلدی اٹھ گئے خیر تو ہے۔ اور ذرا ٹھہر جاتے۔ بچوں کو تو ناشتا کر لینے دیتے ان کی دین بس آنے ہی والی ہے۔ کیا جلدی سے دوپراٹھے اور

ڈال دیں بچوں کو لچ بکس بھی دینے ہیں۔“ وہ ہدایت دے کر بچن سے نکل گئیں۔ شاہ داؤد نے بچ جانے والا آدھا پراٹھا واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

”پورا کھاؤ اور یہ چائے بھی پیو۔“ فرحین نے دیکھا تو گھرگ کر بولیں۔ ٹھٹ بھابھی کی تو عادت تھی بنا سوچے بولنا۔ اب کیا ہر بات دل پر لے لی جائے۔ وہ خود تو بے حس ہو چکی تھیں پر اسے کیسے کر تیں جسے بے حد نازوں سے پالا تھا اور وہ حساس بھی بہت تھا۔

”میں کھا چکا۔“ شاہ داؤد کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا مگر صرف ساں کا خیال کرتے ہوئے کپ اٹھالیا۔

”ماموں آگئے ہیں تمہارے۔ جاتے ہوئے مل لینا۔“ مطمئن ہوتے ہوئے وہ اگلا پراٹھا بیٹنے لگیں ساتھ اسے مطلع کیا۔

”اچھا کب۔“ چائے بے حد گرم تھی۔ ایک چسکی لیتے ہی اس نے جھٹ سے مگ رکھ دیا پھر دو سرا خالی

مک پکڑا اور چائے ٹھنڈی کرنے لگا۔ جیسے بچپن میں ماں کر کے دیا کرتی تھیں۔

”رات کو تم سو گئے تھے۔ میں نے تو کہا تھا جاگتی ہوں۔ پر اس نے منع کر دیا۔ اب تم مل لو اور اپنی فیس کی یاد دہانی بھی کروا دینا۔ ویسے تو میں نے بھی ہفتہ بھر پہلے کہہ دیا تھا اسے لیکن میرے خیال میں بھول گیا ہو گا۔ دو دن رہ گئے ہیں پھر تم خود بھی پریشان ہو گے اور اسے بھی کرو گے بتا ہے نا اتنی رقم نکالنا ایک دم سے کتنا مشکل ہوتا ہے ایک کاروباری آدمی کے لیے۔“

انگلوں کا موڈ دیکھ کر بات کرنا پڑتی ہے انہوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے سمجھایا۔

”ہوں۔“ اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ کہا کچھ نہیں۔ کچن سے نکل کر وہ ان کے کمرے کی جانب چلا آیا۔

”آجائو بھئی۔“ دستک کے جواب میں۔ ملا کی آواز آئی تھی۔ شاہ دادو روزانہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔

وہ بیڈ ریم دروازہ اخبار دیکھ رہے تھے۔

”کیسے ہو بھئی! پرھائی کیسی جارہی ہے تمہاری؟“ اس کے سلام کے جواب میں انہوں نے پوچھا۔

”بہت اچھی اور وہ ملاجی! امی نے آپ سے کہا تھا میری فیس کے لیے۔“ وہ اچھا بھلا با اعتماد انسان اتنی سی بات کہتے ہوئے ہنسا سا گیا۔ رجب ملا نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔ گویا یاد کر رہے ہوں پھر سر ہلایا۔

”ہاں یاد آیا۔“ انہوں نے کہا تو تھا۔ کب ہے آخری تاریخ؟ انہوں نے اخبار آگے کر لیا۔

”پرسوں۔“ اس نے بتاتے ہوئے بغور ان کا انداز دیکھا۔ وہ کیسا سرسری سا پوچھ رہے تھے۔

”اوہو! اتنا کم وقت۔ ابھی تو میرا کراچی میں ہی اتنا خرچا ہو گیا۔ اچھا چلو پھر کرتا ہوں کچھ کل شام مجھے پھر یاد کروانا میں ادھر ادھر سے کروں گا بندوبست کیا بتاؤں کاروبار میں آئے دن اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔

ایک تو ہمارے یہ ملک کے حالات۔“ وہ اپنے رونے شروع کر چکے تھے۔ وہ اک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

یعنی کل شام ایک بار پھر جان کنی کا عالم۔ ٹکست مای کھلے دروازے سے اندر آئیں۔

”کیا کہہ رہا تھا یہ۔“ اس کے کمرے سے نکلتے ہی ان کی نفی شروع ہوئی۔ ملا اخبار میں گم۔ جواب دینا غیر ضروری سمجھا پر مای بھی ایک کائیاں تھیں۔

”چھوٹے کی یونیفارم بہت خراب ہو گئی ہے۔ کل بھی اس کی ٹیچر نے کھلوایا ہے کہ بچے کو نئی یونیفارم دلائیں۔ گڑیا کا ایک کلاس میں کسی بچے نے بلیڈ سے کاٹ دیا وہ روتی گئی ہے بمشکل بھیجا ہے اس دھڑے کے ساتھ کہ شام کو ہی نیا دلوادوں گی۔ سب کی فیس بھی جمع کروانی ہے۔ نوٹس آیا رکھا ہے۔ ٹیسٹ بھی ہونے ہیں سپر فیس الگ اور ہاں۔ چاچی سعیدہ کے بیٹے کی شادی ہے اسی ہفتے۔ وہاں کیا دینا دلانا ہے۔

بچوں کے کپڑے بھی چاہیے ہوں گے۔ میں نے شاپنگ پر جانا ہے مجھے کچھ پیسے۔“

”اوہ۔ خدا کا واسطہ ہے چپ بھی کر جاؤ۔ تم ایک دفعہ منہ کھول لیتی ہو تو بند ہی نہیں کرتیں۔ میرے کھانے پینے کی کوئی فکر نہیں۔ صبح خرچے سناؤ بس۔ حد ہو گئی۔“ انہوں نے اخبار دیوار پر دے مارا۔

بھناتے ہوئے ہاتھ روم چلے گئے۔

”ہونہ! دوسروں کے خرچے چپ چاپ سن لیتے ہیں۔ میں کچھ کہوں تو آگ لگ جاتی ہے۔ ان کی کمالی تو بس اوروں کے لیے ہے۔ میرا اور میرے بچوں کا تو مانو کوئی حق ہی نہیں۔ سارے جان بچا کر نکل گئے۔ ہم ہی پھنس گئے تو اب کمانے کو۔“

ان کی بڑبڑائیں جاری تھیں۔ بھائی کے لیے ناشتا لے کر آتی فرحین نے سب سنا۔ شاہ دادو کو تو جھڑک کر فوراً اس کے دل سے کسی بھی ایسی بات کا اثر زائل کرنے کی کوشش کر لیتی تھیں۔ مگر اپنے دل کا کیا کرتیں۔ ان کی اذیت کون کم کرتا۔ وہ اٹنے بیروں واپس ہو لیں۔

سرخ روش برکھڑی ممانے دوپٹہ سر پر جھلیا۔ قرآنی

آیات کا ورد کر کے گیٹ سے نکلتی براؤ پر پھونک ماری۔ مول پلٹ کر کین کی کرسیوں کی جانب چلی گئی۔

نیل پر اس کی کتابیں اور نوٹ بک رکھی تھیں۔ اسے اپنی اسائنمنٹ مکمل کرنا تھی۔ عنایہ نے ریکٹ سنبھال لیا۔ مقابل سوا تھی۔ اربع اور کالمہ جو صرف بابا جان کو سی آف کرنے کے لیے مارے باندھے کھڑی تھیں فٹ سے نی وی لاؤنج کی جانب دوڑ گئیں۔ پرہ نے سب کو بے فکری سے اپنی اپنی سابقہ مصروفیت کی طرف پلٹنے دیکھا۔ گویا کسی کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ مگر اسے تو بہت زیادہ پڑا تھا۔

اس کے پیارے بابا جاکے تھے پھر سے بہت سارے دنوں کے لیے۔ اب جانے وہ کب آئیں گے۔ وہ اسی بل اداسی میں گھرنے لگی۔ سب ہی اس سے پیار کرتے تھے۔ وہ سب کی لاڈلی تھی۔ مایا بھی خیال رکھتی تھیں مگر بابا سے اسے بے پناہ محبت تھی۔

وہ جب بھی چند ایک روز کے لیے آتے وہ ایک ایک لمحہ ان کے ساتھ بتاتی۔ وہ بھی اسے سینے سے لگا کر رکھتے یہ کچھ دن اس کے لیے عید بن جاتے۔ ان کے جانے پر وہ پرسوں اداس رہتی۔ اب بھی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی ست روی سے چلتی آرہی تھی۔

”پرہ دھی! ادھر آؤ۔“ جیجی نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح گود میں رکھ لی اور اسے آواز دی۔ انہوں نے اس کی آنکھیں پوچھیں، ”ماٹھا چوما، سر تھپتھپایا اور اپنے ساتھ بٹھالیا۔“

”بابا کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کرتے ہیں۔ روتے نہیں۔ آج سے میری بیٹی میرے ساتھ کھانا کھائے گی اور میرے ساتھ سوئے گی، ٹھیک؟“ اسے بھلایا۔

”ٹھیک۔“ پرہ نے پہلے تو جوش سے سر ہلادیا پھر یکدم کچھ یاد آنے پر گردن گھما کر روڈیور کے مشرقی سرے پر لگے جھولے کو دیکھا۔ جہاں بیٹھی بڑی چھوٹی ایک ہی سمت گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ گول گول تھرکتے ڈپے، تنے نقوش، ٹکڑے اعضا۔

اس نے بے اختیار ان کی نظروں کا مرکز بنایا۔ سانولی بو صحت مند سی عام سے نقوش والے چہرے پر بے فکری اور خوشحالی کی گہری چھاپ لیے نیلے سوٹ میں ملبوس مایا تھیں۔ اس نے پھر جھولے کی جانب نگاہ کی۔ وہاں انداز کچھ ایسا تھا جیسے کوئی چالاک بلی اپنے شکار پر جھپٹ پڑنے کو تیار ہو۔ وہ کچھ سسم کر چچی کے بازو میں گھس گئی۔ بابا جب بھی آتے گوٹھ کا ایک چار بھی ضرور لگاتے زمینوں کے حساب کتاب اور کئی معاملات ان کی توجہ کے منتظر ہوتے تھے اور وہ ہر جگہ ساتھ جانے کو تیار رہتی تھی مگر گوٹھ کے نام پر بدک جاتی کیونکہ وہاں اکثر راتوں کو بڑی پھوپھی کی چیخوں سے پوری حویلی گونج رہی ہوتی۔ اسے ان سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ اس حالت میں کسی بھی سامنے آنے والے کو نوچ لیتیں۔

میں نے ایک دوبار جیجی انہیں چیک اپ کے لیے شہر لے کر آئیں۔ اس برصائے میں انہیں کس عذاب سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ ان کے گھریلو بھرے چہرے پر زمانوں کی ٹھکن ڈیرہ ڈالے رہتی تھی۔

”چیچی دوڑی پھوپھی ایسی کیوں ہیں؟“ وہ سہمی سہمی سی سوال کر گئی تھی۔

”بس بچے کچھ نہ پوچھو۔ کبھی کبھار انسان ہوش

خواتین کے لیے خوبصورت تحفہ

خواتین کا گہرے رنگ کا لباس

کالیا اینڈیشن قیمت - 750/- روپے

کے ساتھ کھانا پکانے کی کتاب

کھانا پکانا

قیمت - 225/- روپے بالکل مفت حاصل کریں۔

آج ہی - 800/- روپے کا مفتی آڈر ارسال فرمائیے۔

مندی میں بھی وہ کچھ کر جاتا ہے جو آنے والے کل میں اس کے لیے سخت آزار کا باعث بن جاتے ہیں۔ کرنی کا پھل ہے سارا۔ ان کے کنبے میں ہزاروں دکھ تھے۔

”کیسی کرنی۔“ وہ اب بھی۔ جیتی کی توجہ اس پر نہیں تھی۔ جھولے کی زنگ آلود زنجیر کی جرجاہٹ سماعتوں کو چیرے دے رہی تھی۔ تیز اور تیز گول گول گھومتے ڈیلے والے کنبے چرے پر جیسے کسی نے گندھک مل دیا تھا۔ شدید اضطراب سے مغلوب ہو کر وہ اپنا ہی ہاتھ چبا رہی تھیں۔ انہوں نے گھبرا کر ملازمہ کو آواز دے ڈالی۔ اب ان بوڑھی ہڈیوں کے ساتھ اکیلے انہیں قابو کرنا ان کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ مہا بھی متوجہ ہو میں اور صورت حال بھانپ کر ان کی آنکھوں میں ڈھیروں تاسف کے ساتھ ملال بھی اتر آیا پھر یکدم خیال آنے پر انہوں نے سب سے پہلے مانی چاچا کو لان سے چٹا گیا۔ انہیں علم تھا کبھی کبھی خوش جنوں میں وہ اپنے تن کے کپڑے تک پھاڑ ڈالتی تھیں۔ اس کے بعد لڑکیوں کو ڈپٹا۔

”جاؤ سب یہاں سے۔ اندر کوئی کام نہیں ہے تم لوگوں کو۔ سو! جاؤ اپنی کتابیں کھولو۔ پرہ! تم کیا کر رہی ہو وہاں؟“ آنکھیں پھاڑے ایک ننگ بن جل پھٹی کی مانند تڑپتی چلتی پھو پھی کو دیکھتی پرہ پر ان کی نظر گئی تو چیخ کر بولیں۔ وہ اس کی حساسیت سے بھی خوب واقف تھیں۔ اس نظارے کے بعد اس نے کئی راتوں بڑتے رہنا تھا۔

شاندار سچے سجائے چھوٹے سے لپار ٹمنٹ کی طرز پر بنی یہ انیکسی تیا سائیں کی خوش ذوقی کی اعلیٰ مثال تھی۔ وہ جب بھی آتے زیادہ وقت یہیں گزارتے اور عارب تو رہتا ہی ادھر تھا۔ بقول اس کے اسے اپنی ٹف پڑھائی کے لیے ذہنی سکون اور ایک آرام دہ گوشے کی ضرورت تھی اور یہ جگہ اس لحاظ سے بالکل موزوں تھی۔

جب وہ دونوں بہن بھائی مزید تعلیم کے لیے گوٹھ

سے نظامانی ہاؤس آتے تو عارب اکثر ایسے ہی ہلے گھڑا کرتا۔ تب تیا سائیں نے اسے سب سے علیحدہ یہاں رہنے کی اجازت دے دی تاکہ وہ مکمل ذہنی آسودگی کے ساتھ اپنی پڑھائی کر سکے۔ اس نے سوچا ذرا عارب کے کمرے کا جائزہ لے۔ ایک بیڈروم بالکل صاف ستھرا تھا۔ تیا سائیں کے مخصوص کلوں کی منک پر جگہ پھیلی تھی۔ وہ آہستگی سے دروازہ بند کر لی دو سرے دروازے کی جانب چلی آئی۔

”اف۔“ ایک لمحے کو تو وہ چکرا کر رہ گئی۔ کمر کیا وہ تو ٹھیک ٹھیک کباڑ خانہ معلوم ہو رہا تھا۔ ہر طرف افرا تفری کا عالم، کوئی شے اپنی اصل جگہ پر نہ تھی۔ واقعی یہ عارب کا ہی کمر ہو سکتا تھا۔ وہ کمر کس کس شے پر ہو گئی۔ پہلے تو یہاں وہاں ہنگے سارے کپڑے اکٹھے کر کے نوکری میں ڈالے۔ پھر جگہ جگہ پڑی تمام کتابیں رائٹنگ ٹیبل تک پہنچائیں۔ ساری ترتیب درست کی۔ ٹرائی کے پاس کارپٹ پر بے شمار سی ڈیز بکھری پڑی تھیں، انہیں سمیٹ کر دراز میں ڈالا۔ بیڈ شیٹ جھاڑ کر بچائی۔ صوفوں کے کشن ٹھیک کیے اور دو زانو بیٹھ کر سینٹرل ٹیبل صاف کرنے لگی تھی کہ اس کی نظر نیچے پڑ گئی۔

”اوہ تو یہ کروت ہیں صاحب بہادر کے۔ اس لیے الگ جگہ چاہیے تھی انہیں۔“ وہ جی بھر کر کلکسی اور ہاتھ بڑھا کر سگریٹ کے اوہ جلے ٹوٹوں اور راکھ سے بھری المیش ٹرے اٹھالی۔

”اب یہ ثبوت بابا جان تک پہنچے تو کیا درست بنے گی جناب کی۔“ اسے سوچ کر ہی مڑا گیا۔

وہ نظامانی خاندان کا اکلوتا چم و چراغ تھا۔ صرف بابا ہی کیا تیا سائیں کی بھی اسے بھرپور محبت اور توجہ میسر تھی۔ ہر طرف سے مکمل و آسودہ حال تھا وہ اس کے باوجود یہ حرکتیں اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔ اس نے مقسم ارادہ کیا۔ سگریٹ کی ناگوار بو اسے پورے کمرے میں محسوس ہونے لگی۔ اٹھ کر پردے ہٹائے کھڑکی کھولی۔ ہر ابھرا لان نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ آج کی ایک شاخ پر انکی ششل کاک اور یہ کھڑکی۔ یہاں لگا

کھڑکی تھی۔ ایک لخت ساری کلفت اڑ چھو ہو گئی۔ کھڑکی کیا کھلی کہ اک اور کواڑ بھی کھل گیا۔ عنایہ کے یا توئی لبوں پر دلاویز مسکان بکھر گئی۔ آنکھوں میں اک یاد کے رپ چل اٹھے۔

وہ اک بڑی خوب صورت سی شام تھی۔ ہوا خوب جھومتی اور ہم جاتی ہوئی سارے درخت پودے بھی سرشار سے اس کے سنگ جھول رہے تھے۔ بیڈ منٹن اس کا جنون اسکول کالج کے علاوہ بین الصوبائی سطح پر بھی وہ کئی مرتبہ جیت چکی تھی۔ جتنا فائز وقت بچتا وہ سب اپنے شوق کی نذر کر دیتی۔ وہ کھیل کھیل کے تھکتی نہ تھی۔ اس دن مول کا بھی موڈ نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے عارب کے ساتھ اس کی جھڑپ ہوئی تھی مگر کسی بھی طرح منا کر وہ اسے نیٹ تک لے ہی آئی۔

ابھی پہلی سروس کروائی ہی تھی کہ ہوا کے بھرپور جھونکے کی شرارت سے ششل کاک اڑتی سیدھی اندر سے چائے اور لوازمات سے بھری ٹرے لیے نکلتے عارب کے سر سے ٹکرا کر غراب سے ایک کپ میں جا گری۔ چائے اچھلی تو بسکٹ اور پکوڑے بھی نہا گئے۔ یعنی پورے دو گھنٹے کی مشقت سے تیار ہوئی فرمائشی ٹرے کا ستیاناس۔ عارب کا تو مارے غصے کے برا حال ہو گیا۔ آج کتنے ترلوں سے وہ شاہ داد کو قابو کر کے لایا تھا۔ کل ان کی پریزنٹیشن تھی اور اس کی تیاری حسب سابق زیرو گد وہ شہر اسدا کا پڑھائی چور۔ ڈاکٹر انجینئر بننا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ شاہ داد سے دوستی کی وجہ یہ تھی کہ وہ حد درجے پیارا اور پڑھا کو پڑھ تھا۔ ہر کام آسان۔ نوٹس تیار۔ بنا ٹینشن بس کاپی کر لیتا۔ وہ بھی مول سے کروانا پھر ہر ماہ تیا سائیں رپورٹ لیتے تو کمر پر تھکیاں الگ سے ملتیں۔ موجیں ہی موجیں بدلے میں وہ ان کی کوئی فرمائش پوری کر دیا کرتا تھا۔ مول کی فرمائشیں تو اتنا ساتھ دینے کے بعد جیولری کپڑے سے کم نہ ہوتی تھیں جبکہ بے چارے شاہ داد کی فرمائشیں بس چائے پکوڑے اور کباب تھے اور آج

یہی فرمائش بڑے اہتمام سے سجا کر وہ اس کی خدمت میں لے جا رہا تھا کہ یہ ساتھ ہو گیا۔ ٹرے گھاس پر پٹ کر وہ عنایہ کے پیچھے لپکا جو اس کے تیر دیکھ کر پہلے ہی دوڑ لگا چکی تھی۔

”دیکھ لوں گا تمہیں۔“ وہ گھاس پر گرا لیے لیے سانس لیتا دھمکا رہا تھا وہ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتی پوہنی ہنستے ہنستے منہ اوپر اٹھایا تو یک لخت ہنسی کو بریک لگ گئے۔ سامنے ہی کھڑکی کے فریم میں ایستادہ وہ خوبو چرے والا جس کی پُرشوق نگاہیں جانے کب سے اس پر مچی تھیں۔ وہ بری طرح گڑبڑائی۔ پٹا تو وہ بھی گیا تھا اسی لیے تو اس کے سنہلنے تک وہ بھی پڑے ہٹ گیا۔ کئی دن وہ نگاہیں اسے ڈسٹرب کرتی رہیں۔ پھر اک دن عقدہ کھلا۔

”ادا شاہو! کیسے ہیں۔“ مول نے اسے دیکھتے ہی گر مجوشی سے ہاتھ ہلایا۔ وہ اسے دیکھتا پرے ہو گیا۔ ”یہ ہے کون بد تمیز؟“ عنایہ کو اس کی نگاہ سے الجھن ہوئی۔

”اے اے تمیز سے۔ تم نے کسے بد تمیز کہا۔ ادا شاہو کو بہت بری بات۔ اتنے اچھے اور ڈینٹ ہیں وہ۔ عارب کے سب دوستوں سے مختلف۔ میں تو شکر کرتی ہوں اس نے بھی کسی ڈھنگ کے انسان سے دوستی کی۔ مول نے اسے گھر کا۔

آہستہ آہستہ وہ کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہہ جانے والی نگاہیں اسے اپنا اسیر کرنے لگیں۔ اب عالم یہ تھا کہ اگر چار دن وہ نظر نہ آتا تو وہ بے چین ہو جاتی۔ ”کیا کر رہی ہیں آپ؟“ پرہ اسے ڈھونڈتی ہوئی ادھر آئی تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ دلفریب رنگوں سے جگمگا رہا تھا۔

”کچھ نہیں صفائی کر رہی تھی۔“

”میں بھی آپ کے ساتھ کام کروں۔“ وہ آگے بڑھ آئی۔

باقی کی جھاڑ پونچھ دونوں نے مل کر کی۔ دونوں واش روم میں گرد سے اٹے ہاتھ منہ دھو رہی تھیں جب کمرے کا دروازہ کھلا عارب اپنے ہی

دھیان میں کسی سے بات کرتا آ رہا تھا۔
 ”اس۔“ اندر کی حالت دیکھ کر وہ گڑبڑائی گیا۔
 کہیں غلطی سے تیار سامنے کے کمرے میں تو نہیں
 آ گیا۔ مگر نہیں یہ اس کا ہی کمرہ تھا۔ ہر چیز جانی پہچانی
 لیکن نکھری ستھری بھی ماسی کو تو وہ کمرے میں کھنے
 نہیں دیتا تھا۔ یہ آج کس نے جرات و ہمت کا مظاہرہ
 کر ڈالا تھا۔ وہ حیران تھا۔ اسی دوران وہ دونوں واش روم
 سے اٹھیں۔
 ”ادھر کیا کر رہی ہو تم لوگ؟“ اس کی حیرت دور
 ہوئی۔
 ”میری بد قسمتی کہ ادھر آنکلی۔ معاذ اللہ آپ کا کمرہ
 تھا کہ گھوٹوں کا اصطیل کس طرح رہ لیتے ہیں اس
 اسٹور روم میں۔“
 ”چپ کرو اور ننگو یہاں سے۔“ اس کی باتوں نے
 عارب کو تیار کیا۔
 ”جاری ہوں۔“ عنایہ نے لپک کر نیل پر رکھی
 الیش ٹرے قابو کی اسے بھلا کیسے چھوڑ جاتی۔
 ”یہ یہ کیوں لے کر جاری ہو۔ رکھو ادھر۔“
 عارب بری طرح سٹپٹایا۔ خود کو کو سایہ کیسے بھول گیا وہ۔
 ”یہ کیا ہے بتا ہے آپ کو اور یہ میں جیجی اور بابا کی
 خدمت میں پیش کروں گی۔ پھر بتا لگے گا آپ کو۔“ وہ
 اسے دھمکا رہی تھی۔ عارب دانت کچکا تارہا۔
 ”عنایہ کی بچی! میں جان لے لوں گا تمہاری سوا پس
 کرو مجھے۔“
 ”ارے واہ اتنی آسانی سے۔“ وہ چمک کر کہتی پیچھے
 ہٹی۔ ”کیسے دوستوں کی صحبت میں رہنے لگے ہیں۔
 بالکل ہی بگڑ گئے ہیں۔ اب بابا اور اماں تک رپورٹ
 جائے گی ناں۔ انیسویں میں آپ کے سارے لفظ
 دوستوں کی آوت جاوت بھی بند کروا دی ہوں۔“ وہ
 بولنے پر آئی تو جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی۔
 عارب نے بوکھلا کر ایک نظر دروازے پر ڈالی۔
 ”بار بار کہہ رہا ہوں آہستہ ہو مگر سنتی ہی نہیں ہو۔
 کروادی ناں میری انسلٹ اتنا اچھا دوست ہے وہ میرا

سب سن لیا ہو گا اس نے کیا سوچتا ہو گا وہ۔“ عارب
 کا بس نہیں چلا اس کی گردن دھونچ لیتا۔
 ”ارے ادا شاہو آپ! پرہ اپنی ہی دھن میں بہت
 چیزی کے ساتھ کمرے سے نکلی تھی۔ سامنے لے
 دیکھ کر رک گئی۔ وہ پیش کی طرح اسے دیکھ کر مسکرا بھی
 نہ سکا۔
 ”کیسے ہیں آپ۔“ وہ پوچھ رہی تھی۔ شاہ داد نے
 بڑی دقتوں سے خود کو کپڑا کیا۔ فقط سر ہلا دیا۔
 ”یہ دیکھیں! ادا عارب کے کمرے میں سے کیا نکلا
 ہے۔ وہ سگریٹ پیتے ہیں۔ یہ زہر ہوتا ہے ناں؟“ وہ
 رازدارانہ انداز میں بولی۔
 ”کیا آپ بھی سگریٹ پیتے ہیں؟“ پرہ آنکھوں میں
 استفسار لے لے دیکھ رہی تھی۔ اس نے نفی میں سر
 ہلا دیا۔
 ”کیا بات ہے آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“ وہ اب
 تک اک لفظ نہیں بولا تھا۔ اس لیے پرہ کو تشویش
 ہوئی۔ اب بھی شاہ داد نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔
 تب ہی وہ اندر سے نکلی۔ شاہ داد نے نظر پھیر لی۔
 اب اتنی خفگی کا حق تو رکھتا تھا وہ۔
 ”آیا! ادا شاہو سگریٹ نہیں پیتے۔ آپ نے
 خواہ مخواہ اتنی باتیں سنا دیں۔“ وہ جو یونہی چپ چاپ
 کھسنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی اس کی بات پر بے اختیار
 رک کر صفائی دے گئی۔
 ”مم میں نے انہیں تو کچھ نہیں کہا۔“
 ”لیکن ادا ناراض ہو گئے ہیں۔ کوئی بات ہی نہیں
 کر رہے۔“ پرہ بے شک بچی بھی مگر کم عقل ہرگز
 نہیں تھی۔
 ”س۔۔۔ سوری۔“ جب وہ رک ہی گئی تھی تو پھر
 معذرت کر لینے میں بھی کوئی عار نہیں تھا۔ کم از کم دل
 سے بوجھ تو ہٹ جاتا۔ شاہ داد کی ناراض نظریں بے
 ساختہ اس کی جانب اٹھی تھیں۔ انگلیاں موڑتی
 پلکیں جھپکتی، نزل سی وہ بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی
 اور عنایہ کا یہ مختلف سا روپ اس کا دل بھی بدل گیا تھا
 ۔ ساری کلفت چھٹ گئی۔ اس کے اک سوری نے

دوب چڑی ساری گرداڑادی۔ سارے منظر ٹھہر گئے۔
 ”آ۔۔۔ آپ ادا عارب کو سمجھاتے کیوں نہیں
 ۔ آپ خود تو اتنے اچھے ہیں ان پر آپ کی صحبت کا اثر
 کیوں نہیں آیا۔ پلیز انہیں سمجھایا کریں۔“ مزید اس
 کے الفاظ اندر تک ٹھنڈ ڈال گئے۔ وہ اس کی تعریف کر
 رہی تھی۔
 ”چلو پرہ۔“ وہ آگے بڑھی۔ اس نے جھپٹ کر
 الیش ٹرے پھینچ لی۔ ”میں عارب کو سمجھاؤں گا۔
 ڈونٹ وری۔“ اب ایسا بھی کیا خوشی سے ہونٹ سی
 لیتا۔ اسے کئی دینے کو وہ آخر کار بول اٹھا۔
 ”تھینک یو۔“ وہ مطمئن سی پرہ کو لیے جا چکی تھی
 اور بے اختیار اس کا دل چلا ”یا ہو“ کا نعرہ مارنے کو۔ مگر
 عارب کتاب لے آ رہا تھا سر نیچا کیے۔ یقیناً وہ شرمندہ
 ہو رہا تھا۔ مگر وہ بہت خوش تھا۔ عارب کو ساتھ بٹھالیا۔
 الیش ٹرے اس کی گود میں پختی اور آئندہ نہ پینے کا وعدہ
 لے کر ہی اٹھا تھا۔



نوٹ بک سنبھالتا وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا آ رہا
 تھا۔ دفعتاً نگاہ سامنے اٹھ گئی۔ رایداری کے اختتام پر
 گول ستون کے ساتھ ٹیک لگائے تنگ پاجامے اوچی
 سی شرٹ دوپٹے کے نام پر گلے میں ڈوری سی لٹکائے وہ
 یقیناً ”راہیلہ سومو تھی۔“ لڑکی کی اس جانب پشت
 ہونے کی وجہ سے وہ اس کی ڈریسنگ سے اندازہ ہی کر پایا
 جبکہ اس کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھے بڑے موڈیانہ
 انداز میں کھڑے لڑکے پر اسے گمان ہی نہیں یقین
 تھا۔ عارب نظامانی۔ ہر دو سرے روز ایک آدھ کلاس
 بنک کر کے ان چکروں میں پڑا رہتا ہے۔ پھر اسے ڈنل
 اسائنمنٹ بنانا پڑتی اپنی بھی اور اس لفظ کی بھی۔
 ”نہیں سدھرے گا۔“ دانت کچکا تا سر جھٹک کر وہ
 پارکنگ میں چلا آیا ابھی وہ گاڑی گیٹ کی جانب موڑ رہا
 تھا کہ عارب کو اپنی طرف آتے دیکھا۔
 ”بڑی جلدی میں ہو۔ کہیں خاص پہنچنا ہے کیا؟“
 ”میں نے تو واقعی پہنچنا ہے لیکن میٹنگ تو تمہاری

بھی بہت خاص لگ رہی تھی۔ میں تو سمجھا بیچ بھی
 ہو گا۔“ وہ اس کی حرکتوں پر جلا بھنا کھس کر بولا۔
 عارب نے بلند قہقہہ لگایا۔
 ”جلنے والے کا منہ کالا۔“
 ”جلتا ہے میرا جوتا۔“ شاہ داد نے پاؤں پٹکا۔ چابی
 سمجھا کر کلک لگائی۔ مگر یہ کیا۔ ہائیک نے چوں بھی نہ
 کی۔ وہ پریشان ہو کر نیچے اتر آیا۔
 ”کیا ہوا تیری لاڈلو پھر عداوت گئی تھی؟ تو میں تجھے
 ڈراپ کروں۔“
 ”شکریہ جا کر انہی کو ڈراپ کرو بہن کے ساتھ
 وقت برباد کر رہے تھے۔“ وہ بہت غصے میں تھا۔
 ”یار! میں نے کون سا ڈگری لے کر نوکری ڈھونڈنی
 ہے۔ اپنی تو موبیس ہی موبیس ہیں۔ بابا سامیں اور تیا
 سامیں کا تمام کاروبار میرا ہی تو ہے۔“ وہ ہر طرف سے
 بے فکر تھا۔
 ”بابا سامیں کے کاروبار کی سمجھ تو آتی ہے مگر یہ تیا
 سامیں کا کاروبار کیوں۔“ شاہ داد کو اچنبھا ہوا۔
 ”ارے یار! سمجھا کرو ناں۔ تیا سامیں کی پانچ
 بیٹیاں ہیں بیٹا تو کوئی ہے نہیں پھر میں ان کا بڑا داماد
 بنوں گا تو قانونی اور شرعی طور پر حق دار اور وارث میں
 ہی ہوں ناں۔“ اسے اپنے مطلب کی ساری باتیں آتی
 تھیں۔
 ”اچھا چل چھوڑ آجا۔ میں تجھے ڈراپ کر دیتا
 ہوں۔“
 ”مہربانی میں ٹیکسی کر لیتا ہوں۔ زیدہ کالج تک جانا
 ہے مجھے۔“ اس نے ہائیک کو لاک کر کے چابی نکالی۔
 ”زیدہ کالج اور تم اللہ رے۔ یہ کب سے ہونے
 لگا۔“ عارب نے چھیڑا۔
 ”نکو اس نہ کر۔ دوں گا ایک اگلے ہاتھ کا۔ مینا آئی کو
 پک کرنا ہے وہاں سے۔“
 ”اوہ سو سوٹ! مینا آئی۔ وہ کب آئیں کراچی سے
 سچ میں تو حیران ہوتا ہوں تم نے ان سے کوئی ایک بات
 بھی نہیں لی۔ کم از کم تھوڑا سا مسکراتا ہی سیکھ لیتے۔“
 ”زیادہ باتیں نہ کر۔ چلنا ہے تو ٹھیک نہیں تو میں

چلا۔

”ہاں چل اسی بہانے آئی سے بھی ملاقات ہو جائے گی اتفاق سے میں بھی کلج تک ہی جا رہا تھا۔ عارب نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آگے دھکیلا۔

”یہاں سے دل نہیں بھرتا کہ اب وہاں بھی جا رہے ہو۔“ شاہ داد نے چوٹ کی۔ وہ ہنس دیا۔

اور کس قدر حیران کن اور خوش کن ہوتے ہیں وہ لمحات جب اچانک ہی دل کی کوئی مراد بر آئے تب سمجھ میں نہیں آتا کہ پہلے حیران ہوا جائے یا خوش۔ اور ایسی کیفیت آپ کے چہرے پر کسے رنگ اور ہونق پن بکھیر دیتی ہے ضرور علم ہو جائے اگر آئینہ دیکھ لیا جائے تب سوائے ہنسی کے اور کچھ نہ سوجھے وہ بھی ہنس رہا تھا مگر یہ کی آڑ لے کر جو اسے جانے کیا کیا چٹکے سنانے میں لگن تھی۔ باقی اس سمیت سب مینا آئی سے یوں خوش گپوں میں مگن تھیں گویا ان سے پرانی جان پہچان ہو۔ وہ کسی بات پر ہنس رہی تھی اور شاید وہ جانتی تھی کہ ہنستے ہوئے وہ کس قدر دلکش لگتی ہے۔ سفید یونیفارم میں سرمئی اسکارف کے ہالے میں مقید اس کا سرخ پڑتا چہرہ نہایت دلاویز لگ رہا تھا۔ مگر ہائے افسوس کہ وہ چند ہی دیکھ سکا۔ وہ عارب کی بس تھی اور اتنا احترام لحاظ تو اس میں تھا ہی اور پھر وہ چند ہی تمام دن اس کے حواسوں پر چھائے رہے۔

”شاہ داد! ذرا اپنا سیل دینا، ہم ان سے بات کر رہی تھی کہ میرے فون کی بیٹری ختم ہو گئی۔“ مینا آئی بولتی ہوئی آئیں وہ ہتھیلی ٹھوڑی تلے رکھے اپنے ہی خیال میں کھویا چونک کر سیدھا ہوا۔

”خیر تو بے لڑکے کدھر ہو تم؟“ انہوں نے جانچتی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ ہنس پڑا۔

”کہیں نہیں۔ آپ کہیں کیا کہہ رہی تھیں۔“

”کہیں نہ کہیں تو تھے صاحبزادے! اب بتانا نہ چاہو تو اور بات ہے۔ تمہارے چہرے پر یہ رنگ میں پہلی بار

دیکھ رہی ہوں۔ کیا کوئی خزانہ مل گیا ہے؟“ وہ بڑے اطمینان سے بیڈ کی پائلٹی پر ٹپک گئیں۔ یعنی پوری تفصیل جانے بغیر چھوڑیں گی نہیں۔ وہ خوب واقف تھا ان کے انداز سے۔

”ملا تو نہیں دعا کریں مل جائے۔“ اس نے بھی ریو الونگ چیئر ان کی طرف گھمائی۔

وہ ہمیشہ سے اپنے دل کی ہریات ان ہی سے شیئر کرتا آیا تھا بچپن سے ہی وہ ان کے قریب رہا تھا۔ ماں کی گود پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔ اس کی پہلی درس گاہ خالہ کی گود بنی۔ ماں سے اسے بہت پیار تھا مگر ماں کے گپ چپ انداز وہ بیٹھے بیٹھے کھو جاتیں۔ انہیں اکثر اپنا ہوش نہ ہوتا تھا۔ اس کا کیا خیال رکھتیں۔ اس کی ماں بہت خوب صورت تھیں۔ مگر سادہ کپڑے، بلمہ رے ایچھے بال، بے رونق چہرہ۔ اسے مینا آئی زیادہ پیاری لگتیں۔ نت نئے ڈیزائن لیے ان کے لباس، ہر چہ ماہ نیا ہیرا سائل، چمکتا دکھتا چہرہ ہر وقت ہنستی مسکراتی۔ وہ بچہ تھا ماں اور آئی میں موازنہ کرتا۔

جب وہ آنکھیں میں تھا تو ان کی شادی ہو گئی۔ وہ خوب رویا۔ مگر وہ چلی گئیں۔ مگر اللہ یا رب بلوچ کے ہمراہ۔

اور ان پر یہ بھید ایک ہفتے ہی میں کھل گیا تھا کہ میجر صاحب پہلے بھی خیر سے شادی شدہ اور تین بچوں کے والد محترم ہیں۔

نانا اور نانی تک یہ خبر کسی کے توسط سے چھ ماہ بعد پہنچی۔ نانا نے تو دل ہی پکڑ لیا۔ نانی سر پر ہاتھ مار مار کر رو رہی تھیں۔

وہ بے چاری چپ چاپ سہ گئیں کہ فرحین کا دکھ ہی کیا کہ ہے کہ میں بھی بھاری سہل بن جاؤں۔

میجر صاحب جیسے بھی تھے ان کے حق میں اچھے ہی تھے۔ قدرت نے اولاد کی نعمت سے نوازا تو وہ ہر دکھ بھول گئیں۔ ان کا لاڈلا بیٹا راہد ان اس سے ان کی ہر خوشی وابستہ تھی۔ سو زندگی اب بہت سہل گزر رہی تھی اور یہی زندگی کسی کے لیے کس طرح تنگ تھی اس کا بھی انہیں خوب احساس تھا۔ ماں باپ کے بعد

فرحین اور شاہ داد کے بے ضرر سے وجود بھائی کس دل سے برداشت کر رہا ہے؟ انہیں اچھی طرح علم تھا سو خود ہی دن کے ان کے کئی بوجھ بانٹ رکھے تھے۔

شاہ داد کو وہ اپنا پہلا بیٹا مانتیں ہی نہیں مانتی بھی تھیں۔ وہ ہمیشہ سے اس کے بن کے دل کا حال جانتی آئی تھیں۔ اب بھی جان گئیں۔ مسکرا کر کہنے لگیں۔

ہاں ہاں ضرور دعا کروں گی۔ لیکن اس خزانے کا نام تو بتاؤ۔ اور اک پل کو تو شاہ داد کا منہ کھلا پھر وہ جی جان سے ہنس دیا۔

”آپ بھی ناں خوب کمال ہیں آئی۔ آپ کو کیسے خبر ہوئی؟“

”ارے بھی میں تو اڑتی چڑیا کے پر مگن لوں۔ آخر فوجی کی بیوی ہوں۔ کوئی مذاق ہے بھلا۔“

چلو اب سیدھی طرح بتاؤ کیا نام ہے۔ کہاں رہتی ہے۔ کیا کرتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ؟“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ بیٹھا اور پھر وہ ان سے کچھ بھی نہ چھپایا۔ تمام حکایت دل کتا چلا گیا۔

”ہوں تو یہ ہے۔ معاملہ بہت پیاری لڑکی ہے۔ دیری انومنٹ اینڈ سہیل۔ اچھی لگی مجھے۔ تمہاری پسند تو لا جواب ہے۔“

”ج آئی!“ وہ بے انتہا خوش ہو گیا۔

”ہاں بھی اس میں کوئی شک نہیں۔ تم تو بہت تیز نکلے۔ ماں کی جوتیاں بچالیں۔ اسے تو بیٹھے بیٹھے ہو مل جائے گی۔ شہزاد اسے بھی خوشخبری سناتی ہوں۔“

وہ اٹھنے لگیں۔ شاہ داد نے جھٹ کندھوں سے تمام کر دو بارہ بٹھایا۔

”فوفہ آئی! آپ بھی ناں ہمیشہ بہت فاسٹ رہتی ہیں تھوڑا دم تو لیں۔ آپ کو پتا ہے ابھی میرے بہت سے پلان زیر تکمیل ہیں۔ شادی کا تو ابھی دور دور تک نام و نشان نہیں پہلے میں امی کے خواب پورے کروں گا پھر اپنے بارے میں سوچوں گا۔“ اس کا پر عزم چہرہ عجب لودے رہا تھا۔

زرمن نے بے اختیار اس کی روشن پیشانی جو مہل۔

”تم تو بہت کچھ دار ہو گئے ہو۔ واقعی تمہاری ماں کا بہت حق ہے تم پر۔ تمہیں تو علم بھی نہ ہو گا کیسے کیسے دکھ اٹھائے ہیں تمہارے سنہرے مستقبل کی خاطر اس نے چپ چاپ اس گھر کی خادمہ بننا بھی منظور کر لیا۔ اب تمہارے اولین فرائض میں شامل ہے کہ تم پوری توجہ سے اپنا اسی ایم اے مکمل کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں شاندار کامیابی عطا کرے پھر اچھی جاب کوئی مسئلہ نہیں ان شاء اللہ۔“ انہوں نے اس کا شانہ تھپکا۔ وہ اپنے ہی کسی دھیان میں تھا مگرم صدم کھویا کھویا۔

اول تو اس کے باپ کا تذکرہ کوئی کرتا ہی نہ تھا اور اگر کبھی کہیں ذکر چھڑی جاتا تو اس کے لیے بھی اچھے الفاظ استعمال نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے باپ دیکھے تھے اس نے۔ سب ہی بے حد اچھے تھے۔ اپنے بچوں سے پیار کرنے والے ان کے لاڈ اٹھانے والے۔ تو کیا صرف اس کا باپ کیوں اچھا انسان نہیں نکلا۔ ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک یہ سوئی اس کے سینے میں گڑی تھی اور اکثر بے اندازہ درود دیتی تھی۔ اب بھی یہ تکلیف بہت شدت سے پورے جسم میں پھیلی تھی۔

”آئی! کیا واقعی میرے بابا بہت بُرے تھے؟“

”بہتر ہو گا تم یہ سوال اپنی ماں سے کرو۔ سارا ج تو وہی تمہیں بتا سکے گی۔“ زرمن نے ہمیشہ کی طرح گریز کی راہ اختیار کی۔

”ان سے تو پوچھ پوچھ کر تھک گیا ہوں میں۔ ایک لفظ نہیں کہتیں۔ نہ اچھا نہ بُرا۔ میں اب بچہ نہیں رہا۔ بڑا ہو گیا ہوں۔ میرا حق ہے کہ میں اپنے باپ کے متعلق جان سکوں۔“ وہ جیسے پھٹ پڑا۔

”تو یہ تمہاری ماں کی اعلیٰ طرفی ہے بیٹا! اگر وہ ہزاروں زخم کھا کر بھی اس شخص کی اولاد کو اس کی بابت سچ نہ بتا سکے تو پھر وہ یہی چاہتی ہے کہ تمہاری نظروں میں تمہارے باپ کا تراشا ہوا پیکر ویسے ہی چمکتا دکھتا رہے جیسا تم نے اسے پالش کیا ہے۔ مت پوچھا کرو۔ کیوں آواز نہ ہو اس بے چاری کا ضبط۔ خود کو بھی فضول سوچوں میں مت الجھاؤ اپنی اسٹڈیز پر پوری توجہ

دو اور اب چلو اچھے بچوں کی طرح پڑھو۔ لولائٹ بھی آگئی۔ میں سیل چار جنگ یہ لگاؤں۔ جانے ہمدان کے کتنے ٹیکسٹ آچکے ہوں گے۔ میجر صاحب کو الگ چین نہ ہو گا۔ وہ کمرے سے نکل گئیں۔ وہ یونہی سر نیوڑائے بیٹھا رہا۔

پریکٹیکل کے لیے ان کا گروپ اکثر کیفی ٹیرا کا رخ کرتا تھا۔ چونکہ آج موسم بہت زبردست ہو رہا تھا۔ دوپہر ڈھلنے کو تھی۔ وہ سب باہم مشورے سے انسٹیٹیوٹ کی کھلی چھت پر چلے آئے۔ سب اپنی اپنی فائل کھولے پڑھ رہے تھے۔ شاہ داد بھی اک طرف کھڑا پورے دھیان سے پڑھ رہا تھا جبکہ عارب دیوار پر جھکا دھڑا دھڑا دیکھ رہا تھا۔ تب ہی اس نے تیزی سے چلتی مول کو دیکھا۔

”کیا ہوا ہے۔ اس کا یہ انداز۔“ عارب کا دل گھبرا گیا۔ کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔ وہ فوراً پلٹا۔ ”یار! یہ میری فائل سنبھال میں ابھی آیا۔“ اس نے فائل شاہ داد کی طرف اچھالی۔ جو پکڑتے پکڑتے بھی نیچے گر پڑی۔

عارب کو اس طرح بھاگتے دیکھ کر شاہ داد نے دیوار سے نیچے جھانکا۔ مول لان میں ایک ایک کو پکڑ کر کچھ پوچھ رہی تھی۔ گھبرائی ہوئی حواس باختہ۔ لگتا تھا گر پڑے گی۔ چند لمحوں میں عارب اس تک پہنچا تھا اور اس کا بازو پکڑ کر کچھ پوچھا۔ وہ روتے ہوئے کچھ بتانے لگی۔

”یا اللہ خیر وہ بھی پوری رفتار سے سیر دھیاں اتر گیا۔“ کیا ہوا ہے سب خیر تو ہے۔ ”مول کا ترہتر چہرہ۔“ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے وہ اپنی سسکیاں روک رہی تھیں۔

”سب ٹھیک ہو گا۔ پلہ کنٹرول یور سیلف میں ابھی پتا کرتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔“ عارب اسے تسلی دے کر چند قدم دور ہٹ گیا۔ تمام اسٹوڈنٹس پر سیل فون رکھنے پر پابندی تھی مگر وہ عارب ہی کیا جو کسی

اصول کو مان جائے۔ اس وقت سیل فون کا ہونا اسے بہت بڑی نعمت لگا۔ وہ تیزی سے کوئی نمبر مارا ہاتھ۔ عارب اس کی طرف گھوما۔

”رات تایا سامیں کا فون آیا تھا۔ تائی اماں کو انہوں نے بتایا تھا آج وہ اسلام آباد جائیں گے اور ابھی پتا چلا ہے کہ کچھ دیر پہلے کراچی ٹو اسلام آباد پلین کر لیں ہو گیا ہے۔“

”اوہ مائی گاڈ!“ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

”کک کیا تایا سامیں اس فلائٹ میں تھے۔“ بولتے ہوئے لڑکھڑا گیا۔ عارب نفی میں سر ہلا رہا تھا۔ ”یہ ابھی صرف خدشہ ہے۔ مول کو فلائٹ نمبر یاد نہیں۔ تائی اماں کو معلوم ہے اور گھر کا نمبر مل نہیں رہا۔“

”تم پھر زانی کرو۔ فلائٹ نمبر پوچھو۔ رجب ملان کے دوست نیوز ایجنسی میں ہیں میں ان سے پوچھتا ہوں۔“ اللہ کرے تایا سامیں اس فلائٹ میں نہ ہوں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے۔ ”شاہ داد دل سے دعا گو ہوا۔ گو کہ وہ بھی ان سے نہیں مل پایا تھا۔ مگر عارب کی باتوں میں ان کا اتنا تذکرہ ہوتا تھا کہ وہ بھی انہیں تایا سامیں ہی کہنے لگا تھا۔

”اللہ کرے۔“ عارب اس کے الفاظ کی تائید کرتا۔ بے تابی سے دوبارہ نمبر مارا ہاتھ مگر کیا ہوتا ہے کہ بعض دعا میں اکثر کہیں راہ میں رہ جاتی ہیں دور آسمانوں کے درمیان معلق۔ سب دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ قدرت اپنا فیصلہ کر چکی ہوتی ہے۔ پھر وہ دعا شاید کسی اور وقت کے لیے اٹھا دی جاتی ہے۔ شاید اس وقت کے لیے جب ہم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ کوئی نیکی کام آگئی۔

عارب کی مخدوش حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ پورے چار دن سے اس کے ساتھ تھا۔ جو تھے دن وہ اک تابوت میں تایا سامیں کی سر پریدہ

کئی پھٹی کئی حصوں میں بی لاش ٹوٹی عینک اک مسخ شدہ بریف کیس لے کر ان کے آبیانی گونڈھ پہنچے تو۔

”الف! قیامت سی قیامت تھی۔ کرام کیا ہو گیا۔“ وسیع و عریض شاندار حویلی میں مل دھرنے کو جگہ نہ تھی ہر آنکھ اشکبار تھی۔ صرف عورتیں ہی نہیں شاہ داد نے دیکھا اپنے ہر دلچیز سامیں کی اس قدر اذیت ناک موت پر مود بھی دھاڑیں مار مار کے رو رہے تھے۔ علاقے کا بچہ بچہ حویلی والوں کے دکھ میں برابر کا شریک تھا۔

نماز جنازہ میں ہزاروں لوگ شامل ہوئے۔ انہیں آخری آرام گاہ تک پہنچانے والوں میں وہ بھی تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے مٹی ڈالی۔ عارب دل سے ممنون تھا۔ ہر لمحہ وہ اس کے ساتھ رہا تھا کاندھے سے کاندھا ملائے مضبوط سارے جیسا اور وہ خود جتنا تھک چکا تھا۔ اتنے ہی آرام کی ضرورت اسے بھی تھی۔ اسی لیے وہ اسے اوطاق یا حویلی کے مہمان خانے میں گھرانے کے بجائے سیدھا اپنے کمرے میں لے آیا تھا۔ عارب کے کپڑے لے کر وہ واش روم میں گھس گیا۔ دونوں ہی ایک بھرپور نیند کے طلبگار تھے۔ نہادھو کر کھانا کھاتے ہی جو بستر پر لیٹے تو کب آنکھ لگی مغرب ہی نہ ہوئی۔

جانے رات کا کون سا پھر تھا جب کہیں شور و غل مچ گیا۔ کچھ آوازیں تھیں کوئی چیخ رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ شاہ داد ہڑتا کر اٹھ بیٹھا۔ عارب بے خبر سو رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔ وہ اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ لپک کر اندر آنے والی عنایہ تھی۔ شدت گریہ سے سوچی آنکھیں، کھکھرے پال بنا دوپٹے کے وہ بے دھیانی میں اسے ہی عارب سمجھی۔ وہ اس کا سوٹ پہنے کھڑا تھا اور اس کے کمرے میں بھی۔ وہ جلدی جلدی بولے گئی۔ اس نے فوراً ”عارب کو جگا دیا۔“ عنایہ منہ پر ہاتھ رکھے کھڑی رہ گئی۔ کبھی اسے دیکھتی کبھی عارب کو۔

بچی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ وہ ذرا سی بھی دیر کیے بنا انہیں لیے شہر بھاگے۔

”بھئی کمال ہو گیا۔ جوانی ہم پر بھی آئی۔ دوستیاں ہم نے بھی پالیں مگر ایسے سودا کی نہ ہوئے۔ تم نے تو حد ہی کر دی۔“ تایا اس کا چلا گیا اور عم تم منار ہے ہو۔ کتنے دن ہو گئے کچھ اپنی پرہالی کی فکر بھی ہے کہ نہیں۔ کتنا نقصان ہو گیا ہو گا اتنے دنوں میں۔ اتنی مہنگی تعلیم تمہیں یونہی نہیں دلو رہا۔ میرے پلے کچھ نہ بھی ہو مگر کہیں سے بھی کر کے تمہاری بھاری فیسیں بھرنا ہوں۔ اس لیے نہیں کہ تم جوجی میں آئے کرتے پھو۔ تم سے باز پرس کا پورا حق رکھتا ہوں میں۔ کچھ خبر بھی ہے کتنے دنوں بعد گھر آئے ہو تم۔“ سر شام تلخے حلیمے میں بڑھی شیو پڑھ رہے چہرے ساتھ نڈھال سے وہ گھر میں داخل ہوا تھا کہ رجب ملانے آڑے ہاتھوں لے لیا۔ وہ چپ چاپ نے گیا۔ انہیں کوئی بھی وضاحت دینا بے کار تھا۔

”تو اور کیا۔ ہم جانے کیسے اپنے بچوں کے منہ سے نوالے چھین چھین کر تم پر پیسہ لگا رہے ہیں کہ چلو تمہارا مستقبل بہتر ہو جائے۔ ماں کا آسرا ہی بن جاؤ۔ مگر تمہیں تو کوئی فکر ہی نہیں۔ خواہ مخواہ کی یاریاں لگا رکھی ہیں۔“

نکمت مای مسالانہ چھڑکیں ایسا تو کبھی ہوا ہی نہ تھا۔ فرحین آوازیں سن کر ہر آئیں۔

”تم کب آئے؟“ ”ممتا بھری بے تابی سے چہرے کو چھوتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔ نہ گلہ نہ غصہ ماں تھیں ناں۔ اس کا گرد آلود چہرہ تمام کہانی سناتا رہا تھا۔ وہ اس سے اور کیا پوچھتیں۔

”ابھی۔“ شاہ داد نے یک لفظی جواب دیا۔

”تم نہالو۔ میں کھانا لے کر آتی ہوں۔“ وہ سر ہلا کر کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

”سنبھالو آیا اس لڑکے کو مجھے تو اس کی صحبت ٹھیک نہیں لگتی۔ کل کلاں کو تمہارے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔ اسے اپنی پرہالی کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ میری کسی بات کا کوئی جواب ہی نہیں اس کے

پاس میں۔ حد ہو گئی اتنی اڑے اس لڑکے میں۔ آخر ہے ناں ایک بد قماش باپ کا بیٹا۔ خون کا اثر تو آئے گا ہی۔

وہ جانے کس بات پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ فرحین نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ وہ آدمی دوسروں کی نظر میں چاہے کتنا بھی برا سہی مگر ایسا طعنہ کبھی بھی برداشت نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے کبھی اسے قصور وار جانا ہی نہیں تھا۔ ان کی بیرن تو ان کی تقدیر رہی تھی۔ سارے جرم تو نصیبوں کے نکلتے تھے پھر دفعہ اس پر کیوں لگتی تھی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ کبھی کسی کو سمجھا نہیں سکتی تھیں۔ وہ خاموشی سے پن کی جانب چل دیں۔

”یہ لیں۔ آپ یونہی اپنا خون جلاتے رہتے ہیں۔ ان ماں بیٹے پر تو کوئی اثر ہی نہیں۔ اگلے کو پاگل ہی سمجھتے ہیں اللہ جانے کس مٹی سے بنے ہیں۔“ فرحین نے سب سنا اور چولہے کی آج تیز کر دی۔ ایسی ہی آج ان کے دل کو بھی گھیر رہی تھی۔ چپکے سے دو آنسو دوپٹے میں جذب ہو گئے۔

ججی کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ وہ ہوش میں تو تھیں مگر بے ہوشوں جیسی۔ چند دنوں میں ہی ان کا چہرہ برسوں کا بیمار دیکھنے لگا تھا۔

بے حد لاڈلے اور پیارے بیٹے کی اچانک موت نے انہیں آؤہ مار دیا تھا۔ ان کا زخم خورہ دل اس بوجھ تلے بمشکل سانس لے رہا تھا ان کی حالت کے پیش نظر عارب نے گوٹھ سے مول اور عنایہ کو بلوایا۔ وہ دونوں بڑی پوتیاں ججی کی لاڈلی اور ان سے زیادہ قریب تھیں اس وقت انہیں بے حد دلجوئی کی ضرورت تھی۔ اتنے دنوں سے اسپتال میں عارب ہی تھا ان کے آنے سے کچھ بے فکری ہوئی تو اپنی شدید تھکن کا احساس بھی جاگا۔ مسلسل بیداری اور پریشانی سے آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے گھر جانے کے لیے نکلا تھا کہ

سامنے سے آتے شاہ داد کو دیکھ کر رگ گیا۔

”ججی کیسی ہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”پہلے سے بہتر ہیں۔“ اس نے دیکھا۔ شاہ داد کے عقب میں سیاہ چادر سے یقیناً فرحین تھیں اور وہ جاتے تھا وہ گھر سے بہت کم نکلتی ہیں۔ اب اگر وہ ان کا دیکھ پانٹنے آئی تھیں تو بڑی بات تھی۔ اس نے دوبارہ کمرے کا رخ کیا۔

فرحین نے دونوں کو گلے لگا کر ہار کیا۔

”ججی اویکی ہیں تو آپ سے ملنے کون آیا ہے۔“ یونہی گم صم لٹی تھیں۔ عارب کے بکار نے پر آنکھیں وائیں۔ تب تک فرحین بھی انہیں دیکھ چکی تھیں اور خدا۔

گویا ساتوں آسمان گھوم گئے۔ زمین واقعی گول ہے اور کبھی تو اتنی چھوٹی ہو جاتی ہے کہ فقط ایک نقطے میں سما جائے۔ یہاں آتے ہوئے ان کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ جن کی عبادت کے لیے جا رہی ہیں وہ ہستی کون ہو گی۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے کو تھیں۔ اگر شاہ داد بروقت انہیں تھام نہ لیتا۔ ان سے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا محال ہو گیا۔

”فرحین۔“ ججی کے ہونٹوں نے بے کوا ز جنبش کی۔

بے اختیار انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ عارب نے لپک کر سہارا دیا۔ ان کا ناتواں جسم رعشہ زدہ تھا وہ ایک ٹک دیکھے جا رہی تھیں۔ اس کے پیچھے ہی وہ کھڑا تھا۔ وہی شد رنگ بال، چوڑی پیشانی، فکری ہی دل موہ لینے والی آنکھیں، وہی پر غور کھڑی ناک ویسے ہی کٹاؤ والے ہونٹ۔ وہ بے قراری سے پکاریں۔

”کرم داد۔ کرم داد امیرے بچے میرے شہزادے“ ادھر او میرے پاس۔“

”کیا ہو گیا ہے ججی! ہوش کریں۔ یہ میرا دوست ہے شاہو۔“ عارب کو ان کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔ مول اور عنایہ بھی پریشان سی دیکھ رہی تھیں۔

”نہیں، نہیں یہ کرم داد ہے۔ دیکھو اسے پہچانو۔ غور سے دیکھو۔ یہ تو بنایا میرا کرم داد ہے۔ اس کی

تصویر۔ اس کا بیٹا۔ ان کے کیے گئے انکشاف نے جہاں ان تینوں کو کنگ کر دیا وہیں شاہ داد کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ وہ تو جیسے زلزلے کے جھٹکوں میں تھا۔

”فرحین۔“ فرحین اندکھو میرا بیٹا چلا گیا۔ اسے اپنے بیٹے کو دیکھنے کی بڑی آس تھی۔ اسے ایک نظر دیکھنے کو ترستا چلا گیا۔ وہ کسی سے اپنا دکھ نہیں کہتا تھا مگر میں جانتی ہوں اسے دھچوڑے نے اندر ہی اندر مار دیا تھا۔ ہم نے تمہارا دل دکھایا۔ بڑی سزا کالی ہے ہم نے۔ میری زیب کئی سالوں سے بھگت رہی ہے۔ فرحین! ہمیں معاف کرو۔ میری بیٹی کو معاف کرو۔ میرے کرم داد کو معاف کرو۔ ہمیں معاف کرو۔“ وہ ہاتھ جوڑے زار و قطار رو رہی تھیں۔

”سب نے اپنے اپنے جرم کی سزا پالی۔ مجھے کس جرم کی سزا ملی؟ خسارہ غس کے حصے میں زیادہ آیا۔ فیصلہ کون کرے گا؟“ حلق سے نکلتی چیخوں کو منہ پر ہاتھ رکھے روکتی فرحین تیزی سے کمرے سے نکل گئیں۔ شاہ داد میں ملنے کی سکت نہ تھی۔ ججی ہوش و خرد سے بے گانہ عارب کے بازوؤں میں جھول گئیں۔

وہ اماں بابا کی بڑی نازوں پلی بیٹی تھیں۔ قدرت نے فیاضی سے حسن عطا کیا تھا۔ خاندان بھر میں کئی طلبہ گار ہو گئے۔

”ہونہ۔! یہ خاندان والے فطرت سارے کے سارے۔ چند ہزار کی نوکریاں کرنے والے۔ میں تو اپنی بیٹی کو بہت اونچے گھرانے میں بیاہوں گی۔“ اماں ہر رشتے سے انکار کر دیتی تھیں۔ ساتھ یہ اعلان بھی۔

بابا بے چارے سدا کے سیدھے سادے شروع سے ہی اماں کی ذہانت اور ان کے فیصلوں پر لبیک کہتے آئے تھے۔ اب بھی ان کے ہمنوا تھے۔ حالانکہ ان کا خاندان اب ایسا بھی فقتانہ تھا۔

اور آخر کار اماں کی دعائیں رنگ لائی تھیں۔ ایک

دو چوہن کے توسط سے جاگیر دار گھرانے سے رشتہ آیا تھا۔ بیگم رحیم داد بھی ان کی طرح اپنے خاندان سے آگاہی ہوئی خاتون تھیں۔ جبکہ انہیں خاندان کے کئی لوگ اپنی بیٹی دینے کو تیار تھے۔ وہ ایک بہت سمجھ دار اور دور اندیش خاتون تھیں۔ ان کے اپنے کچھ تحفظات تھے۔ کرم داد پانچ بیٹیوں کے بعد بے تحاشا منتوں مرادوں سے پیدا ہونے والا وہ لاڈلا بیٹا تھا جس سے انہیں عام ماؤں کی طرح صرف پیار نہیں بلکہ عشق کی حدود کو چھوٹی محبت تھی۔ یہی وہ محبت تھی جس نے انہیں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے پر مجبور کیا اور وہ من پسند بہو کی تلاش میں جوتیاں چٹخانے لگیں۔

ان کی ڈیڈ اینڈ مل کلاس گھرانے کی ایک سیدھی سادہ لڑکی تھی فرحین کی صورت میں وہ لڑکی انہیں با آسانی مل گئی تھی۔ البتہ اس کی بے تحاشا خوب صورتی اس کا پس پوائنٹ تھی۔ بس پھر انہوں نے کچھ نہ سوچا، پہلے ہی پھیرے میں رشتہ بکا کر آئیں۔ اماں بیٹی کی بلا میں لیتے نہ تھک رہی تھیں۔

تین ماہ کی منتگنی کے بعد شادی ہوئی تھی اور تین مہینوں میں اس نے کرم داد کو اتنا سوچا تھا کہ آنکھیں بند کر کے بھی اسے پہچان سکتی تھی اور کاش کہ آنکھیں بند ہی رہتیں کیونکہ کھلی آنکھوں سے پھر جو منظر نظر آئے وہ بے حد اذیت رساں تھے۔

اس کے نصیب اونی و شاندار حویلی میں لکھے گئے تھے۔

اس کی خوش نصیبی پر کسی کو شک نہ رہا تھا۔ وہ بھی ہزار ہا خوش گمانیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی مگر۔ پہلی ہی رات اس کے سپنوں کے سنہرے کالج سے محل کو پہلی تھیں لگی جب۔

اس پر بہت روپ آیا تھا۔ دیکھنے والی ہر آنکھ نے اسے بتایا تھا لیکن وہ صرف اس آنکھ میں اپنا عکس دیکھنے کی خواہاں تھی جس کے لیے اسے پور پور سجایا گیا تھا۔ وہ ارمانوں بھری دلہن تھی۔ ڈھیروں آرزو میں تھیں۔ صحن دل میں غل چاٹی دھڑکنوں کا اتنا شور تھا کہ

اور کوئی آواز سنائی نہ پڑی تھی۔ وہ جیتی سا زو سامان سے سج کرے میں تنہا تھی۔

اس کے پر شوق جذبے۔ وہ سراپا انتظار تھی۔ بلکہ بھی نہ جھپکی اور پھر یہ انتظار طویل ہو کر سپیدی تنگ پھیل گیا۔ بیٹھے بیٹھے کرا کر گئی تھی۔ جب دروازے پر کھٹکا ہوا وہ فوراً "سنجھلی" کھلے دروازے سے چار ہاتھوں نے ایک لڑکھڑاتے وجود کو اندر دھکیلا تھا اور ٹھا سے دروازہ بند۔

وہ حیران سی منہ اٹھائے دیکھ رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر ٹکرایا لڑکھڑایا ڈنگایا اور آخر کار بیڈ تک پہنچ کر اس کے پاس ڈھیر ہو گیا۔

وہ دراز قامت انتہائی شفاف رنگت، قیمتی سوٹ میں ملبوس شہزادوں کی سی آن بان والا بے حد خوب صورت مرد اور اس کی یہ حالت۔ اس کی حیرانی حد درجے کی پریشانی میں ڈھل گئی۔ اس سے چند انچ کے فاصلے پر پڑے مدہوش وجود میں جنبش ہوئی۔ اس حالت میں بھی وہ اپنے قریب بڑی سرخ گھڑی سے غافل نہ تھا۔ یہ رنگوں بھری پوٹلی صرف اس کی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف کھینچ چکا تھا اور اس کے منہ سے آتی وہ غلیظ بو۔ فرحین کا تنہاؤں بھر دل نوج کر کسی نے تیزاب کی منہ بند بوتل میں ڈال دیا۔ اتنی جلن اتنی آنت کہ وہ اک پل میں بے حال ہو گئی۔ نہ میٹھی نظریں نہ اس کے سجے سنورے روپ کی مدح سرائی۔ بس اک جنون بھرا استحقاق۔ پہلی رات اور ایسا سواگت۔ کیا واقعی وہ خوش نصیب تھی؟

ایک وقت تھار حیم داد نظامانی کی حکومت تھی۔ وہ اپنی جاگیر کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ایک خالص وڈیرے والی تمام خصوصیات تھیں ان میں بڑا جاہ و جلال تھا کس کی مجال کہ اس کے آگے بر بھی مار سکے۔ جیسی جیسی خاتون کی کسی ہمت نہ پڑی تھی کہ چوں بھی کر سکیں۔ پھر یکے بعد دیگرے بیٹیوں کی پیدائش نے انہیں اپنے ہی گھر میں کمزور کر ڈالا تھا۔ سسرال اور

شوہر کے آگے سر جھکا کر رہتیں۔ دل میں حسرت ہی رہتی کہ اپنی مرضی سے سانس لے سکیں۔ حسرتیں ناسور بننے لگیں۔ قدرت نے ترس کھایا کرم دادوان کی گود میں آگیا۔ پھر دادو۔ یوں وہ سر اٹھانے جوگی ہوئیں۔ مگر جو کچھ مسہد، چکی تھیں وہ بھلائے نہ بھولتا۔

بیٹیوں پر انہوں نے تمام توجہ اور محبت بچھا کر دی۔ کوئی خواہش نا تمام نہ رہنے دی جاتی۔ جو کہتے لمحے کے ہزارویں حصے میں پورا کیا جاتا۔ ہر نعمت ہر آسائش۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ باپ کا روتو بننے لگے۔

کرم دادو تو بچپن سے ہی حویلی کے تمام ملازموں پر یوں رعب ڈالتا گویا وہ سب زر خرید غلام ہوں۔ ذرا کسی بات پر موڈ بگڑتا تو اگلے کو اٹھا کر حویلی سے باہر پھینکنے سے بھی دریغ نہ کرتا پانچوں بڑی بہنوں پر بھی وہ حکم چلاتا۔ وہ بس اک جینجی تھیں جن کی وہ عزت کر لیتا۔ ماں کا ہر لفظ حرف آخر کا درجہ رکھتا تھا آخر کو ان کی مظلومیت کے قصے اپنی پیدائش کے دن سے سن رہا تھا۔

قدرت کی کرنی چند سال پہلے فالج کے شدید حملے نے رحیم داد نظامانی کو معذور و مجبور کر کے ان کے رحم و کرم پر ڈال دیا۔ جینجی تو پہلے ہی ظلم سے سہ کر پھریل ہو چکی تھیں۔ اب دو جوان بازوان کے ساتھ تھے۔ باقی کی کیا پروا، کرم دادو کو تو یوں بھی باپ سے کوئی خاص الفت نہ تھی۔ اب کسی کا دل چاہتا تو ان کا حال احوال لے لیتا مگر نہ انہیں سنبھالنے کے لیے حویلی کے پرانے خادم بچل چاچا تو تھے ہی۔ اتنی بڑے جاگیر اور حویلی کے سب انتظام آپ و آپ کرم دادو کی ذمہ داری بن گئے۔ مگر درون خانہ جینجی کی نا تمام خواہشیں مکمل ہونے لگیں۔ سب معاملات ان کی مرضی و منشا سے طے ہوتے۔ کرم دادو کے سر پر ایسا کوئی بوجھ نہ تھا۔ ہاں سب سنبھالنے کے لیے۔ اسے بے فکری ہی بے فکری تھی اور یہی بے فکری رنگ لانے لگی۔ باپ معذور ماں محبت میں ڈوبی۔ آئے دن اوطاق میں محفلیں سجنے لگیں۔ دوست آتے کھاتے پیتے مہین

اڑاتے۔

آپا سب سے بڑی تھیں اور دوسری بہنوں کی طرح کرم دادو کے رعب میں بھی نہ تھیں۔ آتے جاتے اٹھتے بیٹھتے اس کے کانوں میں اندھلتی رہتیں۔ سبھاگی سے شادی کر لو بڑے فائدے میں رہو گے اچھی لڑکی ہے پھر اتنی بنیاں (زمینیں) ہیں اس کے نام۔ بڑا کچھ لے کر آئے گی حویلی بھر جائے گی۔

اتنی تفصیل سن کر کرم دادو کا بھی اک دن دل للچا گیا۔ بولنے سے قد گندی رنگت، چھوٹی آنکھوں اور چھوٹی ناک کے ساتھ وہ کوئی اتنی بری بھی نہ لگتی تھیں۔ ہمیشہ بڑے اچھے طریقے سے ملتی تھیں۔ آپا کے ہی بے پناہ اصرار پر وہ اک دن جینجی سے بات کر بیٹھا۔

"چریا ہو گیا ہے کیا؟" انہوں نے اس کی پوری بات بھی نہ سنی ڈپٹ کر بولیں۔

"زیب انسا کا تو دل داغ چل گیا ہے۔ چری ہو گئی ہے بالکل وہ تیرے نہیں اپنے فائدے کا سوچ رہی ہے۔ تو کس لالچ میں آ رہا ہے۔ اللہ سائیں کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ مرد مجبور ہو جائے تو مجھو نامرد برابر ہو جاتا ہے۔ وٹے کی شادی گلے کا پھندا بن جاتی ہے زیب انسا کے اولاد نہیں ہے۔ اس جھلی کو ڈر ہے احمد سراج اس پر سوتن نہ لے آئے۔ سبھاگی کو تیرے پتے باندھ کہ وہ اپنا کلا مضبوط رکھنا چاہتی ہے۔ ارے احمد اسے اولاد نہیں دے سکا۔ سبھاگی اسی کی بہن ہے کل کلاں کو وہ بھی اولاد پیدا نہ کر سکی تو پھر ہم تو پھنس گئے ناں۔ نہ تو اسے چھوڑ سکے نہ دوسری شادی کر سکے۔ آنکھوں دیکھی کبھی نگل لوں۔ میں سنبھائی نہیں ابھی۔ تو دیکھتا رہ میں تیرے لیے پڑھی لکھی کیسی خوب صورت کنوار لے کے آتی ہوں۔ سارا زمانہ دیکھے گا۔" اور انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا مگر ساتھ ہی اس سے بھی اک وعدہ لیا۔

"دیکھ کرم دادو! میں نے اپنی بات پوری کی۔ اب یہ نہ ہو کہ تجھے اب صرف گھر والی ہی نظر آئے۔ جانتا ہے ناں تیری ماں نے کیسی زندگی گزاری ہے۔ تیرے باپ کا کیسا رویہ تھا میرے ساتھ۔ اپنی بات کا وزن

برہانے کو آنسو بھی نکال لیے "اور دیکھ لے میں نے پھر بھی نبھائی ہے کبھی جو کوئی شکوہ کیا ہو۔ اچھی عورتوں کے یہی گن ہوتے ہیں۔ جوتے کھا کر بھی کبھی اف نہ کریں اور جب اوپر والے نے ہی عورت کو مرد کے ماتحت پیدا کیا ہے تو وہ اس کی برابری کیسے کرے میری بات یاد رکھنا اپنی زال کو سرنہ چڑھانا اسے اسی جگہ رکھنا جس کے لائق وہ ہے مرد مرد ہی اچھا لگتا ہے۔"

اسے اپنے پرہانے گئے تمام اسباق اچھی طرح ازیر تھے۔

فرحین کو نہیں یاد پڑتا کبھی کرم دادو نے اس سے ہنس کر بات کی ہو۔ کبھی نظر بھر کر دیکھا ہو۔ کاش کبھی وہ اس کی آنکھوں میں جھانک لیتا تو اس کے دل میں چھپے بے تحاشا محبتوں کے خزانے کا راستہ پالیتا۔

اور وہ بے چاری عورت۔ وفا اور چاہتوں کی ماری اس کے آگے بچھ بچھ جاتی۔ بھاگ بھاگ کر اس کی خدمت کرتی۔ جہاں وہ پاؤں رکھتا تھیلیاں بچھا دیتی۔ جیکے جیکے اپنے ہی مال کو چوروں کی طرح دیکھا کرتی کہ اگر کبھی دن کے اجالے میں کرم دادو حویلی میں ہوتا تو اسے اس کے قریب بھی نہ پھینکنے دیا جاتا۔

جینجی خود کیا کم تھیں کہ آئے دن ایک آدھ منہ بھی آتی رہتی۔ آنے بمانے اسے گھر کے مختلف کاموں میں مصروف رکھتیں اور فرحین بے چاری کی مجال کہ انکار کر جائے۔ یوں اس کا دن بچن کی نذر ہو جاتا۔ رات کو تھکن سے بے حال وہ کرم دادو کو بڑی لگتی۔ وہ بیٹے کا عادی تھا اور جب اپنے حواسوں میں نہ ہوتا تو انتہائی بے رحم ہو جاتا اور فرحین کو اسے جھیلنا محال۔ ایک بار ہمت کر کے اسے گناہ و ثواب بتانے کی غلطی کر ڈالی اور بس طوفان آگیا۔

لحوں میں وہ دو ٹکے کی ہو کر رہ گئی اور اسی پر بس نہیں۔ کرم دادو نے سزا برہادی اوطاق پھر سے آباد ہونے لگی۔

رات کے شرے سنائے میں گھنگھروں کی کھٹک وہاں تک آتی۔

"اے ہائے تجھ سے اب تک اپنا شوہر ہی قابو

نہیں ہو سکا۔ مرد تو اڑیل گھوڑا ہوتا ہے اسے سدھانا پڑتا ہے پیار سے محبت سے۔ تم کیسی زال ہو اس کی بری عادتیں ہی نہیں چھڑا سکیں؟

تپا زب آئیں تو انہوں نے اس کے زخموں پر خوب خوب نمک پاشی کی۔

جیجی بھی بڑے اطمینان سے سارا الزام اس کے سر تھوپ دیتیں۔ اگر وہ کچھ کہتی اپنی صفائی میں تو وہ آگے ایک کی چار لگا کر کرم داد کو بتاتیں۔

اس کی حالت کچھ دنوں سے خراب تھی۔ جیجی کو بیٹیوں کے چاؤ چوچلوں سے ہی فرصت نہ ملتی تھی اس کی بدلی رنگت کیا خاک پھیانتی۔

اسی دوران چاول کی گھل کی کٹائی مکمل ہو گئی۔ اسے سکھانا چھٹانا پھر سنبھالنا بڑا محنت طلب کام ہوتا تھا۔ جسے جیجی گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر کیا کرتی تھیں۔ اس باریہ ذمہ داری اس کے سر ڈالی گئی۔

حویلی کی بڑی ساری چھت پر صبح سویرے کپڑے بچھا کر ان پر بوریاں الٹ دی جاتیں۔ شام ڈھلنے سے پہلے انہیں سمیٹنا۔ اچھے بھلے آدمی کی کمر تختہ ہو جائے وہ تو پھر دوسرے حال سے تھی۔ اماں نصیبین اس سے صرف نگرانی کرواتیں۔ اسے کرسی بچھا کر دے دیتیں۔ سربا کی نرم گرم دھوپ۔ اس روز بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی۔ شامت اعمال جیجی اور تپا زب التسلو ہر آنکلیں اور یوں دن دھاڑے کی عورتوں کے سامنے اسے سوتے دیکھ کر انہوں نے وہ لیتے لیے کہ خدا کی پناہ۔ کام چور ہڈ حرام لا پروا جانے کیا کیا خطابات سے نوازا۔ اماں نصیبین بے چاری وضاحتیں دیتی رہیں اور آخر کار انہیں بتانا ہی پڑا اور وہ اچھل پڑیں۔

”واہ اتنی بڑی اور اہم خبر تم سے چھپائی تم نے اور دو نکلے کی ملازمہ کو بتادیا۔ ہم اس قابل بھی نہیں دیکھو اس لڑکی کی جرات۔“ وہ سینہ کوئی کرتیں نیچے اتریں۔ کرم داد ابھی حویلی سے ہی تھا۔ جیجی اور آپا نے رو رو کر تماشا لگایا۔

پھر کرم داد نے اسے خوب ذلیل کیا اور وہ جو سوچتی

تھی کہ جب کرم داد کو یہ خبر ملے گی تو کتنا خوش ہو گا۔ وہ نہ ہو سکا۔ اس کی زندگی کی دوسری بڑی خوشی بھی اس کی توقع کے خلاف ہی ہوئی۔

”بیٹیاں بہت ہمارے خاندان میں حویلی کو وارث چاہیے۔“ اٹھتے بیٹھتے اب جیجی کا ایک ہی لہجہ ہوتا۔ انہوں نے کرم داد کو بھی خوب سبق پڑھا دیا وہ بھی اکثر ماں کی زبان بول دیتا کہ اس کے رویے میں وہ پہلی سی سختی نہ ہونی تھی۔ اپنے بچے کی وجہ سے ہی سہی وہ کچھ تو اس سے نرمی پر تنے پر آمادہ ہوا۔ فرحین کے لیے یہی بہت بڑی خوشی تھی۔

نوامہ اس نے آس و زاس کی سولی پر بیٹھے گزارے اور جب ننھا منا پیار سا گول گوتھنا سا بچہ گود میں آیا تو اسے لگا تھا کہ کسی طول قید سے رہائی مل گئی ہو۔ سات روز تک حویلی میں جشن کا سماں رہا۔ خوب جی کھول کر صدقہ خیرات کیا گیا۔ کرم داد بے انتہا مسرور تھانے بچے کا نام اس نے ہی شاہ داد تجویز کیا تھا۔ بیٹے کی محبت میں کھو کر وہ اپنے دیرینہ مشغلے بھولا ہوا تھا۔ حویلی سے باہر کاراستہ تو جیسے اسے یاد ہی نہ تھا۔

شاہ داد دو ماہ کا ہو چکا تھا۔ سب کا لاڈلا سب کا راج دلار۔ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک۔ جیجی کو بھی اپنے پوتے سے بے پناہ پیار تھا۔ سارا دن وہ انہی کے کمرے میں ہوتا۔ بس صرف دودھ پینے کے لیے اس کے پاس آتا۔ ان کا پوتے سے یہ پیار بھی اسے اذیت دینے کا ایک انداز تھا۔ اسے تو یہی لگتا کہ سارا دن بچے کے لیے ترستی۔ ہاں رات کو وہ اس کے بغیر نہیں سو سکتی تھی۔ نہ ہی کرم داد کو نیند آتی۔ وہ کرم داد جس کا ذرا سی بات پر مزاج برہم ہو جاتا تھا اب چاہے بیٹا ساری رات شور مچے رکھتا وہ ذرا ماتھے پر ہل نہ لاتا۔ بچے کا رونا مسکرانا ہاتھ پاؤں ہلانا قلقاریاں مارنا اک اک ادا پر غار ہوتا۔ دن میں تو اسے باہر کے کاموں سے فرصت نہ ہوتی۔ رات کو سارا وقت بیٹے کے ساتھ گزرتا۔ ان لمحوں میں فرحین کو لگتا صحرا کا سفر گزرتا گیا ہے اب ہر

طرف خلستان ہی خلستان ہے۔

اس روز کرم داد صبح سویرے گایا شام ڈھلے حویلی آیا تھا اور آتے ہی بیٹے کو دیکھنے کی فرمائش کی تھی جو حسب معمول جیجی کے پاس تھا۔

فرحین ان کے کمرے میں گئی تو وہ تپا زب التسلو کے ساتھ باتوں میں مشغول تھیں۔ شاہ داد کو گھنٹہ بھر پہلے انہوں نے ہنگھوڑے میں لٹایا تھا۔ فرحین نے جب اسے اٹھایا تو احساس ہوا کہ اسے تو بخار ہے۔ وہ بے اختیار گھبرائی۔

”ارے خیر سے کچھ نہیں ہوا۔ بچے بیمار بھی ہو جاتے ہیں۔ تم تو خامخواہ پریشان ہوئے جا رہی ہو۔ لے جاؤ اسے اپنے کمرے میں۔ آج تو بہت ہی تنگ کیا ہے اس نے۔“ انہوں نے ہاتھ لگانا بھی گوارا نہ کیا۔ زب انسا بھی گپ چپ سی بغور اسے دیکھتی اسی فرحین کو کبھی کبھی ان کی نظروں سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ وہ سخت پریشان سی کمرے سے نکل گئی۔ آپا کی حسرت بھری نظریں پیچھے لگ گئیں۔

فرحین بہت تیزی سے کمرے میں آئی تھی۔ کف کے بن بند کرتے کرم داد نے اسے آتے دیکھا تو بے تاب سے بیٹے کو لینے کے لیے بڑھا۔

”سامیں دیکھیں اسے کتنا بخار ہے۔“ فرحین نے بچے کو اس کے ہاتھوں میں دیتے نہایت پریشانی سے بتایا۔ کرم داد نے بیٹے کے ماتھے پر ہونٹ رکھے تو اسے بھی اندازہ ہوا۔

”کیسے ہوا اسے بخار۔ اتنا سا بچہ تم سے سنبھالا نہیں جاتا۔ کتنی دفعہ کہا ہے لغت بھی جو سب کاموں پر بس اس کا خیال کرو۔“ وہ التسلو پر چڑھ دوڑا۔

”مم مجھے کیا پتا صبح سے جیجی کے پاس تھا۔“ وہ رو دینے کو تھی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے کیا میری ماں نے اسے کچھ کھلا پلا دیا۔“ وہ مزید سخت ہوا۔

”نہیں سامیں! میرا یہ مطلب نہیں میں تو۔“ ایک تو بچہ کو بخار اس پر کرم داد کا غصہ۔ وہ بے اختیار رو پڑی۔

”اچھا اب زیادہ ڈراما مت کرو میرے سامنے اور کان کھول کر سن لو۔ اسے ایک مٹک کے لیے بھی اکیلا مت چھوڑنا میں ڈاکٹر سے دوائے کرم داد کے ہاتھ بھیج دیتا ہوں۔“ شاہ داد کو اسے پکڑاتے وہ ڈرنگ میل کی طرف گیا اور برش اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگا۔ فرحین نے اب غور کیا وہ نمایاں دھویا نئے غور کپڑے پہنے تیار ہوا کھڑا تھا۔

”لگ کماں جا رہے ہیں آپ؟“ وہ پوچھے بتانہ نہ سکی۔

”اوطاق پر عشر سے کچھ دوست آئے ہیں۔“ وہ پرفیوم اٹھا کر خود پر اسپرے کرنے لگا۔ کتنی دیر وہ لگ سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر مت بیکجا کی۔

”شاہ داد کی طبیعت خراب ہے۔ میرا دل گھبرا رہا ہے آپ نہ جاتیں۔“

آجائوں گا ایک ڈیڑھ گھنٹے میں تم اسے لٹاؤ اور ہاں جا کر دیکھو ذرا اماں نصیبین نے اوطاق پر کھانا بھجوا دیا ہے کہ نہیں اور تم نے کھانا کھایا؟“ اسے خیال آیا تھا۔ فرحین کو اب کسی بات کا ہوش نہ تھا بس ایک ہی فکر ایک ہی خیال کہ وہ نہیں نہ جائے۔ پہلی بار پیش قدمی کرتے ہوئے تمام حیا بلائے طاق رکھتی وہ اس کے چوڑے سینے سے جا لگی۔

”سامیں! اللہ کے واسطے! آج میری بات مان لیں مجھے بہت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ ڈر لگ رہا ہے۔“

”یہ کیا پاگل پن ہے۔“ کرم داد نے اک جھٹکے سے خود سے علیحدہ کیا۔ مگر جب نگاہ بھیکے گلابی چہرے اور جل تھل آنکھوں پر بڑی توجہ آپا آپا موم ہو گیا۔

”پگلی۔“ اک نرم سی مسکان اس کے ہونٹوں کو چھو گئی۔

”تم تو بہت ڈر پوک ہو۔ میں تو سمجھتا رہا میری بیوی بہت بہادر ہے۔ پر تم نے تو آج میرے خیال کو جھٹلادیا۔ فکر نہ کرو میں دوا بھیج دیتا ہوں ایک آدھ گھنٹے میں بخار اتر جائے گا تم کھانا بھی کھا لیتا۔“ کرم داد اسے بازو کے گھیرے میں لیے بیڈ تک لے آیا۔ اسے بٹھا کر بچے کو پیار کیا۔ وہ ابھی اس کے نرم لہجے پر ہی حیران سی

دیکھ رہی تھی کہ کرم داد نے اس کی پیشانی بھی چوم لی۔
انس۔ وہ جیسے کسی ٹھنڈے چٹنے میں نہائی۔ وہ تو
اس کا خصوصی انتفاع ہی خاص خزانے کی طرح دامن
میں سمیٹا کر لی تھی۔ یہ آج کیا ہوا تھا۔ عمومی طور پر
ایسی عنایت؟

وہ پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔
یکدم وہ پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ اسی لمحے کے
حصار میں تھی۔ فرط مسرت سے اس نے بچے کو ہی
ہینے میں بچھ لیا۔ جو اتنی شدت پر پہنچ کر رو پڑا۔ وہ
ہستی چلی گئی۔ وہ کہاں گیا ہے یہ فکر بھی نہ رہی اور بچے
کو جھلاتے جھلاتے جانے کب وہ بھی نیند کی دوا دی میں
اتر گئی۔

اک انگارہ سا پہلو کو چھو گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر جاگی۔ شاہ
داد کسمسا تا ہوا ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ گھائی چہرہ انتہائی
سرخ اس نے بے اختیار پیشانی پر ہاتھ رکھا۔
”یا اللہ۔“ گویا جلتے تو بے پناہ تڑ گیا۔ وہ جھٹکے سے
اٹھی۔ اماں نصیبین کو جگایا۔

”اماں! دیکھیں کیسے بخار میں تپ رہا ہے۔ سائیں
نہیں آئے ابھی تک۔ سو تو کہہ رہے تھے ایک ڈیڑھ
گھنٹے میں آجائیں گے اور نہ دوا بھجوائی انہوں نے۔“
ہمارے پریشانی کے رہا ہوا ہو گئی۔

”اللہ سائیں سے خیر مانگ۔ وہ سب ٹھیک کرے گا
میں جا کر مراد سے پوچھتی ہوں۔“
وہ باہر کو لپکیں۔ کچھ دیر بعد باپتی کانپتی واپس
آئیں۔

”مراد کہتا ہے ڈاکٹرز اسے کو اگلے گھنٹے کوٹھ گیا ہوا تھا دوا
نہیں ملی۔ وہ پوچھ رہا ہے اگر خدا نخواستہ زیادہ پریشانی کی
بات ہے تو ڈاکٹر کو ادھر لے آئے۔“

”ہاں ہاں۔ اسے کیس جلدی سے ڈاکٹر کو بلا لائے
۔ اسے اب صرف اپنے بچے کی فکر تھی۔“

آپا زب انسا انسو مینیا کا شکار تھیں اکثر راتوں کو
اٹھ اٹھ کر غملا کرتیں۔ اب ان کی نیند روٹھی ہوئی
تھی۔ کمرے میں دل گھبراہوا چھت پر جانے کے
ارادے سے نکلی تھیں کہ رات کے اس پہر خاموش

حویلی میں انہوں نے اک اجنبی کو آتے دیکھا۔ بچے
مراد تھا جس کے ہاتھ میں تھمے چھوٹے سے بیگ کو دیکھ
کر وہ سمجھ گئیں کہ آنے والا کون ہے۔ پھر انہیں یہ
بھی یاد آ گیا کہ کل شام فرحین بچے کو لینے آئی تو اسے
بخار تھا۔

شوئی قسمت کہ اسی وقت کرم داد کی جیب بھی
حویلی کے داخلی گیٹ سے اندر آئی۔ انہوں نے ہارن
سن لیا اور بس جھٹ پٹ ان کے شاعرانہ ذہن نے ایک
پلان ترتیب دے ڈالا۔

اماں نصیبین کو انہوں نے کچن میں جاتے دیکھا
تھا۔ مراد بھی واپس جا چکا تھا اور اندر آ کر کرم داد حسب
سابق نشے میں جھومتا جھامتا بمشکل خود کو سنبھالے
چل رہا تھا۔ زب انسا کی چیخوں نے حویلی کے دروازے پر
ہلا ڈالا۔

”ہم لٹ گئے۔ بریاد ہو گئے۔ ارے یہ دن دیکھنے
سے پہلے مر کیوں نہ گئی میں۔ آنکھیں کیوں نہ اندھی
ہو گئیں میری۔ ہائے! ہمارے رکھوں کی اونچی ٹیگ دل
گئی“ ہائے۔ حویلی کے ماتھے پر کالک مل دی اس
ڈائن نے۔ ارے اتنی بے غیرتی۔ ایسی ذلالت۔ دیکھ
کرم داد! تیرے پیچھے کیا رنگ رلیاں مناتی ہے تیری
زال۔“ وہ سر پٹتی اس تک پہنچیں۔

”ہائے! ہائے! سائیں! کچھ تو خدا کا خوف کرو۔“
اماں نصیبین کے ہاتھوں سے ٹھنڈے پانی کا پیالہ گر کر
چھٹکا چور ہو گیا۔

”چپ کر بڑھیا! ملی ہوئی ہے اس کے ساتھ تو ہی
ہے ہماری دشمن۔“ وہ چیل کی طرح چپٹیں اور انہیں
دھکیل کر کچن میں بند کر دیا۔ وہ دروازہ پینے لگیں۔ مراد
بھی بھاگا آیا تھا۔ فرحین حواس باختہ سی باہر آئی اور
پچھے ہی وہ ڈاکٹر اور بس۔ جو منظر وہ بھائی کو دکھانا چاہ رہی
تھیں وہ اس نے دیکھ لیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر جلتی پر تیل
ڈال رہی تھیں۔ مراد نے گواہی دینا چاہی۔ انہوں نے
اسے بھی مار مار کر بھگا دیا۔ کرم داد پھرے شیر کی طرح
ڈاکٹر پر جھپٹا مگر وہ باہوش نوجوان تھا۔ جلد ہی اسے پچھاڑ
کر حویلی سے نکل گیا۔ آپا زب انسا کو یقین تھا وہ سویر

ہوتے ہی گاؤں سے بھی نکل جائے گا اور پیچھے تمام
غائب سننے کو فرحین بچی تھی جسے کرم داد نے لائوں اور
گھونٹوں پر رکھ لیا۔ وہ لاکھ چینی چلائی مگر وہ حواسوں
میں ہوتا تو سنتا۔ جب تک چینی آ کر صورت حال
بجھتیں زب انسا کے دل کی مراد پوری ہو چکی
تھی۔

”میں نے تمہیں طلاق دی۔“ ہرے بھرے چمن
پر چنگاری آگری۔ کرم داد نے تین مرتبہ یہ لفظ دہرایا۔
”نہیں، نہیں سائیں! اللہ کا واسطہ چپ کر
جائیں۔ میری بات سنیں۔“ نیم جان سی فرحین
ندموں میں آگری۔ مگر وہ فریاد پر کیسے کان دھرتا۔
شیطان مکمل رقص میں تھا۔
ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ سب جل کر خاکستر
ہو گیا۔

وہ اتنی سخت جان تھی کہ اس سب کے بعد بھی زندہ
تھی۔

تین دن سے اماں بابا اس کی پی سے لگے بیٹھے تھے۔
ان کی لاڈلی نازوں پلی جسے انہوں نے بڑے ارمانوں
بڑے چاؤ کے ساتھ بپا ہوا تھا وہ ابڑ کر اٹھتی تھی۔ خالی
دامن خالی ہاتھ کچھ بھی تو نہ بچا تھا، ظالموں نے سب
چھین کر صرف انگارے بھر دیے تھے۔ اماں دامن
پھینکا پھینکا کر کونے دے رہی تھیں۔ بابا کے ہونٹوں پر
بھاری قفل لگ گئے تھے۔ اس غم نے تو انہیں توڑ کر
رکھ دیا تھا۔

”میرا بچہ! اماں! میرا بچہ کہاں ہے۔ اماں وہ بھوکا
ہے۔ اماں وہ بیمار ہے کہاں ہے وہ؟ مجھے وہ اسے مجھے
دو۔ میں اپنا بچہ نہیں دوں گی تم لوگوں کو۔“ وہ ادھر ادھر
ہاتھ مارتی پہلو خالی ملتا تو پھر وہی دلدوز چیخیں ان بے
رحموں نے اس سے ننھا سا دوا بھی چھین لیا تھا۔

اور جب کرم داد کا نشہ اترا حواس ٹھکانے آئے تو
علم ہوا کہ وہ مدہوشی میں کیا کر چکا تھا۔ اماں نصیبین اور

مراد کی گواہیاں اور اپنا دل۔ وہ اتنے عرصے سے ساتھ
رہ رہی تھی۔ وہ اسے خوب جان گیا تھا وہ کتنی شفاف
اور پاکیزہ تھی۔ بے شک وہ اکثر اسے ماں کی آنکھوں
سے دیکھتا اور ماں کے ہی کانوں سے سننے کا عادی تھا مگر وہ
سب سمجھتا تھا مگر اپنی جھوٹی انا اور مراد کی کے زعم میں
جھٹکا مشکل تھا لیکن اب وہ اندر سے بالکل ٹوٹ گیا
تھا۔

”وہ کیسے رہے گی اپنے بچے کے بنا۔ مجھ سے جو کچھ
ہوا، بھول میں ہوا۔ کوئی تو راہ ہوگی ناں کوئی تو کفارہ۔ پھر
شاہ داد معصوم سا بچہ جسے پہلے ہی بخار نے نڈھال کر
رکھا تھا۔ ڈائریا بھی ہو گیا۔ کتنی سی جان کے لالے پڑ
گئے۔ جو سزا ان کے مقدروں میں درج تھی وہ تو انہیں
جھپٹتی تھی۔ اس معصوم سی جان کا کیا قصور۔ چینی تو
بالکل اس حق میں نہ تھیں بچہ ہے بچے بیمار بھی ہوتے
ہیں بل جائے گا ماں کے بغیر مگر کرم داد کو وہ بچہ اپنی جان
سے زیادہ پیارا تھا۔ وہ اسے تکلیف میں کیسے دیکھتا وہ
خود اسے لے آیا۔

ہمیشہ صاف سٹھرا رہنے والا کرم داد انتہائی لمبے
حلیے میں تھا۔ بکھرے بال بڑھی سیو سرخ انگارہ
آنکھیں فرحین نے نظر بھی نہ ڈالی۔ بچے کو جھپٹ
لیا۔

وہ اسے دلواندہ وار چوم رہی تھی۔
شاہ داد کو کرم داد نے اسے سونپ دیا تھا اپنی رضا
سے۔ پھر وہ کبھی بیٹے سے ملنے کے لیے پلٹ کر نہ آیا۔
جرم اس نے کیا تھا تو سزا بھی اسے ہی کاٹنی چاہیے تھی
اور اس نے کالی بھی یہاں تک کہ عمر کی نقدی تمام ہو
گئی۔

آپا زب انسا ہر مقام پر جیت گئی تھیں۔ اسے حویلی
سے نکلوا کر بھاگی کو اس کی جگہ لانے میں کامیاب ہو
گئیں۔ ان کا گھر بچ گیا تھا۔ ان کے مہرے ختم ہو گئے
تھے اب آگے تقدیر کے مہرے تھے جو ختم نہیں ہوتے
اور نئے بھی نہیں۔

ایک بی جھولی میں ڈال کر وہ خالق حقیقی سے جا ملی۔
سجھا کی اور جیجی کی تدبیر بھی ناکام رہ گئی۔

وہ آنکھیں موندے آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ پاس ہی نیبل پر رکھا فون وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔ زمین بھیس رہ سو رہا ہے مگر ان کی آہٹ پر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ حیران ہوئیں۔

”نون اٹھا کیوں نہیں رہے۔ کس بے چارے کا ضبط آزار ہے ہو۔“ چائے کا کپ انہوں نے نیبل پر رکھ دیا۔ شاہ داداؤں سمیٹ کر سیدھا ہو بیٹھا۔
”ممانے کچھ کھایا؟“ سوال کا جواب دیے بغیر الٹا وہ پوچھ رہا تھا۔

”ہاں کھانا کھالیا ہے کچھ دیر تک دودھ اور دوادے دوں گی۔ تم بے فکر رہو۔ اب میں ہوں ناں۔“ انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ان چند دنوں میں۔ پے درپے ہونے والے دکھ بھرے انکشافات نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

دفعنا پھر اس کا سیل بول اٹھا۔ کپ لبوں تک لے جاتے اس نے بھنویں اچکا کر روشن اسکرین پر نظر ڈالی پھر اعصاب ڈھیلے چھوڑتے ہوئے پیچھے ہو گیا۔ زمین کے دل میں جانے کیا آئی انہوں نے کال ریسیو کر لی۔

”اداسا میں۔ اداسا میں ایلیز ایک بار آجائیں۔ جیجی کی طبیعت بے حد خراب ہے وہ آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ میری ماما چلی گئیں۔ میرے بابا بھی چلے گئے۔ اب جیجی کو کچھ ہوا تو میں بھی مری جاؤں گی ادا سائیں! آپ کو اللہ کا واسطہ پلیر اداسا میں پلیر۔“

”اوہ گاڈ! زمین جھرجھری لے کر رہ گئیں بے ساختہ انہوں نے اسپیکر آن کر دیا۔

پرہ۔ روتی ہوئی اس کی منٹیں کر رہی تھی۔ اس نے اپنا سیل آف کر دیا۔ چہرے پر پتھروں کی سی ویرانی تھی۔

”یہ سب کیا ہے شاہ دادا! تم اور یہ رویہ آئی کانٹ بلو ات تمہاری ماں نے یہ تربیت تو نہیں کی۔ وہ بوڑھی

بھائی نے کرم داد کو چار بیٹیوں کا تحفہ دیا۔ وہ حویلی کو وارث نہیں دے سکی تھی۔ کرم داد کا نام لیوا کون ہوگا یہ دکھ جیجی کو اندر ہی اندر کھائے جاتا اور تب انہیں شدت سے اپنی پہلی بیوی اور پوتا یاد آتے۔ جن کا ذکر بھی انہوں نے اپنی زندگیوں میں ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ جبکہ کرم داد کی آنکھوں سے اس کی شبیہ بٹی ہی نہ تھی۔ بظاہر وہ اپنی زندگی میں بہت ملن و سرور نظر آتا تھا۔ وہ سارے زمانے سے چھپ سکتا تھا بیوی کو دھوکا دے لیتا لیکن ماں کی آنکھیں کیسے دھوکا کھاتیں وہ جانتی تھیں فرحین سے جدائی اور بیٹے سے دوری کا دکھ اسے گھن کی طرح لگا ہوا ہے۔ جیجی نے کئی بار کہا بیٹے کو واپس لے آؤ اور جواباً ”کرم داد کے لبوں پر زخم خورہ مسکان شرجاتی۔“

سجھا کی اسے بیٹا نہ دے سکی تھی اور کرم داد نے کبھی اس سے اس کی کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اس کی ذات کا مظنہ وہ غور وہ اکثر سب کے سب فرحین کے ساتھ ہی رخصت ہو چکے تھے۔

سجھا کی بھی ایک عورت تھی۔ وہ بھی اور اک رکھتی تھی کہ اس کا مرد اس پہلی عورت کو بالکل نہیں بھولا اور وہ خود بھی اسے خوشی نہ دے سکی تھی۔ اسی لیے تو اس نے کرم داد کو دوسری شادی کی اجازت، بخوشی دے دی۔ کرم داد تو کسی طور راضی نہ تھا مگر جیجی۔

سجھا کی پر سو گن آگئی۔ احمد سراج اور اس کی ماں نے اک طوفان اٹھا دیا۔ زیب النسا کو بدلے میں میکے بھجوا دیا گیا۔

اگر بیٹے کی چاہ میں کرم داد شادی کر سکتا تھا تو احمد سراج کو بھی پورا حق تھا کہ وہ اولاد کے لیے دوسری شادی کر سکے۔ زیب النسا کی اپنی راجدھانی بچانے کی ساری کوششیں اکارت گئیں۔ اس کی حاکمانہ اور حاسدانہ فطرت اپنے گھر کو دو حصوں میں بٹانہ دیکھ سکی اور سال بھر میں ہی بے پناہ ذہنی دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پاگل ہو گئی۔

کرم داد کی دوسری بیوی بھی اسے بیٹا نہ دے سکی۔

عورت تمہاری وادی ہے۔ زمین کو حقیقتاً شاک لگا تھا۔ شاہ داد کے اس رویے پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

”آئی ڈونٹ کیئر میرے لیے صرف میری ماں اہم ہے اور کوئی دوسرا رشتہ نہیں۔ میں کسی کو نہیں جانتا۔“ وہ شدید اضطراب میں تھا۔ آنکھوں میں تنفر بھرا تھا۔

”تمہارے لیے اپنی ماں اہم ہے۔ ٹھیک ہے لیکن یہ تو سوچو کہ تمہارے باب کی ماں ہے۔ وہ زندگی اور موت کے دورا ہے پر ہے میں تمہارا دکھ بھی سمجھتی ہوں لیکن کیا ضروری ہے کہ تم اس وقت ان سے اپنا رشتہ یاد رکھو۔ اور وہ چھولی سی گزریا رہے۔ جس بے چاری نے ماں نہیں دیکھی۔ اب باب بھی نہیں رہا اور اگر اس کی وادی بھی اف۔ شاہ دادا! بے رحم مت بنو بیٹا! سختی سے سمجھاتے سمجھاتے زمین کے لہجے میں لجاجت اتر آئی وہ بالکل ٹھس ہوا بیٹھا تھا۔
زمین نے اسے بھیج کر ہی دم لیا۔

نظامانی ہاؤس کا گیٹ ویسا ہی سنہرا اور چمکتا دکھتا ہوا تھا۔ وہی جھومتے سرو کے درخت وہی ہار سنگھار کے دور تک بکھرے خوش آمدید کہتے پھول ویسی ہی لاش ہنس سنخ روش جس پر کھڑی پر اوپر ڈالے گئے پیرا شوٹ کو پر جمی دھول بتاتی تھی کہ اس کے مالک نے کئی روز سے اسے استعمال نہیں کیا۔

یہی لائن تھا جہاں اس نے گیٹ کے پار سے انہیں پہلی اور آخری بار دیکھا تھا۔ وہ پرہ کے بابا تھے۔ اس کے ساتھ کھیلتے بے حد باوقار بہت پیارے۔ اس کی خوشی میں خوش۔ اس پر محبت لٹاتے۔ اسے کیا بتا تھا وہ اس کے بھی بابا تھے۔ وہ تب ہی ان کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ اپنے اندر بھلتے اودھم مچاتے سوالوں کے جواب لے لیتا۔ ساری تشنگی مٹا لیتا۔ تمام حسرتوں کو قرار دے لیتا۔ وہ کیسا بد نصیب تھا۔ وہ کئی بار یہاں آیا مگر کبھی ان سے مل ہی نہ سکا۔ نہ ہی وہ اسے دیکھ سکے۔ وہ اسے

دیکھتے تو ضرور پہچان لیتے۔ یہ گھر اس کے باپ کا تھا اور وہ مہمانوں کی طرح یہاں آتا رہا۔ وہ منصوبے ہی بنا تا رہا سوچتا رہا اور اجل انہیں اپنے پروں میں چھپا کر لے گئی۔ وہ دیوانوں کی طرح اپنے ہاتھوں کو گھور رہا تھا۔ ان ہاتھوں سے اس نے ان کے تابوت پر مٹی ڈالی تھی۔ وہ بابا کی گود میں سر رکھ کر سارے دکھ سنانے کا آرزو مند انہیں کہاں چھوڑ آیا تھا۔ وحشت سی وحشت۔ وہ اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ دور بہت دور مگر قدموں میں ملنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ وہ پتھر بنا کھڑا تھا۔ پرہ کو اس کی آمد کی خبر ہوئی۔ وہ ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی اس تک پہنچی۔

”اداسا میں! اداسا میں!“ کی تکرار کرتی وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹی۔ وہ ویسا ہی بت کابت۔ وہ اسے کھینچتی ہوئی اندر لے گئی۔ جیجی اسے دیکھتے ہی پھر سے جی اٹھی تھیں۔ آنسو رکتے ہی نہ تھے۔ وہ اس کے اک اک نقش کو چوم رہی تھیں۔ بار بار بازوؤں میں بھینچ لیتیں۔ ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر دیکھے گئیں۔ اور اتنی نرم گرم سی پرجوش محبت بھی اس کے اندر پھیل نہ چاسکی۔ اک گہری دھند احساسات پر جم چکی تھی۔

پرہ بازو سے چٹنی ہوئی تھی۔ بابا کی لاڈلی بیٹی اس کا دکھ سب سے سوا تھا۔ اس کا ایک بڑا بھائی ہے۔ بابا اسے بتایا کرتے تھے اور یہ کہ وہ ایک دن ضرور آئے گا اور وہ کب آیا جب بابا چلے گئے۔ وہ اس کے وجود میں بابا کو ڈھونڈ رہی تھی اور اس کے اندر گہری نیند اتری تھی۔ ہر جذبہ سو رہا تھا۔

عرب اس سے یوں ملا جیسے کسی اجنبی سے ملا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت کو ایک دم قبول کرنے میں شاید وہ متاثر تھا اور امداد نظامانی جو اس کے سکے چچا تھے اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر بھی کوئی گرم خوشی کوئی خوشی کی رمت نہ جاگی۔ روکے سے انداز میں اسے گلے لگا کر وہ پیچھے ہٹ گئے۔ جیجی بغور دیکھ رہی تھیں۔

”جب ایک شیر جنگل میں اکیلا ہو اور سمجھ رہا ہو کہ اب ہر طرف اس کا راج ہو گا اور تب اچانک کہیں

سے دو سرائو تانا شیر جنگل میں نکل آئے تو پہلے شیر کو بے چینی تو ہوگی۔ ان کے جانے کے بعد وہ اس کا کاندھا سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ وہ مہربان لب انہیں دیکھ رہا تھا۔

”مگر میں ابھی زندہ ہوں۔ کرم داد کی ماں اس کے بچوں کی وارث۔ میں تمہاری حق تلفی نہیں ہونے دوں گی۔ تمہاری ماں بہت نیک عورت ہے۔ اللہ اسے اجر دے بہت خوب تربیت کی ہے اس نے تمہاری۔ بس ہم ہی بد قسمت تھے۔ جو قدر نہ کر سکے اللہ پاک ہمیں معاف کرے۔ بچے اتم بھی اپنا دل صاف کر لو۔ ہمیں معاف کر دو۔ اپنے بابا کی بھی ہر خطا بھلا دو۔ وہ تمہارے لیے ہزاروں حسرتیں لے کر گیا ہے اور اپنی بیٹیوں کے متعلق بھی اس کے بہت سے خواب تھے۔ اب تم ہی ان کے بڑے بھائی ہو اور بڑا بھائی باپ برابر ہوتا ہے۔ میں چاہوں گی تم ان کے سر پر ہاتھ رکھو۔ اس طرح ان نمانیوں کا دکھ بھی کم ہو گا اور تمہارے باپ کی روح بھی راضی ہوگی اس کے بوجھ کم ہوں گے کرم داد کا سب کچھ اب تمہارا ہے اور اس پر

تمہارے جتنے قرض تھے میں اب سب اتاروں گی تم کوئی فکر نہ کرنا۔ میں ہوں تمہارے ساتھ۔“
شاہ داد کا ایک ہاتھ جیبی کے کپکپاتے ہاتھوں میں تھا اور دوسرا برہ دلوچے پیٹھی تھی۔
مول اور سوہاثرالی سجا کر لے آئیں اور ہر چیز اصرار سے پیش کرنے لگیں۔

ان کے انداز میں۔ پیار بھری اپنائیت تھی۔ ان کے رویے سے پول محسوس ہو رہا تھا برسوں دیار غیر میں رہنے والا بھائی لوٹ آیا ہو۔ وہ اس کی خدمت میں بچہ بچہ جارہی تھیں۔ جیبی نے اس سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ان سے روز ملتے آئے گا اور اس نے ہامی نہیں بھری تھی تو انہیں انکار بھی نہیں کر سکا تھا۔ وہ دوبارہ یہاں آئے گا بھی یا نہیں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا یہ جگہ جہاں قدم قدم پر بابا کی برچھائیاں تھیں وہ کن آنکھوں سے دیکھے گا اس دکھ کے گہرے سیاہ

اندھیارے سے وہ کیسے نکلے گا کچھ بتانے تھا وہ ابھی کے لیے قدم بڑھا چکا تھا جب کوریڈور کے پہلے قدم پر بیٹھی عنالیہ کا سوال راہ میں حائل ہوا۔

”جاری ہے۔“ وہ جا ہی رہا تھا۔ انتہائی بے سگ سوال کا کیا جواب ہوتا وہ چپ ہی رہا۔

”پھر کب آئیں گے؟“ ہاں اس سوال کا جواب ضرور تھا مگر وہ بتا نہیں چاہتا تھا۔ کتنا قریبی تعلق تھا ان کا آپس میں اور وہ کتنے انجان رہے۔

”جیبی آپ کے آنے سے کتنی خوش ہوئی ہیں اور پرہ اسے تو جیسے پھر سے تیا سائیں مل گئے ہیں۔ وہ ان سے بہت قریب بھی اور ان کے بعد صرف وہ ہی کیا ہم سب ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں اور ایسے موقع پر آپ کا ملنا بالکل ایسا ہے کہ ہمارے زخم سل گئے ہیں بے شک ہمیں یہ دکھ بھی ہے کہ تیا سائیں آپ سے نہ مل سکے اور نہ آپ ان سے۔ اس بات کی آپ کو یقیناً بے حد تکلیف ہوگی مگر۔“

”میں چلتا ہوں۔“ وہ ابھی کچھ اور بھی کہتی کہ وہ بول اٹھا۔

”پھر کب آئیں گے۔“ اس کا سوال ہنوز تھا۔ شاہ

داد کی نظریں اس کے چہرے پر جا نکلیں۔ سبز اور زرد رنگوں کے سوٹ میں ملبوس۔ اجلی رنگت اور دلکش نقوش والی یہ لڑکی جس کی آنکھوں میں اس کے لیے غمٹھا رہے تھے وہ دل سے کتنے قریب بھی مگر اس بل دل انتہائی بے حس ہو رہا تھا۔ اس لیے ذرا سا بھی مروت اور لحاظ برتتے بغیر وہ کندھے جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ پیچھے مڑ کر اس بیماری لڑکی کے چہرے پر پھیلا سناٹا بھی نہ دیکھا۔ اس کے دیوں پر اس کے قدموں سے اٹھتی دھول بڑتی جارہی تھی۔ جانے والے کے انداز تانے تھے مشکل ہے وہ پلٹ کر آئے۔

اور اس رات جب اس نے کھانا بھی نہ کھایا۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ کھلی کتاب سامنے رکھے دیکھ کہیں اور رہی تھی اور جب جیبی نے پانی مانگا تو وہ پونہ ہونق سی ادھر ادھر نا دیدہ شے تلاش کرنے لگی۔ ٹیبل

پر رکھا جگ اور گلاس اسے دکھائی نہ پڑ رہے تھے وہ تو ان کی بہت حاضر دماغ اور خوش اطوار ہوتی تھی یہ آج اسے کیا ہوا تھا اس کے بدلے انداز انہیں چونکا رہے تھے انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھالیا۔

”عنالیہ! کیا بات ہے بچے کیوں پریشان ہو، مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟“ ان کے پوچھنے کی دیر بھی اس کے نین کٹورے تیزی سے بھرتے چلے گئے اور جب جیبی نے سینے سے لگایا تو وہ زار و قطار رو رہی تھی اور روتے روتے بے خودی میں وہ ان سے راز دل کہہ گئی تھی اور اب رگوں سے جان کھینچتا حدشہ جس نے اسے شام سے اس لمحے تک ادھ مو اکڑا لیا تھا۔

”نہیں آئیں گے جیبی وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔“ روتے روتے ایک ہی تکرار جیبی نے راز دلا

سہلی کی طرح شک پوچھے۔ تسلی دی۔

”آئے گا ضرور آئے گا مگر نہ آیا تو میرا تم سے وعدہ ہے اسے لے کر آؤں گی میں۔ تم دل چھوٹا مت کرو، جیسے ہم سب غم سے نڈھال ہیں ویسے وہ بھی بکھر گیا ہے۔ اسے تھوڑا وقت دو، خود کو سمیٹ لینے دو۔ اس دکھ پر صبر آئے گا تو وہ ہمارے پاس ہی آئے گا۔ وہ ہمارا ہے۔ ہم سے دور نہیں جائے گا۔ فرحین کا بیٹا ہے۔ کبھی بے وفائی نہیں کرے گا بس یہ بات یاد رکھنا۔“ ان کے لبوں پر آسودہ مسکان بکھری تھی۔ آج عارب اور امداد نظامانی کے انداز دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی تھیں۔ وہ عارب جو ہر وقت شاہو، شاہو کرتا رہتا تھا اس سے کتنا کھنچا کھنچا سا تھا۔ واقعی سب مایا ہے اور آج کے مادی دور میں کیسے اس مایا کے پیچھے خونی رشتے بھی ایک دوسرے سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ عنالیہ کے آنسو انہیں نئی راہ دکھا گئے تھے۔

دل ہلکا ہوا تو اس بھی جاگے۔ وہ جھنجھکی جھنجھکی سی روپے سے چہرہ پوچھ رہی تھی۔ جیبی سے شرم آنے لگی۔ وہ کتنی بے جا بن کر سب کچھ کہہ گئی تھی وہ کیا سوچتی ہوں گی اک نئی فکر دامن گیر ہوئی۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“ وہ جھک کر جو کرز کے تھے کھول رہا تھا۔ جب فرحین کمرے میں داخل ہوئیں اور ابھی وہ کوئی بہانہ گھڑنے ہی لگا تھا کہ ان کے پیچھے ہی اندر آئی زمین بول اٹھیں۔

”نظامانی ہاؤس گیا ہو گا اور کہاں جاتا ہے اس نے۔“ ”کک، کیوں۔۔۔ وہاں کیوں گئے تھے۔“

فرحین کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ”جیبی بہت بیمار ہیں ماں۔ ان ہی کی عیادت کو گیا ہو گا۔ میرے خیال میں تو بڑی نیکی کی بات ہے۔ پھر اس کا خون کا رشتہ بھی ہے ان سے۔“ زمین یوں بتا رہی تھیں گویا نظامانی ہاؤس کے کیمنوں سے خوب مثالی تعلقات ہوں۔

”یہ گیا ہے وہاں، تمہیں علم تھا اور مجھے بتایا تک

نہیں اور اور تم کیا جانتے نہیں ہو کیا سلوک رہا ہے ان لوگوں کا میرے ساتھ۔ پروں میں سمیٹ کر پالا ہے تمہیں۔ کیا صرف اس دن کے لیے کہ تم پھر ان لوگوں سے جا ملو۔“ وہ زمین پر برس کر اس پر الٹ پڑیں۔ ”ظالم، بے حس لوگ ہیں۔ چھین لیں گے تمہیں ہمجھ سے دور کر دیں گے۔“ خوابیدہ خوف پھر سے جاگ اٹھے۔

”ارے جانے بھی دو، یہ کوئی دودھ پیتا بچہ ہے کہ چھین لیں گے۔ ماشاء اللہ سے عاقل و بالغ ہے۔ اپنا اچھا برا سب جانتا ہے پھر جس سے ڈر تھا وہ دنیا میں رہا نہیں۔ وہ بے چارہ جیتے جی نہ لینے آیا تو اب کس بات کی فکر۔ ایک نہ ایک دن تو اپنوں سے ملنا ہی تھا اس نے تو یوں مل لیا بس۔ بھلا جڑ کے بغیر بھی کوئی پودا ہوا ہے کبھی۔“ زمین حد درجے لا پرواہ تھیں۔ جبکہ فرحین کا دم حلق میں آن اٹکا۔ انہوں نے انتہائی پریشان کن نظروں سے اسے دیکھا وہ بوکھلا کر نگاہ پھیر گیا۔

”افوہ آیا۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ اس کا اپنا خاندان ہے وہ سب لوگ اس کے اپنے ہیں۔ تو پھر اس کے وہاں جانے میں کیا قیاحت ہے۔“

”قباحت؟ کیسا خاندان کیسے اپنے ان لوگوں نے جو کچھ کیا پھر اس کے بعد کبھی مڑ کر اسے پوچھا اس کی خبر لی کیسے جی رہا ہے۔“ فرحین اپنی جگہ پر تھیں۔

”کیسے لیتے خبر جب ہاتھ ہی بندھ گئے تھے۔ کس منہ سے آتے پوچھنے پھر جب کرم داد ہی اسے آپ کو سونپ گیا تھا تو وہ کیا کرتے اب وہ خود بھی نہیں رہا مگر یہ تو نہیں نال کہ اس کا باپ سے اور ان لوگوں سے رشتہ ختم ہو گیا۔ وہ تو اقامت برقرار رہے گا اور اس کے باپ کا اور کون سا بیٹا ہے یہی اکلوتا بیٹا ہے اس کا۔ اپنے خاندان سے ملنا اس کے اپنے حق میں بھی اچھا ہے۔ ساری زندگی ترس ترس کر گزاری۔ اب بھی جن حالوں سے تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ وہ بھی سب آپ کے سامنے ہے پھر ڈگری ملتے ہی یہ بھی نہیں کہ جھٹ سے کوئی ٹاپ کلاس جاب مل جائے گی

زندگی میں اور بھی بہت سی باتیں وجہ خوشی بن سکتی ہیں۔ یہ نہ ہوا انجانے میں خود اپنے ہاتھوں کسی خوشی کا گلا گھونٹ دو۔“ لگتا تھا آج زمین سارے پردے اٹھا کر رہیں گی شاہ داد نے ملتان سے نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ کھٹ کھٹ کرتی کمرے سے نکل گئیں۔ فرحین تانکھی سے اس کا چہرہ تک رہی تھیں۔

وہ ”ایکسکیوز می“ کہتا ہوا شوم میں جا گھسا کہ فی الحال اس سے بہتر چھپنے کی اور کوئی جگہ نہ تھی۔

اس کی پہلے بھی کسی سے خاص دوستی نہیں تھی اب تو بالکل ہی سب سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ عارب سے کلاس میں آتے جاتے ہیلو ہائے ہو جاتی۔ دونوں کے بیچ اک ان دیکھی دیوار حائل ہو گئی تھی تکلف کی گریز کی۔ وہ تو جان بوجھ کر اس سے بچتا پھر مگر عارب کیوں بدل گیا تھا اس بارے میں وہ سوچتا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ کتابوں میں سر دیے رہتا۔ کلاس کے بعد فارغ نام ملتا تو لائبریری میں جا گھستا۔ اس وقت بھی وہ پورے انہماک سے آؤٹ کے اسرار و رموز سمجھنے میں غم تھا جب کوئی آہستگی سے برابر والی کرسی پر آ بیٹھا۔ شاہ داد نے چونک کر نظر اٹھائی۔ اپنے مخصوص سیاہ گاؤن میں چھپی گریے اس کا رخ سلیقے سے ماتھے تک لیے وہ مول تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں حزن و ملال کی آمیزش لیے چہرے پر غم کی پرچھائیاں۔ وہ باپ کے سائے میں نہیں رہا تھا اس کا دکھ اپنی جگہ مگر وہ باپ کی گود میں پلی تھی اس کا دکھ اس سے بھی ہوا تھا۔ اس نے پھر کتاب پر نظر نکالی چند ثانیاں وہ بیخوشی کی تہ میں دبے چلے گئے۔

وہ ایک دم سے اٹھ کر جانا بھی نہیں چاہ رہا تھا اور اس کے متوقع سوالوں سے خائف تھا۔

”آپ ہم سے خفا کیوں ہیں؟“ آخر کار مول نے لب کشا کیے تھے۔ وہ کیا کتا کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ وہ اس سے تو خفا نہ تھا جس سے خفا ہونے کا حق رکھتا تھا وہ تو منائے بغیر ہی ملک عدم سدھار گیا۔

اسے کیا کرے گالیہ بے چارہ ساری زندگی محنت۔ اپنے اور آپ کے خوابوں میں رنگ بھرتے بھرتے بال ختم ہو جائیں گے اس کے۔ کیا چاہتی ہیں آپ گھٹ گھٹ کر جیسے یہ۔“ زمین نے انہیں قائل کرنے کو بے دردی سے سفاک حقیقت کا پردہ بھی چاک کر ڈالا وہ اور پھر گئیں۔

”تو کیا چاہتی ہو اس کے باپ کی دولت کے پیچھے اسے ان لوگوں میں دھکیل دوں۔ ہرگز نہیں۔ کیا ملا ہے مجھے اس دولت سے اور کیا مل گیا نہیں۔ دولت خوشیوں کی ضامن نہیں ہوتی۔ سب کچھ جانتے بوجھتے اسے سبق پڑھا رہی ہو۔ اور تم۔“ وہ اس کی طرف گھومیں۔

”تمہیں پتا ہے نال تم کیا ہو میرے لیے۔ میری کل کائنات۔ میری قیمتی متاع۔ میری کل زندگی کا سرمایہ۔ میں یونہی تمہیں کسی کے حوالے کر دوں۔ ہاں تمہارا باپ زندہ ہوتا تو اور بات تھی۔ مگر اب نہیں۔ میں نے کہہ دیا ہے تم نہیں ملو گے ان لوگوں سے۔ سنا تم نے۔“

”بے شک دولت خوشیوں کی ضامن نہیں ہوتی مگر

اب کیسے گلے اور کہاں کے شکوے سب منوں مٹی تلے دفن ہو گئے تھے۔

”جینجی کی آنکھیں ہر وقت دہلیز پر لگی رہتی ہیں۔ آپ کا ذکر آپ کا انتظار بس یہی کام ہے انہیں۔ جھوٹی تسلیاں دے دے کر انہیں غذا اور دوا کھلانا پڑتی ہے پھر مزید بے شمار جھوٹ بول کر ہلانا پڑتا ہے کہ آپ مصروف ہیں اس لیے نہیں آسکے۔ آپ کا میسٹ ہے۔ آج پرکٹیکل ہے، اگلے دن پھر سننے بہانے۔ بتائیں مجھے ان سے اور کتنے جھوٹ بولوں میں پرہ الگ رو رو کر بلکان ہوتی ہے ہم کیا کریں کہ ہمارے دلوں میں آپ کے لیے محبت بہت بچپن میں ہی ڈال دی گئی تھی۔ ایک بڑا بھائی ہے۔ شہزادوں جیسا اور اک دن وہ ضرور آئے گا۔ ہر روز صبح اٹتے میرا سوال آپ کے بارے میں ہوتا کہ آپ کب آئیں گے۔

اب سوچتی ہوں میرے ان سوالوں سے بابا کو کتنی اذیت ہوتی ہوگی۔ میں ہر روز ان کے زخم اُدھیر ڈالتی تھی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں وہ آپ سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور ان کی آپ سے محبت کے وہ سارے ثبوت انیکسی میں ان کے بیڈ روم کی ایک الماری میں موجود ہیں۔ اس الماری کو ان کی زندگی میں کسی کو کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ تو اب ان کے جانے کے بعد ہم پر بھید کھلا جب میں نے اس کا تالا توڑا۔ آپ کو پتا ہے اس الماری میں کیا تھا۔“ وہ اسے دیکھتی پل بھر کورکی۔ شاہ داد بے دھیانی سے سنتا بے اختیار اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”اس الماری سے مجھے جگمگ کرتے شیشوں جڑی ایک ننھی سی ٹوپی ملی۔ ننھے منے کڑھائیوں والے کرتے اولی موزے دو چھوٹے تکیے جھوٹی چھوٹی رلیاں جھنجھنے چند چابی والے کھلونے اور کچھ تصویریں اور جانتے ہیں وہ چیزیں اور تصویریں کس کی تھیں۔ سب آپ کی تھیں مجھ نہیں بابا نے اپنی جان سے بڑھ کر سنبھال رکھا تھا۔ وہ جب بھی گھر آتے اپنا زیادہ وقت انیکسی میں ہی گزارتے تھے۔ کیوں یہ راز تو اب

کھلا انہوں نے آپ سے دوری اختیار کیے رکھی تو ضرور اس کے پیچھے کوئی سولڈ ریزن ہو گا۔ وہ آپ تک پہنچ سکتے تھے مگر انہوں نے کیوں خود پر اتنے ہرے بٹھائے رکھے یہ میں نہیں جانتی لیکن اٹنا مجھے علم ہے کہ وہ آپ کو بے اندازہ چاہتے تھے۔ اگر آپ کے دل میں ہمارے لیے ذرا سی بھی مٹھنا کش ہو تو پلیز ایسے کھنور نہ بنیں۔ ہمارے بیٹوں کی غلطیوں کی سزا خود کو اور ہمیں نہ دیں۔ اور جانے والوں کی خطائیں تو یوں بھی یاد نہیں رکھتے۔ کیا آپ ان کی خطا کو معاف نہیں کر سکتے کیا آپ ہمیں معاف نہیں کر سکتے۔ آپ کو نہ سہی لیکن ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ ہم آپ میں اپنے بابا کو دیکھ لیا کریں گے۔ پلیز ہر روز نہیں تو کبھی کبھار اپنے قیمتی وقت میں سے چند لمحے ہی ہمیں خیرات کر دیا کریں ادا سائیں۔“

وہ اس کی منت کر رہی تھی اس کا دل بھی رو رہا تھا۔ اس کے تو سوگ ہی کم نہ ہو رہے تھے وہ کس کس غم پر نوحہ کرتا بابا تو چلے گئے تھے یہ اس کے بابا کی پیاری بیٹی تھی اس کی بہن جس سے اپنے رشتے کو وہ چند دن پہلے ہی جان پایا تھا۔ بے اختیار اس کا ہاتھ مول کے سر پہ ٹپک گیا۔

”بڑا بھائی“ وہ ایک دم سے کتنے خوب صورت احساس سے دوچار ہوا تھا۔ مول روتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاہ داد نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

”ننھنک بوا ادا سائیں ننھنک بوا سوچو وہ خوش ہو گئی اور اس کے چہرے پر کھلتے رنگوں کو دیکھ کر۔ وہ ماں کی تاکید بھی بھول گیا۔“

مول بڑی دیر اس سے ادھر ادھر کی کہتی رہی۔ وہ بھی پوری دلچسپی سے سننے گیا پھر یک لخت وہ جانے کے لیے اٹھی۔

”آپ میں چلتی ہوں۔ اگر آنے کا وقت نہ ملے تو پلیز جینجی کو فون کال ہی کر لیجئے گا۔ خوش ہو جائیں گی۔ چاہے کوئی جھوٹا دلا سا ہی سہی۔ کم از کم مجھے تو انہیں

کھانے اور دوا کے لیے مٹانے کے جتن نہیں کرنا پڑیں گے۔ پہلے تو عنایہ۔ میرا ساتھ دیتی تھی۔ اب مجھ اکیلی کو چھپا پڑتا ہے چار دن ہوئے وہ تو خود بستر نشین ہو کر رہ گئی ہے۔

”عنایہ! کیوں کیا ہوا اسے۔“ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا جب سے ماں کے توروں کی تھیں۔ وہ تب سے دل کو سمجھا رہا تھا مگر دل جیسا ڈھیٹ بھی دنیا میں دوسرا کوئی ہوا ہے۔

”جانے کس حکیم نے مشورہ دیا تھا صبح صبح ننگے پاؤں گھاس پر چلنے کا۔ بس کسی زہریلے کٹرے نے نکٹ لیا ہے۔ اس دن سے پیر پکڑے بیٹھی ہے۔ پر ہائیاں بکھیل سب بند جیجی کی فکر کیا کم تھی کہ اوپر سے وہ بھی میری تو اچھی خاصی پریڈ ہو جاتی ہے سچ میں۔“ مول پریشان تھی۔

”اوہ گاڈ! ڈاکٹر کو دکھایا؟“ وہ حد درجے پریشان ہوا تھا۔

”ہوں روز بینڈیج بھی کروا رہے ہیں دعا کریں جلدی سے ٹھیک ہو جائے کم از کم وقت بے وقت اسے سہارا دینے سے تو میری جان بچے۔ اچھا ادا سائیں بھولے گامت اوکے ٹیک کیر۔ وہ جا چکی تھی اسے ایک نئی فکر میں غلط کر کے پھر اس کا دل کتابوں میں کیسے لگتا وہ جلد ہی گھر آگیا سوچا تھا ٹھیکے اعصاب کو کچھ ریسٹ ملے گا ایسی قسمت کہاں۔“

”مائی نکت اپنی کسی سہیلی کے ہاں جانے کو تیار بیٹھی تھیں۔ اسے آتے دیکھ کر رجب مانا ان کی ”شو فری“ کا ذمہ اس کے سر ڈال گئے جسے ناچا ہتے ہوئے بھی اسے انجام دینا پڑا۔

رات جب تھکے ماندے جسم و جاں کو گھسیناؤ بیڈ پر آیا تو نظر سائڈ ٹیبل پر رکھے سیل فون پر پڑی۔ بے اختیار اٹھا کر آن کیا اور اسی بے اختیاری میں انگلیاں ایک نمبر پر پس کر گئیں۔ دوسری طرف سے آتی آواز پر وہ ہوش میں آیا۔

”جیجی تو سو گئی ہیں۔ آپ نے بہت لیٹ کال کی۔“

یہ رکی رکی سہمی آواز مول کی تو ہرگز نہیں تھی جبکہ نمبر اسی کا تھا۔ شاہ داد نے سیل آنکھوں کے سامنے کیا پھر کان سے لگایا۔

”مول!“ جانے کیوں تصدیق چاہی حالانکہ پہچان تو آگیا تھا۔

”وہ نماز پڑھ رہی ہے۔ میں عنایہ۔“ ادھر سے گمان پر یقین کی مہر لگی تو تنہا ہوئے اعصاب یکدم پرسکون سے ہو گئے۔ گہری سانس بھرتے بند کراؤن سے ٹیک لگائی۔

”کیسی ہیں۔“ مختصر سوال مگر تفکرات سے بے۔

”ٹھیک ہوں۔“ ادھر بھی اختصار مگر سرشارت سے مزین جواب۔

”پاؤں کا درد کیسا ہے۔“ تصور کی آنکھ سے اسے چلتے دیکھا تو از حد تکلیف محسوس کی۔

”پہلے سے قدرے بہتر۔ آہ۔ آپ کو کس نے بتایا۔“ وہ یک لخت چونکی۔

”مول نے بتایا تھا۔“ آئندہ ایسی بد احتیاطی مت کرنا پلیز۔“ وہ التجا کر رہا تھا اور عنایہ کا دل میٹھی سی تل پر ہلکورے لینے لگا۔ شاہ داد پھر یوں چپ ہوا جیسے کرنے کو کوئی بات ہی نہ رہ گئی ہو اور بعض باتیں ہوتی ہی ایسی ہیں جو نہ بھی کہو وہ پھر بھی دل میں اترتی ہیں اور اثر کرتی ہیں۔

”آپ آئے کیوں نہیں جیجی روز انتظار کرتی ہیں۔“ ہمتیں مجتمع کرتی وہ پوچھ رہی تھی شاہ داد کا جی چاہا پوچھے اور تم؟ مگر کہا تو اتنا۔

”وقت نہیں ملتا۔“ کوشش کروں گا۔ پھر شاہ داد نے الوداعی کلمات کہہ کر فون بند کر دیا۔ وہ تادیر بے خیالی میں سیل ہونٹوں پر رکھے گزشتہ لمحوں کے فسون میں گم رہی۔ اس کا ایک ایک لفظ ذہن کی ٹیپ میں بار بار گونجتا رہا اور ہریار خوشی اور سرشاری کا ایک نیا سکہ دامن میں آگرتا۔

”وہ فرحین کا بیٹا ہے۔ بے وفائی نہیں کرنے گا۔“ جیجی نے کہا تھا۔ اسے یقین ہونے لگا وہ یونہی بد گمان

ہوتی رہی۔

”کس کی کال تھی۔“ مول چہرے کے گرد بندھا دھڑکا کھولتی پاس آ بیٹھی۔ عنایہ کو اپنی آنکھوں سے جگر جگر پھوٹنے ان رنگوں کو چھپانے کا موقع بھی نہ ملا۔ جو کچے چور کی طرح سارے بھید کھولنے پر تیار تھے۔ بنا لب کھولے فون اس کی جانب بڑھا دیا اور چادر سر تک تان لی۔ مبارک وہ کوئی سوال ہی نہ کر دے۔ مول نے حیرانی سے اس کا انداز دیکھا پھر موبائل کی اسکرین کو۔

”ادا سائیں کی کال۔“ اور عنایہ کی جھمپھی جھمپھی سی مسکن۔ راز کیا ہے۔“ بغور چادر کو کھینچی مول نے قیاس کے گھوڑے دوڑائے اور پھر جو انکشاف ہوا تو بے اختیار اس نے چادر جھپٹ لی۔

”عنایہ سنبھل بھی نہ سکی۔ دونوں رات گئے تک راز دہ نیاز کرتی رہیں۔“



انہوں نے اسے نظامانی پاؤں جانے سے منع کیا تھا اور وہ نہیں گیا تھا۔ ہر رشتے ہر جذبے سے افضل و مقدم اس کے لیے اپنی ماں تھی۔ چاہے اس کوشش میں اسے اپنے ہی دل پر پتھر رکھنا پڑے تھے اس نے پروا نہیں کی۔ مگر تب کیا کرنا کہ جب جیجی خود ہی چلی آئیں۔ فرحین اب ایسی بھی بد لحاظ و بے مروت نہ تھیں کہ گھر آئے مہمان کو نکال باہر کرتیں۔ پھر مہمان بھی کون جن سے ان کا کوئی رشتہ نہ سہمی مگر بیٹے کا تو خون کا رشتہ تھا انہوں نے اسے ملنے سے نہیں روکا۔ یہی ان کی اعلا طرفی تھی۔ جیجی تو دل سے ممنون و قدر دان تھیں گو کہ انہوں نے جیجی سے زیادہ بات نہ کی فرحین نے زب زب انسا کو دیکھا۔

وہ حسن، وہ کرافر، وہ نخوت، یہ وہ زب النساء تو نہ تھیں۔ ہڈیاں ہی ہڈیاں جن پر سلوٹ زدہ کھال کا مہین برہ، ان کے پُر ہیبت چہرے پر وہشت زدہ کرتی دو آنکھیں۔ فرحین حق دق سی ان کا اجازت و جود دیکھ رہی تھیں۔ فرحین کو دیکھتے ہی جیجی کے آنسوؤں میں روائی آگئی۔

”دیکھو فرحین۔ دیکھو! ہماری حالت یہ سب اس کرنی کا پھل ہے جس نے تمہیں اجازت دیا مگر پھر خود بھی نہ بس سکی۔ سب تدبیریں الٹ لگیں۔ اپنے ہی گلے کا پھندا بن گئیں۔ دیکھ لو قدرت کا فیصلہ کیا اب بھی ہمیں معاف نہ کروگی۔“

وہ اپنی جگہ ساکت و صامت تھیں۔ ایسی دل دہلا دینے والی حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر ان میں ملنے کی سکت نہ تھی۔ کبھی دکھ کے بیکراں بوجھ تلے دب کر کراتی ہوئی روح نے چاہا ضرور ہو گا مگر ایسا انتقام۔ یہ تو گمان کے ہزارویں حصے میں بھی نہ تھا۔ واقعی کسی انسان کی کیا مجال کہ درست میزان رکھ سکے وہ خود تو اس قاتل تھیں ہی نہیں کہ اپنے ساتھ کی گئی برائی کا بدلہ لے سکتیں مگر وہ جو مالک کون و مکان ہے۔ وہ تو سب جانتا ہے ناں ظالم اور ظلم سے بے خبر نہیں اور وہی سب سے بہتر منتقم ہے۔

”تم چاہو تو نظامانی پاؤں جا سکتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ وہ تمہارے اپنے ہیں پھر تم سے

دہائی دیکھن کا لہوار کوہدہ

Herbal

سوہنی شیمپو

SOHNI SHAMPOO

اس کے استعمال سے چندوں میں خشک ختم
گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے

قیمت 90/- روپے

رجسٹری سے منگوانے پر ادھر جی آرڈر سے منگوانے والے

دو تھیں 250/- روپے تین تھیں 350/- روپے

اس میں ڈاک فرج اور بیکنگ چار ج شامل ہیں۔

بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ

پتہ: 53، انارکلی، راجست، لاہور۔ جی آرڈر کرنا۔

دفتر خریدنے کے لیے:

کتبہ رحمان، انارکلی، 37، بازار راجست، فون نمبر 32216361

چاہت بھی رکھتے ہیں سچ کہتی ہے زمین بھلا جزے بغیر بھی کوئی پودا ہوا ہے کبھی اور میں اتنی ظالم بھی نہیں کہ اپنے ہاتھوں اپنی خوشی کا گلا گھونٹ دوں۔ تمہاری خوشی میں ہی تو میری خوشی ہے۔“ فرحین نے ان کے جانے کے بعد شاہ داد سے کہا تھا۔ وہ حیران سا دیکھ رہا تھا۔

”اچھی لڑکی ہے عنایہ۔ زمین بتا رہی تھی مجھے سچ کہوں اس دن میں نے غور سے دیکھا ہی نہ تھا۔ تم پہلے بتا دیتے میں ذرا دھیان سے دیکھ لیتی۔“

”تو اب دیکھ لیں۔“ حیرت پر خوشی نے غلبہ پایا تو وہ فٹ بولا پھر ماں کی کھلی آنکھوں پر نظر گئی تو اپنی تیزی کھنکھائی۔

”وہ۔۔۔ وہ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔“ مارے بوکھلاہٹ کے بات بھی نہ بنائی گئی۔ فرحین ہنسنے لگیں اور جانے کتنے عرصے بعد ماں کے ہونٹوں پر کھلی ہنسی نے شاہ داد کی روح تک کو شادمان کر دیا۔ ان کی گود میں سر رکھ کر وہ بھی ہنس رہا تھا۔



نظامانی ہاؤس کا گیٹ دیا ہی چمکتا دکھتا تھا۔ وہی

جھومتے سرو کے درخت، وہی ہار ستھار کی ٹیل، ٹوگلائی سفید پھولوں سے انی پڑی تھی۔ مگر یہ کیا آج تو آنے والوں کا استقبال کرنے کے لیے صرف یہ پھول ہی نہیں بلکہ سرخ روش پر سرخ ہی خوشبودار پتیاں دور تک بکھری تھیں۔ بڑا دلکش نظارہ تھا! معطر فضا سرسبز لان میں خوب گہما گہمی اور رونق تھی۔

نیروزی گھبردار فراک میں سنہرے بالوں کو خوب صورت سی پونی ٹیل بنائے خوش باش چہرے والی پرہ ادھر سے ادھر اڑتی پھر رہی تھی۔ آج کا دل اس کے لیے تو عید جیسا تھا۔ قیمتی سوٹ میں ملبوس جینگی کے چہرے پر بھی آج سکون آمیز کیفیت ثبت تھی۔ ان کے دایں ہاتھ کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں اور ہر دانے کے ساتھ دل اپنے بچوں کی

داعی خوشیوں کے لیے ہزار رہا دعائیں کر رہا تھا۔ ان کے بچے ان کی دولت۔۔۔ جنہیں آج وہ ایک ہی لڑی میں موتیوں کی طرح پروانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ عارب اور مول کی زندگی کا فیصلہ تو وہ ان کے بچپن میں ہی کر چکی تھیں۔

اب شاہ داد اور عنایہ کا نصیب ایک ہو جائے۔ ان کے لب دن رات اپنے رب کے حضور گزرتا رہے تھے اور بے شک وہ سننے والا ہے۔ وہ اپنے پروردگار کی بے حد شکر گزار تھیں جس نے ان کی چاہت کو حقیقی روپ دیا تھا۔ کرم داد کے بعد یہ ان کے گھر کی پہلی خوشی تھی۔ بے حد قیمتی خوشی۔ ایک ہی جیسے میروں کلر کے برائڈل ڈریس میں دونوں دلنہیں انتہائی حسین لگ رہی تھیں۔ بھاری زیورات خوشنما میک اپ اور اندرونی احساسات نے انہیں اسیر بنا ڈالا تھا۔ تو بلیک ٹوپس میں دوہرا بھی شہزادوں سے کسی طور کم نہ دکھ رہے تھے۔ جینگی کی نظریں بار بار اپنے بچوں کی بلاتیں لے رہی تھیں۔

عارب کی انگلیاں تیزی سے موبائل کے ٹن پش کر رہی تھیں ایسی دلربا ساعتوں میں بھی اس کی سوتی کہیں اور انکی تھی۔ ساتھ ہی بیٹھی مول کے خوب صورت چہرے پر شرم و حیا کے بجائے جھٹکا چھما رہی تھی۔ بس نہ چلتا تھا کوئی چیز اٹھا کر اسے دے مارے۔

”نہیں سدھرو گے۔ شرافت سے خود ہی بک دو۔ کیا علاج کیا جائے تمہارا۔“ شاہ داد کو بھی تاؤ آ گیا پاس ہی تو بیٹھا تھا۔ بے لہجے میں غرایا۔

”اس! میں نے کیا کیا ہے؟“ عارب نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ پہلے دائیں دیکھا پھر بائیں۔ چار آنکھوں سے اس کے لیے شرارے نکل رہے تھے۔ وجہ اس کے ہاتھ میں تھی۔

”ادھو! خود ہی دیکھ لو! بار بعدیل سے بات کر رہا ہوں وہ گدھا ابھی تک نہیں پہنچا۔ اسے گالیاں سینڈ کی ہیں ایمان سے۔“ اس نے بوکھلا کر اپنی صفائی پیش کی

ساتھ ہی ثبوت کو شاہ داد کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے مگر تمہارے حق میں بہتر ہو گا کہ آج کے دن اپنی ساری خرمستیاں کسی ڈسٹ بن میں ڈال دو، تمہاری بونگیوں کی وجہ سے مول کی آنکھ میں کبھی ایک آنسو بھی آیا تو پھر اپنا انجام سوچ لیتا۔“

شاہ داد کے لہجے کی غراہٹ پہلے سے بھی بڑھ کر تھی۔ عارب نے ڈرنے کی بھرپور ایکٹنگ کی۔ مول کے لیے بھائی کی طرف سے ملنے والا اتنا سامان ہی بہت خاص دل ہی دل میں اس کی درگت پر مسرور ہوتی وہ خود بھی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ عارب نے انتہائی مسکینیت کا مظاہرہ کرتے میل اس کی گود میں ڈال دیا جسے اک لمحے کی تاخیر کے بغیر وہ جھپٹ کر اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال گئی۔ وہ بے اختیار گہری سانس لیتا بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

شاہ داد نے اپنی بے ساختہ لٹ آنے والی مسکراہٹ کو اس سے چھپانے کے لیے دوسری جانب رخ پھیر لیا۔

شرمائی لالچی سی عنایہ کا دل فریب روپ ہوش اڑا رہا تھا۔ وہ پہلے ہی گھبراہٹ کا شکار تھی۔ اس پر شاہ داد کی مخمور نگاہیں۔ وہ مزید خود میں سمٹنے لگی۔ اس کی نظروں کی لو بڑھتی ہی جا رہی تھی اور وہ صورت جمع گھلتی ہوئی۔

”پلیز ایسے مت دیکھیں مجھے۔“ بری طرح جڑل ہوتی آخر کار وہ کہہ ہی گئی مگر اگلے ہی لمحے سخت پچھتائی۔

”کیوں میری نظر لگ جائے گی۔“ شاہ داد نے خاصا برا مانا ساتھ پر بل پڑ گئے۔ عنایہ کی توجہ ان پر بن گئی۔ اپنے سابقہ الفاظ کا اثر زائل کرنے کو بڑی متانت اور جذب سے بولی۔

”جو پیار کرتے ہیں۔ ان کی نظر نہیں لگتی۔“

”یعنی میں آپ سے پیار کرتا ہوں؟“ وہ حد درجے

حیران ہوا اور اس کی حیرت زدہ صورت دیکھ کر وہ اس سے کہیں بڑھ کر حواس باختہ۔ بمشکل حلق سے آواز نکلی۔

”کیا مطلب؟“

”قریب آؤ، پھر مطلب سمجھانا ہوں۔“ اس کی پوری کھلی آنکھوں میں دھڑلے سے جھانکتا وہ کہہ رہا تھا۔ باوجود کوشش کے ہونٹوں کے کناروں سے چھلکتی مسکراہٹ چھپائے نہ چھپی۔ عنایہ اسی حواس باختگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی شاہ داد تھا جو ہمیشہ سنجیدگی کا تہمتا نے رکھتا تھا۔ اب یہ انداز اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”اب کیا مجھے نظر لگانے کا ارادہ ہے؟“ وہ سہم رہا تھا

”میری نظر نہیں لگے گی۔“

”کیوں آپ مجھ سے پیار کرتی ہیں؟“ وہ انتہائی معصومیت سے استفسار کر رہا تھا۔

”اف! عنایہ نے بوکھلا کر سر جھکا لیا۔

شاہ داد خوش دلی سے ہنس رہا تھا اور اس کے چمکتے چہرے پر بارش کی طرح اتاری خوشیاں فرحین کو بھی سرشار کر رہی تھیں۔ نہایت مطمئن ہو کر انہوں نے گلے میں بائیں ڈالے کھڑی پرہ کو سینے سے لگا لیا۔

”آپ ادا سائیں کی ماما ہیں تو میں آپ کی بیٹی ہوئی ناں۔“

اس نے خود ہی ان سے رشتہ جوڑ لیا تھا اور انہیں اس پیارے رشتے پر کیا اعتراض ہوتا۔ وفا کے سارے وعدے نبھانے پر وہ تو انہیں اک انعام کی صورت لگی تھی۔ باقی کی زندگی بہت سہل اور خوب صورت ہوگی۔ اس کی پیشانی چومتے ہوئے انہیں پختہ یقین تھا۔



نبیلہ عزیز



مادر امرتسنی عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلتا ہے۔ نہیں کرہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ مادر خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ٹیمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لا تعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منورہ خیم اپنی بہن ٹیمینہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایر پورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً سہاشا کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بدتمیزی پر خفا ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

منورہ ٹیمینہ اور نیوہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس میں ہے اور بے حد شان دار برساتانی کا مالک ہے۔ ولید رحمن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیشن حائل نہیں ہے۔ نیوہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمیدہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے خواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کو جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ ٹیمینہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ٹیمینہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔

اشتیاق یزدانی آفاق سے حد درجہ خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ عزت تیمور کے موبائل سے ولید کا نمبر لے کر اسے فون کرتی ہے مگر ولید اس



کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ رضا حیدر تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو بھدا اسرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ عزت اپنے دل کی کیفیات ساشاسے بیان کر دیتی ہے۔ ماورا ابی گل کو بتاتی ہے کہ وہ رضا حیدر کے بیٹے تیمور حیدر سے ملی ہے۔ بی گلی گل دم بخود رہ جاتی ہیں۔

شادی میں تیمور حیدر، ماورا کے قریب آنے کی کافی کوشش کرتا ہے مگر ماورا کا سخت اور کھردرا رویہ ہر بار اسے ناکام کر دیتا۔ تیمور، ماورا سے رضا حیدر کو ملوانا ہے۔ رضا حیدر اسے دیکھ کر چونک جاتے ہیں مگر باوجود کوشش کہ وہ سمجھ نہیں پاتے۔ فارہ کی ہی شادی میں عزت کی ملاقات تیاام مرزا کے بیٹے مولس مرزا سے ہوتی ہے۔ وہ سخت بیزار ہوتی ہے جبکہ مولس خوب دلچسپی لیتا ہے۔

آفاق آدمی رات کو غائب ہو جاتا ہے۔ فارہ پریشان ہوتی ہے۔ وہ صبح آکر بتاتا ہے کہ اس کے دوست کے ساتھ کوئی ایمر جنسی ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کے آرام کا خیال کرتے ہوئے وہ بغیر بتائے چلا گیا تھا۔ مگر فارہ اس کی بات پہ یقین نہیں کرتی۔ تیمور، فارہ کے ذریعے ماورا کو اپنے آفس میں ایک شاندار پیکیج پر جاب کی پیشکش کرتا ہے جسے ماورا کافی حیل جت کرنے کے بعد قبول کر لیتی ہے۔

—۱۲—

چوہو پوئی قیصل

”کس لڑکی کو؟“

وہ ان کے اس قدر اچانک حملے اور اتنے غصے کی وجہ سے فوری طور پر سمجھ ہی نہ سکا کہ وہ کس کی بات کر رہے ہیں۔

”اس لڑکی کو؟“ انہوں نے یکدم پلٹ کر گلاس وال سے پار نظر آتے اس کیبن کی طرف اشارہ کیا تھا جہاں ماورا امرتسنی ٹیبل پہ جھکی اپنے کام میں مصروف نظر آرہی تھی۔ تیمور ان کا اشارہ ماورا کی سمت دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔

”آپ ماورا کی بات کر رہے ہیں؟“ تیمور کو اک عجیب سا دھچکا محسوس ہوا تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمارے اس آفس میں کوئی اور ایسی لڑکی نہیں ہے جسے فیصل آباد سے یہاں لایا گیا ہو؟“ انہوں نے طنزیہ جواب دیا۔

”لیکن بابا! اسے یہاں اس سیٹ پہ اس کے ٹیلنٹ کی بیس پہ بلایا گیا ہے۔ وہ یہاں کام کر رہی ہے جھک نہیں مار رہی۔“

تیمور نے بے ساختہ اس کا دفاع کیا تھا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اپنے شہر سے ٹیلنٹ ختم ہو چکا ہے۔؟“ رضا حیدر کا جواب طنز اور تمسخر لیے ہوئے تھا اور تیمور کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔

”اگر ہم نے دوسرے شہر سے کسی لڑکی کو اپائنٹ کر لیا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے؟“ وہ ابھی بھی حیرت اور الجھن کا شکار تھا۔

”قباحت دوسرے شہر سے کسی لڑکی کو اپائنٹ کرنے میں نہیں ہے۔ بلکہ قباحت۔۔۔“

رضا حیدر اچانک ماورا کا نام لیتے لیتے رگ گئے تھے۔ یوں کھلے عام اس لڑکی کے خلاف بولنا انہیں خود ہی اپنی

غلطی کا احساس دلا گیا تھا۔ وہ فوراً ہی چپ ہو گئے تھے۔

”کیا ہوا۔ کیا کہنا چاہ رہے ہیں آپ۔؟“

قباحت کہاں ہے؟ تیمور ان کا بولتے بولتے یوں اچانک رک جانا نوٹ کر چکا تھا مگر ان کی مخالفت کا مقصد نہیں سمجھ سکا تھا۔

اور رضا حیدر اس کے سوال پہ ٹھنک کر رہ گئے۔

”بابا! کبھی نہ کیا قباحت ہے اس میں؟“ تیمور انہیں بولنے پہ اکسار ہا تھا۔

”نہیں کچھ نہیں۔ بعد میں بات کریں گے۔ فی الحال ہم گھر جا رہے ہیں۔“ رضا حیدر نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہیں سے پلٹے اور تیزی سے دروازہ عبور کر گئے اور تیمور اپنی جگہ پہ کھڑا جوں کا توں ان کو دور تک دیکھتا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بس ایک ہی سوچ کلبلارہی تھی۔

”تو اس کا مطلب ہے کہ بابا کو ماورا سے کوئی اختلاف ہے۔ یا پھر وہ انہیں پسند نہیں آئی۔ مگر کیوں؟ کیا کی ہے اس میں۔ شئی ازبر فی کٹ کرل۔“ وہ خود ہی اپنے آپ کو تسلیاں دے رہا تھا اور خود ہی سوال جواب کر رہا تھا۔ ”مے آئی کم ان سرا! ذرا سے توقف کے بعد دروازے پہ دستک ہوئی اور ساتھ ہی ماورا کی آواز ابھری۔ تیمور چونک کر متوجہ ہوا۔

”مے آئی کم ان سرا! اس نے تیمور کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر دوبارہ استفسار کیا تھا۔

”بیس کم ان۔! اس نے جواب دیا۔

ماورا نے اندر آتے ہی اس پہ ایک تنقیدی سی نگاہ ڈالی تھی اور وہ اسے اسی کیفیت میں نظر آیا تھا جس کی اسے توقع تھی۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ساری بھول
ہماری تھی



راحت جبین
قیمت - 300 روپے

شریک سفر



زہرہ ممتاز
قیمت - 550 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمنہ خورشید علی
قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نگہت عبداللہ
قیمت - 400 روپے

فون نمبر:
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

”میں آپ کے ساتھ آئی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ کی باتوں میں بھی آجاؤں گی۔“ اس کی لاپرواہی کا وہی عالم تھا اور مولس مرزا نے زچ ہو کر گاڑی اک طرف روک دی تھی۔

”دیکھیے مس عزت حیدر! آپ ٹھنڈے دل سے میری پیشکش پر غور کریں۔ آپ میں کچھ ایسی بات ہے کہ میں نے آپ کا انتخاب کیا ہے ورنہ میں شادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ ویسے بھی آج کل شادی کے جھنجھٹ میں پڑنے کی سوچنا کون ہے۔“

مولس مرزا نے دلکش بورڈ سے سگریٹ کا پکٹ اور لائٹ اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر بہت مزے سے ایک سگریٹ سگالیا تھا جبکہ عزت اس کی بات سن کر اندر سے کھول اٹھی تھی۔

”اوہ تو یہ اصلیت ہے آپ کی۔“ اس کا لہجہ طنزیہ ہو چکا تھا مولس مرزا اس کی بات پہ مسکرایا۔

”کہتے ہیں کہ سب سے اپنی اصلیت چھپالو مگر اس سے اپنا آپ مت چھپاؤ جس سے تم محبت کرتے ہو۔“ اس نے سگریٹ کا کش لے کر کہتے ہوئے دھواں گاڑی کی فضا میں ہی چھوڑ دیا تھا البتہ اب کی بار عزت اس کی بات پہ مسکرا دی تھی۔

”ہو نہ محبت۔“ جانتے ہیں محبت کسے کہتے ہیں؟“ عزت نے بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔

”فی الحال میری نظر میں تو عزت کو ہی محبت کہتے ہیں۔“ اس نے عزت سے بھی زیادہ دلچسپ انداز میں کہتے ہوئے براہ راست عزت کی آنکھوں میں جھانکنا تھا۔

”جو بات فی الحال ہوتی ہے وہ عارضی ہوتی ہے یعنی وقتی ہوتی ہے۔ اور وقتی چیزیں کبھی پائیدار نہیں ہوتیں۔ اس لیے آپ کا یہ فی الحال میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“ عزت کی لاپرواہی اور انداز میں رتی برابر بھی فرق نہیں آیا تھا۔

”مائی ڈیر! آپ نے غور نہیں کیا۔ میں اس فی الحال کو ہی تو پائیدار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اپنے اور آپ کے بیچ رشتہ استوار کرنا چاہ رہا ہوں۔ ایک پائیدار رشتہ۔ اور میری اس چاہ پہ تو آپ کو فخر کرنا چاہیے کہ میں نے یہ رشتہ آپ سے استوار کرنا چاہا ہے ورنہ ہزاروں ایسی لڑکیاں پڑی ہیں جو میری صرف اک نظر کی منتظر ہیں۔ اور یہاں معاملہ یہ ہے کہ میں آپ کی اک نظر کا منتظر ہوں۔“

مولس مرزا کا لہجہ اور انداز بدل گیا تھا۔ وہ بڑے دلبرانہ انداز میں آچکا تھا۔

”اور میں کسی اور کی نظر کی منتظر ہوں۔“ عزت کا لہجہ بھی دو ٹوک نتیجے میں بدل گیا تھا۔

”بابا بابا۔“ جو دنیا کی نظروں سے ڈرتا ہے۔“ مولس مرزا نے مذاق اڑایا تھا اور عزت اس کے مذاق پہ بری طرح چونک گئی تھی۔

”کیا مطلب۔“ کس کی بات کر رہے ہیں آپ۔“ اس نے فوراً استفسار کیا۔

”یہ آپ کو بہتر بتا دو گا کہ دنیا کی نظروں سے کون ڈرتا ہے؟“ اب وہ لاپرواہی دکھا رہا تھا۔

”آپ سیدھی طرح بات کریں۔“ پسلیاں کیوں بھجوا رہے ہیں؟“ وہ جھنجھلائی۔

”سیدھی طرح ہی تو بات کر رہا ہوں مگر آپ سمجھ ہی نہیں رہیں۔“ آپ کو اب بھی ولید رحمان کے ہی پروپوزل کا انتظار ہے حالانکہ وہ یہ پروپوزل کبھی بھی نہیں بھیجے گا۔“ مولس مرزا نے بالآخر اس کی یہ الجھن بھی دور کر دی تھی۔

عزت اس کی اس قدر جاسوسی پر دانت کچکا کے رہ گئی تھی۔ اسے اس کی بات ذرا اچھی نہیں لگی تھی۔

”وہ پروپوزل بھیجے گا یا نہیں۔“ یہ میرا اور اس کا مسئلہ ہے۔ آپ کو اس کے لیے پریشان نہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ عزت نے اس کو اپنی حد میں رہنے کا اشارہ دیا تھا۔

”میری فائل تیار ہے۔“ اس نے اسے اطلاع دی۔

”ہوں! ہاں۔“ اس کے۔ میں تھوڑی دیر میں چیک کر لیتا ہوں۔“

تیمور ذہنی طور پر غیر حاضر تھا اور اس چیز کو اچھی طرح محسوس کر چکی تھی۔

”پلیز ذرا جلدی چیک کر لیجئے گا کیونکہ مجھے پھر نیکسٹ فائل پہ کام کرنا ہے۔“

”اؤکے۔“ کرلوں گا۔ لیکن فی الحال نہیں۔“ تیمور نے کہتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”اپنی براہم سہ۔“ اور اس نے جان بوجھ کر اس کی غائب دماغی میں دلچسپی لی تھی ورنہ اسے اندازہ تو تھا کہ دونوں باپ بیٹے میں کوئی بات ضرور ہوتی ہے کیونکہ رضا حیدر اسے دیکھتے ہی بھڑک سے گئے تھے۔

اور پھر اس بھڑک کا نشانہ یقیناً انہوں نے تیمور حیدر کو ہی بنایا ہو گا۔

”نفس۔“ اس آل رائٹ۔“ تیمور نے فوراً نفی میں گردن ہلائی۔ اور اسے لاپرواہی سے کندھے اچکا دیے۔

”اؤکے! اے آئی گوناؤ؟“ اس نے اجازت طلب کی۔

”ہوں۔“ یس۔! وہ آہستگی سے کہہ کر اپنی سیٹ پہ جا بیٹھا۔

کوئی اور وقت ہو تا تو اس کی یہی کوشش ہوتی کہ ماوراء کچھ دیر اور ٹھہر جاتی۔ مگر اس وقت اس نے یہ کوشش بھی نہیں کی تھی۔



مولس مرزا کی گاڑی سڑکوں پہ بہت سبک رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔

یوں جیسے وہ لوگ گھر سے لائٹ ڈرائیو کے لیے نکلے ہوں اور واپسی کی فی الحال کوئی جلدی نہ ہو۔ کیونکہ گاڑی کے اندر کے ماحول میں بھی بہت خاموشی اور بہت سکون تھا۔ لیکن عزت حیدر یہ خاموشی اور یہ سکون زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے اس خاموشی کا حصار اس نے خود ہی توڑ ڈالا۔

”کوئی خاص بات۔“ اس نے گردن موڑ کر مولس مرزا کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”شاید ہاں۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

”تو بات کریں۔“ انتظار کس چیز کا ہے۔“ اس نے کندھے اچکا دیے۔

”میں آپ کے گھر پر پوزل بھیجنا چاہتا ہوں۔“ مولس مرزا بات کو زیادہ دیر ڈھکا چھپا نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ یہ اس کی عادت نہیں تھی۔

”میں آپ کو اس بات کا جواب پہلے ہی دے چکی ہوں۔“ عزت نے بھی کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی تھی۔

”وہ ایک سرسری سی بات تھی اور اس وقت ہم راستے میں کھڑے تھے نہ میں ٹھیک سے بات کر سکا اور نہ آپ۔“ آج وہ پہلے سے کچھ سنجیدہ نظر آ رہا تھا مگر عزت کو کیا فرق پڑتا تھا بھلا۔!

”یہ بھی ایک سرسری سی بات ہے کیونکہ اس وقت بھی ہم راستے میں ہی ہیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ آپ بے شک ٹھیک سے بات نہ کر سکیں لیکن میں ضرور ٹھیک سے بات کر سکتی ہوں۔“ وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

اسے مولس مرزا کے ساتھ تنہا سفر کرتے ہوئے بھی کوئی ڈر خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا۔

”عزت۔“ میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں اور نہ ہی یہ بات مذاق ہے کہ آپ اتنی غیر سنجیدگی سے لے رہی ہیں۔“ مولس مرزا کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ وہ کتنا سنجیدہ ہے۔

”آپ کا اور اس کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ میرا اور آپ کا بھی مسئلہ ہے اس قصے میں میں بھی انوالو ہوں۔ اس لیے میری پریشانی ایک لازمی امر ہے۔“

مونس مرزا بھی ڈھیٹا ہن ڈھیٹا تھا۔ اس کی سوئی بھی بس آج کل عزت کے نام پر ہی اٹکی ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ عزت کی ذات میں اسے اپنے لیے انکار کی جھلک نظر آتی تھی اور انکار کو اقرار میں بدل دینے کی ضد تو مردکی فطرت میں ازل سے ہی جلی آرہی تھی۔ مونس مرزا کی یہ ضد کوئی نئی یا انوکھی ضد تو نہیں تھی۔

”لیکن میں آپ میں انٹرنل نہیں ہوں۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”جس میں آپ انٹرنل ہیں وہ آپ میں انٹرنل نہیں۔“ وہ ہنسا۔

”میں نے کہا تھا یہ میرا اور اس کا مسئلہ ہے۔“ عزت نے پھر زور دے کر کہا۔

”تو آپ اپنے اس مسئلے میں مجھے کیوں بھول رہی ہیں۔ میں صبر اور تحمل سے کام لے رہا ہوں ورنہ میں آپ سے زیادہ جھنجھالی اور جذباتی ہوں۔“ مونس مرزا نے یکدم تیور بدل کر بات کی تھی۔

”آپ دھمکی دے رہے ہیں مجھے۔“ عزت نے اس کی سمت دیکھا۔ وہ بڑے سکون میں تھا۔

”یہی سمجھ لیں۔ اور یاد رہے! دھمکی وہی لوگ دیتے ہیں جو کچھ کر جانے کی طاقت رکھتے ہیں۔“

وہ اسے ایک بار پھر باتوں باتوں میں بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

”ہوں۔“ تھینک یو۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ مجھے یہاں کیوں لائے تھے؟“ عزت نے کہتے ہوئے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کے دروازہ کھولنا چاہا۔

”ابھی تو آپ کو صرف اندازہ ہوا ہے۔ اگر سچ کچھ ہو گیا تو۔“

مونس مرزا کی اگلی بات پر عزت دروازہ کھولتے کھولتے رک گئی تھی۔

”تو حاصل آپ کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔“ عزت کا لہجہ سرد تھا۔

”جنون میں نفع و نقصان کا احساس پس پشت چلا جاتا ہے۔“ وہ اپنی طرف کا شیشہ نیچے کر کے سگریٹ کا ٹکڑا باہر اچھال چکا تھا۔

”ہوں۔“ اچھی بات ہے۔“ عزت کہہ کر دروازہ کھول کے نیچے اتر آئی۔

”رہے مس عزت حیدر۔! لہجہ تو آپ نے کیا ہی نہیں۔“ مونس مرزا بھی گاڑی سے اتر آیا۔

”لہجہ دلیر رحمان کے ساتھ نہیں کر سکتی تو آپ کے ساتھ بھی نہیں کر سکتی گی۔ میں آپ کے ساتھ لہجہ کرنے کی نیت سے نہیں آئی تھی۔“

عزت نے استہزائیہ لہجے میں کہا اور ٹیکسی کو اشارہ کیا۔

”مگر میں اپنا پروپوزل ضرور سمجھوں گا۔“ اس نے پیچھے سے آواز دی مگر عزت سنی ان سنی کرتے ہوئے ٹیکسی میں بیٹھی اور ہوا ہو گئی۔

شام ڈھل رہی تھی اور فضا میں اک جمود سا طاری تھا۔

قیام مرزا ماحول کی بیزاریت سے خائف ہو کر رضا حیدر کو لے کر گالف کلب چلے آئے تھے لیکن وہاں آکر انہیں پتا چلا کہ وہی ہی بیزاری رضا حیدر کے مزاج پر بھی طاری ہے۔ ان کا موڈ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ جس پر انہیں خاصی تشویش ہوئی کیونکہ رضا حیدر مسلسل چپ تھے۔ اور اندازہ درجہ پر سوچ ہو رہا تھا۔

”مجھے لگتا ہے رضا کہ میں نے تمہیں ساتھ لاکر غلطی کی ہے۔“

قیام مرزا نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں۔ اظہار خیال کیا تھا اور صدا افسوس کہ رضا حیدر ان کا یہ اظہار خیال بھی نہیں سن سکے تھے بلکہ ان کے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا جس پر قیام مرزا نے ایک بار پھر گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا تھا۔

”رضا حیدر۔! اب کی بار انہوں نے ان کے کندھے کو ہاتھ سے تھپکا تھا۔“

”ہوں۔! کہو وہ چونک کر متوجہ ہوئے۔“

”میں کہہ رہا ہوں کہ میں نے تمہیں بلا کر غلطی کی ہے۔“ انہوں نے اپنی بات دہرائی۔

”ہاں۔ کہہ سکتے ہو۔“ رضا حیدر نے ان کی بات کی تردید کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔

”کوئی ٹینشن ہے کیا؟“ قیام مرزا نے ایک دوست ہونے کے ناتے ان کی اس کیفیت اور۔ پریشانی کی وجہ جاننا چاہی تھی۔

”ٹینشن۔ بس اچانک ہی بن گئی ہے اور بتانے والا میرا بیٹا ہے۔“ رضا حیدر بہت ہی ضبط سے کام لے رہے تھے۔

”کیوں کیا ہو گیا ہے۔ بیٹے نے ایسا کیا کر دیا ہے۔؟“ قیام مرزا بڑے سکون میں تھے۔

”ایک مڈل کلاس لڑکی سے دل لگانے کا شوشا چھوڑ رکھا ہے اس نے۔؟“ رضا حیدر کی تلملاہٹ عود کر آئی تھی۔

”ارے۔! تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ اس عمر میں ایسے شوشے تو ہر کوئی چھوڑتا ہے، کبھی تم نے بھی چھوڑا ہوگا۔“ قیام مرزا نے مذاق اڑایا۔

”صرف شوشا چھوڑتا تو مجھے کوئی پریشانی نہ ہوتی مگر یہاں یہ مسئلہ ہے کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرنے سے نکل گیا ہے۔ اور اسے اپنے آفس میں سیٹ بھی دے دی ہے۔ وہ اس کے پاس آفس کی نظروں کے سامنے جاب کر رہی ہے۔ جبکہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ تیور میری عمر بھر کی جمع پونجی ہے اور میں اپنی عمر بھر کی جمع پونجی کسی ایری غیر لڑکی کے دامن میں نہیں ڈال سکتا۔ میں اس کی دلہن اس کے شایان شان لانا چاہتا ہوں۔“

رضا حیدر کہتے کہتے حد درجہ جذباتی ہو گئے تھے اور قیام مرزا نے ان کے جذبات سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہوں۔! کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو مگر اسے اس کی چاہت سے کیسے ہٹاؤ گے؟ وہ اگر اسے اتنا پسند کرتا ہے تو پھر آسانی سے اسے چھوڑے گا بھی نہیں۔“ قیام مرزا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ معاملہ کچھ گہیر ہے۔

”یہی چیز تو مجھے سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ میں نے اب اس کا حل کیا نکالنا ہے۔؟“ رضا حیدر چلتے چلتے رک گئے تھے اور ایک گہری اور طول سانس خارج کی تھی۔

”اس کا آسان حل یہ ہے کہ اس کے سامنے ایک اور لڑکی کا آپشن رکھ دو۔ اس کی شادی کا بکھیر ڈال دو۔“

”لیکن اس کام کے لیے کوئی لڑکی بھی تو ہونا۔؟“ رضا حیدر کو ہلکا خیال یہی آیا تھا۔

”رضا حیدر! مجھے لگتا ہے کہ پریشانی اور ٹینشن نے تمہارے دماغ کا خانہ خالی کر دیا ہے۔ تیور حیدر کو لڑکیوں کی کمی ہے کیا۔ میں نے یہاں آکر دیکھا ہے تمہارے بیٹے کا نام کئی محفلوں میں بڑی حسرت سے لیا جاتا ہے۔“

قیام مرزا نے جوابات نوٹ کی تھی وہ کہہ دی تھی۔

”مجھے پتا ہے۔ اور بہت اچھی طرح پتا ہے کہ ہائی سوسائٹی میں میرے بیٹے کی کیا ویلوی ہے۔ لیکن سوچ یہ رہا ہوں کہ لڑکی کون ہو۔ کیسی ہو۔ اور کس کی بیٹی ہو۔ کیونکہ یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک چہرہ ہے۔ اور ایک سے بڑھ کر ایک فیملی ہے۔ اس کام کے لیے بھی ذرا سوچ بچار سے کام لینا ہوگا۔“ رضا حیدر اپنی اگلی سوچ کا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شاندار پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

اظہار کر رہے تھے۔
 ”ہاں۔۔۔ آئیے تو ہے۔۔۔ مگر میرا خیال ہے کہ تمہارے حلقہ احباب میں تمام ہی فیملیز بہت اچھی ہیں۔ کسی بھی ایک فیملی کا انتخاب کر لو۔“ ان کا مشورہ بڑا لاروہا سا تھا۔
 ”قیام۔۔۔! تم میری سوچ کو سمجھ نہیں سکو گے۔۔۔ میں دراصل یہ چاہتا ہوں کہ لڑکی اس کے ٹکری ہو۔ جیسی وہ چاہتا ہے، تاکہ اسے وہ پہلی والی یاد نہ رہے۔ وہ اس کا خیال بھی دل سے نکال دے۔“
 رضا حیدر اور امرتشی سے مل بھی چکے تھے۔ اسے دیکھ بھی چکے تھے اور اس سے بات بھی کر چکے تھے اس لیے انہیں اندازہ تھا کہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ اس لیے اس کی شخصیت کا اثر زائل کرنے کے لیے انہیں اس سے بھی بہترین لڑکی چاہیے تھی۔
 ”تو پھر۔۔۔ میرا کہا مانو گھر جاؤ۔ اور اپنے بیدروم میں سکون سے بیٹھ کر اس کے لیے کوئی ایسی لڑکی سوچو جو پہلی والی سے بہتر ہو۔ اگر پھر بھی سوچ میں نہ آئے تو کل صبح مجھے کال کرو۔ پھر مل کر یہ مسئلہ حل کریں گے۔“ قیام مرزا نے ان کے کندھے پر ہتھی دیتے ہوئے مشورے سے نوازا۔
 جس پر رضا حیدر محض سر ہلا کر رہ گئے تھے۔
 ”اور ہاں۔۔۔ تیمور حیدر کی زندگی سے اس پہلی والی کو ایک دم سے نکال دینے کی کوشش مت کرنا، ورنہ تمہارا اپنا بیٹا ہی تم سے بدظن اور متفر ہو جائے گا اور تم اپنی جمع پونجی اپنے ہاتھوں لٹا بیٹھو گے۔“ جاتے جاتے انہوں نے ایک اور بات سمجھا ڈالی تھی۔
 ”ہوں۔۔۔! جانتا ہوں۔۔۔ اسی لیے تو آفس سے چپ چاپ واپس چلا آیا۔۔۔ ورنہ اس لڑکی کو وہاں سے نکال کر ہی دم لیتا۔“ رضا حیدر دانت پیس کر بولے تھے۔
 ”ہوں! ایسے معاملوں میں اسی طرح سیاست اور ذہانت سے کام لینا چاہیے۔“ قیام مرزا نے انہیں سراہا تھا اور دونوں نے ایک ساتھ واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

ولید بڑے شکستہ انداز میں گھر پہنچا تھا اور کسی سے بھی بات کیے بغیر چھت پر آکر لیٹ گیا تھا۔ زبیدہ بیگم، وحید اور کککو کو خاصی تشویش ہوئی تھی کہ اسے آخر کیا ہوا ہے کہ وہ آج خلاف معمول ان سب سے بات کیے بغیر ہی چھت پہ چلا گیا ہے، یہاں تک کہ کپڑے بھی چھینچ نہیں کیے۔
 ”امی۔۔۔! سب خیر تو ہے نا؟“ کککو برآمدے سے اٹھ کر ماں کے پاس صحن میں آ بیٹھی تھی۔
 ”خیر ہوتی تو کیا اس طرح ہوتا۔؟“ زبیدہ بیگم بھی دل ہی دل میں پریشان ہو رہی تھیں۔
 ”تو آپ پوچھیں یاں۔؟“ کککو ان سب سے چھوٹی تھی لیکن بھائی کو اس کیفیت میں دیکھ کر ان سب سے زیادہ فکر مند ہو رہی تھی۔
 ”نہیں۔۔۔ فوری پوچھنا اور کریدنا ٹھیک نہیں ہوتا، فی الحال اسے تھوڑا ریلیکس ہونے دو۔“ انہوں نے بیٹی کو سمجھایا۔
 ”امی۔۔۔! ریلیکس ہونے کے لیے آدھا گھنٹہ کافی ہوتا ہے۔۔۔ اور انہیں چھت پہ گئے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے۔“ وہ لٹا انہیں سمجھا رہی تھی۔
 ”ہوں۔۔۔ تو ہے۔۔۔ خیر، تم ایسا کرو چھت پہ جاؤ اور اس سے پوچھو کہ کھانا کھائے گا یا چائے چاہیے۔؟“ اور یہ بھی کہو کہ شاور لے کر فریش ہو جائے۔ پھر بجلی چلی گئی تو تازہ پانی بھی نہیں ملے گا۔“ وہ اسے ولید کے پاس جانے

اور بات کرنے کے بہانے سمجھا رہی تھیں۔
 ”لیکن امی! یہ سب کرنے سے اور کہنے سے کیا ہو گا۔؟“ ککو نے سوال اٹھایا۔
 ”اف ککو۔ مجھے مزید تنگ مت کرو۔ یہ سب کہنے اور کرنے سے یہ ہو گا کہ اس کے موڈ کا پتہ چل جائے گا۔ کم از کم یہ اندازہ تو ہو گا ناں کہ وہ غصے میں ہے۔ اور اس ہے یا ویسے ہی پریشان ہے؟“
 زبیرہ بیگم نے ککو کے سوال سے عاجز آ کر جیسے سر پیٹ لیا تھا اور ککو ان کے موڈ سے گھبرا کے بے ساختہ کھڑی ہو گئی تھی۔
 ”اگر بھالی نے مجھے ڈانٹا ناں تو اچھا نہیں ہو گا۔ میں جا رہی ہوں اور۔“
 وہ خفگی سے ماں کو دھکی دیتی ہوئی بیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی حالانکہ جانتی تھی کہ ولید نے اسے آج تک نہیں ڈانٹا تھا۔
 ولید سامنے چارپائی پہ چاروں شانے جٹ لینا آنکھوں پہ بازو رکھے نجانے سو رہا تھا یا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر حال ککو پھر بھی اس کے قریب چلی آئی تھی۔
 ”بھالی! اس نے قریب آ کر آہستگی سے پکارا۔
 لیکن اپنی شکستگی کے شکنجے میں جکڑا ولید اس کی یہ آواز نہیں سن سکا تھا۔
 ”بھالی! اب کی بار اس نے ولید کا پاؤں ہلایا تھا اور ولید نے یکدم چونکتے ہوئے چہرے سے بازو ہٹا دیا۔
 ”کیا بات ہے۔؟“ ولید کا لہجہ بہت دھیمہ اور بوجھل محسوس ہو رہا تھا۔
 ”بات تو کچھ نہیں ہے۔ بس آپ سے پوچھنے آئی تھی کہ کھانا کھائیں گے یا چائے لیں گے؟“ اس نے بڑی معصومیت سے بڑا سیدھا سوال کیا تھا۔
 ”کچھ نہیں لوں گا۔ کسی چیز کو دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
 ”تو جس چیز کو دل چاہ رہا ہے وہ بتا دیں۔“ ککو نے بنا سوچے سمجھے ہی اتنا بڑا سوال کر دیا تھا۔
 ”میرا خود کو گولی مار دینے کو دل چاہ رہا ہے۔ تو ایسی کیفیت میں کیا کروں۔؟“ ولید انتہائی تلخی سے بولا۔ اور ککو نے یکدم تڑپ کر اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ لیے تھے۔
 ”ہائے اللہ نہ کرے۔! آپ ایسا کیوں بول رہے ہیں۔؟ اللہ آپ کو ہماری بھی زندگی دے دے۔ آپ کے سوا ہمارا کون ہے بھلا؟“ ککو کا لہجہ روہانسا سا ہو گیا تھا اور ولید اس کی بھرائی ہوئی آواز اور بھری ہوئی آنکھیں دیکھ کر پکھل گیا تھا اور اسے بھی فوراً ہی اپنے الفاظ کی سختی کا احساس ہو گیا تھا۔
 ”سوری۔ میری گڑیا۔!“
 وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر اسے ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کو کہا تھا۔
 ”ادھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔“ اس نے ککو کو چارپائی پہ اپنے قریب بیٹھنے کو کہا۔
 ”میں نہیں آؤں گی۔ آپ نے اتنی دل رکھانے والی بات کیوں کہی ہے۔ آپ کو پتا ہے ناں اگر امی نے سن لیا تو سن کر ہی مرجائیں گی۔“ ککو کے آنسو بہہ نکلے تھے۔
 ”اف ککو۔! کیا کہہ رہا ہوں میں۔؟ ادھر آؤ۔ میرے پاس بیٹھو۔“ ولید نے جان بوجھ کر مصنوعی خفگی کا اظہار کیا اور ککو اس کی خفگی سے خائف ہوئی اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی تھی۔
 ”پہلی بات تو یہ کہ تم سے کتنی بار کہا ہے کہ پاؤں پکڑ کر مت جگایا کرو۔ اس طرح اچھا نہیں لگتا۔ بازو یا کندھا ہلایا کرو۔“ ولید کو ککو کی اس عادت پہ ہمیشہ یہی خفگی ہوتی تھی وہ جب بھی بھی جگانے کے لیے آئی تھی اس کا پاؤں ہلایا کرتی تھی اور ولید اس کی اس حرکت پہ ہمیشہ ہی اسے ٹوکے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا

تھا کہ اس کی چھوٹی بہن اس کے پیروں کو ہاتھ لگائے۔
 ”سوری۔! عادت ہو گئی ہے۔“ اس نے معصومیت سے منہ پھلا کر معذرت کی۔
 ”عادت کنٹرول کرنے کے لیے ہی تو کہتا ہوں۔“ اس نے ککو کے سر پہ ہاتھ رکھ کے اس کے سر کو جان بوجھ کر جھنجھوڑنے والے انداز میں ہلایا تھا۔
 ”تو آپ بھی تو اپنی عادت کو کنٹرول کریں ناں۔؟ کیوں اس طرح چہرے پہ بازو رکھ کے پریشان سے انداز میں لیٹ جاتے ہیں۔؟ آپ کو دیکھ کر ہم تینوں کو طرح طرح کی فکریں ستانے لگتی ہیں۔“ اس نے برملا شکوہ داغا۔
 ”کوئی وجہ ہوتی ہے تب ہی ایسا کرتا ہوں ناں۔؟ بے وجہ پریشان ہونے اور بے وجہ چہرے پہ بازو رکھ کے لیٹنے کو تو کسی کا بھی دل نہیں چاہتا ناں۔؟ خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ اچھی سی چائے پلاؤ۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔“
 ”آپ کے سر میں درد ہو رہا ہے تو آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔؟ میں پہلے ہی چائے لے آئی۔“ ککو کہہ کر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
 ”تم کون سا پہلے پوچھنے کے لیے آئی ہو۔“ ولید بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔۔۔ وہ تو امی نے مجھے بہانے سے بھیجا ہے۔“ وہ کہتے کہتے آخری سچ بھی کہہ ہی گئی تھی اور ولید ایک زبردستی کی مسکراہٹ مسکراتا ہوا اس کے ساتھ ہی نیچے اتر آیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی وجہ سے اپنی ماں اور اپنے بہن بھائیوں کو پریشان ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آخر اس قصے میں ان کا کیا قصور تھا بھلا؟
 جو بھی ہوا تھا بس دل کی غلطی تھی۔
 اپنی اوقات سے بڑھ کے پاؤں پھیلا بیٹھا تھا۔
 بڑے لوگ تھے۔ بڑی باتیں تھیں اور بڑا غصہ تھا۔
 ذرا سی بے رخی یہ کایا ہی پلٹ کے رکھ دیتے تھے۔ ایسے لوگوں سے دل لگانا تو اوکھلی میں سر دینے کے برابر تھا۔
 لیکن افسوس کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اب وہ اس اوکھلی میں سر دے چکا تھا۔
 ☆ ☆ ☆
 ”ہاں اب بتاؤ کیا ارادہ ہے تمہارا؟ آج تو سنڈے ہی ہے ناں۔؟“ ماورا ابھی سوکرا ٹھی بھی نہیں تھی کہ فارہ نے صبح صبح ہی فون کھڑکا دیا تھا۔
 ”اف فارہ۔ تم ہوش میں تو ہونا۔؟ ابھی تو میں بستر سے بھی نہیں اٹھی۔“ ماورا نے منہ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے جمائی کو روکا تھا۔
 ”ہاں۔“ امیں ہوش میں ہوں۔ کیونکہ میں بستر سے کافی دیر ہوئی اٹھ چکی ہوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ اب تم بھی ہوش و حواس میں آ جاؤ اور بستر سے اٹھ جاؤ۔“ فارہ تنک کر چمک کر بولی تھی۔
 ”اوہو۔۔۔ آج تو بڑی سینہ زوری کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ کیا بات ہے؟ کوئی اچھا خواب دیکھا ہے یا کسی خواب کی تعبیر اچھی دیکھی ہے؟“ ماورا اپنی کہنیوں پہ زور ڈالتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھی اور بیڈ کراؤن سے ٹیک لگالی تھی۔
 ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں رات بھر سوئی ہی نہ ہوں۔۔۔؟“
 ”اچھا چھوڑو یہ بتاؤ کہ کیا پروگرام ہے تمہارا۔؟“ ماورا نے ٹاپک ہی بدل دیا تھا۔
 ”میرا پروگرام تو یہی ہے کہ تم اپنی چھوٹی سی فیملی کے ساتھ آج کے دن کا لچ اور ڈنر میرے گھر پہ ہی کرو۔ لیکن اس پروگرام کے حوالے سے تمہاری کیا رائے ہے؟ اس کے لیے منتظر ہوں۔؟“
 فارہ اس کی پوری فیملی کو انوائٹ کر رہی تھی جو کہ محض تین افراد پہ مشتمل تھی اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ

افراد کے حصے کی اسے معذرت ہی موصول ہوگی۔ لیکن پھر بھی ایک موبوم سی امید کے تحت کہہ ہی دیا تھا۔
 ”اس پروگرام کے خاتمے سے میری کیا رائے ہوگی کہ تم سے بہتر اور کوئی بھی نہیں جانتا۔ اس لیے تمہیں مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں آؤں تو پھر صرف مجھے ہی انوائٹ کرو۔ جی گل اور امی والا پروگرام کسی اچھے وقت کی امید پر رہنے دو۔“ ماورا نے کہا تھا اور فارہ پہلے سے ہی جانتی تھی اس لیے چپ ہو گئی تھی۔

”اوکے۔! تو پھر تم کب آرہی ہو؟“

”تقریباً بارہ بجے تک۔!“ ماورا نے وال کلاک دیکھا جہاں آٹھ بج رہے تھے۔

”بارہ بجے نہیں دس بجے؟“ فارہ نے دس بجے کا ٹائم دیا۔

”دس بجے کیوں؟ اتنی جلدی کیا ہے آخر؟“ اسے تعجب ہوا تھا۔

”میں تمہیں محض کھانا کھانے کے لیے نہیں بلارہی۔ بلکہ کچھ دیر اپنے پاس بیٹھنے اور باتیں کرنے کے لیے بلارہی ہوں۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ تم گھر سے ذرا جلدی نکلو۔“
 فارہ لفظ چبا کر بولی تھی اور ماورا اس کے اس اصرار پر سر جھٹک کر رہ گئی تھی۔
 ”اف! شادی کے بعد بھی اس لڑکی کی بے وقوفی اور بچپن میں کوئی چٹج نہیں آیا۔“ ماورا نے تاسف سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا اور چادر ہٹا کر بستر سے اتر آئی تھی۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ بی گل اور عافیہ بیگم کے صبر اور برداشت کا امتحان لیتی ٹھیک دس بجے گھر سے نکل آئی تھی حالانکہ اسے اندازہ تھا کہ دس بجے تو مارکیٹیں بمشکل کھلتی ہیں۔ لیکن پھر بھی اسے چالس لے لیتا ہی، بہتر لگا تھا۔

تب ہی اپنے سیل فون پر ہونے والی وائبریشن کی طرف دیکھا۔ جہاں ابھی ابھی فارہ کا میسج موصول ہوا تھا۔

”کہاں ہو؟“ میسج بھی مختصر ہی تھا۔

”راستے میں۔! اس نے بھی میسج ٹائپ کیا۔

”گلد۔ ویری گلد۔ جیتی رہو۔“ گلد میسج موصول ہوا۔

”تھینکس۔! ماورا لکھتے ہوئے مسکرائی۔

اور پھر مارکیٹ پہنچنے تک یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر یونہی کھلتی رہی تھی۔

وہیل میں بیکی سوچ رہی تھی کہ شاپنگ مال میں پہلا کسٹرومی ہوگی۔ لیکن نہیں۔ وہاں تو خاصی گہما گہمی نظر آرہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ اس جیسے سر پھرے اور بھی تھے۔ جن کو دیکھ کر وہ قدرے رُسکون ہو گئی تھی۔ بڑے اطمینان سے فارہ اور آفاق کے لیے گفتیں دیکھنے لگی۔ ابھی وہ اسٹینڈ پینگ کی ہوئی شرٹس میں سے ایک گرے کمر کی مردانہ قمیص نکال کر دیکھ رہی تھی کہ اچانک اپنے عقب سے ابھرنے والی آواز سن کر چونک گئی تھی۔

”ہوں۔! نائس۔! کمر اور آپ کی چوائس آؤٹ کلاس ہیں۔“ تیمور حیدر کے لہجے اور انداز سے ہی لگ رہا تھا۔ اسے وہ شرٹ کتنی پسند آئی ہے۔ اور ماورا اس کی اتنی پسندیدگی دیکھ کر اک نظر دوبارہ شرٹ کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

”کیا دیکھ رہی ہیں؟ دیکھیں مت۔ بس خرید لیں۔“ تیمور نے بڑے دل سے اسے مشورہ دیا تھا۔ لیکن ماورا کو

اس کے مشورے پر عمل کرنے سے پہلے سوچنے کی ضرورت پیش آئی تھی۔
 ”میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ جس کے لیے میں یہ شرٹ لے رہی ہوں اس پر یہ کمر اور یہ ڈیزائن سوٹ کرے گا یا نہیں؟“ اس نے وجہ بتائی۔

”ہوں۔! واقعی یہ سوچنے کی بات ہے۔ اپنی اوے آپ اس کی پرسنالٹی کو ”سامنے“ رکھ کے خریدیں گی تو آسانی رہے گی۔“ تیمور نے معنی خیزی سے کہا۔

”سامنے رکھ کے۔؟“ ماورا نے بھی اس کے جملے کے زور کو فوراً ”نوٹ کیا تھا۔

”سوری۔! بد نظر رکھ کے۔“ تیمور فوراً ”بات بدل گیا تھا اور دل ہی دل میں مسکرایا تھا جبکہ ماورا اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے چونکی تھی۔

وہ اسے دیکھنے میں کچھ بدلا ہوا سا لگا تھا۔

”کیا ”بد نظر“ اس طرح رکھتے ہیں؟“ تیمور اس کے نظر بھر کے دیکھنے پر بولا اور ماورا سر جھٹک کر رخ ہی موڑ گئی تھی۔ اسے اپنے آپ پر خفگی ہوئی تھی۔

”پلیز۔! یہ بھی پیگ کر دیں۔“ اس نے وہی شرٹ سیلز مین کی طرف بڑھا دی تھی۔ اور خود ایک اور شرٹ چیک کرنے لگی۔

”کیا میری کچھ ہیلپ کر سکتی ہیں آپ؟“ تیمور بھی اپنے لیے شرٹس پسند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کا سارا دھیان ماورا کی طرف تھا اس لیے وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

”سوری۔! میں لیٹ ہو رہی ہوں۔“ اس نے ٹالنا چاہا۔

”گھر پر کچھ کام ہے؟“ اس نے جان بوجھ کر گھر کا پوچھا۔

”نہیں۔!“ فارہ کے گھر سے۔ ”وہ بھی اپنی بے دھیانی میں بے ساختہ ہی کہہ گئی تھی۔ اور اپنی اس بے دھیانی اور بے ساختگی کا احساس اسے فوراً ہو گیا تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا بھلا۔؟

”اوہ! تو آج آپ اپنی دوست کے گھر جا رہی ہیں؟ ہا! کتنی خوش قسمتی ہے ان کی؟“ اس نے بڑے حسرت بھرے انداز میں کہا تھا۔

”کوئی اتنے شوق اور اتنی محبت سے انوائٹ کرے تو جانا تو پڑتا ہے نا؟“ ماورا نے کاؤنٹر پر رکھے اپنے تمام ہیگز اٹھا لیے تھے۔

”سچ کہہ رہی ہیں؟“ تیمور نے دہرا کے پوچھا اور ماورا اس کے دہرا کے پوچھنے کا مفہوم سمجھ گئی تھی۔

”جی ہاں۔! وہ ذرا سنبھل کر بولی۔

”ڈیس گرےٹ۔! لائیے یہ ہیگز میں اٹھا لیتا ہوں۔ آپ نے بے شک میری ہیلپ نہیں کی۔ مگر میں آپ کی ہیلپ ضرور کروں گا۔“ تیمور نے اس کے ہاتھ سے خود ہی تمام ہیگز تھام لیے تھے۔ اور ماورا اس کی بات نظر انداز کرتی وہاں سے نکل آئی تھی۔

”میں آپ کو ڈراپ کر دوں؟“ پارکنگ میں آکر تیمور کو نئی بات سوچھی۔

”آپ۔! ماورا پہلے رکی تھکی۔ اور پھر بے ساختہ ہی اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

”اوکے۔! اس نے کہتے ہوئے قدم تیمور کی گاڑی کی طرف بڑھا دیے تھے۔ اور وہ بے یقین سا اس کے پیچھے آتے ہوئے گاڑی کا لاک کھولنے لگا۔

اور آج پہلی بار اس کے ساتھ اس کی گاڑی کی فرنیٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے ماورا کو کچھ عجیب سا لگا تھا۔ حالانکہ وہ پہلے بھی ایک دوبار اس کے ساتھ فیکٹری آئی اور گئی تھی لیکن اس طرح تنہا نہیں۔ تب ڈرائیور یا فاروقی صاحب

ساتھ ہوتے تھے۔ جبکہ آج تو صرف وہ دونوں ہی تھے۔
”فارہ نے کیوں انوائٹ کیا؟ کہیں اس کا برتھ ڈے وغیرہ تو نہیں ہے؟“ تیمور کا اشارہ اس کے خریدے گئے
گفتگو کی طرف تھا۔

”نہیں۔! وہ دراصل میں جب سے کراچی آئی ہوں۔ آج پہلی بار اس کے گھر جا رہی ہوں۔ اس لیے یہ سب
ماورائے آخری جملہ ادھر اور اچھوڑ دیا تھا۔“
”لو۔! یعنی جب پہلی بار کسی کے گھر جاتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ یہ سب لے کر جانا پڑتا ہے؟“ اس کا
اشارہ پچھلی سیٹ پر رکھے شاپنگ بیگ کی طرف تھا۔

”نہیں۔! ایسا بھی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ سب صرف دو چیزوں پر ڈیپنڈ کرتا ہے۔ ایک آپ کے تعلقات پر اور
دوسرے آپ کے طبقے پر۔“ ماورائے اس کی بات کی نفی کی۔
”میں سمجھا نہیں۔؟“ وہ گاڑی روڈ پر ڈالتے ہوئے بولا۔

”میرا مطلب ہے کہ یہ سب آپ اسی کے لیے لے کر جاتے ہیں جس کے ساتھ آپ کے اچھے تعلقات ہوتے
ہیں جس کے ساتھ آپ کلوز ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ سب مل کلاس کے چوچکلے ہیں۔ آپ کلاس میں یہ
سب تکلفات نہیں پائے جاتے۔ اس لیے یہ سب صرف دو چیزوں تک محدود ہو کے رہ گیا ہے آپ کے تعلق اور
طبقے تک۔“ ماورائے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہوں۔! تو یہ سب لے کر جانے کے لیے کسی کے ساتھ کلوز ہونا یا مل کلاس ہونا ضروری ہے؟“ اس نے
گردن موڑ کر اور اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔! کہہ سکتے ہیں۔“ وہ لاپرواہی سے بولی۔
”تو پھر یہ بتائیے کہ میں بھی کسی کے لیے یہ سب لے کر جانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کسی
کے ساتھ کلوز ہو جانا چاہیے یا کسی کے لیے مل کلاس ہو جانا چاہیے؟“ اس نے ماورائے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے
پوچھا۔

”کسی کے ساتھ کلوز ہونا اور اپنی کلاس بدلنا دونوں ہی انسان کے اختیار میں نہیں۔“
”کیسے بھلا۔؟“ تیمور نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ضروری نہیں۔ آپ جس سے قریب ہونا چاہیں وہ آپ کو خود سے قریب ہونے کی اجازت دے اور جس کلاس
میں آپ پیدا ہوئے ہیں پرورش و تربیت ہوئی ہے۔ آپ کہیں بھی چلے جائیں۔ آپ وہی رہیں گے۔“

تیمور نے کندھے اچکاتے ہوئے سامنے دیکھا اسکرین پر نظرس جھانک کر۔
”کیا سوچ رہے ہیں؟“ ماورائے اسے چند منٹس متواتر خاموش دیکھ کر استفسار کیا۔

”یہی کہ مل کلاس میں کیسے شامل ہوا جائے؟“ وہ اپنے لہجے کی شرارت دبا نہیں سکا تھا۔ اور اس کے اس
شرارت بھرے لہجے پر ماورائے نے بے اختیار اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ اور اسے اب کی بار بھی وہ کچھ بدلا ہوا سا
نظر آیا تھا۔

جبکہ تیمور نڈا اسکرین کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود اس کی نظروں کی محویت نوٹ کر چکا تھا۔
”میری لک چینیج لگ رہی ہے نا؟“ اس نے ماورائے کی طرف دیکھے بغیر سوال کیا۔ اور ماورائے اس کے سوال پر گڑبڑا گئی
تھی۔

”اور کچھ نہیں کیا۔ بس کنگ کروا کے آیا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“ تیمور اس کی نظروں کی محویت اور پھر
اس کے یکدم گڑبڑا کر نکل ہونے پر اچھا خاصا لطف اندوز ہوا تھا۔ اسی لیے اس کا موڈ شرارت پر آمادہ ہو رہا تھا۔

”ویسے کیسا لگ رہا ہوں؟“ اس نے اپنے چہرے کا رخ ماورائے کی سمت موڑا۔
”آئینہ نہیں دیکھا۔؟“

”نہیں۔! جلدی میں تھا۔“ وہ مزے سے بولا۔

”لیکن ہیر سیلون کی تو ہر دیوار پر نکس آئینے ہوتے ہیں۔ جلدی میں بھی دیکھ لیے جاتے ہیں۔“
”لیکن جو آئینہ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔“ اس کا لہجہ ذومعنی ہوا۔

”تو اب گھر جا کر دیکھ لیجئے گا۔“ ماورائے لاپرواہی دکھائی۔

”اب گھر جا کر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ آئینہ میں نے راستے میں ہی دیکھ لیا ہے اور مجھے نظر
آ رہا ہے کہ میں اچھا لگ رہا ہوں۔“ آخر میں وہ مسکرا اٹھا تھا۔

”اور کتنی دیر سے فارہ کے گھر پہنچنے میں؟“ وہ بات ہی بدل گئی تھی۔

”لیجئے۔“ پہنچ گئے فارہ کے گھر۔ ”اگلے چند سیکنڈ میں تیمور نے اسپید کم کرتے ہوئے گاڑی سیدھی آفاق یزدانی
کے گھر کے گیٹ کے سامنے روک دی تھی۔“

”تھینک یو۔! ماورا مزید کچھ کہے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول کر اتر گئی۔ تیمور بھی تیزی سے نیچے اتر آیا تھا اور
پچھلا دروازہ کھول کر اس کے شاپنگ بیگ نکال کر اس کو تھمائے تھے۔“

”تھینک یو۔! تیمور نے بھی شکریہ ادا کیا۔“

”فارواٹ۔؟“ وہ ٹھہری۔

”یہ نہیں بتا سکتا۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔ اور ماورائے اس کے جواب پر چپ سی ہو گئی۔

”اوکے۔! میں چلتا ہوں۔“ مل آفس میں ملاقات ہو گئی۔ ”وہ کہہ کر پلٹ گیا تھا۔ دوسری سائیڈ سے جا کر
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور ابھی گاڑی اشارت کرنی رہا تھا کہ ماورا پھر گاڑی کے قریب آگئی تھی۔ تیمور نے تیزی
سے فرنٹ سیٹ کا شیشہ نیچے کیا۔“

”یہ آپ کے لیے۔!“ اس نے ایک بیک سیٹ پر رکھ دیا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ تیمور کو خیال ہی نہ رہا۔

”گفت۔! اس کا جواب بیک لفٹھی تھا۔“

”مگر کس لیے۔؟“ تیمور نا سمجھی سے بولا۔

”یہ نہیں بتا سکتی۔“ اس نے تیمور کے الفاظ اسے لوٹا دیے تھے۔

”یعنی مجھے خود ہی سمجھ جانا چاہیے۔“ وہ بے انتہا خوش ہوا تھا۔

”خدا حافظ۔! وہ کہہ کر پلٹ گئی تھی۔“

اور تیمور نے وہی گھرے شرٹ اپنے لیے دیکھتے ہوئے بے اختیار بڑی سرشاری سے گاڑی اشارت کرتے
ہوئے آگے بڑھا دی تھی آج اس کا اتوار بہت خوب صورت ثابت ہوا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قرۃ العین رائے



گلاس بھر کر لائی اور ثریا بیگم کی جانب بڑھایا۔
”لے پانی پی! اور بتا سب خیر تو ہے۔“ روا سے
گلاس لے کر انہوں نے بیٹی کے لبوں سے لگایا جس
نے ایک گھونٹ لے کر گلاس پرے کیا اور اپنی جانب
دیکھتی سوالیہ نظروں کو محسوس کرتے ہوئے وہ پھٹ
پڑی تھی۔

”میں... میں اب اس گھر میں کبھی نہیں جاؤں گی“
جینا دو بھر کر دیا ہے میرا ان لوگوں نے دم گھٹتا ہے میرا“
جب تک معاذ مجھے الگ گھر لے کر نہیں دیں گے میں
نہیں جاؤں گی۔“ اس کے ان جملوں سے گھر والوں کی
پریشانی اور بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”بات کیا ہے؟ اپنی بہن کی آنکھوں میں کسی کے
بھی دیے گئے آنسو میں ہرگز برداشت نہیں کروں
گا۔“ معاذ غصے سے آگے بڑھ کر بولا۔

”صرف ڈیڑھ مہینہ ہوا ہے شادی کو، لیکن ہر کوئی
مجھے یوں ٹریٹ کرتا ہے جسے شادی کو دس سال ہو گئے
ہوں۔ شادی کے تیسرے دن ہی یکن میں تین ٹائم کا
کھانا پکانے پر لگا دیا ساس صاحبہ نے یہ کہہ کر کہ وہ گھٹیا
کی مریضہ ہیں اور اب اس گھر کی مالکین میں ہوں لہذا
اب گھر میرے حوالے مسر صاحب کو صبح ہی صبح ناشتا
چاہیے کیونکہ وہ شوگر کے مریض ہیں۔ بھوک
برداشت نہیں کر سکتے۔ گھر کی مالکین نہیں میں تو گھر کی
نوکرانی بن گئی ہوں وہ بڑی دوندیں ہیں تو بیاہی مگر میری
بد قسمتی کہ دو گھنٹیاں چھوڑ کر ان کا سسرال ہے جب
دیکھو منہ اٹھا کر اپنے بچوں کے ساتھ آجاتی ہیں یہی

صبح کے وقت ہر کوئی اپنی مصروفیت میں گم تھا جب
کوئی بیرونی گیٹ کے چھوٹے داخلی دروازے سے اندر
داخل ہوا دودھ والا ابھی دودھ دے کر گیا تھا لہذا گیٹ
کھلا ہوا تھا داخل ہونے والے وجود پر نظر پڑنے پر
ہر کوئی اپنی جگہ ٹھہر سا گیا تھا بالکل ایسے جیسے چلتی فلم کو
ریموٹ کے ذریعے اسٹاپ کا بٹن دبا کر روک دیا
جائے۔ چھوٹی انعم، ثریا بیگم اور یکن کی کھڑکی میں سے
دیکھتی روا ہر کوئی اپنی جگہ ٹھنک کر رہ گیا۔ ابھی ڈیڑھ
مہینہ قبل ہی دھوم دھام سے رخصت کی جانے والی
زارا آج زرد چہرہ گریہ زاری سے سوچی آنکھیں الجھے
بال، مگنا جلیہ، انداز میں شکستگی لیے یہ وہ نوبیا ہوتا تو ہرگز
نہ تھی۔

”اماں!!!“ لڑکھاتی چال کے ساتھ وہ برآمدے میں
تخت پوش پر بیٹھی اماں کی جانب بڑھی اور ان کے گلے
لگ کر ہبھک ہبھک کر رونے لگی یہ صورت
حال گھر والوں کے لیے مزید پریشانی کا باعث بن گئی۔
معاذ اور یکن میں سے روا اس کے پاس آن کھڑے
ہوئے۔ سب کی آنکھیں سوالیہ تاثرات لیے ہوئے
تھیں۔

”یا اللہ خیر! کیا ہوا سعاد ٹھیک ہے؟“ ثریا بیگم نے
یوں روتی ہوئی بیٹی سے گھبرائے ہوئے انداز میں
پوچھا۔ ظفر صاحب بھی اٹھ کر پاس چلے آئے تھے۔
”ارے کچھ بتا تو میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے، ارے
کوئی پانی پلائے اسے بھی اور مجھے بھی رانا جلدی بول
ورنہ میرا بارٹ فیل ہو جائے گا۔“ انہوں نے ہلکتی رانو
کو خود سے الگ کرتے ہوئے کہا رونا جلدی سے پانی کا

نہیں اپنی سسرال میں سے کسی نہ کسی مہمان کو بھی
ساتھ لے کر آتی ہیں کہ بھابھی سے ملنے کا شوق تھا
ان کی خاطر مدارت بھی کرو اور مسکرا مسکرا کر ان کے
مہمانوں کا بھی خود سے ملنے کا شوق پورا کرو۔ ایسے میں
اگر ہمارا کہیں یا ہر جانے کا موڈ ہو تو کوئی نہ کوئی بھانجا
بھانجی لاؤ لے اکلوتے ماموں کے ساتھ دم چھلا بن کر
ساتھ ہو لیتے ہیں۔ شاپنگ کروں تو مندوں کی تنقید
بھابھی یہ کیا اٹھالا میں اس کی تو قیمت وکان وار نے زیادہ
دصول کی ہے مجھے شاپنگ کا سلیقہ نہیں اگلی دفعہ جب
شاپنگ پر جاؤں تو سعاد کے بجائے کسی منہ کے ساتھ
جاؤں۔ یہ میری ساس کا فرمان ہے۔ ہر کام میں کیڑے
نکالے جاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ دو غلا جملہ کہا جاتا ہے
کہ آہستہ آہستہ اس گھر کے اطوار سیکھ جائے گی اور
اب تو حد ہی ہو گئی ہے میں اور سعاد بنی مون کے لیے
تین دن کے لیے مری جانا چاہتے ہیں میں نے اپنی
ساری سلامی اس کے لیے بچا کر رکھی ہے جب یہ بتا چلا
تو میری نند اور چھوٹا دیور بھی تیار ہو گئے کہ ہم بھی

ساتھ جائیں گے مجال ہے جو سعاد نے منع کیا ہوا ناواہ
میری دونوں بیانی مندوں کو بھی ساتھ لے جا رہے
ہیں۔ رات اسی بات پر جھگڑا ہوا اور صبح دیکھتے سر کے
ساتھ میں نے چھوٹی نند صاحبہ کو کہا کہ وہ آج ناشتا
بنادے میرے سر میں درو ہے تو اس نے صاف انکار
کر دیا کہ جی آج تو میرا بہت اہم ٹیسٹ ہے لہذا مجھے
کالنج جلدی جانا ہے سعاد کو بتایا تو وہ النابھہ نے خفا ہونے
لگے کہ میں ان کے گھر والوں کو اپنا نہیں سمجھتی، اپنی
ذمہ داریاں نہیں سمجھتی بس ہر وقت شکایتوں کا دفتر
کھولے بیٹھی رہتی ہوں وغیرہ وغیرہ اور جو میں نے غصہ
میں کہہ دیا کہ بس اب مجھے اس گھر نہیں رہنا تو اسی
وقت گاڑی میں بیٹھا کر یوں یہاں دلیزبر اتار کر چلے
گئے۔“ زارا عرف رانو نے روتے بلکتے اپنا دکھڑا سنایا۔
معاذ اور ظفر صاحب کا تو غصہ سے برا حال ہو گیا تھا یہ
سب سن کر اس گھر کی پہلی لاڈلی اور چیتی بیٹی کی اتنی نا
قدری۔ انہیں رانا اپنی جگہ درست لگی۔



”کوئی ضرورت نہیں تمہیں وہاں جانے کی مجھے
اپنی بیٹی بھاری نہیں ہے جب تک وہ لوگ ناک
رگڑتے اس در پر آکر تمہیں منا کر نہ لے کر جائیں تم
یہیں رہو گی بیٹی دی ہے ہاتھ کاٹ کر نہیں مہم یہ
معاملہ ہمارے طریقے سے ہی بنے گا سعاد تمہیں
جب تک الگ گھر لے کر نہیں دے گا تم یہیں رہو
گی۔ انور ڈکڑا کر سکتا ہے وہ دوسرا گھر ورنہ دو وقت کی روٹی
بھاری نہیں مجھے اپنی بیٹی کی۔“ ظفر صاحب نے غصے
سے بیچ و تاب کھاتے ہوئے فیصلہ سنایا۔ اور زارا کے
چہرے پر باپ کی طرف سے پائی جانے والی شبہ پر سرخی
چھلکی تھی۔
”بالکل ٹھیک ہے زارا یہیں رہے گی سعاد کو اب جو
بات کرنی ہے ہم سے کرے اس کی ہمت کیسے ہوئی

زارا کو یوں — چھوڑ کر جانے کی اب ہم اس سے بات کریں گے۔ ”معاذ نے بھی جذباتی ہوتے ہوئے ظفر صاحب کے فیصلے کی تائید کی تھی اور زارا کے شکست خوردہ وجود میں گھر والوں کا حوصلہ دوڑنے لگا تھا۔

”بس! اب ایک لفظ اور نہیں، یہ اب اس گھر کی بیٹی نہیں ہے بلکہ اس کا اصل گھر وہی ہے جسے یہ اپنی بچکانہ اور بے وقوفانہ باتوں سے چھوڑ کر آئی ہے اور حیرت تو مجھے آپ کی عقل پر ہو رہی ہے بچہ اگر نادانی اور نا سمجھی میں رہتا تو مکہ پکڑنا چاہے تو اسے پکڑنے دیا جاتا ہے؟ ابھی شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے دل میں بغض رکھے گی تو ان لوگوں کی ہر بات الٹی ہی نظر آئے گی۔ کب دی تھی میں نے اسے بدگمانی کی عینک جینر میں جسے لگا کر یہ ان کے ساتھ بیرماندہ رہی ہے ٹھیک ہی تو کیا اس کی ساس نے یہ گھر کی مالکن ہے اور عورت کے گھر میں اس کی حکمرانی کچن سے ہی شروع ہوتی ہے سیاہ سفید کی مالک ہے یہ وہاں پر جو چاہے پکائے جو چاہے کھائے، حکمران تو بنادیا اس کی ساس نے اپنی گھر کی، جس کی ایک ایک اینٹ اس نے کتنی محنت سے لگائی ہوگی اب اگر اس گھر کے طور طریقے وہ سکھاتی ہے تو اسی کا بھلا ہے اور رہی بات مندوں کی تو شادی کے شروع کے دن ہیں نئی نئی بھابی ہے ان کا شوق ہے چاہے ان کی محبت ہے جو اپنا گھر بار چھوڑے اس کی مدد کو چلی آتی ہیں وقت کے ساتھ ساتھ یہ سب نارمل ہوتا جائے گا اور سچ بتا رہا تو کیا تیری مندیں کام میں تیرا ہاتھ نہیں بٹاتیں؟ اس روز جب میں تم سے ملنے گئی تھی تو تمہاری بڑی مند کپڑے دھونے والی مشین لگا کر تمہارے ہی میال کے کپڑے دھو رہی تھی اور دونوں مندیں کچن میں تمہارے ساتھ لگی ہوئی تھیں کہ معاذ نے اس روز اپنے دوستوں کی اچانک دعوت کی تھی تمہاری ساس نے اپنی دونوں بیابھی بیٹیوں کو فون کر کے تمہاری مدد کے لیے بلوایا تھا۔ تمہاری جیسی ہوتیں تو نکا سا جواب دے دیتیں۔ اپنا گھر بار اور کام کاج چھوڑ کر بھابی کی مدد کو کیوں آئیں اور تمہاری چھوٹی

مند کا گلے روز بھی ضروری ٹیسٹ تھا لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ رات کو پڑھ لے گی، آج یقیناً اس کی مجبوری ہوگی جو اس نے ناشتا بنانے سے انکار کیا اور یہ بھانجا بھانجی کا کیا گلہ وہ تو اپنے ماموں کے ساتھ ویسے ہی آتے جاتے ہیں جیسے ان کے ماموں نے شروع سے انہیں رکھا ہے اور یہ ہنی مون کا کیا تماشا ہے، کو اچلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا، یہ مونے انگریزوں کی نقل کرنے کا یہی انجام ہے وہ تو شربے مہار ہوتے ہیں نہ گھر میں ماں باپ بسن بھائی بس منہ اٹھا کر ہنی مون منانے چل پڑو بلکہ اس سے زیادہ اچھا تو یہی ہے کہ پوری فیملی مل جل کر کہیں گھوم آئے اکیلے دو منہ اٹھائے جنگلوں میں گھومتے پھوکیا اپنی ردا اور معاذ گئے ہیں؟ جو تم رات بھر شوہر سے بے بنیاد بات پر لڑتی رہی ہو اگر معاذ اور ردا جا رہے ہوتے ہنی مون پر اور تم سب بھی جانا چاہتے تو کیا معاذ بھی دو ٹوک انکار کر کے اپنی بیوی کی باتوں میں بائیں ڈالے چل پڑتا، برداشت کرتے تم سب یہ؟ تم نے ہماری تربیت کی خوب لالچ رکھی، عورت گھر بساتی ہے صبر سے، حوصلے اور برداشت سے، آج قربانی دو گی کل پھل پاؤ گی۔“

ثریا بیگم نے بارعب آواز میں ظفر صاحب اور معاذ کو ٹوکتے ہوئے زارا کے لئے لیے۔ ”ثریا بیگم کی باتیں سن کر ہر کوئی چپ چاپ کھڑا رہ گیا تھا، زارا تو حیران پریشان ماں کاغھے بھرا پتھر بن رہی تھی۔

”معاذ گاڑی نکالو ابھی اسی وقت میں اسے گھر چھوڑ کر آؤں اور آئندہ اگر تم شوہر سے لڑ کر آئیں تو گھر میں گھسنے نہیں دوں گی اور خردار جو اپنے سرال کی برائیاں آکر یہاں کیں۔“ ظفر صاحب کا غصہ تو ثریا بیگم کی سچی کھری باتیں سن کر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا اور وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

”مگر ای۔“

”معاذ سنا نہیں میں نے کیا کہا ہے۔“ ثریا بیگم نے سختی سے معاذ کی بات کاٹی۔

”جلدی کرو تمہیں بھی آفس جانا اور معاذ کے آفس جانے سے پہلے اسے وہاں ہونا چاہیے۔“

ماں کا سخت انداز دیکھ کر زارا پھر سے رونے لگی تھی اسے امید نہ تھی کہ اماں اس کے ساتھ یوں پیش آئیں گی لیکن دل ہی دل میں وہ اماں کی باتوں کو سوچ کر شرمندہ بھی ہو رہی تھی، تالی دونوں ہاتھوں سے بجاتی ہے اس بات کی وہ قائل تھی اور رات بھر وہ جس طرح سعاد کے ساتھ لڑتی رہی اور صبح بھی وہ کتنی بدتمیزی سے بولی تھی وہ سب اب یاد کر کے اسے شرمندگی ہو رہی تھی واقعی اسے محل کے ساتھ کچھ وقت دینا چاہیے خود کو بھی اور اپنے سرال کو بھی۔

”آرے آئی آپ! ہم لوگ تو بس زارا کو لینے ہی آرہے تھے۔“ جب وہ لوگ زارا کے سرال پہنچے تو بڑی مندیٹ پر ہی مل گئی بہت تپاک سے وہ انہیں لاؤنج میں لے کر آئی جہاں اپنے والدین کے پاس سعاد سر جھکائے بیٹھا تھا، زارا کی ساس نے ہاتھ بڑھا کر جلدی سے زارا کو اپنے قریب بٹھا کر پار کیا۔

”کان کھینچے ہیں میں نے اس احمق کے اور اب یہ سین کے ساتھ چھپیں لینے آنا ہی والا تھا اگر تم کسی بات پر ناراض ہو گئی تھیں تو منانے کے بجائے تمہیں یوں میکے کے باہر چھوڑ کر چلا آیا، حد ہوتی ہے بے وقوفی کی، سین کو فون کر کے میں نے ہی بلایا ہے۔ تم تو جانتی ہو یہ مواکھیا کا مرض، ورنہ میں خود آئی اپنی پری کو لینے صبح سے پورا گھر بے رونق ہوا پڑا ہے۔“ زارا کی ساس نے بے حد پار سے بات کرتے ہوئے اپنی بڑی بیٹی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”سین سب کے لیے چائے بناؤ۔“

”آئی آئی ایم سوری مجھے بھی یوں آپ کو بتائے بغیر نہیں جانا چاہیے تھا۔ غلطی صرف ان کی نہیں میری بھی ہے چھوٹی سی بات بس میں نے ہی برہادی میں وعدہ کر لی ہوں آئندہ آپ سب کو مجھ سے شکایت نہیں ہوگی، کوشش کروں گی کہ ایسی غلطی دوبارہ نہ ہو آپ نے انہیں ڈانٹا ہے اور مجھے امی نے بہت ڈانٹا ہے ہم دونوں کو تو صبح صبح ڈانٹ کا ناشتا مل گیا ہے اب میں سب کے لیے مزے دار ناشتا بنا کر لاتی ہوں آئی ایم سوری سعاد۔“ ساس کی بات سن کر زارا کے دل سے

بدگمانی کے رہے سے بادل بھی چھٹ گئے اس نے اعتراف کرنے اور معافی مانگنے میں تامل نہ کیا اور سر جھکاتے ہوئے سعاد سے بھی سوری کی۔

”آئی ایم سوری تو مجھے بھی ایک دم اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سوری آئی اور معاذ! ہماری وجہ سے آپ لوگوں کو پریشانی ہوئی آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“ سعاد نے بھی کھلے دل سے معذرت کی اور معاذ نے بڑھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے اسے گلے لگالیا۔ ہر کوئی اپنی جگہ پر پرسکون ہو چکا تھا اور خوش تھا۔ زارا جھٹ سے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

اور ثریا بیگم سب کو پرسکون اور مسرور دیکھ کر سوچ رہی تھیں کہ آج اگر وہ بروقت درست فیصلہ نہ کرتیں تو تو ازل بگز جاتا زارا کی حالت اس کے رونے پر وقتی طور پر انہیں بھی بے حد غصہ آیا تھا مگر جیسے ہی ان کی نظر معاذ کے پیچھے خاموش کھڑی ردا پر پڑی، انہیں تصویر کا دو سرا رخ بھی نظر آگیا۔ زارا اور معاذ کی اکٹھی شادی ہوئی تھی انہوں نے بھی شادی کے تیسرے روز ہی ردا کو کچن سنبھالنے کے لیے کہہ دیا تھا کہ اب گھر کے کام ان سے نہیں ہوتا تھے وہ بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں اور آج صبح ہی ردا نے بھی انعم کو ناشتا بنانے کا کہا تھا کہ اس کے سر میں درد ہے مگر انعم نے کانج جلدی جانے کی وجہ سے منع کر دیا تھا جس پر وہ خاموشی سے کچن کی جانب بڑھ گئی تھی۔ ایسے ہی چھوٹے مونے گلے شاید ردا کو بھی ان سے ہوں گے اور اگر آج وہ زارا کا ساتھ دے دیتیں اس وقت سختی سے پیش نہ آئیں تو ردا کی آنکھوں میں نمودار ہوتی شکایت وہ کبھی نہ دور کر پاتیں۔

وہ مطمئن انداز میں معاذ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اپنے گھر کی جانب جارہی تھیں جہاں ردا ان سب کے لیے مزے دار ناشتا بنا کر ان کی منتظر تھی اس وقت ایک پرسکون مسکراہٹ زارا کے لبوں پر تھی اور وہی ہی مسکراہٹ ردا کے لبوں پر تھی اور دونوں کی مسکراہٹ کا تصور ثریا بیگم کے لبوں پر بھی دھیمی سی پرسکون مسکان لے آیا تھا۔



قائتہ راجہ

لالہ

”ڈاکٹر سے شادی کیا ہوئی ہر چیز ہی اینٹی کی پیٹ میں آگئی۔ ہر وقت ادویات پر مہیز احتیاط“ علیہ نے سوچا۔

شادی سے پہلے گول گیوں وہی بھلے پار پی چاٹ کے ارد گرد زندگی گھومتی تھی۔ شادی کے بعد میاں سے پہلی فرمائش کی بھی تو یہ کہ ”سنا ہے آپ کے ہاں کے گول گے بہت مشہور ہیں۔“ یہ تو علیہ ہی جانتی تھی کہ گول گے کتے ہوئے صرف منہ ہی گول نہیں ہوا بلکہ آنکھوں میں اہلی کے پانی کا تصور کرتے ہی شرارے سے پھوٹنے لگے منہ سے رال نکلنے لگی۔

واہ۔۔۔ گول گے۔۔۔ خوب کھٹے پانی کے ساتھ وہ تصور میں گول گے دیکھ رہی تھی۔

”کیا کہا؟ گول گے۔۔۔ واٹ نان سینس، جانتی ہو بازار کی گندی اور کھیلوں والی اشیاء کھانے سے کتنی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔“ وہ خشکی انداز میں دیکھتے ہوئے بولے۔

”کوئی نہیں میں نے تو ہفتے میں دو دو سو روپے کے گول گے کھائے ہیں۔ مجھے تو کبھی کچھ نہیں ہوا، بلکہ ہاضمے کے لیے بہت اچھے ہوتے ہیں۔“ اب ڈاکٹر میاں کا نا کر اوکیل کی بیٹی سے تھا۔

”تمہیں کبھی کچھ نہیں ہوا؟“ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ علیہ خواہ مخواہ شرانگی۔ ”دیکھو تو کتنی کمزور ہو۔ وزن کیا ہے کبھی؟“

”اف۔“ علیہ نے سر ہٹا (اپنا) شادی سے پہلے دو ہزار مینے کے دے کر جم جو ان کی ڈانٹنگ کی ہر چکنی اور مرغن چیز سے منہ موڑا کہ باجی سارا وقت

”بارہ من کی دھو بن جاؤ گی“ کہہ کر ڈراتی جو تھیں اور ملے سارے کا سارا گول گیوں پر آن گرا۔

”اف گول گے۔“ اس نے آہ بھری۔ گول گیوں سے شروع ہونے والے لیکچر کا سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ وہ تین بچوں کی ماں بن گئی مگر مجال ہے جو ڈاکٹر صاحب کی ڈاکٹری میں رتی بھر فرق آیا ہو۔ سب سے پہلے چنورے بن کو الوداع کہا پھر کھٹی میٹھی چیزیں چھوڑیں۔ پھر پھلے پھلے کھانوں پر آئی اب تو وہ آدھی ڈاکٹر نہ

سی نرس تو بن ہی چکی تھی۔۔۔ دو سالہ بیٹے کو ہلکا سا نمیر پچر ہوتا فافٹ نہلا دیتی۔۔۔ کیل پول کا بیج دیتی۔ کھاسی ہوتی تو دوسرے سینے پر ملتی۔ کوئی نہ کوئی کف سیرپ بھی اٹھا کر ملا دیتی۔۔۔ چوٹ لگ جاتی تو آیوڈینس کا مساج کرتی۔۔۔ بی پی آپریٹس کے استعمال سے انجکشن لگانے اور فرسٹ ایڈ کے سارے کام اسے ”منہ زبانی“ آتے تھے۔ اس کی نو سالہ بیٹی نائلہ کو

خوب چھینکیں آرہی تھیں علیہ کا دل چاہا کہ ارار بھڑ لگائے غصے سے اس کو بلایا۔

”بے وقوف سارا دن کھٹے مائے کھائے ہیں نزلہ تو ہونا ہی تھا کیسے چھینکوں یہ چھینکیں مارے جارہی ہو۔ میں توہ بنا کر دیتی ہوں اور ساتھ میں اینٹی الرجک بھی۔ یہ لو۔“ علیہ نے سفید گولی اس کے ہاتھ پر رکھی۔

”بچے تو بچے ہوتے ہیں وہ آنکھیں ہٹھا کر بولی۔“ اماں! ہماری بچہ تو کہتی ہیں کہ مائوں میں وٹامن سی ہوتا ہے کیا وٹامن سی سے نزلہ ہو جاتا ہے؟ اور یہ



آس،

اک صہرا

جس کے ذرے پختے پختے

میری انگلیاں شل ہو جائیں گی

ایک سمندر

جس کے جرے پیتے پیتے

میری سانس اکھڑ جائے گی

شکب جلالی

کس کارن اتنے رنگوں سے یاری کس کارن یہ ڈھنگ
جتنے رنگ بھی چاہو زلیت میں بھر لو موت کا ایک ہی رنگ

نام و نمود سے اتنی دُوری ٹھیک ہے لیکن آخر کیوں
سارے جہاں سے قوسِ قزح کا رشتہ اپنے آپ سے جنگ

ہل میں دجی دجی بکھرنے والی ایسی ہے یہ زلیت
اک سے زیادہ پنچوں کے ہاتھوں میں جیسے کٹی پتنگ

عمر بتادی اپنوں اور عزیزوں کے نقش بنانے میں
جب اپنی تصویر بنانا چاہی پھیکے پر گئے رنگ

میں اک کھنٹے والا مجھ کو بنانا، یار احمد پر دیر
روح و قلم سے آگے بھی ہے کیا، یہ دنیا اتنی تنگ

صابر ظفر

انتقال ہو گیا ہے وہاں گئی ہیں، بابائے کمرے سے نکل کر
اسے بتایا وہ اپنے بابا کی شکل دیکھتی رہی۔

”ابا کس کا؟“ اس نے دوبارہ سوال کیا۔
”آپ کی آنٹی مہرین جو کل ہمارے گھر آئی
تھیں۔“ ابا کی آواز میں بھی سوگ اور دکھ تھا۔

”ابا انتقال فوت ہونے کو کہتے ہیں ناں؟“ اس نے
سہم کر پوچھا۔

”جی بیٹے۔“ ایک لمحے کے لیے ابا نے کہا ”زندگی
کی سب سے بڑی حقیقت تو موت ہے جس کا ہم اپنی
اولاد کو بتانا اس کے لیے تیار کرنا تو دور کی بات نام لینا بھی
پسند نہیں کرتے۔“ ابا نے خود کلامی کی۔

”ابا آنٹی مہرین تو بالکل ٹھیک تھیں۔ ابھی کل تو
انہوں نے ہمارے گھر میں اتنے سارے ہی بھلے اور
فروت چاٹ کھائی تھی۔ وہ تو بیمار نہیں تھیں وہ کیسے
فوت ہو گئیں۔“ اس کا چھوٹا سا دل بڑی طرح سہما
ہوا تھا۔ ایک جیتا جاگتا، کھیلتا کھاتا انسان موت کے منہ

میں کیسے جا سکتا ہے یہ تو اس نو سالہ بچی نے سوچا بھی
نہ تھا۔ لیکن خبر بہت بڑی تھی اس نے پھر باپ سے
سوال کیا۔

”ابا ان کو کیا ہوا تھا وہ آپ سے کون سی دوا لینے آئی
تھیں؟“

”بیٹے انہیں ذہنی بیماری تھی اور وہ مجھ سے اینٹی
ڈپریشن لینے آئی تھیں۔“

”اینٹی ڈپریشن؟“ وہ کیا ہوتا ہے ابا؟“
”بندہ جب بہت زیادہ سوچتا یا پریشان رہتا ہے تو جو
دوا دیتے ہیں اسے اینٹی ڈپریشن کہتے ہیں۔ انہوں نے
وضاحت کی۔

”ابا! ڈاکٹر ہر بیماری کی دوا اینٹی سے شروع کرتے
ہیں۔ تو آپ نے ان کو ایک گولی اینٹی ڈفٹھ کی بھی
دے دینا تھی۔ کیا یہ دوا آپ کے پاس نہیں ہے؟“
اس کے اس سوال پر ایک آنسو بابا کی آنکھ سے نکلا۔

”نہیں بس یہی ایک بیماری ہے جس کا علاج یا دوا
کسی کے پاس نہیں ہے۔“

اینٹی الرجک کیا ہوتا ہے؟“
”زیادہ باتیں نہ کرو اور گرم لحاف میں لیٹ جاؤ۔“
علینہ نے اسے گھر کا۔ صبح ناکلہ اٹھی تو اس کا جسم بخار
میں چنک رہا تھا۔ ناکلہ نے ہاتھ لگایا تو گویا آگ کی
بھٹی میں جل رہی تھی۔

”اف تمہیں بخار ہو گیا ناں۔!“ عینہ نے
حسبِ عادت ڈانٹا۔

”لیکن میں نے تورات اینٹی الرجک لی تھی اماں
ناکلہ منمنائی، عینہ نے تھراپیٹر سے بخار چیک
کیا۔

”اوہ میرے خدایا ایک سو دو۔“ عینہ نے فوراً
چائے پاپے دیے اور ساتھ ہی بڑا سا کیپول بھی۔

کیپول دیکھ کر ناکلہ گھبرا گئی۔
”اماں یہ کیا ہے!“
”بیٹے یہ اینٹی بائیوٹک ہے۔ انفیکشن کنٹرول
کرنے کے لیے۔“

دوا لے کر ناکلہ لحاف میں لیٹ گئی ابھی تین چار دن
پہلے ہا کھلتے کھلتے پیڑھیوں سے گرمی باہر سڑک کی
طرف پیڑھیاں نکلتی تھیں۔ اس کے کھنٹے پر خوب
رگڑ لگی تھی۔ اس وقت بھی اماں نے ابا سے پوچھے بغیر
کوئی دوا دی تھی اور ٹیکا لگوا دیا تھا۔ پتا نہیں کیا نام تھا

اس کا؟ اینٹی میپٹک ہاں اماں نے کہا تھا اینٹی
میپٹک لے لو، ورنہ زخم خراب ہو جاتا ہے اور
کیا ڈر کو بھیج کر ایک انجکشن بھی لگوا دیا تھا، عجیب سا
ہی نام تھا۔ میٹنٹس۔۔۔ نہیں نہیں میٹنٹس کا ٹیکا پتا

نہیں کب دوانے اثر کیا اور وہ نیند کی گود میں جا چکی۔
آنکھ کھلی تو طبیعت عجیب سی تھی۔ ہا اور مہران کی
آواز نہیں آرہی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر صحن میں آئی۔

اماں بھی غائب تھیں۔ اس نے گھبرا کر آواز دی، پسینے
اور بخار اترنے سے وہ بہت نقاہت محسوس کر رہی
تھی۔

”اماں۔۔۔ اماں آپ کہاں ہیں؟“
”آپ کی اماں کی دوست تھیں ناں مہرین آنٹی ان کا



شکایت

گئے اور کافی دیر اس کے ساتھ گپ شپ لگاتے رہے۔
کھانے کا وقت ہوا تو انہوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا
پھر شطرنج کی بساط بچھ گئی۔ کئی گھنٹوں بعد جب پروفیسر
صاحب رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر دوست نے رسماً
پوچھا۔

”گھر پر تو سب خیریت ہے نا؟“

پروفیسر صاحب چونک اٹھے۔
”خوب یاد دلایا تم نے۔ اصل میں میں تمہیں
لینے آیا تھا۔ میری بیوی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔“
نوشابہ فضل۔ کھاریاں

قابلیت

ایک دن شریف کا بیٹا اس کے پاس آیا اور بولا۔
”ذرا اپنا گدھا کچھ دیر کے لیے دے دیں۔“
”مجھے افسوس ہے کہ آپ کو گدھا نہیں مل سکتا،
کیونکہ آج صبح ہی ایک صاحب گدھا مانگ کر لے
گئے ہیں۔“ شریف نے معذرت کی۔

جس وقت شریف یہ بات کہہ رہا تھا عین اسی وقت،
اصطبل سے گدھے کی آواز آئی۔ بیٹا جان گیا کہ
شریف اسے ٹال رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ”میرا خیال
ہے کہ گدھا اندر ہے۔“

شریف نے شرمندگی ظاہر کیے بغیر بڑے وقار سے
جواب دیا۔ ”جو شخص انسان کے مقابلے میں گدھے
کی بات کا یقین کرے وہ اس قابل نہیں کہ اس پر اعتماد
کیا جائے اور اسے کوئی چیز دی جائے۔“

حراقربی۔ ملتان

خاوند

نفسیات کے ایک پروفیسر انسانی رویے پر لیکچر دے

میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی نوعیت جاننے
کے لیے ان کے ایک بزرگ نے بیوی سے پوچھا۔
”آخر تمہیں اپنے خاوند سے کیا شکایت ہے؟“
”یہ بات بات پر گالیاں دیتے ہیں اور کتوں اتنے
ہیں کہ گزارا کرنا بہت مشکل ہے۔“ بیوی نے شکایت
کی تو خاوند تلملا کر بولا۔

”کون کم بخت اس بد ذات، کمبختی اور گھٹیا عورت
کو گالیاں دیتا ہے۔ بکواس کرتی ہے اور سارے پیسے
اس کو دیتا ہوں۔ خواہ جیب میں پھولی کوڑی بھی نہ ہو۔“

حمیرا نوشین۔ منڈی بہاؤ الدین

اس نے کہا میں نے کہا

اس نے کہا۔ ”میں ہمیشہ اپنے دلی جذبات کا اظہار
پھولوں سے کرتا ہوں۔“
میں نے کہا۔ ”لیکن تم نے تو مجھے صرف ایک
پھول بھیجا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”در اصل میں بہت کم گو واقع ہوا
ہوں۔“
اس نے کہا۔ ”تمہارا کہا ہوا صرف ایک لفظ مجھے
کائنات کا سب سے خوش نصیب شخص بنا سکتا ہے۔
کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“
اس نے کہا۔ ”بہت بہت شکریہ۔ یہی وہ لفظ تھا۔“
ماہم اختر۔ راولپنڈی

پروفیسر صاحب

ایک پروفیسر صاحب اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے گھر



کچھ حقیقت تو ہوا کرتی تھی انسانوں میں

وہ بھی باقی نہیں اس دور کے انسانوں میں

وقت کا میل بہا لے گیا سب کچھ ورنہ

پیار کے ڈھیر لگے تھے میرے کھلیانوں میں

شاخ سے کٹنے کا غم ان کو بہت تھا لیکن

پھول مجبور تھے ہنستے رہے گل دانوں میں

ان کی پہچان کی قیمت تو ادا کرنی تھی

جاننا ہے کوئی اپنوں میں نہ بے گانوں میں

سر ہی ہم پھوڑنے جائیں تو کہاں جائیں گے

کھوکھلے کانچ کے بت ہیں ترے بت خالوں میں

سعید احمد اختر

بے اختیار رہنا، بے اختیار رکھنا

عشق و جنوں کو یونہی سر پر سوار رکھنا

تم سے بچھڑنے جاؤں اس غم کے شب کدے میں

تم دل کے آئینے میں مجھ کو اتار رکھنا

ہم ایک ہوں گے ایک دن پختہ یقین ہے مجھ کو

تم میری چاہتوں کے گیسو سنوار رکھنا

تیری نظر سے پی کر جو بے خبر پڑے ہیں

آنکھوں میں ان کی اپنا قائم خمار رکھنا

جتنے ہیں درد دل میں کاغذ پر تم اتارو

منظر نہیں مناسب دل میں عبا رکھنا

شعیب منظر

رہے تھے۔
”وہ آدمی جو غلطی پر ہو اور ہار مان لے، وہ عقل مند ہوتا ہے۔ اور وہ آدمی جو درست موقف رکھنے کے باوجود ہار مان لے۔ وہ کون ہوتا ہے۔“
”سر! وہ خاوند ہوتا ہے۔“ ایک طالب علم نے فوراً جواب دیا۔

کامل عدنان۔ کراچی

بد قسمتی

ایک صاحب دیسی علاقے کی سیر کو گئے اور ایک مقامی دیہاتی کو بطور گائیڈ اپنے ساتھ لے لیا۔ ادھر ادھر گھومتے ہوئے صاحب نے محسوس کیا کہ دیہاتی اپنے خراب حالات اور مالی تنگی کا مسلسل رونا رو رہا ہے۔ وہ صاحب قدرے جھنجھلا گئے۔

”تمہارے حالات اتنے خراب ہونے تو نہیں چاہئیں۔“ اپنی کوفت پر قابو پا کر انہوں نے کچھ نرمی سے کہا۔ ”تم بتا رہے ہو کہ تمہارے پاس تھوڑی بہت زمین بھی ہے۔“
دیہاتی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”جی جناب! ہے۔“

”تو تم اس پر کوئی فصل وغیرہ کیوں نہیں اگاتے؟“ صاحب نے کہا۔

”بس جی! کیا بتاؤں۔ قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔“ دیہاتی نے اپنی پگڑی اتاری اور روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا۔

”اُنی پھوڑ اور نکمی بیوی ہے میری۔ کھیتی باڑی میں ہاتھ ہی نہیں بٹاتی۔ زمین بے کار ہوئی جاتی ہے۔“

الماس تنویر۔ ہزارہ

سدا باب

پسند کی شادی کر کے کرائے کے مکان میں رہنے والا جوڑا شادی کے ابتدائی ایام میں تفریق کی غرض سے باہر نکلا۔ کافی دور نکل جانے کے بعد دفعتاً ”نویا ہوتا

بیوی نے کچھ پریشانی سے کہا۔
”اوہ۔۔۔ میں استری کا سوچ آف کرنا بھول گئی تھی۔۔۔ کہیں آگ نہ لگ جائے۔“
”تم فکر نہ کرو۔ آگ نہیں لگے گی۔“ شوہر نے اطمینان سے کہا۔ ”میں ہاتھ روم کا قتل کھلا چھوڑ آیا ہوں۔“

رشیدہ تہول۔ کراچی

سیاست دان

ایک طویل آپریشن کے بعد سیاست دان کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وارڈ کے تمام دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے ہیں۔ اس نے پوچھا۔
”یہ پردے کیوں گرادیے ہیں ڈاکٹر؟“
”بات یہ ہے جناب!“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”سڑک کے دوسری طرف بلڈنگ میں زبردست آگ لگی ہوئی ہے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ آپ ہوش میں آنے کے بعد یہ سمجھیں کہ آپریشن ناکام ہو گیا اور آپ جہنم میں پہنچ چکے ہیں۔“

حورین زیب۔ کھروڑپکا

نسخہ

”ڈاکٹر صاحب! میری زبان دیکھیے۔ میں پانچ منٹ سے باہر نکالے بیٹھی ہوں۔“ مریضہ چلائی۔
”ڈاکٹر بولا۔“ بس محترمہ! زبان اب اندر کر لیں۔ مجھے آپ کے لیے نسخہ لکھنا تھا۔ وہ میں نے سکون سے لکھ لیا ہے۔“

ماہر سرفراز۔ لاہور

چریل

”نویا آنٹی! ماما نے چینی منگوائی ہے۔“ ننھے عاطف نے کہا۔

نویا نے عاطف کو چینی دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا! تمہاری ماما نے اور کیا کہا ہے؟“
”آنٹی! ماما کہہ رہی تھیں۔ اگر وہ چریل چینی نہ

دے تو شگفتہ آنٹی سے لے آنا۔“ ننھے عاطف نے چینی سنبھالتے ہوئے مزے سے کہا۔

نسبت سنبھال۔ کھروڑپکا

جھوٹی امید

نجوی نے سائل کا ہاتھ دیکھنے کے بعد کھلا کھنکار کر صاف کرتے ہوئے کہا۔

”دیکھیے صاحب! میں کسی کو جھوٹی امید دلانا پسند نہیں کرتا۔ میرا علم کتنا ہے کہ انتالیس سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو جائے گا۔ اڑتیس سال کی عمر میں آپ شادی شدہ ہوں گے اور آپ کے سولہ بچے ہوں گے۔“

”کیا بات کر رہے ہیں۔“ ان صاحب نے بگڑتے ہوئے کہا۔ ”اڑتیس سال کی عمر میں میری شادی ہوگی! انتالیس سال کی عمر میں میں مرجاؤں گا تو میرے سولہ بچے کیسے ہوں گے؟“

”نجوی ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔“ آپ کی شادی جس بیوہ عورت سے ہوگی وہ پندرہ بچوں کی ماں ہوگی۔“

گریا شاہ۔ کھروڑپکا

بے عزتی

”تم نے پولیس والے کی بے عزتی کی ہے؟“ سارجنٹ نے غصے سے ملزم کو دیکھا اور پوچھا ”کیا تم نے اسے جھوٹا کہا تھا؟“

”جی ہاں۔“
”تم نے اسے چھپھورا کہا تھا؟“

”جی ہاں۔“
”تم نے اسے بھیڑا، لنگڑا، احمق اور ناکارہ بھی کہا تھا۔“

”جی نہیں۔“ ملزم نے سادگی سے جواب دیا۔
”باتیں تو اس وقت مجھے یاد ہی نہیں آتی تھیں۔“
(میرا سہیل۔ اوکاڑہ)

دوسری گولی

ایک سینما ہال میں پاکستانی پنجابی فلم چل رہی تھی۔ ایک سین میں ولن ایک تیار کی عزت لوٹنے کے لیے اس پر حملہ کرتا ہے۔ ولن کی ماں ہندو لے آتی ہے اور ولن کو گولی مار دیتی ہے پھر بڑے رعب سے گردن اکڑا کر کہتی ہے۔

”سن وے بے غیرتا! تینوں دوجی گولی ایس لئی نہیں ماری کہ۔“ اتنا کہہ کر ولن کی ماں خاموش ہو جاتی ہے۔ ولن سینہ تھام کر نیچے گر جاتا ہے اور غیرت مند ماں سے سوال کرتا ہے۔

”چھپتی دس ماں۔ توں دوجی گولی مینوں کیوں نہیں ماری۔“

”سن وے بے غیرتا! دوجی گولی تینوں ایس لئی نہیں ماری کہ۔“ ماں پھر خاموش ہو جاتی ہے۔ ولن پھر سوال کرتا ہے۔

”توں دسدی کیوں نہیں ماں! توں مینوں دوجی گولی کیوں نہیں ماری؟“

”لن کی ماں آخر سے سینہ تان کر کہتی ہے۔“ کن کھول کے سن وے بے غیرتا۔ دوجی گولی تینوں ایس لئی نہیں ماری کہ۔۔۔ ہندو بیچ اکواک اسی گولی سی۔“

شگفتہ فیاض۔ مشی گن امریکا

ایک کشتی کے سوار

مریض نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”جناب! میرے اعصاب بالکل جواب دے چکے ہیں۔ ذرا سی آہٹ پر چونک بڑتا ہوں۔ دروازے کی آہٹ بھی ہے تو دل دھڑکنے لگتا ہے۔ رات کو ٹھیک طرح سے سو نہیں پاتا۔ آخر مجھے کیا بیماری ہے؟“

”تمہاری اور میری بیماری میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم دونوں شادی شدہ ہیں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔
تادرو بخاری۔ کراچی

گلشنِ حیات

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت سنان بن سہل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
”کھانے والے شکر گزار کے لیے صبر کرنے والے روزہ دار جتنا ثواب ہے۔“ (مسند احمد)

فوائد و مسائل :-
1۔ صبر اور شکر دونوں اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ مسلمان کو نعمت پر شکر مصیبت پر صبر اور نیکی پر ثابت قدمی اختیار کرنی چاہیے۔

2۔ کھانا کھا کر شکر ادا کرنا بھی ایک نیکی ہے جب کہ کھانا حلال طریقے سے حاصل کیا گیا ہو اور وہ چیز خود بھی حلال ہو۔

3۔ جس طرح مردار اور خنزیر پر کاکوشت حرام ہے اسی طرح چوری، دہکے، دھوکے اور جھوٹ کے ذریعے سے یا تصویر سازی، شراب نوشی اور سودی کاروبار وغیرہ سے کمایا ہوا رزق بھی حرام ہے، ایسا رزق کھا کر زبان سے شکر کا لفظ کہہ لینے سے شکر ادا نہیں ہوتا۔

4۔ روزے کی افضلیت اس لیے ہے کہ وہ صبر پر مشتمل ہے۔ اللہ کے منع کیے ہوئے کاموں سے اجتناب کرنا بھی صبر ہے۔ اور نیکی کی راہ پر قائم رہنا بھی صبر ہے۔

5۔ شکر اور روزہ دونوں کے الگ الگ روحانی اور قلبی فوائد ہیں اس لیے مومن کو دونوں طرح کے اعمال کا اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مجذوم عورت کو طواف

کرتے دیکھا تو فرمایا،
”اے اللہ کی بندی! اپنے گھر بیٹھ اور لوگوں کو تکلیف مت دے۔“

وہ طوعاً و کرہاً چلی گئی۔ چند سال کے بعد دیکھا پھر آ رہی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت عمرؓ کا انتقال ہو چکا تھا مگر اس کو خبر نہ تھی۔ ایک شخص نے اس سے کہا،
”اب دل کھول کر طواف کر لے کیونکہ عمرؓ (جنہوں نے منع کیا تھا) وفات پا چکے ہیں۔“

اس نے بہت تاسف کیا اور انا للہ پڑھا اور کہا،
”میں اب اسندہ طواف نہ کروں گی۔ اگر عمرؓ زندہ ہوتے تو طواف کرتی۔ میں ان کو مردہ سمجھ کر نہیں آئی تھی۔ بلکہ زندہ سمجھ کر آئی تھی۔ طواف کے ثواب نے مجھے مجبور کیا اور میں نے جی میں کہا طواف کروں گی بہت سے بہت یہ سزا ہو جانے کی، عمرؓ ایسا شخص نہ تھا کہ زندگی میں تو اس کا حکم مانا جائے اور مرنے کے بعد نہ مانا جائے۔“ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

دنیا سے بے رغبتی،

بی حیثیت خلیفہ سیدنا علیؓ کی دنیا سے بے رغبتی کے بے شمار واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں شربت (فالودہ) پیش کیا گیا۔ آپ نے اس شربت کو مخاطب کر کے فرمایا،
”تیری خوشبو ابھی ہے، رنگ حسین ہے۔ مزہ لذیذ ہے مگر میں نہیں چاہتا کہ نفس کو ایسی چیز کا عادی بنائوں جس کا وہ اب تک عادی نہیں ہے۔“

سیدنا علیؓ نے بہت المال کی امانت و حفاظت کی بھی قابل تقلید مثال قائم کی۔ ایک بار خطبہ دیا اور فرمایا،
”لوگو! اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے تمہارے مال سے نہ تمہارا لیا ہے نہ بہت، سوائے

اس سٹے کے۔“ اور جب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر دکھائی جس میں عطریہ کوئی خوشبو تھی، سیدنا علیؓ نے کہا،
”مجھے ایک دہقان نے یہ دیا ہے۔“

پھر وہ بیت المال تشریف لائے اور کہا، ”یہ لوہہ شیشی (بیت المال میں جمع کرادی)“

عجیب و غریب،

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک دہساقی عورت ہمارے پاس اکثر آیا کرتی تھی اور اکثر یہ شعر کہا کرتی۔
”ہار والا دن ہمارے رب کے عجائب میں سے ہے خوب سن لو کہ اس نے مجھے کافروں کے شر سے نجات دی۔“

اس سے پوچھا گیا، ”یہ جو شعر تم اتنی کثرت سے پڑھتی ہو، لگتا ہے کہ اس کے پس پشت کوئی واقعہ چھپا ہوا ہے تو وہ کیا واقعہ ہے۔ ذرا بتاؤ تو سہی؟“

اس نے کہا، ”میں گاؤں میں ایک گھر میں کام کیا کرتی تھی تو ایک دن گھر والوں میں سے ایک لڑکی نے میرے سامنے ہار رکھ دیا۔ اتنے میں ایک شکاری چیل کا وہاں سے گزر ہوا۔ اور وہ ہماری بے خیالی میں ہار کو گوشت سمجھ کر کچک کچک کر لے گئی۔ چنانچہ جب ان لوگوں نے ہار تلاش کیا اور ان کو نہیں ملا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا،
”میں نے کہا، ”مجھے نہیں پتا۔“

انہوں نے کہا، ”تم ہی اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔“

میں نے قسم اٹھالی اور معذرت کی لیکن انہوں نے میری قسم اور عذر قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور مردوں کو بلوایا تو وہ آئے اور خوب جھان بین کی مگر انہیں کچھ نہ ملا۔

تو بعض نے کہا، ”اس نے اپنے کپڑوں میں چھپا لیا ہوگا۔“

چنانچہ انہوں نے میرے کپڑے اتارنے چاہے۔ اب ایسی عورت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ

اسے کیا کرنا چاہیے تھا جسے ایسا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ جب مجھے اپنی بے عزتی کا یقین ہو چلا تو میں نے اپنا سر آسمان کی طرف اٹھا کر کہا،
”یارِ باہ! اغثنی!“

ترجمہ: ”اے میرے رب! میری مدد کر۔“ اتنے میں چیل کا ہمارے اوپر سے دوبارہ گزر

ہوا اور اس نے ہار کو ہمارے پاس پھینک دیا۔ پھر وہ لوگ بہت نادام ہوئے اور کہا،
”ہم نے بے چاری پر ظلم کیا اور مجھ سے معذرت کرنے لگے۔“

چنانچہ جب بھی میں کسی مصیبت میں مبتلا ہوتی ہوں تو اسے یاد کرتی ہوں۔ اور راحت کی امید کرتی ہوں۔ بخاری شریف میں یہ فقہ مختصر الفاظ میں مذکور ہے۔

اس کے آخر میں جب اس عورت کو اللہ تعالیٰ نے نجات دلوائی تو اس نے کہا،
”اسی کے لیے تم لوگ مجھ پر تہمت لگا رہے تھے۔ حالانکہ میں اس سے بری تھی۔“

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

”تمہیں کسی شخص کی نماز اور روزہ دھوکے میں نہ ڈال دے جو چاہے روزہ رکھے، چاہے نماز پڑھے مگر اس کا کوئی دین نہیں جو امانت دار نہیں۔“

تین صفات،

جس انسان میں تین صفات ہوں گی وہ کبھی شرمندہ نہیں ہوگا۔

- 1۔ صبر و تحمل۔
- 2۔ صلاح و مشورے کی عادت۔
- 3۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ۔

دل آزاری،

کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ دل آزاری ہے۔ چاہے دل مومن کا ہو یا کافر کا۔

حلال اور حرام گوشت میں فرق،

امام جعفر صادق سے پوچھا گیا۔
”ذبح کیے ہوئے جانور اور مردہ جانور کے گوشت
میں فرق کیسے کیا جائے؟“
فرمایا: ”اگر گوشت آگ کی پیش سے سکر تلے
تو ذبح کا ہے۔ اگر پھیلے تو مردہ کا ہے۔“

ایمان کی پہچان،

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں۔
”دل کی تین ریگیں ہوتی ہیں۔ اگر اپنے ایمان کو پرکھنا
ہے کہ تمہارا دل زندہ ہے یا مر گیا ہے تو
1۔ قرآن کھول کے پڑھو، دیکھو دل لگ رہا ہے
یا نہیں۔
2۔ اس محفل میں بیٹھو جہاں اللہ کا ذکر ہو رہا ہو،
دیکھو دل لگتا ہے یا نہیں۔
3۔ تنہائی میں بیٹھ کر دیکھو کیا تمہاری تنہائی پاک
صاف ہے۔ اللہ بھی یاد آتا ہے کہ نہیں۔
اگر جواب ”نہیں“ میں ہے تو ذرا اللہ سے
دُعا کرو کہ تم پر رحم فرمائے۔“

زبان پر قابو،

بہرام گور ایک درخت کے نیچے آرام کر رہا تھا کہ
ایک پرندہ چمکنے لگا۔ اس نے فوراً تیر کر ان اٹھایا اور
پرندے کو گرا لیا۔ ادھر سے ایک فلسفی گزر رہا تھا۔
وہ بول اٹھا۔
”اگر یہ پرندہ ”زبان“ کو قابو میں رکھتا تو یہ انجام
نہ ہوتا۔“
(دانش عرب و عجم)
حراقریشی۔ ملتان

ہمدردی اور غم خواری،

حضرت محمد بن سیرینؒ نے ایک شخص سے پوچھا
کہ کیسے ہو؟
اس نے جواب دیا۔
”کیا حال ہو سکتا ہے اس شخص کا جو پانچ سو

درہم کا قرض دار ہو اور خیال کثیر رکھتا ہو اور ایک
پیسہ اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔“

یہ بات سن کر ابن سیرینؒ اپنے مکان پر تشریف
لے گئے اور ایک ہزار درہم لاکر اس کے حوالے کیے کہ
پانچ سو درہم قرضہ میں دے دو اور پانچ سو درہم
اپنے اہل و عیال پر خرچ کرو۔
اس نے فرمایا۔

”دریافت حال کے بعد علی طو پر غم خواری نہ کرنا
مناقت ہے۔“
مخدوم کا اپنے خادم کے حالات سے آگاہ ہونا
اور موقع و حالات کے مطابق تسلی، ہمدردی و ایش
کا اظہار کرنا اندوے شریعت ہے مد ضروری ہے۔

دونقص،

امیر المومنین مہدی نے ایک نیا محل تعمیر کروایا۔
خلیفہ نے فرمایا۔
”کسی شخص کو اس محل کے نظارے سے منع نہ کیا
جائے۔ ناظرین یا تو دوست ہوں گے یا دشمن۔
اگر دوست ہیں تو خوش و خرم ہوں گے اور دشمن
کی خوش دلی مطلوب ہے۔ اور اگر دشمن ہیں تو رنج
اٹھائیں گے اور دل کوفہ ہوں گے اور ہر شخص کی بھی
مراد ہوتی ہے کہ دشمن کو رنج پہنچے، نیز شاید وہ کوئی
عیب ڈھونڈیں اور کوئی نقص یا عاری بتائیں تو۔
اس نقص کو دور کر دیا جائے۔“

ایک فقیر نے کہا: ”اس محل میں دونقص ہیں۔
ایک یہ کہ آپ اس میں ہمیشہ نہ رہیں گے اور سرائے کہ
یہ محل ہمیشہ نہ رہے گا۔“
خلیفہ اس کام سے اس قدر خوش ہوا کہ وہ محل
غریب اور فقراء کے لیے وقف کر دیا۔



خواتین ڈائجسٹ



ستمبر 2014
کے شمارے کی ایک جھلک

- نمرہ احمد کا مکمل ناول ”نمل“،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول ”عہد الست“
- عائشہ نصیر احمد، عتیقہ ایوب اور راؤ سمیرا ایاز کے ناولٹ،
- سمیرا حمید، عدنان شاہ، معصومہ اقبال اور آسیہ مقصود
کے افسانے
- پیارے افضل کے ڈرامہ نگار ”خلیل الرحمن قمر“ سے ملاقات،
- ٹی وی فنکارہ ”عاصمہ جہانگیر“ سے باتیں،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، عدنان کے مشورے
اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا ستمبر 2014 کا شمارہ آج ہی خرید لیں



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

ماہنامہ شعاع۔ آری اور ایسٹس کی گفتگو کہانی کی بہت میں منت
نئے رنگ بھرتی اس کے لطف کو دیکھ کر کتنی مٹی۔ ارے ہاں
یاد آیا! "یارم" کی دوسری قسط کا اختتامیہ فقرہ زبردست تھا۔
گریٹ سکس! اگوا ایک ہی وقت میں آفریدی نے بالی
سکور کر کے سینچوری بنالی ہو۔
حمد کا پانچواں شعر کئی دفعہ پڑھا کہ اس میں اپنی دلی دلی
آرزو سے مقیم ہے۔ عید سروے میں پیاری قارئین
کی گفتگو حقیقت کے خیمے میں مستور حقیقت سے قریب
تر لگی۔
ج: پیاری حرا! میں بے حد افسوس ہے کہ عید سروے
میں آپ شامل نہ ہو سکیں۔ آپ کا سروے موصول ہوا تو
پرچا پریس جا چکا تھا۔ اس لیے آپ کا سروے شامل نہ کر
سکے۔ معذرت خواہ ہیں۔ اس ماہ بقرعید کے لیے جو
سروے دیا جا رہا ہے۔ اس کے جواب جلد بھجوا دیجئے گا
تاکہ شامل ہو سکیں۔
تبصرہ حسب معمول، حسب روایت بہت خوب ہے۔

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں
اللہ تعالیٰ سے آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے
لیے دعا میں اللہ تعالیٰ ہم آپ کو، ہم سب کو، ہمارے
پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین
پہلا خط بلال کالونی ملتان سے حرا قریبی کا ہے، لکھتی ہیں

"سروے" میں ہم نہیں کیا یہ "ظلم" نہیں؟
اچھی بھلی ہنسی مسکراتی عید بد مزہ سی لگنے لگی جب
سروے میں اپنا اسم خاص نہ پایا۔ ارے یہ کیا حیرت صد
حیرت! ساتھ رضا کا پہلا خط۔
"ایسے لکھا جاتا ہے خط؟ ایسے لکھتے ہیں خط؟" قلب
کے گم گشتہ پر اسرار کو نے سے صدا ابھری۔ تو رفیقہ من
ساتھ جی! کبھی ہم نے اپنا خط بھی اتنے ذوق و شوق سے نہیں
پڑھا بار بار جتنا اس کو ایک دفعہ "عائشہ فیاض" کا خط پڑھا
تھا تو ان حرف باکمال کی مٹھاس اور صداقت پر فوراً دل
نے کھتا تھا کہ یہ عام قاری نہیں اور بعد میں انکشاف ہوا
کہ وہ تو مصنفہ ہیں۔ خط وہ بھی کمال تھا اور یہ بھی باوشاہو!
محفل کا میلہ تے تے ساں لٹ لیتا! الغرض ان کے جملوں میں
عمیاں کارگر بے ساختگی، لطافت اور زندگی سے بھرپور
جملوں پر "واہ واہ" کیے بغیر نہ رہ سکے۔ پر توجہ باریک بین
پراثر تحریر کی مالکہ "سمیرا حمید" کی جانب بڑھتے ہیں۔
"یارم" ایک خوب صورت شاہکار کی طرح بہت نیچے سے
بہت اوپر جاتی دکھائی دے رہی ہے۔
لگی رہیں سمیرا جی! ہماری پر خلوص تمنا میں آپ کے ساتھ
ہیں۔ "زہر" قرۃ العین کی تحریر کا موضوع تو بچپن سے پرانا
تھا، لیکن ایک اچھوتا انداز لیے ہوئے تھا۔ "شکریہ"
عنیقہ جی ایک اچھا سبق منظر عام پر لانے کے لیے شکریہ!
"ہم سے ہے زمانہ" سبیل (میری اسٹوڈنٹ) نے شکایت کی
کہ "بہن چاری ورق لکھے تمہو بخاری نے؟" (منہ بسورتے
ہوئے) ہم نہیں بولتے آپ سے! "بہر کیف ہمیں تو ازلہ
خوشی ہوئی کہ انہوں نے اپنے نادر و نایاب وقت سے کچھ
لئے ہمارے لیے مخصوص کیے (سدا ہماروں کے سنگ
رہے ہنسی مسکراتی!) "محببتوں میں انا کی بات نہیں چلتی"
بھی اچھی کاوش رہی۔ دماغ میں پرست سوچوں کی نشوونما
کرتی آسہ رزائی کی تحریر نے عید سعید کی خوشیوں کو اپنی
نایاب تحریر سے مزید نایاب کر دیا۔ "منبعد عمر" کو فرست

نخالہ پچیلانی

نخالہ پچیلانی کی کہانی کا مطالعہ

البشر رفیق _____ ہارون آباد
وہ حیدر گریں جو مجھ پر تلاش کریں
چراغ ہم نے جلانے ہوا کے ہوتے ہوئے
اقرا ملک _____ گوجرانوالہ
سینے چھوڑ کے ساحل چلے تو ہیں لیکن
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس ٹھکانے لگتے ہیں
پلنگ جھلکتے ہی دنیا اُجاڑ دیتی ہے
وہ بستیوں جنہیں بستے زمانے لگتے ہیں
رومی انصاری _____ لاہور
اب نہ وہ منظر نہ وہ چہرے نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مرتلے ہیں
جانے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کے سب
ایک پل کے لیے دکھتے ہیں گزر جاتے ہیں
سعدیہ _____ دہر کی
ہم کو تو عمر کھا گئی محسوس ہمیں گدہ نہیں
دیکھ تو کیا سے کیا ہوئے یا بے کے خدو خال بھی
عروہ خان _____ کراچی
یہ انتقام بھی لینا تھا زندگی کو ابھی
جو لوگ دشمن جاں تھے وہ عم گساہ ہوئے
عائشہ جمیل _____ لاہور
مجھ سے پہلے رخ سادہ کی حقیقت کیا تھی
منہ نہ کھلواؤ مری بات گراں گزرے گی
تحریم _____ گوجرہ
مسماں ہو سکے نہ گھر وندے وفاؤں کے
آتے رہے پیار کی بستی میں زلزلے
ندا، فضلہ یوسف _____ کراچی
ایثار کے دیار سے نفرت کے شہر تک
ہیں کس قدر طویل محبت کے سلسلے

آپ کی تعریف و تہنید ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔
یو کے سے صائمہ اسد قریشی نے شرکت کی ہے۔
لکھتی ہیں

میں شعاع کی چوبیس سال سے خاموش قاری ہوں اور میں نے اسے ہمیشہ بہت معیاری اور بہت ہی اچھا پایا۔ خصوصاً ”مذہب کے حوالے سے اتنی اچھی تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں جن کا کوئی جواب نہیں۔ بہت ہلکے پھلکے انداز سے اسلامی معلومات مل جاتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ہم سب کو آپ کا ممنون ہونا چاہیے۔

آج جس چیز نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے وہ ہے ”ایک تھی مثال“ بے شک رخصانہ نگار نے بہت اچھے انداز میں لکھا ہے۔ رخصانہ نگار ہماری بہت سینئر رائٹر ہیں لیکن میں ان کو کہنا چاہتی ہوں کہ مثال اور واقع کا کردار بہت آپ سبب تک اور ڈپر تک لکھا ہے۔ بے شک یہ ہمارے معاشرے کی ہی کہانیاں ہیں ان میں بہت سچائی ہے لیکن آج کے دور میں ہر انسان پہلے ہی اتنا پریشانیوں کا سامنا کر رہا ہے اور بہت سی ہواؤں کو بالکل ایسے ہی حالات کا سامنا ہے لیکن قاری اپنے حالات میں سے وقت نکال کر ان ڈائجسٹ کو پڑھتا ہے تو وہ حق دار ہے کہ پڑھنے کے لیے

اتنی ہلکی پھلکی تحریریں ہوں جو کہ اپنی پریشانیوں سے ہٹ کر کچھ دیر کے لیے موڈ اچھا کر دے تاکہ اپنی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ ان کرداروں کی پریشانیاں بھی اعصاب پر سوار ہو جائیں۔ میری رخصانہ صاحبہ سے گزارش ہے کہ پلیز کہانی کو آگے جا کر ہلکا پھلکا لکھنے کی کوشش کریں تاکہ پڑھنے والا اپنے حالات کے ساتھ ساتھ ان کرداروں کے لیے بھی ڈپر بسند نہ ہو۔

باقی سب تحریریں بے حد دلچسپ اور اچھی تھیں۔
ج : پیاری صائمہ! بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے ہمیں اتنی دور جا کر بھی یاد رکھا ہے اور خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

زندگی اتنی آسان چیز نہیں ہے۔ یہاں ایک قدم غلط اٹھ جائے تو بعض اوقات بہت دور تک اور بہت دیر تک اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ رخصانہ نے اس ناول میں یہی بتایا ہے۔ جذبات اور غصہ میں آکر کی ہوئی ایک غلطی نے

نہ صرف ایک گھر توڑا بلکہ ایک لڑکی کا بچپن پھین کر اس کی زندگی کو محرومیوں کی نذر کر دیا۔ یہ کہانی آئینہ ہے ان لوگوں کے لیے جو طلاق کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس مسائل اور ٹینشن کے دور میں اس طرح کی دکھ بھری کہانیاں پڑھ دل افسردہ ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں اس کا احساس بھی ہے اسی لیے ہم زیادہ تر خوش گوار کہانیاں دیتے ہیں آپ نے خود اعتراف کیا ہے کہ باقی سب تحریریں ایسی نہیں تھیں۔ تو ایک کہانی ایسی بھی سہی۔
آپ کے اطمینان کے لیے بتا دیں کہ آگے کہانی ایک خوش گوار موڑ لے رہی ہے۔

سمیعہ انعم ضلع چنیوٹ سے لکھتی ہیں

پچھلے ماہ میرا خط شائع تو ہو گیا مگر ادھا ادھورا نام بھی غلط چھپ گیا میرا انجم جبکہ میرا نام ہے سمیعہ انعم اور ناول کا نام تھا۔ ”بیتے بل کا سایہ“ آپ نے لکھ دیا بل بیتے کا سایہ۔ بازار میرے گھر سے کافی دور ہے اور پھر میرا روزہ اوپر سے اتنی سخت گرمی میں سب کچھ بھلا کر محض اس لیے رسالہ لینے چلی گئی کہ اس میں میرا خط شامل سے مگر خط دیکھ کر بہت دکھ ہوا اور میں روہاسی ہو گئی۔ فریڈز کے درمیان سبکی ہوئی وہ الگ۔

ج : پیاری سمیعہ! معذرت خواہ ہیں آپ کا نام غلط شائع ہو گیا۔ آپ اپنے گاؤں کے بارے میں لکھیں ہم ضرور شائع کریں گے۔

اقراء ملک نے جو جرنالہ سے لکھا ہے پانچ سالہ خاموشی ”منعم سے صدمہ تک“ کے لیے توڑنی پڑی۔ منتظر کو حیا کی قدر نہ ہو سکی اور ماہم جیسی خود غرض اس کی بیوی بنی۔ ”رقص بزل“ میری فیورٹ کہانی ہے۔ ”ایک تھی مثال“ رخصانہ جی آپ مثال کے ساتھ بہت برا کر رہی ہیں۔

ج : پیاری اقراء! اب خاموشی ٹوٹ گئی ہے تو یہ سلسلہ جاری رکھیے گا اور ہمیں خط لکھ کر ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مدیحہ عارف نے لکھا ہے

میری کمی کسی کو محسوس نہ ہوئی ہوگی پر پھر بھی مجھے تو تمام مصنفین اور قارئین بے حد عزیز ہیں۔ اس بار خط

آپ کے میں موسٹ فیورٹ سائزہ رضا کا خط پڑھ کر دل جھوم اٹھا۔

نئی بات ہے میں تو سب سے پہلے سمیرا جی کے ناول ”یارم“ کی طرف گئی اور ایک ہی نشست میں پڑھ کر مزہ لیا۔ لیڈی مہر کا کیا کردار تخلیق کیا ہے، واہ اور عالیان اور امرجہ اوسم۔ امرجہ کی فائل گم ہونا عالیان کا اسے واپس لانا زبردست رہا۔ اس کے بعد آسیہ رزاقی کا نایاب ہیں ہم خوب عمدہ رہا۔ اس میں ٹویہ کا کردار دل کو بھلایا اور میرے خیال میں تو آج کے دور کی یہی ضرورت ہے کہ لڑکی باہمت اور بہادر ہو اور بچن بھی خوب سنبھالے میری طرح نہیں جو بچن کا نام سنتے ہی دوڑ لگا دیتی ہے۔

”بازگشت“ نے مزہ دیا۔ خوب انجوائے کر کے پڑھا۔ پر آدی کا یوں باہم کے لیے لاپرواہ ہونا اچھا نہیں لگا۔ اب رقص بزل کے راز سے پردہ اٹھ جانا چاہیے۔ ایک تھی مثال پتا نہیں اور کتنے دکھ لکھنے ہیں رخصانہ نگار عدنان نے مثال کی زندگی میں۔

افسانے سب ہی اچھے تھے ”شکریہ“ بازی لے گیا۔ مجھے بہت پسند آیا۔ اس کے بعد قرۃ العین کا زہرا اچھا رہا ایک عام سی گھر گھر کی کہانی اچھے الفاظ میں بیان کی انہوں نے اور اب محبتوں میں آنا۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے اس کا ذکر آخر میں کیوں تو وہ اس لیے کہ یہ مجھے بہت ہی زیادہ اچھا لگا۔ آؤ کہ ہم اپنی اپنی رجسٹروں کو بھلا دیں اس نظم نے تو مجھے اپنا فین بنالیا۔

ایک ریکویسٹ تھی پلیز دستک میں نواذ خان کو لائیے نا اور تاریخ کے جھروکے میں شیر شاہ سوری کو لکھیے۔

ج : مدیحہ! آپ کی فرمائشیں نوٹ کر لی ہیں۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔ بچن کا نام سنتے ہی آپ دوڑ لگا دیتی ہیں تو یہ راز بھی بتا دیں کہ آپ کے گھر والے آپ کو بخش کیسے دیتے ہیں ورنہ تو دس کام کر لیں اور ایک کام نہ کریں تو فوراً ”کام چوری کا طعنہ مل جاتا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے آپ کے ممنون ہیں۔ متعلقہ مصنفین تک تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے اور ایک ضروری بات نوٹ کر لیں کہ آپ کی کمی کوئی محسوس کرے یا نہ کرے، ہمیں بے حد محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں ہر ماہ باقاعدگی سے خط لکھا کریں۔

رافیہ کنول دیر و دن ہناہ سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

مجھے پڑھنے اور سیکھنے کا بے حد شوق ہے۔ مگر میرے آس پاس کے کچھ لوگ اسے میرا بگ پن سمجھتے ہیں اور جب بھی ان کو موقع ملتا ہے وہ میرے گھر والوں کو میرے خلاف اکسالتے ہیں۔ میرا دل دکھتا ہے۔ ٹائٹل بہت خوب صورت تھا نبیلہ جی کا ناول رقص بزل بہت شاندار جا رہا ہے۔ خاص کر عزت کی اس قدر بے نیازی پلیز آپی تیمور حیدر کے ساتھ کچھ غلط مت کیجئے گا۔ اس کے بعد سمیرا احمد کا ناول یارم یہ ایک ایسی کہانی ہے جس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ آسیہ رزاقی کا ”نایاب ہیں ہم“ ٹویہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے بالکل اچھی نہیں لگی سمیعہ عمیر کی بازگشت ایک منفرد کہانی تھی۔ ماہم کی معصومیت دل کو پسند آئی پلیز نبیلہ عزیز کا انٹرویو شامل کریں ہمیں انہیں پڑھنا چاہتی ہوں۔

ج : رافیہ! کوئی بلاوجہ برائی کرے یا تنقید کرے تو واقعی بہت دکھ ہوتا ہے لیکن اگر آپ اپنی جگہ درست ہیں اور خود کو حق بجانب سمجھتی ہیں تو بالکل توجہ نہ دیں۔ ایک بار دل میں یہ سوچ لیں گی کہ مجھے بلاوجہ کی باتوں پر دھیان نہیں دینا تو پھر آپ کو تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ پڑھنے اور کچھ سیکھنے کا شوق بہت اچھی بات ہے لیکن ایک بات کا دھیان رکھیں کہ کوئی بھی شوق جنون نہیں بنانا چاہیے۔ اعتدال سے ہٹ کر حد سے بڑھا ہوا کوئی بھی عمل خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔ اچھا نہیں رہتا۔

سمیرا حمید اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

طوبی اسلم نے سمیعہ جی آبادملتان سے شرکت کی ہے۔ لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت خوب صورت تھا۔ سب سے پہلے ”رقص بزل“ پڑھی۔ اچھی لگی۔ اس کے بعد سمیرا جی کا ”یارم“ کیا خوب لکھا ہے۔ نمروہ بخاری نے بہت انتظار کروایا لیکن اس بار ”ہم سے ہے زمانہ“ دیکھ کر سارے انتظار کی کوفت دور ہو گئی۔ میں ”میری کزنز اور بھائی بہن شوق سے پڑھتے ہیں نمروہ جی پلیز دوبارہ جلدی جلدی آئیے گا آسیہ رزاقی کا ”نایاب ہیں ہم“ عید کے لحاظ سے کچھ نٹ کھٹ سے رنگ

لیے اچھا لگا۔ سنیعہ عمیر کا "بازگشت" بھی بہت خوب تھا، خصوصاً اس ناول کی شروعات خاموشی کے ذکر سے جو شروع ہوئی۔ ان الفاظ نے کئی بار روکا۔ غور سے پڑھنے پر مجبور کیا۔ مسکوریہ۔ خطوط میں سائرہ رضا کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی۔ سائرہ جی بہت بڑی فین ہوں میں آپ کی۔ ج : پیاری طوطی آپ : آپ کی کزنز اور بھائی ہی نہیں سمر بخاری کو ہم بھی بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ وہ جتنا اچھا مزاح لکھتی ہیں ان کی سنجیدہ کہانیاں بھی اتنی ہی عمدہ ہوتی ہیں۔ جب سے نیوی کو پیاری ہوئی ہیں لکھنا کم کر دیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم اور ہمارے قارئین ان کی کیسے حد محسوس کرتے ہیں سمر آپ ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں۔ پلیز لکھنا چھوڑیں۔

سنیعہ عمرنی مصنفہ ہیں لیکن انداز کی پختگی، کہانی پر گرفت اور سب سے بڑی بات کہانی کے اختتام کا سلیقہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ آگے چل کر بہت اچھا لکھیں گی۔ سمر احمد اور سائرہ رضا خود کو منوا چکی ہیں۔ ہماری دعا ہے وہ ہمیشہ اسی طرح لکھتی رہیں۔ آمین

راجہ اسلم وڑائچ نے رحیم یار خان سے خط لکھا ہے اگست کا شمارہ خوب صورت ٹائٹل کے ساتھ بہت دیر سے ملا۔ عید سروے خوب رہا۔ رضیہ مہدی کی تحریر بہت اچھی لگی۔

سمر بخاری اپنے مخصوص اسٹائل کے ساتھ دلچسپ تحریر لے کر آئیں۔ ہلکی پھلکی سی۔ دادی کا کردار تو بڑا دلچسپ لگا۔ رمشہ خالد نے اچھے ٹاپک پر لکھا اور واقعی ہر شوق اعتدال میں اچھا لگتا ہے اور جناب عنیقہ محمد بیگ کی "شکریہ" تو بڑی دلچسپ لگی۔ بس اس کا نام حوریہ ہی رہنے دیتیں نا۔

قرۃ العین کی "زہر" سبق آموز تحریر تھی۔ اب بات ہو جائے "یارم" کی توجہ کیا ہی بات ہے۔ میں تو سمر احمد کی بہت بڑی (FAN) پکھی بن گئی ہوں۔ واہ بہت اعلیٰ۔ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔

ج : پیاری راجہ! شعل کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

بینا صدف نے ٹوپی سے شرکت کی ہے لکھا ہے ٹائٹل عید کی مناسبت سے کافی اچھا تھا۔ "ایک تھی مثال" پڑھی مثال کی حالت بڑھ کے بہت دکھ ہوا۔ میرے خیال میں ان سب میں سارا قصور عدیل کا ہے۔ کیونکہ مرد کو اگر اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا حق دیا ہے۔ تو اس پر یہ لازم ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر یہ حق استعمال کرے۔ یارم بہت ہی زبردست جا رہا ہے۔ عالیان کا امرہ کو ساگرہوش کرنے کا جملہ "کہ وقت تمہیں زندہ رکھے" بہت ہی اچھا بلکہ منفرد لگا۔ "رقص بک" شروع کیا۔ لیکن یہ کیا۔ ساتویں صفحہ پر ہی باقی آئندہ دیکھ کے کوفت کا شکار ہوئی۔ پلیز کچھ تو صفحات بڑھائیں "خط آپ کے" میں سائرہ رضا کا خط بہت ہی زبردست تھا۔

وہیے اس دفعہ عید پر شہرہ جی نے کافی نگہری عیدی دی ہے۔ شبلی اور جواد کی صورت میں۔ اب آتے ہیں۔ ہمارے پیارے شہر ٹوپی کی طرف۔ جو کہ کافی شہرت رکھتا ہے۔ کے کی کے کے نیلے گورنر صاحبزادہ عبدالقیوم خان کا تعلق اسی شہر سے ہے اور ان کی آخری آرام گاہ بھی یہی پر ہے۔ غلام اسحاق خان انسٹیٹیوٹ بھی یہیں واقع ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پرائیویٹ اور گورنمنٹ اسکولوں کی بھی بہتات ہے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ ہائی اسکول بھی ہیں۔ یہاں کے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ تربیلا ڈیم بھی ٹوپی کے نزدیک ہی واقع ہے۔

ج : پیاری بیٹا! آپ کے پیارے شہر ٹوپی کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا ہمارا خیال تھا۔ چھوٹا سا شہر ہو گا۔ یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ وہ بڑا شہر ہے اور وہاں تمام سہولیات بھی مہیا ہیں۔

شعل کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ نیلہ عزیز سے ہمیں بھی یہی شکایت ہے کہ وہ قسط بہت مختصر لکھتی ہیں۔

حسنہ زہرا نے ہنگو خیر بختون خواہ سے لکھا ہے شعل مجھے بہت بہت پسند ہے۔ شعل کے تمام اسٹاف کو میرا سلام۔ اللہ آپ لوگوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔

ج : پیاری حسنہ! شعل کی محفل میں خوش آمدید۔ خیر بختون خواہ سے خط موصول ہوتا ہے تو ہمیں بے حد خوشی

ہوتی ہے کیونکہ پہلے کے کی کے سے بہت کم نہیں خط لکھتی تھیں۔ پاکستان میں ایک خوش آئند تبدیلی آ رہی ہے۔

ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ پاک آپ کو سلامتی کے ساتھ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین امتہ السلام نے شیخوپورہ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ٹائٹل نے خوشگوار اثر ڈالا۔ ماڈل کو پسند آیا زبور خاص پسند نہیں آیا۔ رخسانہ نگار عدنان کے "ایک تھی مثال" کی طرف سب سے پہلے بھاگی۔ صد شکر کہ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ رخسانہ نگار عدنان کافی عرصے بعد آئی ہیں اور اپنے سحر میں باندھ چکی ہیں۔ رخسانہ نگار وہ رائٹر ہیں جن کا ذکر میں نے پہلی مرتبہ اپنی ای سی سے سنا۔ میری زی زی ان کی تعریفیں کرتی پانی نکلتی ہیں انہیں پڑھا تو قائل ہو گئی وہ اکثر انیسہ سلیم کا ذکر بھی کرتی ہیں آخر وہ کہاں ہیں؟ رقص بک ابھی تک مجھے کوئی خاص متاثر نہیں کر سکا نیلہ عزیز اس سے بہت بہتر لکھ سکتی ہیں۔

سائرہ رضائے بالکل ٹھیک کہا۔ سمر احمد کا نام پڑھتے ہوئے ان کی لکھی کہانی کو چوکنی ملی بن کر نہ رہوں، ایسا ممکن نہیں۔ سمر احمد کا افسانہ "بوند بوند تماشا" میرے ذہن میں نقش ہوا پڑا ہے ورنہ افسانے مجھے خاص یاد نہیں رہتے۔ سمر احمد کا "یارم" پڑھنے کے بعد میرے احساسات ایسے تھے کہ میرا دل کر رہا تھا کہ میں بھی کچھ کروں، نایاب ہیں ہم اور بازگشت دونوں کچھ خاص تاثر قائم نہ کر سکے۔ یہ بشری جی "سفال گر" کے بعد کہاں نکلیں میں تو انتظار میں اپنے فیورٹ بک + ناول کی ہیروئن بنی بیٹھی ہوں بس امید ہے کہ فاطمہ کی طرح جو

(The alchemist paulo Coehilo) ناول کا کردار ہے پر امید رہوں حتیٰ کہ بشری اپنے ناول کے ساتھ جلوہ گر ہوں جیسے فاطمہ کے لیے صحرا میں بھی امید آگئی تھی۔

ج : پیاری امتہ السلام! کچھ کرنے کو دل چاہا یہ ہی بڑی بات ہے۔ وہ کہانیاں جو بے عملی کی ترغیب دیں۔ ہمیں سخت ناپسند ہیں۔ صحیح سمت میں کوشش ہر انسان کا فرض ہے۔ کوشش کا نتیجہ انسان کی تقدیر ہے۔ بغیر کچھ کیے کچھ پانے کی توقع انتظار میں بیٹھنے والے اکثر ناکام ہی رہتے

ہیں۔ اور بقول ڈاکٹر عبدالقدیر خان انہیں ملتا بھی ہے تو اتنا جتنا کوشش کرنے والوں سے بچ جاتا ہے۔ شعل کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ایڈیٹر رفیق ہارون آباد سے شریک محفل ہیں لکھا ہے اس بار سارا شعل ہی لا جواب تھا جولائی میں ختم ہونے والے کنیز نبوی کے ناول "صنم سے صدم تک" میں حیا کے ساتھ ہونے والا سلوک بڑھ کر بہت روئی۔ اصل میں جولائی میں میرے آیا ابو کنیڈا سے آئے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا میرے لیے لب ٹاپ لانے کا وہ تو آگئے مگر لب ٹاپ نہ آیا کیونکہ وہ کزن لے کر آئے گا۔ اگست میں تو کچھ حیا کا دکھ اور کچھ اپنے لب ٹاپ کا میں نے آپ سے ایک ریگوسٹ کرنی ہے پلیز کوئی ایک آدھ سنوری ایسی بھی لکھ دیں جس میں ہیرو آرمی میں ہو پلیز۔ مجھے آرمی میں جانے کا جنون کی حد تک شوق ہے۔ آپ سب اور پڑھنے والے قارئین دعا کیجئے گا۔ مجھے کمیشن مل جائے اور خواب بھی۔ ج : ایڈیٹر! شمالی وزیرستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ہمیں بھی بے حد دکھ ہے شمالی وزیرستان آرمیٹن سے 20 لاکھ افراد بے گھر بے سرو سامان در بدر ہو گئے ہیں۔ ڈرون حملوں میں بے گناہ افراد شہید ہو رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ حق کی فتح ہو جو بے گناہ افراد شہید ہو رہے ہیں۔ ان بے گناہ لوگوں کا ہورایگاں نہ جائے اور ان بے گھر مظلوم افراد کے دکھی دلوں سے نکلتی دعائیں قبول ہوں۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کے حق میں بہتر کرے۔ آپ کا آرمی میں جانے کا شوق ضرور پورا ہو گا اگر شوق و لگن ہو تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتے ہیں۔

شعل کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ مصنفین تک آپ کی فرمائش پہنچائی جا رہی ہے۔

انیلہ، تول، الوین فاطمہ، سائرہ زاہد، افغان اشفاق ملتان سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

ماڈل کا ڈریس بہت زبردست تھا لیکن ماڈل پسند نہیں آئی۔ پچھلے ماہ سب سے زیادہ جو ناول پسند آیا وہ "صنم سے صدم تک" تھا۔ ویسے کنیز نبوی جی! آپ کے ناول کا ہر ہیرو اتنا ظالم کیوں ہوتا ہے۔ آپ اتنا زبردستی لکھتی ہیں لیکن اتنا کم کیوں لکھتی ہیں ہماری خواہش ہے کہ آپ سے ملاقات کریں۔ ایک تھی مثال اور رقص بک اچھے جا رہے ہیں۔

رمضہ خالد کا محبتوں میں ان کی بات بہت پسند آیا۔ عنیقہ کا افسانہ شکر یہ بہت زبردست تھا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ سمیرا حمید کا یارم اچھا جا رہا ہے لیکن سمیرا کا افسانہ دمڑی مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ پلیز کرکٹر احمد شہزاد کا انٹرویو شائع کر دیں۔ عفت سحر کا ناول بن مانگی دعا بہت پسند ہے۔

ہم اپنے گاؤں کے بارے میں بتانا چاہیں گے کہ ہمارے گاؤں کی سڑکیں پکی اور کشادہ ہیں۔ گاؤں میں صحت اور تعلیم کی سہولت موجود ہے۔ حال ہی میں ہمارے گاؤں کے قریب ڈگری کالج کا اجرا ہوا ہے جس کی وجہ سے اب ہر لڑکی آزادی سے تعلیم حاصل کر سکتی ہے۔ اگر گاؤں سے باہر جائیں تو سرسبز کھیت آنکھوں کو ٹھنڈک بخشتے ہیں۔ ضرورت کی ہر شے یہاں پر دستیاب ہے ہمارے گھر میں شعاع اور خواتین باقاعدگی سے آتا ہے اور ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ سب سے پہلے میں پڑھوں اور قرعہ فال سب سے پہلے بھابھی سائرہ کے نام نکلتا ہے۔ پلیز فرحت اشتیاق اور عمیرہ احمد سے کچھ لکھوائیں۔

ج : انیلہ بٹول، الوین فاطمہ، سائرہ زاہد اور افنان آفاق! سائرہ زاہد کا تو ہمیں آپ نے بتا دیا وہ آپ کی بھابھی ہیں جو سب سے پہلے شعاع اور خواتین پڑھتی ہیں۔ بانی آپ لوگ بہنیں ہیں یا کزنز۔؟ آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔ پاکستان کا دیہی علاقہ ترقی اور تعلیم کی طرف بڑھ رہا ہے وہاں لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ یہ امر ہمارے لیے بے حد خوشی کا باعث ہے۔

آپ سب لوگوں کا شکریہ۔ آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کیجئے گا۔

فوزیہ صادق کسوال سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے کافی عرصے بعد لکھنے بیٹھی ہوں۔ کچھ عرصے سے ایسی

صروفیت نے زندگی کو گھیر لیا کہ بہت بار چاہنے کے باوجود لیٹر نہ لکھ سکی۔ شعاع اور میرا ساتھ چودہ سال پرانا ہے۔ آج میں کسی خاص تحریر پر تبصرہ نہیں کر دوں گی۔ آج تو آپ سے اور سب قارئین سے ملاقات کرنے آئی ہوں قارئین کے لیٹر پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے بہت سی تحریریں جو نہیں پڑھی جاتیں ان کی تعریف یا تنقید پڑھ کر پھر ضرور میں وہ تحریر پڑھتی ہوں۔ کچھ عرصے سے بہت سی نئی رائٹرز

کا اضافہ ہوا جن میں امیہ خان قابل ذکر ہیں۔ کچھلے کچھ عرصے سے قسط وار ناولز بہت شائع ہونے لگے ہیں۔ آپلی آپ سے گزارش ہے کہ پلیز ناول کو اتنی اقساط میں نہ لے کر جایا کریں۔ آج کے جدید دور میں قارئین کے لیے اتنا انتظار کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، دوسری بات یہ کہ بے شک کہانیاں معاشرے سے ہی جنم لیتی ہیں رائٹرز سے گزارش ہے کہ تکلیف دہ موضوع کے بجائے ہلکے پھلکے موضوعات کو شامل کریں۔

غم زدہ، دکھی تحریریں پڑھ کر یقیناً ہماری سوچ بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے۔

اور کوئی بھی ہلکی پھلکی مزاح کا تاثر لیے ہوئے تحریر پڑھ کر ہم خود کو بھی بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگ جاتے ہیں۔

”ایک تھی مثال“ شروع سے اب تک میرا فیورٹ رہا ہے۔

”رقص بسل“ بہت ست رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ماوراکا کردار کچھ زیادہ ہی انارست سا ہے۔ سمیرا حمید کا ”یارم“ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہستی مسکرائی تحریر ”ہم سے ہے زمانہ“ میں جوادی اور شبلی کی شرارتیں اس بار پھر مزادے گئیں لیکن ان دونوں کی دادی اور ماموں کی کمی محسوس ہوئی۔

”خط آپ کے“ میں سائرہ رضا سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ سائرہ جی آپ کی تحریر جتنی بھی لمبی ہو مجھے تو ہمیشہ بہت پسند آتی ہے۔

ج : پیاری فوزیہ! طویل عرصہ بعد آپ کی آمد پر ایک خوشگوار سا احساس دل کو چھو گیا جیسے کسی پرانے دوست سے اچانک ملاقات ہو جائے۔

امیہ خان بلاشبہ ایک قابل قدر اضافہ ہیں، کچھلے ماہ سنیعہ عمیر کا مکمل ناول شائع ہوا تھا، ہمیں ان سے بھی بہت توقعات ہیں، میمونہ صدف، نور عین بھی اچھا لکھ

رہی ہیں اور سائرہ رضا تو واقعی کچھ بھی لکھیں، کمال لکھتی ہیں۔

قسط وار کہانیاں ہمیں بھی بالکل پسند نہیں لیکن مصنفین اگر طویل کہانیاں لکھیں تو آپ ہی بتائیں کہ کیا کیا جائے؟

عمرانہ جمیل نے میاں چنوں سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

”ایک تھی مثال“ میں رخسانہ نگار نے بہت اچھی طرح مثال کی ماں کی دکھاوے کی محبت کو واضح کیا۔ بہت گریٹ ہیں آپ۔

”یارم“ سمیرا حمید آپ نے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ ج : عمرانہ! مثال کی ماں کی محبت دکھاوے کی محبت نہیں ہے، رخسانہ نگار نے ایک ماں کی مجبوری دکھائی ہے جو ایسے حالات کا شکار ہو گئی ہے کہ اپنی اولاد کے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔

رخسانہ عبدالغفار نے شاہنکدر چک نمبر 155 سے لکھا ہے

غالباً سات آٹھ سال بعد آج ایک دفعہ پھر برم شعاع میں حاضر ہوں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ شعاع پڑھنا چھوڑ دیا۔ بس گردش دوراں میں کچھ یوں اچھے کہ۔۔۔

ٹائٹل تو اس بار بہت اچھا لگا۔ کچھلے ماہ کنیز نبوی کا ناول پڑھا۔ آغاز سے اختتام تک ناول نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر ”کنیز نبوی“ میرے پاس تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔

سلسلے وار ناولز ”ایک تھی مثال“ میری موٹ فیورٹ رائٹر رخسانہ نگار کا ناول بھی زبردست جا رہا ہے رخسانہ جی مثال پر ہاتھ ذرا ہولار نہیں۔ ”رقص بسل“ بھی اچھا مگر بہت سلو جا رہا ہے۔ یارم پر تبصرہ ادھار رہا۔ باقی تمام مستقل سلسلے بھی زبردست تھے۔

ج : پیاری رخسانہ! گردش دوراں تو کسی کو بھی چین نہیں لینے دیتی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ دوستوں سے ملاقات ترک کر دی جائے۔ خط آدھی ملاقات ہوتی ہے۔ سات آٹھ سال کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ اب اتنا طویل وقفہ نہ دیجیے گا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔

یاسمین حنفی نے کراچی سے لکھا ہے

ٹائٹل پر اور نچ کر بہت پیارا لگ رہا تھا۔ (ناول پر اچھا نہیں لگ رہا تھا) ”ایک تھی مثال“ رخسانہ جی آپ سے ہاتھ جوڑ کر گزارش ہے کہ بس کر دیں بہت ہو گیا یار۔۔۔ 20 قسطوں میں مثال کی درد بھری زندگی دکھائیں گی۔ اور

جب مثال خوش ہوگی تو وہ لاسٹ قسط کر دیں گی۔ (یہ بھی کوئی گل ہوئی) ”رقص بسل“ یہ تو دوسرا ”در دل“ اشارت ہونے جا رہا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ (در دل) کی طرح 30 قسطوں سے پہلے ماوراکا ماضی نہیں کھولنے والی رائٹر صاحبہ ”نایاب ہیں ہم“ ہیرو ہیروئن تو نہیں پر ہاں ہم قارئین ضرور نایاب ہیں جو ایسی تحریریں برداشت کرتے ہیں ”یارم“ اس ناول کی تعریف کے لیے تو میرے پاس الفاظ ہی نہیں ”ہاز گشت“ پڑھ کر یوریت مزید سوا ہو گئی۔۔۔ اب ناولٹ اور افسانوں پر کیا تبصرہ کروں۔ بس یہ کہ اس بار بالکل مزہ نہیں آیا حالانکہ عید کے حساب سے شان دار ہونا چاہیے تھا فاسٹ بالر محمد عامر کا انٹرویو شائع کریں پلیز پلیز پلیز۔۔۔ 3 مہینوں سے ریکورسٹ کر رہی ہوں لوجی لائیٹ چلی گئی اب اندھیرے میں کیا لکھوں۔

ج : پیاری یاسمین! مزید کچھ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں، اتنا ہی کافی ہے اب افسوس ہی کر سکتے ہیں کہ آپ کو یارم کے سوا کچھ بھی پسند نہیں آیا۔

تمینہ رؤف نے بنوں سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں ”یارم“ سمیرا جی آپ کیوں ہماری دل کی دھڑکنوں کے ساتھ تھیاتی ہیں۔ جم کر قدم رکھنا اور اپنے حوصلوں کو بلند کیسے رکھتا ہے، یارم، ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ آپ کی ہر تحریر سائرہ رضا کی تحریروں کی طرح دل پہ اترتے ساتھ ہی اپنے نقش چھوڑ جاتی ہے ”ایک تھی مثال“ رخسانہ نگار عدنان صاحبہ میں نے آج تک حقیقت کے اتنے قریب اتنی پیاری اسٹوری کبھی نہیں پڑھی ”رقص بسل“ بھی خوب جا رہی ہے اور تمہ جی ”ہم سے ہے زمانہ“ بس اتنی سی؟ کیا ہمارے سال بھر انتظار کا صرف اتنا سا صلہ سائرہ جی آپ ہر ماہ ڈائجسٹ کو پڑھتی ہیں مطلب اگر میرا یہ خط شائع ہوا تو آپ اس کو بھی پڑھیں گی، میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہوگی یہ کہ میری تحریر آپ کی نظر سے گزرے گی، سنیعہ عمیر کی بہت اچھی کاوش تھی اگر یہ آپ کی پہلی تحریر تھی تو ”ویری ویل ڈن“

ج : پیاری تمینہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سنیعہ عمیر کی یہ پہلی ہی کہانی سمجھ لیں۔ اس سے پہلے ان کا ایک مختصر سا افسانہ نیلا گلاب شائع ہوا تھا۔ تھو بخاری سے تو ہمیں بھی شکایت ہے کہ اتنے عرصہ بعد لکھا اور اتنا مختصر۔

سائرہ رضا واقعی پرچے کا ایک ایک حرف پڑھتی ہیں اور اپنی رائے سے بھی نوازتی ہیں۔

مریم اور ماہم سنیہ نے چک نمبر 41 گ ب جگہ سے تحصیل سمندری سے لکھا ہے

میں اور میری کزن شعل اور خواتین بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہم نے کبھی خرید بھی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ بڑی آبی جو کہ فیصل آباد میں رہتی ہیں پڑھنے کے بعد ہم تک پہنچا ہی دیتی ہیں۔ (دو مہینے بعد) لٹ پڑھنے کی مجبوری یہ ہے کہ ہم گاؤں میں رہتے ہیں لیکن گاؤں میں رہتے ہوئے بھی ہم اچھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ میں (مریم) ایم اے اسلامیات کر رہی ہوں پرائیوٹ اور میری کزن ماہم جو کہ حال ہی میں رانٹر بننے جا رہی ہے۔ اس نے "بدلہ" کے نام سے افسانہ لکھا ہے۔ ماہم ایف ایس سی (میڈیکل) کر رہی ہے۔ ہم دونوں کزنز بیوٹھ اے ملے لیتی ہیں۔ سائرہ رضا، نمرہ احمد، بشری سعید، فرحت اشتیاق، فائزہ افتخار کا شمار ہماری پسندیدہ ترین رانٹرز میں ہوتا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہم نے نمرہ احمد کا ناول "جنت کے بے" کتابی شکل میں شائع ہونے سے پہلے ہی گھر میں ہی کتابی شکل دے لی تھی۔ وہ ایسے کہ ہر دفعہ ڈائجسٹ میں سے کہانی الگ کر کے رکھ لیتے اور جب مکمل ہو گئی تو ہم نے اس کی بانڈنگ کروالی۔ (واہ کیا بات ہے ہماری)

مریم اور ماہم! آپ کے بارے میں جان کر بہت خوش ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے ارادوں میں کامیاب کرے۔ آمین۔

ایک بات کی داد ضرور دیں گے کہ رسالہ آپ نے کبھی نہیں خریدا پھر بھی اتنی باقاعدگی سے آپ تک پہنچتا ہے کہ جنت کے بے کی ایک بھی قسط آپ سے مس نہیں ہوئی اور آپ نے مفت میں مکمل کتاب حاصل کر لی۔

فرح ناز، ربیعہ عینا اور گلشن گل گاؤں سکھانہ تحصیل وضع گجرات سے لکھتی ہیں

"ایک تھی مثال" میں اب اصل کہانی شروع ہوگی۔

اب پتا نہیں کون سا قہر ٹوٹا باقی ہے مثال پر۔ آپ جی! میری ماما کو سمجھائیں کہ ڈائجسٹ پڑھنا گناہ نہیں ہے۔ میں حرم خان سے دوستی کرنا چاہتی ہوں اور

مس آنسہ شبیر (ڈوگر) آپ وہی ہیں نا جو مکھیا نہ میں نیبجنگ کر چکی ہیں۔ ہمارے کلیوال والوں کو بھی شعل پسند ہے لیکن کبھی بھی خط نہیں لکھا۔ میں ہی فرجی ارمان ہوں اور فرح ناز بھی۔

ج: فرح ناز، ربیعہ عینا اور گلشن گل! خط تاخیر سے ملا، اس لیے پچھلے ماہ شامل نہ ہو سکا۔ اپنی امی کو آپ شعل کے سلسلے پڑھ کر سنائیں، پیارے نبی کی پیاری باتیں اور باتوں سے خوش ہو آئے، ہمیں یقین ہے کہ پھر وہ آپ کو شعل پڑھنے سے منع نہیں کریں گی۔

عائشہ جمیل بلدیہ ٹاؤن کراچی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

اس مرتبہ ٹائٹل گرل دوپٹہ کے ہالے میں بہت پیاری لگی۔ "رقص ببل" نبیلہ عزیز کا ناول دھیرے دھیرے آگے کھسک رہا ہے۔ "یارم" میرا حمید کے ناول نے طبیعت ایک دم خوش کر دی۔ کافی عرصہ بعد ایسا کچھ پڑھنے کو ملا بہت مزا آیا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ "صنم سے صدم تک" کنیز نبوی کے ناول کا اینڈ حسب توقع تھا۔ ماہم کا کردار شروع میں جتنا اچھا لگا آخر میں اتنا ہی برا محسوس ہوا۔

"ڈھل گیا بھر کا دن" صدف آصف کا ناول معذرت کے ساتھ بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ "کوئی نہ جانے بات" عائشہ نصیر احمد کے ناول نے دل موہ لیا۔ ویل ڈن عائشہ جی۔ افسانے سب ہی اچھے لگے لیکن "یلتہ القدر" قانتہ رابعہ کا افسانہ بہت ہی اعلیٰ لگا۔ "ایک تیر" رشک حبیبہ کا افسانہ بہت پسند آیا۔

ج: پیاری عائشہ! شعل کی پسندیدگی کے لیے تمہ دل سے شکریہ۔ آپ کی تعریف و تحقید متعلقہ مصنفین تک پہنچانی جارہی ہے۔ آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں ہیں اس لیے کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔

عظمیٰ مشتاق جملہ سے لکھتی ہیں

ٹائٹل گرل بہت پیاری لگی۔ میرا حمید کا ناول "یارم" بہت دلچسپ ہے۔ سینہ عمیر کا ناول بازگشت بھی بہت خوب صورت ناول تھا۔ آپ کے ان پریچوں نے سچ میں مجھے زندگی گزارنے کا ہنر سکھایا ہے۔ میری فریڈ حرا بھی شعل کی دیوانی ہے۔ آبی راحت جیسے کہاں عائب ہیں

انہیں کہیں نہ کوئی ناول لکھیں۔
ج: پیاری عظمیٰ! شعل کی بزم میں خوش آمدید! راحت جیسے آج کل ٹی وی پر مصروف ہیں اس لیے لکھ نہیں پا رہی ہیں انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد شعل کے لیے لکھیں گی۔ اپنی دوست حرا کا ہماری جانب سے شکریہ ادا کر دیں۔

نورینہ حنیف نے سرگودھا سے لکھا ہے
آبی کیا حال ہیں؟ ہمارا تو گرمی سے بہت برا حال ہے، سرگودھا میں تو بارش ہو ہی نہیں رہی۔ ٹائٹل بہت پیارا لگا۔ مکمل ناول سب بیسٹ تھے افسانوں میں جوادی اور شبلی کو پڑھ کر اچھا لگا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے سائرہ آپ کا خط اچھا لگا۔

ج: الحمد للہ ہمارا حال بالکل ٹھیک ہے، بارش تو کراچی میں بھی نہیں ہوئی لیکن گرمی زیادہ نہیں ہے۔ شعل کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عائشہ خان، مندو محمد خان سے لکھتی ہیں

خط آپ کے میں سائرہ رضا کا خط پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سائرہ جی کی کیا بات ہے۔ اس بار نمرہ بخاری کا نام پڑھ کر جتنی خوشی ہوئی، اتنی افسانہ پڑھ کر نہیں ہوئی۔ آسیہ رزاقی کو پڑھا خلاف توقع انہوں نے بھی مایوس کیا۔ اس بار عنیقہ بیگ کا افسانہ بہت پسند آیا۔
ج: عائشہ! شعل پر تبصرے کے لیے شکریہ۔

نمرہ رحمان نے جہانیاں منڈی سے لکھا ہے

"ایک تھی مثال" بظاہر کہانی آگے بڑھ چکی ہے لیکن پھر بھی وہیں رکی ہوئی سی محسوس ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ زندگی کی ایک تلخ حقیقت کو آشکار کرتی ہوئی تحریر ہے، لیکن پھر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، اتنے سارے رشتوں میں اتنے سارے سالوں میں کوئی بھی اس کا خیر خواہ نہیں... کچھ تو مثبت پہلو دکھایا ہوتا۔ خواہ سہیلی کی شکل میں ہی سہی... لیکن ناں جی! مسلسل تکلیف میں

ڈوبی ہوئی مثال ہے اور بس معذرت کے ساتھ... رقص ببل نبیلہ عزیز بھی کچھ خاص متاثر نہیں کر پارہیں۔
ج: پیاری نمرہ! آپ نے بہت تاخیر سے خط لکھا، اس لیے پچھلے ماہ شامل نہ کر سکے۔ شعل کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔



قارئین متوجہ ہوں!

- 1 شعل ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کانڈ استعمال کریں۔
- 2 افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کانڈ استعمال کر سکتے ہیں۔
- 3 ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔
- 4 کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔
- 5 مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت صورت میں تحریر کی واپسی ممکن نہیں ہوگی۔
- 6 تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔
- 7 شعل ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔
ماہنامہ شعل۔ 37 اردو بازار کراچی۔

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعل اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل تین ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔



درفش کاویانی

درفش کاویانی، ایرانیوں کا وہ امتیازی نشان تھا جسے اڑھائی سے تین ہزار سال قبل مسیح کے دوران بنایا گیا تھا۔ ان دنوں ایران پر ضحاک نامی ایک حامی النسل بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ حقیقتاً "بیمین کارہنے والا تھا" لیکن ایران کو اس نے اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا تھا۔ روایت ہے کہ اس نے ایک ہزار سال حکومت کی اور یہ عرصہ 1970 قبل مسیح سے 2970 قبل مسیح کے لگ بھگ بیان کیا گیا ہے۔

تاریخ طبری کے مطابق ضحاک نہایت ظالم شخص تھا۔ اس نے کئی بادشاہوں کو قتل کیا۔ تازیانے مارنا اور لوگوں کو وار پر لٹکانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس نے ایک ہزار سالہ حکومت میں لوگوں پر بے پناہ ظلم ڈھائے۔ لوگ اس سے سخت ہراساں اور خوف زدہ رہتے تھے۔ حکومت کے آٹھ سو سال گزرنے کے بعد اس کے کندھوں کے ابھرے ہوئے گوشت پر زخم آ گئے جن کی وجہ سے وہ سخت تکلیف میں رہتا تھا۔ طرح طرح کے علاج کرائے گئے۔ لیکن زخم اچھے نہ ہوئے۔

آخر ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ ان زخموں کا علاج انسانوں کے مغز سے کرو۔ دوسرے دن ایک انسان کا مغز نکال کر زخموں پر لگایا گیا تو درد میں افاقہ ہو گیا۔ اس روز سے یہ معمول ہو گیا کہ گلی کوچوں سے دو آدمی پکڑ کر لائے جاتے اور انہیں مار کر ان کے مغز ضحاک کے زخموں پر لگائے جاتے۔ روایات کے مطابق یہ سلسلہ دو سو برس تک جاری رہا۔

ضحاک کی حکومت کے ہزارویں سال حاکم اصفہان

فریدون جب بھی کسی مہم پر روانہ ہوتا، درفش کاویانی اس کے ساتھ ہوتا۔ یہ علم تمام ایرانی تاجداروں کے خزانوں کی زینت رہا۔ اس پر پیش ہوا جواہرات ٹانگے گئے، یہاں تک کہ اس کا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ یہ جھنڈا جب کھولا جاتا تو جواہرات کی چکاچوند سے آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ ایک عرب شاعر بختری نے اپنے ایک مشہور قصیدے میں درفش کاویانی کی تعریف کی ہے۔

"نوشیرواں، درفش کاویانی کے نیچے سپاہیوں کی صفیں لے کر چل رہا ہے اور عورتیں کھڑی دیکھ رہی ہیں۔"

بہمن کی محبت

ہجرت کا بیسواں سال تھا اسلامی فوجوں نے دمشق کا محاصرہ کر رکھا ہے اور اسلامی فوج کا ایک ایک جان باز اپنی جان نثار کرنے کے لیے بے تاب تھا، اسی دوران میں یہ خبر آئی کہ دشمن کی فوجیں ہزاروں کی تعداد میں اجنادین کے مقام پر جمع ہو رہی ہیں۔ امیر لشکر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے سارے کمانڈروں کو اکٹھا کر کے ان سے اس نازک صورت حال کے متعلق مشورہ کیا۔

"امیر! ہم جاں نثاری کے لیے تیار ہیں، فکر کی کوئی بات نہیں، اس سے بڑی اور کیا سعادت ہوگی کہ ہماری جانیں اللہ کی راہ میں کام آجائیں۔" حضرت خالد بن ولید نے جوشیلی آواز میں کہا۔

"ہاں! مگر یہ بتاؤ کہ اس مہم کو سر کرنے کے لیے کس جواں عزم کو بھیجا جائے؟" ابو عبیدہ الجراح نے دریافت کیا۔

"امیر! میرے خیال میں اس مہم کے لیے ضرار بن الاזור بہت موزوں ہیں۔ اس شیر دل کو بے کھٹک روانہ کر دیجئے۔" حضرت خالد نے ضرار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور حضرت ابو عبیدہ نے ضرار بن الاזור کو پانچ ہزار شیر دل جوانوں کا کمانڈر بنا کر اجنادین

کی طرف روانہ کر دیا اور سب نے فتح کے لیے دعا کی۔ اسلامی فوج کے یہ جاں نثار ابھی راستے میں ہی تھے کہ شاہ حمص سے مدد بھیڑ ہو گئی، شاہ حمص بارہ ہزار تازہ دم فوج لیے اجنادین کی طرف جا رہا تھا۔ ضرار نے اسلامی لشکر کو حکم دیا "ہمارو! عقاب بن کردشمن پر ٹوٹ پڑو اور اس سے پہلے کہ یہ اجنادین پہنچیں یہیں ان کا کام تمام کر دو۔"

اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت ضرار اپنی جان سے بے نیاز بڑھ بڑھ کر حملے کر رہے تھے اور اپنے جوانوں کی ہمت بڑھا رہے تھے کہ اس دوران شاہ حمص دروان کے بیٹے ہمدان نے موقع پا کر حضرت ضرار پر نیزے سے وار کیا، نیزہ بازو

میں لگا۔ حضرت ضرار زخمی ہو گئے۔ دوسرے ہی لمحے زخمی شیر دہاڑا اور پلٹ کر نیزہ ہمدان کے سینے میں اتار دیا۔ نیزہ سینے اور پشت کی ہڈیاں توڑتا ہوا پار ہو گیا۔ حضرت ضرار اپنا نیزہ نکال رہے تھے جو کسی ہڈی میں پھنس کر رہ گیا تھا کہ دشمن نے موقع پا کر حضرت ضرار کو گرفتار کر لیا۔

اسلامی فوج امیر لشکر کی گرفتاری کے باوجود بڑی بے جگری سے لڑتی رہی تھی اور دشمنوں کا صفایا کرتی رہی۔ اوھر کسی تیز رفتار سوار نے حضرت خالد کو ضرار کی گرفتاری کی اطلاع پہنچادی۔

حضرت خالد بے چین ہو گئے اسی وقت امیر کے خیمے میں پہنچے اور اجازت لے کر ایک ہزار جاں بازوں کو لے کر محاذ کی طرف علی گھوڑے دوڑا دیے۔

گھوڑے طوفان بن کر دوڑ رہے تھے کہ حضرت خالد کو اپنے گھوڑے کے آگے گرداؤنی نظر آئی، آپ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا مگر آگے جانے والے شہسوار کا گھوڑا طوفان سے زیادہ تیز تھا۔ حضرت خالد نے غور سے دیکھا، سیاہ لباس پہنے، لمبائیزہ ہاتھ میں لیے، کوئی جاں باز آندھی اور طوفان کو شکست دے رہا تھا۔

فوج آگے دوڑنے والے شہسوار سے کچھ قریب تو

ہو گئی لیکن اس کو پکڑ نہ سکی۔

غضب کی رفتار تھی۔ حضرت خالد نے دیکھا، شہسوار نے منہ پڑھا نا باندھ رکھا ہے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ امیر لشکر نے پھر گھوڑے کو ایڑ لگائی گھوڑا اڑنے لگا مگر وہ شہسوار ان سے پہلے ہی میدان میں کود پڑا تھا۔ وہ بجلی کی طرح دور تک رومیوں کی فوج میں گھستا چلا جاتا، پھر اسی تیزی سے دشمنوں کو کاٹتا ہوا واپس آ جاتا۔ اس کا لبائیزہ دشمنوں کے تازہ خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ کبھی وہ اللہ کا غضب بن کر دہائی جانب جھپٹتا، کبھی قہرائی بن کر بائیں جانب جھپٹتا، کبھی سامنے کی فوج پر بجلی بن کر گرنا اور جدھر جاتا عقاب کی طرح شکار پر اس طرح ٹوٹا کہ شکار خاک و خون میں ترپتا نظر آتا۔

دوپہر کے بعد رومی فوج کی ہمت ٹوٹ گئی، ان کے حوصلے پست ہو گئے اور آخر کار وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، وہ شہسوار ایک جانب خون میں نہایا ہوا کھڑا تھا۔ حضرت خالد اس بہادر جوان سے ملنے کو بے چین تھے، انہوں نے ایک سپاہی کو معلومات کے لیے بھیجا مگر وہ خاموش رہا۔ پھر حضرت خالد خود اٹھے اور شہسوار کے پاس جا کر سلام کیا اور پوچھا!

”اللہ تمہاری ہمت اور برہمائی تم کوں ہو؟“

امیر لشکر کو دیکھ کر شہسوار نے بڑے ادب سے سلام کا جواب دیا اور نہایت دھیمی آواز میں کہا۔ ”اے امیر میں ایک بہن ہوں۔“

”تم ایک خاتون ہو؟“ حضرت خالد نے حیرت اور قدر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا۔

”جی ہاں! میں ازور کی بیٹی اور ضرار کی بہن خولہ ہوں۔“

”خولہ! تمہارے درد کو میں جانتا ہوں، خدا ضرار کی حفاظت فرمائے۔“ امیر لشکر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور خاموش ہو گئے۔

”امیر! میرا سکون غارت ہو گیا ہے، جب تک میں اپنے بھائی کو دشمن سے چھڑانہ لوں چین سے نہیں بیٹھ سکتی۔ اگر مجھے پتا چل جائے تو باز کی طرح جھپٹ کر

اسے ظالم پنجوں سے چھڑا دوں۔“

میرے بھیا! کیا میں اب تجھے کبھی نہ دیکھ سکوں گی؟ کیا تو بھی اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا ہے؟ تیرے باپ ازور نے تو خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جام شہادت نوش کیا تھا۔ میرے بھیا! اگر تو باپ کے پاس پہنچ گیا ہے تو میری طرف سے تجھ پر ہزاروں سلام۔“

بھائی کی یاد میں بہن کا یہ درد بھر مرخیہ سن کر سب ہی کا دل بھرا آیا اور بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ پہاڑی کے دامن سے رومی فوج کا ایک مختصر دستہ برہمچلا آ رہا ہے، جوں ہی وہ دستہ قریب آیا، مسلمان فوج نے دیوانہ وار اس پر حملہ کر دیا۔

رومی دستہ لڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور امان طلب کرنے کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور انہیں امان دے دی گئی، پھر امیر لشکر نے ان سے پوچھا۔

”تم لوگ کہاں سے آرہے ہو اور کہاں جانے کا قصد ہے؟“

”ہم لوگ حمص کے باشندے ہیں اور شاہ حمص کی مدد کے لیے آئے تھے۔“

”پھر تم نے امان طلب کیوں کی؟“ امیر لشکر نے پوچھا۔

”ہم لڑائی کا ارادہ ترک کر کے حمص لوٹنا چاہتے ہیں!“ رومی سردار نے کہا۔

”کیوں؟ ارادہ ترک کرنے کی کیا وجہ ہے؟“ امیر لشکر نے پوچھا۔

”ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ شاہ حمص آپ جیسے جاں بازوں کے مقابلے کی تاب نہیں لاسکتا۔ لہذا اس کی حمایت میں لڑنا بے سود ہے۔“

یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ امیر لشکر نے خولہ کی بے تابی کو بھانپ لیا اور رومی سردار سے کہا۔

”میں تم سے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں اور مجھے توقع ہے کہ تم صحیح بتاؤ گے۔“

”ضرور ضرور اگر میرے علم میں ہوگا تو میں آپ کو دھوکا نہیں دوں گا۔“ رومی سردار نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”یہ بتاؤ ہمارے کمانڈر ضرار کہاں ہیں؟“ حضرت خالد نے پوچھا۔

”ضرار کو سو جنگی سواروں کی نگرانی میں حمص کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے اور وہاں سے ان کو شاہ ہرمل کے حضور پیش کیا جائے گا۔“ رومی سردار نے سچ سچ بتا دیا۔

یہ خبر سنتے ہی سب سپاہی بے چین ہو گئے، خولہ بھی بھائی کے لیے بے تاب تھیں۔ حضرت خالد نے اسی وقت حضرت رافع کو سو جنگی سواروں کے ساتھ حمص کی جانب روانہ کر دیا اور انہیں ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

”میرے جاں باز شیرو! نشانات قدم سے دشمن کی کھوج لیتے ہوئے دشمن کو جا پکڑو اور اپنے محبوب سردار ضرار کو چھڑا کر ہی دم لینا۔“ حضرت رافع سوتا زہ دم سواروں کو لے کر جوش و خروش کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ حضرت خولہ بھی اس دستے کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ حضرت خالد نے انہیں روکنا مناسب نہ سمجھا۔

اسلامی فوج بے پناہ جوش کے ساتھ گھوڑے دوڑاتی اور نشانات کا کھوج لیتی آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن کئی منزلیں طے کرنے کے بعد بھی رومی دستے کا کہیں پتا نہ چلا تو سردار کو فکر ہوئی۔ انہوں نے سپاہیوں کو مخاطب کر کے کہا!

”جس برق رفتاری سے تم لوگ چل رہے تھے، میرا خیال ہے کہ دشمن ضرور پیچھے رہ گیا ہے۔ لہذا ہمیں یہیں اس کا انتظار کرنا چاہیے۔“ یہ ان کی فراست تھی۔

اسلامی لشکر اپنے امیر کا حکم سنتے ہی دشمن کی گھات

میں بیٹھ گیا۔ انتظار کرتے کرتے کافی وقت گزر گیا اور دشمن فوج کا کچھ پتا نہ چلا تو سب بے چین ہو گئے۔ حضرت خولہ کا بھی برا حال تھا، وہ چاہتی تھیں کہ دم بھر میں حمص پہنچ جائیں اور اپنے بھائی کی صورت دیکھ لیں۔ اسلامی لشکر مایوسی اور بے تابی کی کیفیت سے دوچار تھا کہ دور سے گرد اڑتی ہوئی نظر آئی۔ سب کی نگاہیں وہیں جم گئیں۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کچھ سوار پوری قوت سے گھوڑے دوڑاتے ان کی طرف آرہے ہیں۔ جب معلوم ہوا کہ یہ وہی دستہ ہے جو حضرت ضرار کو حمص لے جا رہا ہے تو حضرت خولہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ جو کس ہو گئیں اور عزم کے ساتھ اپنا نیزہ سنبھال لیا۔ ادھر اسلامی لشکر کے جوش و خروش کا عجیب عالم تھا، ہر ایک کے حوصلے کا یہ حال تھا کہ وہ اکیلا ہی پورے دستے سے سننے کے لیے تیار تھا۔

جونہی رومی دستہ مسلمانوں کے سامنے آیا، ساری مسلمان فوج اللہ اکبر کا نعروں لگا کر ان پر ٹوٹ پڑے۔

رومیوں کے ہوش اڑ گئے۔ کچھ مارے گئے، کچھ ادھر ادھر بھاگ گئے۔

حضرت خولہ کی نظر جب اپنے بھائی پر پڑی تو ان کی عجیب کیفیت ہو گئی، اپنے بھائی کو زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ کر فرط مسرت سے ان کے آنسو نکل آئے۔

مسلمان فوج بھی اس منظر کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوئی۔

حضرت ضرار رہا ہو چکے تھے اور اسلامی فوج خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئی کہ انہیں کامیاب و کامران کیا، اب وہ اپنے امیر کے سامنے سرخرو ہوئیں گے۔

(تسليم جعفری)



واصفہ سہیل



حب الوطنی

ہمارے عوام انڈیا سے بہت متاثر ہیں۔ ہمیں ان کی فلمیں، ڈرامے، ان کے ڈانس، ان کی سب سے باکی حد تویہ ہے کہ ہم ان کی فحاشی، بے ہودگی اور عریانیت تک سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو آج کل ہونے والے ایوارڈ شوز اور شووز کی ہونے والی تقریبات دیکھ لیں۔ ہماری اداکارائیں جس طرح کالباس پہنتی ہیں اور ڈراموں میں جو ماحول ہم دکھاتے ہیں وہ پاکستانی معاشرے کی اصل تصویر تو نہیں۔

ہم نے انڈین ڈراموں سے بے ہودگی اور کم لباسی سیکھ لی ہے، لیکن ان سے حب الوطنی کا سبق نہیں لیا۔ جس طرح وہ اپنے مذہب کا پرچار کرتے ہیں۔ سوپ ہو تو ہر قسط میں روزانہ ایک سین پوجا پاٹ کا ضرور ہوتا ہے۔ ان کے ہر ڈرامے میں ماڈرن سے ماڈرن لڑکا لڑکی اپنے مذہبی تہوار پوری شان و شوکت اور اہتمام سے مناتے ہیں۔ بلکہ بچ پوچھیں تو کہانی تو برائے نام ہوتی ہے، زیادہ تر ہولی، دیوالی، نورانی، راکھی اور گن پتی کے تہوار ہی دکھائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر ڈرامے میں بھارت ماتا سے محبت اور ایکٹا کا چرچا کرتے ہیں۔ (صرف چرچا ہی نہیں کرتے دراصل محبت کرتے بھی ہیں۔) سو ارب کی آبادی والے اس ملک میں بے شمار قومیں آباد ہیں۔ مختلف ذاتیں ہیں۔ ذات پات کے جھگڑے بھی ہیں۔ زبانیں بھی مختلف ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے ڈراموں میں ملک سے محبت کے گن گاتے نظر آتے ہیں۔ ان کے چینلز تعصب کو ہوا نہیں دیتے۔ وہ یک جہتی اور اتحاد کا سبق دیتے ہیں۔ وطن سے محبت کا پرچار کرتے ہیں۔ جبکہ ہمارے یہاں تعصب بہت کم ہے۔ لوگ

آپس میں مل کر رہتے ہیں۔ رشتے کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے چینلز چند ایک متعصب قسم کے بیانات کو نمایاں کر کے دکھاتے ہیں۔ کوئی قوم مظلومیت کا رونا روئے تو اس کو اس طرح سے پیش کیا جاتا ہے کہ لگتا ہے کہ ظلم کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں۔

خالصتان تحریک میں بھارتی حکومت نے سکھوں کو کچل کر رکھ دیا۔ ان کی مذہبی عبادت گاہ گولڈن ٹیمپل میں فوج گھس گئی، لیکن میڈیا نے انہیں اپنی مظلومیت کا رونا روئے کا موقع فراہم نہیں کیا۔

جبکہ ہمارے ڈراموں میں پاکستان کا نام لینا قدامت پرستی میں شمار ہوتا ہے۔ ماڈرن ازم کا مطلب ہے مذہب اور ملک کی برائیاں کرنا، جبکہ بھارت اس کے برعکس دکھاتا ہے۔ کاش! لوگ اس چیز کو سمجھ لیں تو اپنے ڈراموں کے ذریعے لوگوں کی سوچ بدل سکیں۔

باادب

بدر خلیل سینئر ترین آرٹسٹ ہیں اور ان کے کریڈٹ پر بے شمار کامیاب ڈرامے ہیں۔ آج کل وہ ”قدوسی صاحب کی بیوہ“ میں عقیلہ بھابھی کا کردار بخوبی ادا کر رہی ہیں۔ لیکن اب سننے میں آ رہا ہے کہ وہ پاکستان چھوڑ کر اپنے بیٹے کے پاس کینیڈا جا رہی ہیں اور اب وہیں رہیں گی۔ ہم نہیں جانتے کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے، لیکن کہنے والے کہتے ہیں کہ آج کل زیادہ تر ڈرامے کراچی میں بن رہے ہیں، لیکن بدر خلیل جیسی منجھی ہوئی اداکارہ کو اس میں نہیں لیا جا رہا، بلکہ باہر سے آرٹسٹوں کو بلا کر کاسٹ کیا جا رہا ہے۔ جو بہر حال زیادتی ہے۔ (جی اسی لیے ایک دو مخصوص چہرے ہی ہر چینل پر ہاں کے کردار میں نظر آ رہے

در حقیقت بی وی کے لیے اچھا لکھنے والوں میں اکثر خواتین رائٹرز کی ہے۔ پاکستانی ڈراموں کو ہندوستانی چینل پر نشر کیے جانے سے پاکستان کے بارے میں غلط تصورات کو ختم کرنے میں مدد ملے گی۔ ”مگر بول“ اور ”خدا کے لیے“ جیسی فلمیں بنا کر تھیں کہ پاکستان میں حالات ہمیشہ خراب رہتے ہیں اور ہم خوش باش زندگی نہیں گزار سکتے۔ ان ڈراموں کے ذریعے لوگ (انڈیا کے) جاننے لگیں گے کہ ہم ان سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔

عمل

اردن سے تعلق رکھنے والے گلوکار اور موسیقار ”عمر العبد اللات“ نے گلوکاری ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اعلان کیا ہے کہ وہ فلسطینی عوام سے اظہار یکجہتی کے لیے اپنے تمام پیشہ ورانہ معاملات سے دستبردار ہوتے ہیں۔ (اسے کہتے ہیں صرف باتیں نہیں، عمل بھی) انہوں نے میڈیا سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے فلسطینی ساتھی نسل کشی جیسی خوف ناک صورت حال سے گزر رہے ہیں۔ انہوں نے اس سے پہلے مصر میں ہونے والا اپنا کنسرٹ اور دورہ امریکا بھی ملتوی کر دیا ہے اور ایک کمپنی سے ہونے والا انیا الیم کا معاہدہ بھی اب ختم کیا جا چکا ہے۔ عمر نے اپنے تمام گانے اور اپنی تمام نیک



ہیں۔) دوسرے ”ہم بی وی“ ایوارڈ کی تقریب میں سلطانہ صدیقی، بدر خلیل کے ساتھ بیٹھی تھیں کہ فواد خان (ہم سفریم) اپنی جگہ سے اٹھ آئے اور انہوں نے سلطانہ صدیقی سے براہ راست آکر کہا کہ وہ ان کے ساتھ آکر بیٹھیں، ورنہ وہ تقریب سے چلا جائے گا۔ (فواد! فرمائش کرنا غلط نہیں، لیکن اگر ادب آداب کا خیال کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ وہ جو کہتے ہیں نا باادب یا نصیب بے ادب؟) فواد خان کے اس رویے کو بدر خلیل نے بہت محسوس کیا۔ ان ہی رویوں کی وجہ سے وہ اب باہر جا رہی ہیں۔ (بدو جی! آپ کے پرستار آپ کی بہت قدر اور عزت کرتے ہیں۔ چند لوگوں کی وجہ سے

آپ انہیں نہ چھوڑ کر جائیں۔)
نقطہ نظر

معروف ڈراما نگار عمیرہ احمد کا کہنا ہے کہ ”پاکستانی میڈیا میں خواتین چھائی ہوئی نظر آتی ہیں۔ (عمیرہ! ذرا نظر دوڑائیں تو ہر جگہ ہی نظر آئیں گی۔) ہمارے بارے میں سوچا جاتا ہے کہ یہ ایک قدامت پسند ملک ہے جہاں خواتین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ مگر ہمارے پاس خواتین فنکاروں کی کمی نہیں ہے۔





کیا مطلب ہے (بھئی؟) "افرا تفریح" رکھا گیا ہے (کیس فلم بھی افرا تفریح ہی کا شکار نہ ہو جائے۔) جولعد میں تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے۔ (کیس کاسٹ ہی تبدیل نہ ہو جائے۔) اس کا اسکرپٹ واسع چوہدری نے لکھا ہے اور اس فلم کی ہیروئن کے لیے صبا قمر کا انتخاب کیا جا چکا ہے۔ ہدایت کار ندیم بیگ ہیں۔ (اور ہیرو یقیناً "ہمایوں خود ہی ہوں گے؟")

ذہنیت

پاکستانی گلوکارہ زب نے بھارتی فلم "ہائی وے" کے لیے گانا "سوننا سونا" گایا تھا۔ مگر جب بھارتی میوزک کمپنی نے سوشل ویب سائٹ پر گانا اپ لوڈ کیا تو اس میں پاکستانی گلوکارہ کا نام ہٹا دیا۔ (ان کی ذہنیت کا اندازہ کریں ذرا) اس گیت میں جہاں فلم کے ڈائریکٹر امتیاز علی اور میوزک ڈائریکٹر اے آر رحمان کو کریڈٹ دیا گیا ہے وہیں بطور گلوکارہ صرف عالیہ بھٹ کا نام شامل کیا گیا ہے۔ پاکستانی گلوکارہ کے ساتھ اس نا انصافی پر سوشل میڈیا پر ان کے پرستاروں نے احتجاج کیا ہے۔



پاکستان کی پہلی خاتون کوہ پیما ثمنہ بیگ جنہوں نے 2013ء میں دنیا کی بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ سر کی تھی۔ اب انہوں نے ایک اور اعزاز حاصل کر لیا ہے کہ حال ہی میں سات براعظموں کی بلند ترین چوٹیاں کامیابی سے سر کی ہیں۔ اس طرح وہ پہلی مسلمان اور پاکستانی خاتون بن گئی ہیں جنہوں نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔ (ہمت خوب ثمنہ! آپ نے مسلمان اور پاکستانی خواتین کا سر بلند کروایا۔) ثمنہ نے یہ اعزاز سال 2014ء میں حاصل کیا۔

ترقی

معروف اداکار احمد یونس یونس تو فی وی پر ڈرامے اور لائو شوز کرتے نظر آتے ہیں، لیکن اب وہ ٹی وی اسکرین سے فلم اسکرین پر جا پہنچے ہیں اور معروف اداکار و فلم ساز ہمایوں سعید کی کامیڈی فلم میں عنقریب نظر آئیں گے۔ اس فلم کا نام فی الحال (یہ فی الحال سے

(حالانکہ ہماری گلوکارہ کے ساتھ یہ نا انصافی نئی نہیں۔ ہم راحت فتح علی خان کے ساتھ نا انصافی کو بھی ابھی بھولے نہیں ہیں) اور بھارتی میوزک کمپنی سے زب کا نام شامل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

ادھر ادھر سے

طاہر القادری کا اس قدر زور و شور سے میدان میں نکل آنا اس بات کی دلیل ہے کہ تبدیلی کے فیصلے کو امریکہ سے گرین سگنل مل چکا ہے۔ جس طرح 2001ء میں جنرل مشرف نے ایک فون کال پر ملک کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا تھا۔ اب 2014ء میں امریکی افواج کی افغانستان سے واپسی سے قبل امریکہ کو ایک اور جنرل مشرف درکار ہے۔ سوال یہ ہے کیا پاکستان ایک اور جنرل مشرف کا تحمل ہو سکے گا؟

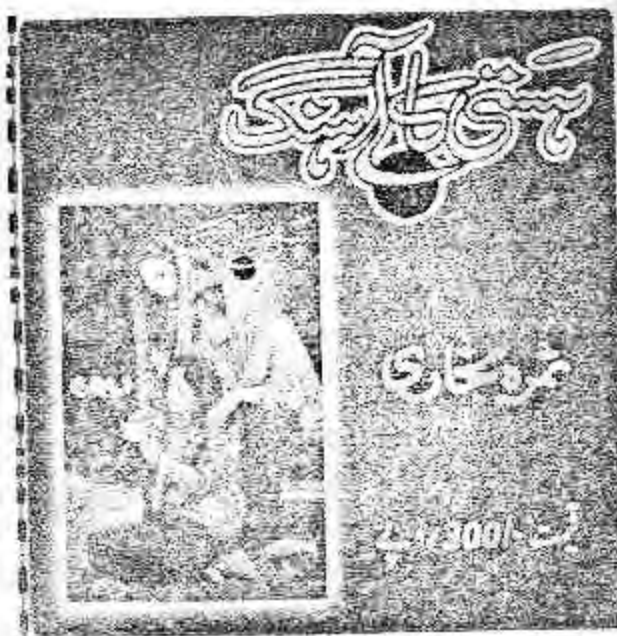
(سید وجیہ حسن۔ جسارت) ☆ ہمارے ہاں نریندر مودی جیسے متعصب شخص کا وزیر اعظم کیا کونسلر بننا بھی مشکل ہے، جبکہ بھارت میں نریندر مودی ایک عام بھارتی لیڈر کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ لیڈر میں لوگ اپنا پر تو دیکھتے ہیں۔ بھارتی عوام کو مودی میں اپنا آپ نظر آیا تو اس کی وجہ یہی تھی۔ بھارت کا متوسط طبقہ بھی مودی ہی کی طرح متعصب ہے۔

(اسمیر زاهد۔ ذرا ہٹ کے) ☆ امریکی لاڈلوں نے ہم پر "ہماری جنگ" مسلط کر دی اور لی وی چینلز کو ایفون گھول کر پلانے کے کام پر لگا دیا۔ آپ یہ چینل دیکھیں اور خاص طور پر ڈان نیوز جس نے مرنے والے فلسطینیوں کے لیے ایک بار بھی شہید کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ جب بھی خبر دی ان الفاظ میں دی کہ اسرائیلی کارروائی میں اتنے فلسطینی ہلاک ہو گئے۔ "ہماری جنگ" کی پاس داری کا حق ادا کر دیا۔ غنیمت ہے کہ اس نے مرنے والے 13 یہودیوں کے لیے "شہید" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

(عبداللہ طارق سہیل۔ نئی بات) ☆ عوامی مقبولیت رکھنے والی قیادت بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف کو مشرف نے جب تک چاہا ملک میں داخل نہیں ہونے دیا۔ جب وہ واپس آئے تو سیاسی سوے بازی کے بعد واپس آئے۔ مسلم لیگ ن سادہ اکثریت اور عوامی مقبولیت کے باوجود حکومت قائم کرنے کے لیے اصل طاقت ور فیصلہ سازوں کے محتاج ہیں۔

(روزنامہ جسارت) ☆ سینئر صحافی رازدرون خانہ سے باخبر ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ بھری بزم میں راز کی بات کہہ جاتے ہیں۔ صحافی کہتے ہیں میاں نواز شریف اور راجیل شریف میں اختلافات کی وجوہات یہ ہیں کہ مشرف کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ بھارت کے ساتھ دوستی نہ کی جائے۔

(ایفٹینٹ کرٹل (ر) عادل اختر) ☆ نیویارک ٹائمز لکھتا ہے کہ جنرل راجیل شریف نواز شریف سے ناراض ہیں اور یہ ناراضی مشرف کو پاکستان سے نہ جانے دینے پر ہے۔ (مظفر اعجاز۔ قلم رو)





سوسکے پکوانے

خالہ جیلانی

لڈو پیٹھی

اجزا :

چنے کی دال
سفید زیرہ
اجوائن
پیکنگ پاؤڈر
نمک
تیل

ترکیب :

چنے کی دال کو رات بھر کے لیے بھگو دیں۔ صبح اس کا پانی نکال کر سفید زیرہ، اجوائن اور نمک کے ساتھ بلینڈ کر لیں۔ آمیزہ یکجان ہو جائے تو پیکنگ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح پھینٹ لیں، پھر کھانے کے پیچھے کی مدد سے پکوٹوں کی طرح گرم تیل میں تلیں اور اٹلی کی کھٹی میٹھی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

اجزا :

ہنی چکن

اجزا :

چکن

شہد

کیچپ

سرخ مرچ

لسن اور ک پیسٹ

نمک

تیل

ترکیب :

چکن میں نمک، سرخ مرچ، لسن اور ک پیسٹ، شہد اور کیچپ اچھی طرح مکس کر کے رکھ دیں۔ آدھے گھنٹے بعد تھوڑے تیل میں ہلکی آج پر چکن گل جانے تک پکائیں۔ روغن اور آجائے تو بھون کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھیں، پھر چپاتی کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

شملہ مرچ کا چار

اجزا :

شملہ مرچ

زیرہ دھنیا

ہلدی

سرخ مرچ

اٹلی کا پیسٹ

گرز

نمک

تیل

ترکیب :

شملہ مرچ کاٹ لیں۔ فرانگ پان میں تیل گرم کر کے شملہ مرچ تمام مسالوں کے ساتھ دو منٹ تک فرائی کریں۔ اٹلی کے گودے کو چھان کر گڑ میں ملا لیں، پھر اس پیسٹ کو شملہ مرچ میں ملا کر اتنا پکائیں کہ گاڑھا ہو جائے۔ مزے دار اچار تیار ہے۔

چکن چلی رائس

اجزا :

بغیر ہڈی کا چکن

اے بے چاول

شملہ مرچ

نٹماو پیسٹ

سرخ مرچ پیسٹ

نمک

تیل

ترکیب :

گرم تیل میں چکن فرائی کریں۔ پھر نٹماو پیسٹ، سرخ مرچ پیسٹ، سیاہ پسلی مرچ اور نمک ڈال کر بھونیں، اس کے بعد چکن اور شملہ شامل کر کے پانچ منٹ تک پکائیں، پھر گرم اے بے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

براؤنیز

لوپاؤڈر

چھ کھانے کے پیچھے

میدہ

پیکنگ پاؤڈر

مکھن

اندے

چینی

ترکیب :

اندول کو اچھی طرح پھینٹ لیں پھر اس میں چینی اور مکھن ملا لیں۔ مکھن نہ ہو تو تیل بھی استعمال کر سکتی ہیں اور مزید پھینٹ لیں۔ میڈہ، پیکنگ پاؤڈر اور کوپاؤڈر ملا کر مزید مکس کریں۔ آمیزہ جتنا اچھا یکجان کریں گی۔ اتنی ہی براؤنی نرم بنے گی۔ سانچے میں آمیزہ ڈالیں۔ پھر ہلکے سے خوب گرم توے پر سانچہ رکھ کر بیس منٹ تک ہلکی آج پر بیک کریں۔ سوئی کی مدد سے چیک کریں۔ عموماً بیس منٹ میں براؤنیز تیار ہو جائے گی، لیکن اگر ضرورت محسوس کریں تو پانچ منٹ کے لیے مزید توے پر رہنے دیں۔

چکن میٹ اسٹک

اجزا :

چکن بون لیس

میدہ

بریڈ کریمبز

مکھن

لسن اور ک

نمک

تیل

ترکیب :

چکن قے میں (گوشت یا آلو بھی لیے جاسکتے ہیں) نمک، سرخ مرچ، میڈہ، مکھن، بریڈ کریمبز، لسن پیسٹ اور چار ہری مرچیں پس کر مکس کریں اور آٹس کریم اسٹک یا شاشنگ اسٹک پر حسب پسند شہب دے کر لگائیں۔ آدھا گھنٹہ رکھ کر ٹلے تیل میں سنرے ہونے تک تلیں اور کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ ٹماہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سپریم کوالٹی، ہارل کوالٹی، کمپیوٹر کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

بھاپ لینے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر آپ چاہیں تو گرم پانی میں تولیہ بھگو کر نچوڑیں اور تین سے چار مرتبہ چہرے پر رکھ کر ہلکے ہلکے ہاتھ سے دبائیں پھر کم از کم دو منٹ کے لیے چہرہ اسی گرم تولیہ سے دھوئیں گے۔ انڈے کا ماسک لگائیں۔ دس منٹ بعد منہ دھوئیں اور ٹونک کے طور پر عرق گلاب کا سپرے کر لیں یا روئی کی مدد سے لگائیں۔

مرحبا ہوتی، کملائی ہوئی جلد کی حامل خواتین وائننگ فیشل کریں۔ رات کو چار بجے دودھ میں آدھا لیون نچوڑ کر رکھ دیں۔ صبح اسی پھٹے ہوئے دودھ سے چہرے پر مساج کریں۔ بھاپ کے لیے کھولے پانی میں چند قطرے زیتون کے تیل کے شامل کریں اور دو منٹ تک تولیہ ڈھک کر بھاپ لیں پھر برف کے ٹکڑے لے کر چہرے پر رکھیں۔ نمائز کو بالائی میں کچل کر ماسک کے طور پر لگائیں۔ چند منٹ بعد چہرہ دھو کر کھیرے یا پودینے یا چندر کے عرق سے ٹونک کریں۔

بڑھتی عمر کے اثرات کو روکنے کے لیے اپنی ایجننگ فیشل کریں۔ زیتون کے تیل میں برابر کا پانی ملا کر پینٹ لیں پھر ہلکے ہاتھ سے مساج کریں۔ یا جو کے دلے میں دودھ ملا کر گڑھا سا پیسٹ بنا کر مساج کریں۔ خشک ہونے پر اتار لیں۔ بھاپ لیں۔ بھاپ والے پانی میں بھی زیتون کا تیل ملا لیں۔ بھاپ لینے کے بعد کم از کم دو برف کے ٹکڑوں سے نکور کریں۔ انڈے کی سفیدی میں شد ملا کر ماسک لگائیں۔ خوبائی کچل کر بھی بطور ماسک لگا سکتی ہیں۔ ٹونک کے لیے لیون کا عرق لگائیں۔

کیل ماسوں سے نجات کے لیے ایکسپری فیشل کریں۔ تھوڑی سی چینی کو تھوڑے سے پانی میں اتنا گھول لیں کہ کچھ دانے باقی رہیں۔ پھر ہلکے ہاتھوں سے مساج کریں۔ (یہ مساج آپ ہر ہفتے)۔ بغیر فیشل کے بھی کر سکتی ہیں) کیل ماسوں والی جلد بھاپ کی محفل نہیں ہوتی۔ مسور کی وال دودھ میں بھگو کر پس لیں۔ یہ آمیزہ بطور ماسک لگائیں۔ پیتا کچل کر بھی لگا سکتی ہیں۔ ملانی مٹی کا بھی ماسک لگا سکتی ہیں اور ہم کے پتوں کا پیسٹ بنا کر بھی بطور ماسک لگا سکتی ہیں۔ ٹونک کے طور پر عرق گلاب لگائیے۔

یاد رکھیے! کوئی بھی فیشل مہینے میں زیادہ سے زیادہ دو بار اور کم سے کم ایک بار کریں اور فیشل کے بعد کم از کم آدھا گھنٹہ چہرے کے نزدیک جانے سے گریز کریں۔



اگرچہ خوب صورتی عمر کی محتاج نہیں ہوتی اور خواتین ہر عمر میں خوب صورت نظر آسکتی ہیں۔ تاہم پچیس سال کی عمر کے بعد جلد کی تازگی، شادابی اور صحت برقرار رکھنے کے لیے مہینے میں ایک بار فیشل کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ فیشل اور خوب صورتی سے متعلق تمام مسائل کے لیے مہنگے یونی پارلرز کا رخ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ گھر میں ہی ایک عمدہ فیشل کر سکتی ہیں۔

فیشل کی چار اقسام ہیں۔ نارمل فیشل، وائننگ فیشل، اپنی ایجننگ فیشل اور ایکسپری فیشل۔

اگر خوش قسمتی سے آپ کی جلد ہر قسم کے مسائل سے پاک ہے تو آپ مندرجہ ذیل طریقوں سے نارمل فیشل کریں۔ منہ دھو کر سادہ دودھ سے روئی کی مدد سے چہرے کا مساج کریں۔ پانچ منٹ تک کلیننگ کرنے کے بعد سادہ روئی سے چہرہ صاف کر لیں، نارمل جلد میں